

Click on http://www.paksociety.com for more
READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
گھر کے ہر فرد کے لیے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
دسمبر 2015
نگران اعلیٰ
معراج رسول
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM
☆ قیصرہ حیات، نگہت سیما اور دُرِّ ثمن بلال کے خوب صورت ناول
☆ نیلم احمد بشیر، سکینہ فرخ وتابندہ نعیم کی دلکش تحریریں
☆ جانی پہچانی صداکارہ ربیعہ اکرم کی کاوشوں کی حوصلہ افزا داستان
READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

ماہنامہ
کراچی

نگرانِ اعلیٰ: [illegible] رسول
مدیرۂ اعلیٰ: عذرا رسول
مدیرہ: انجم انصار
معاون: آمنہ حماد

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی



ماڈل: سونیا
میک اپ: روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی: موسیٰ رضا

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789
نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
رانا اے حمید 0323-2895528
نمائندہ لاہور سید افراز علی نازش 0332-4214400

قیمت فی پرچا (پاکستان) 60 روپے
قیمت فی پرچا (سعودی عرب) 12 ریال یا مساوی متحدہ عرب امارات
زرِ سالانہ (اندرون ملک) 800 روپے ...... جلد: 43 شمارہ: 09 دسمبر 2015ء

اداریہ

سلسلے وار ناول

منی ناول

ناولٹ

مکمل ناول

افسانے

خصوصی مضامین

مستقل عنوانات

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن ۔ مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313. Fax: 35802551, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجھے کچھ کہنا ہے......!

بے شک موت برحق ہے لیکن حادثاتی، اچانک اور ارضی و آسمانی آفات سے ہونے والے سانحات گہرے زخم چھوڑ جاتے ہیں کیونکہ قدرتی آفات ہزاروں گھروں کو برباد کرتی ہیں، بچوں کو یتیم اور بزرگوں کو ان کی اولاد سے محروم کر دیتی ہیں۔

پاکستان کی تاریخ کے بدترین زلزلے نے پوری پاکستانی قوم کو نہ صرف ہلا کر رکھ دیا ہے بلکہ اس حقیقت سے بھی روشناس کرا دیا ہے کہ پاکستان میں قدرتی آفات سے پیشگی خبردار کرنے والا نظام شاید کوئی ہے ہی نہیں......

زلزلے کا مرکز کوہ ہندوکش میں افغانستان کے صوبہ بدخشاں کا علاقہ فیض آباد تھا۔ ہندوکش وہ پہاڑی سلسلہ ہے جہاں گزشتہ دو سالوں سے قدرے کم شدت کے زلزلے بھی تواتر سے آرہے ہیں...... ماہرین ارضیات کا کہنا ہے کہ چھبیس اکتوبر کو آنے والا زلزلہ مزید خطرناک زلزلوں کا پیش خیمہ ہوسکتا ہے۔ یوں بھی پاکستان زلزلوں کی پٹی پر واقع ہے۔ اور ماضی میں آنے والے زلزلوں اور سیلاب جیسی قدرتی آفات سے بچاؤ کے معاملے میں حکومتوں کا ریکارڈ کوئی قابلِ رشک نہیں رہا۔ دوسرے ممالک میں جہاں اکثر زلزلے آتے رہتے ہیں، اچھے حفاظتی انتظامات کی بدولت نقصانات برائے نام ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایسی آفات کے بعد بھاگ دوڑ تو خوب دکھائی جاتی ہے کہ ہم نے یہ کیا اور ہم نے وہ کیا......اور فلاں سے زیادہ کیا......مگر کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہماری حکومت بعد کی بھاگ دوڑ کے بجائے قدرتی آفات سے بچاؤ کے پیشگی اقدامات پر توجہ دے اور عوام کی جان و مال کو بچانے کی بھرپور تدابیر کرے...... کہ کسی بھی حکومت کا یہ اولین فرض ہے کہ وہاں کے عوام کی جان و مال کی حفاظت کی جائے...... دوسری باتیں تو بہت بعد کی ہیں جو زندگی سے مشروط و مربوط ہیں۔ بحران ......افراد اور قوم کو بے نقاب کیا کرتے ہیں......اس لحاظ سے یہ ہم سب کے لیے بھی امتحان کی گھڑی ہے......اس لیے آج آپ اپنے آپ سے پوچھیں...... کہ آپ نے اس میں کیا حصہ لیا ہے۔

مدیرہ
انجم انصار

دین کی باتیں



ہر طرح کی تعریف اللہ کو (سزاوار) ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور تاریکیاں اور روشنی بنائی پھر (اس قدرۃ ظاہرہ کے) جو لوگ کافر ہیں وہ (دوسروں کو) اپنے پروردگار کے برابر کرتے ہیں (۱) (اے لوگو) وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر (تمہارے مرنے کا) ایک وقت معین کیا اور (قیامت کے آنے کا) اس کے ہاں ایک وقت معین ہے پھر (بھی) تم شک کرتے ہو (۲) اور وہی اللہ ہے (حاکم) آسمانوں میں اور زمین میں جانتا ہے تمہاری پوشیدہ بات کو (بھی) اور تمہاری ظاہر بات کو بھی اور جو کچھ تم کرتے ہو اس کو (بھی) جانتا ہے (۳) اور (ان لوگوں کا عجب حال ہے کہ) ان کے پاس اللہ کی آیتوں میں کوئی آیت نہیں آئی مگر یہ کہ یہ لوگ اس سے اعراض کرتے ہیں (۴) پس ثابت ہو گیا کہ (امر) حق جب ان کے پاس آیا تو انہوں نے اسے جھٹلایا تو عنقریب انہیں اس چیز کی حقیقت معلوم ہو جائے گی جس کے ساتھ یہ مسخرا پن کرتے ہیں (۵) کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنے گروہ ہلاک کر ڈالے ہیں (باوجودیکہ) ہم نے انہیں زمین میں ایسا قابض کیا تھا کہ اس قدر تمہیں نہیں قابض کیا اور آسمان کو ہم نے ان پر لگاتار پانی برساتا ہوا چھوڑ دیا تھا (یعنی بارش خوب ہوتی تھی) اور ہم نے ان کے نیچے بہتی ہوئی نہریں بنائیں پھر ان کے گناہوں کے سبب سے ہم نے انہیں ہلاک کر دیا اور ان کے بعد دوسرے لوگ پیدا کیے (۶) اور اگر ہم تم پر کاغذ پر لکھا ہوا (قرآن آسمان سے) اتارتے اور یہ لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھوتے (تب بھی نہ مانتے اور) بے شک جو لوگ کافر ہیں کہتے ہیں کہ یہ تو ایک کھلا ہوا جادو ہے (۷) اور کہتے کہ کوئی فرشتہ نبی پر کیوں نہیں اتارا گیا حالانکہ اگر ہم فرشتہ بھیج دیتے تو بے شک ان کا کام تمام ہو جاتا پھر انہیں مہلت نہ دی جاتی (۸) (سورۂ انعام آیت نمبر ۱ تا ۸)

سیدنا محمود ﷺ

اسم مبارک 'محمود' عدد '۸' کی خصوصیات کا مظہر:

نیز سورۃ الحاقۃ میں ارشاد ہے۔ اور تمہارے پروردگار کے عرش کو اس روز آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے یعنی وہ آٹھ فرشتے بھی انتہائی معزز و مقرب ہوں گے نیز بہشتوں کی تعداد بھی آٹھ گنوائی جاتی ہے۔ نیز عدد '۸' انتہائی طاقت اور حکومت کا علمبردار ہے اور ابدی عظمت وہی ہے جو بہشت میں عطا ہوگی اور بہشت کا مقام محمود، آپ ﷺ کے لیے مخصوص ہے اور آپ ﷺ کا اسم مبارک 'محمود' اسی مقام عظمت سے منسوب ہے اس لیے احمد، حامد، محمود، سب کا نمبر آٹھ ہے۔



۶۔ الفضائل:

۱۔ روزانہ باوضو حالت میں ۴۰ مرتبہ اس اسم مبارک کو پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے والا بہت جلد دولت مند ہو جائے گا۔

۲۔ روزانہ نماز فجر اور نماز عشا کے بعد ۱۴۰ مرتبہ پڑھنے سے ہر دعا پوری ہوگی اور چند دنوں میں حاجت پوری ہو جائے گی۔

نوٹ: ہر قسم کا ورد کرنے سے پہلے کسی مستند روحانی بزرگ کی اجازت ضروری ہے۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس

یادوں کی مالا

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی



پُرعقیدت روحانی سفر کی حیرت انگیز رُوداد

یہ داستان جو میں رقم کررہی ہوں یہ کوئی عام داستان نہیں...... نہ ہی عام لوگوں کے لیے کشش کا باعث ہوگی۔ یہ داستانِ عشق ہے۔ اس عشق کی داستان جو اللہ کی کتاب سے کیا گیا۔

تیسرا باب

یہ داستان جو میں لکھ رہی ہوں وہ صرف قلم اور قرآن حکیم کے حوالے سے ہے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں میری زندگی صرف دو چیزوں کے گرد گھوم رہی ہے۔ ایک قلم اور دوسرا قرآنِ حکیم...... اللہ تعالیٰ نے قلم کے ذریعے علم سکھایا اور قرآنِ حکیم کے اندر پورا کا پورا علم بند ہے۔ جس شخص نے ان دو چیزوں کو تھام لیا اس نے فلاح پائی۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ قلم میں قسم کھائی ہے۔

"ن۔ قلم کی اور جو (اہلِ قلم) لکھتے ہیں اس کی قسم!" (۱۔۲۸)

قلم اور اہلِ قلم دونوں کی قسم کھائی گئی۔ اب اہلِ قلم پر جو ذمّے داریاں عائد ہوتی ہیں ان سے بھی آگاہی ہونی چاہیے۔ مجھے اپنی زندگی کے حوالے سے بات کرنی ہے۔ میں نے اگر کسی کو کوئی تحفہ دیا ہے تو قلم اور قرآن شریف کا...... اور ملا تو بھی قلم اور قرآن شریف...... میں قابلِ ذکر تحفے کی بات کررہی ہوں۔ مجھے زندگی میں سب سے پہلا قابلِ ذکر تحفہ ملا وہ قرآن حکیم ہی تھا۔ جس کا ذکر میں پہلے کرچکی ہوں اور میں نے لکھ کر دیا وہ بھی قرآنِ حکیم......

آج بھی میں اپنے قلم کے ذریعے اگر کسی کے حق میں کوئی کلمۂ خیر لکھ سکتی ہوں تو ضرور لکھتی ہوں۔ کوئی

سورہ لکھ کر گفٹ کر دیتی ہوں یا پھر دعا کے لیے قرآنِ حکیم بھی پڑھ دیتی ہوں۔ میں نے اپنے گھر والوں، رشتے داروں، دوستوں اور کئی لوگوں کے لیے قرآن پاک ختم کیے اور دعائیں کیں۔ میری بے شمار دعائیں قبول ہوئیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر خاص کرم ہے۔

عجب بات ہے کہ کسی بات کو صرف سوچ لوں وہ بھی ہو جاتی ہے۔ دل میں کسی چیز کا خیال کروں وہ پوری ہو جاتی ہے۔ کسی سے ملنا چاہوں تو ملاقات ہو جاتی ہے۔ کسی کا فون نمبر چاہیے، وہ مل جاتا ہے۔ دور دراز بیٹھی دوستوں سے رابطہ ہو جاتا ہے۔ (جن سے رابطے کی بظاہر کوئی صورت نہیں ہوتی) صرف میرے سوچ لینے کی دیر ہوتی ہے اور غیب سے کوئی ایسا انتظام ہو جاتا ہے کہ میری خواہش فوراً پوری ہو جاتی ہے۔ یہ کہنا کہ دعائیں قبول نہیں ہوتیں، بہت بڑا گناہ ہے۔ دعائیں پوری ہونے کے تین طریقے ہیں۔

1۔ جوں کی توں دعا قبول کر لی جائے۔

2۔ اس سے بہتر چیز عطا ہو جائے۔

3۔ آخرت کے لیے دعا کو اٹھا کر رکھ لیا جائے اور دوسری زندگی میں اس کے عوض بیش بہا تحائف سے نوازا جائے۔

ساری بات عقیدے کی ہے، یقین کی ہے اگر یقین نہیں تو کچھ بھی نہیں...... دنیاوی زندگی صرف سراب ہے، دھوکا ہے، اس کے سوا کچھ بھی نہیں، اصل زندگی وہ ہے جو آنے والی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ یہ اللہ کا فرمان ہے اور یہی ہمارا یقین ہے۔ ہمیں ہر حال میں اللہ کا شکر گزار ہونا ہے۔ خواہ ہمیں کچھ ملے یا پھر چھن جائے۔ راضی بہ رضا ہونا اسی کو کہتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جب اللہ تجھ سے راضی اور تو اللہ سے راضی۔

اللہ تعالیٰ کہتا ہے۔

"تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔" (۲۔۱۵۲) اپنے دل میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی یاد کو بسائے رکھنا چاہیے۔ باقی سب بیکار ہے۔ اللہ تعالیٰ سے محبت کرو، اللہ تعالیٰ کہتا ہے۔

"تم ہماری طرف ایک قدم بڑھاؤ، ہم تمہاری طرف دس قدم بڑھائیں گے۔ تم چل کر آؤ ہم دوڑ کر آئیں گے۔" اللہ سے محبت کرو دل کو سکون ملتا ہے۔ قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے۔ عزت ملتی ہے، کامیابی ملتی ہے۔ برخلاف اس کے کہ کسی انسان کی محبت میں ڈوبو تو رسوائی ملتی ہے، جدائی مقدر بنتی ہے اور غم ملتا ہے۔ جس قدر اس کی جانب بڑھو وہ دور بھاگتا ہے۔ تیز اور تیز...... پیچھے مڑ کر دیکھنا نہیں چاہتا اور اپنے آپ کو وہ سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے جو وہ ہوتا نہیں۔ تو پھر کیوں نہ اس ہستی کو دل میں بسائیں جو عطا کرنے والی ہے۔ سکون کی دولت سے مالا مال کرنے والی، عزت دینے والی اور سو گنا محبت کرنے والی۔

مجھے اپنے قلم پر اختیار ہے نہ جذبوں پر...... خیالات کا ایک سمندر ہے جو مجھے بہا کر نہ جانے کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔ میں بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں، لکھنا چاہتی ہوں مگر وہ سب کچھ لکھ نہیں سکتی، نہ کہہ سکتی ہوں۔ میں تو اس یادوں کی مالا میں صرف چند باتیں لکھ رہی ہوں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ میری تحریر میں ربط ہے بھی یا یہ بے ربط ہو گئی ہے۔ اب پھر اپنے لکھے ہوئے قرآنِ حکیم کی بات کروں گی۔

میں نے دوسرا قرآن پاک 3 دسمبر 1973ء میں مکمل کر لیا تھا پھر یکے بعد دیگرے دو بچوں کی پیدائش (کاشف 14 فروری 1974ء اور عالیہ 10 مئی 1975ء) نے مجھے بے حد مصروف کر دیا۔ میں قرآن پاک کثرت سے پڑھا کرتی لیکن دل میں ایک ہوک سی اٹھتی، ایک بار پھر لکھنے کی...... میں بے چین رہنے لگی۔ میں نے اپنے شوہر سے ایک ریکویسٹ کی کہ قرآن پاک لکھنے کے لیے کاغذ کا انتظام کریں۔ وہ میری بات کب ٹالتے تھے مگر جانتے تھے کہ میں گھر میں کتنا کام کرتی ہوں، تین بچوں کی پرورش اور پورے گھر کا کام...... ان دنوں میری صحت بھی گر گئی تھی مگر میرے ذہن میں قرآن حکیم لکھنے کی خواہش شدت اختیار کر گئی۔ چنانچہ میرے شوہر نے کاغذ پرنٹ

کروائے اور 6 مئی 1976ء کو تیسرا کلام پاک لکھنا شروع ہوا۔ اس وقت میرے بچے، دو اور ایک سال کے تھے۔ میں دوپہر کے وقت بعد نمازِ ظہر لکھا کرتی تھی۔ آصف اسکول سے واپس آکر سو جاتا۔ کاشف دو سال کا تھا۔ وہ کھلونوں سے کھیلتا رہتا۔ عالیہ ایک سال کی تھی اور چلتی نہیں تھی۔ (اس نے دیر سے چلنا شروع کیا) ان دنوں میں نے کھانے کی میز پر اپنی جگہ بنائی ہوئی تھی۔ میں اپنے برابر کی کرسی پر عالیہ کو بٹھاتی اور اس کے سامنے میز پر باریک دال موٹھ رکھ دیتی اور وہ ایک ایک دانہ اٹھا کر کھاتی رہتی، خاموشی کے ساتھ اور میں قرآن پاک لکھتی رہتی۔

میری خواہش کتنی آسانی سے پوری ہوتی رہی۔ اب سوچتی ہوں تو حیرانی ہوتی ہے کہ بچوں نے اس معاملے میں بالکل تنگ نہیں کیا۔ حالانکہ وہ عام بچے تھے۔ آپس میں کھیلنے کودنے اور لڑنے جھگڑنے والے، اودھم مچانے والے مگر بہت کہنا ماننے والے تھے۔ میں نے اپنے بچوں کو کبھی مارا نہیں، ہمیشہ پیار سے سمجھایا۔ پیار سے پڑھایا۔ اپنے تینوں بچوں کو قرآن پاک میں نے خود ہی پڑھایا، کوئی مولوی نہیں رکھا۔

یہ قرآن حکیم جو میں نے 6 مئی 1976ء کو شروع کیا تھا وہ اسی سال 8 دسمبر 1976ء کو مکمل ہوگیا۔ دیکھیں اللہ کی قدرت اور اس کا کرم...... کس طرح اس کی رحمت میرے ساتھ ساتھ رہی۔ اتنے چھوٹے بچوں کے ساتھ یہ بڑا کام کتنی جلدی مکمل ہوا۔

قرآن حکیم کے ساتھ، ساتھ مجھے ناولز کی بھی فکر تھی جو تین عدد ناولز میں نے مسلم باغ میں لکھے تھے وہ جوں کے توں رکھے ہوئے تھے۔ ان کی اشاعت کا مسئلہ تھا۔ میرے دو ناول فروغِ ادب سے شائع ہوئے تھے۔ جناب سرور کیفی صاحب نے خوشی سے شائع کیے تھے مگر پھر انہوں نے اپنا یہ اشاعتی ادارہ بند کردیا اور نعت گوئی میں مشغول ہوگئے۔ ان کے 18 نعتیہ کلام کے مجموعے شائع ہوئے اور اب ان کا انتقال ہوچکا ہے، اللہ ان کو غریقِ رحمت کرے۔ (آمین) میری شدید خواہش کو دیکھتے ہوئے بلگرامی صاحب نے میرا ناول "اک دیا بجھا بجھا سا" خود شائع کروایا۔ ان دنوں ان کی جیب خالی تھی مگر جو کچھ تھا کتاب کی اشاعت پر لگا دیا۔ اس کی چھپائی اور کاغذ معیاری نہیں تھا کیونکہ اتنی رقم پاس نہیں تھی مگر میری خواہش پوری ہوگئی تھی۔ میں نے اپنا ناول "ستاروں سے آگے" ایک ہفت روزہ میں شائع کروایا جس کی غالباً 180 اقساط تھیں۔

ابھی میں تیسرے کلام پاک کو لکھ کر فارغ ہوئی تھی کہ افسانہ نگاری کا دور شروع ہوگیا۔ میرے شوہر نے مجھ سے کہا افسانے لکھا کرو۔ میں چونکہ صرف ناول ہی لکھ رہی تھی اور اس وقت تک پانچ ناول لکھ چکی تھی۔ اس وجہ سے افسانے کی طرف دھیان نہیں گیا مگر بلگرامی صاحب کے مشورے اور زور دینے پر میں نے 1977ء سے افسانہ نگاری شروع کردی پھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ساتھ ہی ساتھ بچوں کی کہانیاں بھی لکھنی شروع کردیں جو لاہور کے ماہنامے تعلیم و تربیت میں شائع ہونے لگیں۔ سب سے پہلے میں نے تعلیم و تربیت میں اپنی بیٹی عالیہ کے لیے لکھی گئی نظمیں شائع کروائیں۔ اس وقت ماہنامہ تعلیم و تربیت کے ایڈیٹر پروفیسر خالد بزمی (مرحوم) تھے جو میو کالج لاہور میں تھے۔ انہوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ نہ صرف یہ کہ میری نظمیں شائع کیں بلکہ کہانیاں اور مضامین بھی...... میری اکثر کہانیوں پر انہیں اعتراض ہوتا تھا کہ انجام غم ناک ہے پھر یہ کہ میری کہانیاں بہت چھوٹے بچوں کے لیے نہیں تھیں۔ ان میں افسانوی رنگ جھلکتا تھا۔ وہ مجھ سے شکایت کرتے تھے مگر میں مجبور تھی اپنا طرزِ تحریر بدل نہیں سکتی تھی۔ چنانچہ میں اپنے مخصوص انداز میں لکھتی رہی اور وہ چھاپتے بھی رہے۔

میرے افسانے ہر ماہ کسی نہ کسی ڈائجسٹ میں چھپتے رہے۔ ان دنوں پاکیزہ ڈائجسٹ کے ساتھ ساتھ دیگر ڈائجسٹ بھی چل رہے تھے۔ سبھی نئے تھے اور انہیں اچھے رائٹرز کی سپورٹ کی ضرورت تھی۔ افسانہ نگاروں

کی حوصلہ افزائی کے لیے پاکیزہ ڈائجسٹ نے 1978ء اور 1979ء میں افسانہ نگاری کا مقابلہ کروایا اور اوّل آنے والے افسانے پر 500 روپے کا انعام مقرر کیا۔ میں نے اس میں پہلا انعام حاصل کیا۔ 1979ء میں، میں نے بہت زیادہ لکھا۔ اس سال میرے 18 افسانے شائع ہوئے۔ بچوں کی کہانیاں اس کے علاوہ تھیں اور ''بندھن'' ناول بھی قسط وار شائع ہوا۔ ان ڈائجسٹوں کے علاوہ میں اردو ڈائجسٹ میں بھی لکھ رہی تھی۔ اردو ڈائجسٹ میں بڑے ادیب ہی شائع ہوتے تھے۔ میں نے یہاں بھی اپنی جگہ بنالی۔ ایک دن ینگ رائٹرز ایسوسی ایشن کے صدر میرے گھر آئے اور میرے ساتھ ایک شام منانے کی تجویز رکھی۔ میں نے منع کر دیا، میں نہیں سمجھتی تھی کہ اتنی جلد لوگوں کو میرے ساتھ شام منانی چاہیے۔ وہ صاحب مایوس ہو کر واپس چلے گئے مگر پھر وہ صاحب 1982ء میں دوبارہ آئے۔ اس وقت تک میں بہت زیادہ چھپ چکی تھی۔ اس بار میں نے منع نہیں کیا اور بلگرامی صاحب کی اجازت سے راضی ہوگئی۔ چنانچہ وائے ایم سی اے میں میرے ساتھ ایک شام منائی گئی جس میں سیکڑوں لوگوں نے شرکت کی۔ عراق قونصل خانے کے میڈیکل چیئر مین ڈاکٹر علی مطلق مہمانِ خصوصی تھے۔ مقالہ پڑھنے والوں میں ڈاکٹر سرور اکبر آبادی، ڈاکٹر طاہرہ اور شمع زیدی تھے...... رُوداد جنگ اخبار میں شائع ہوئی۔ انٹرویوز کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہا اور افسانہ نگاری کے ساتھ، ساتھ ناول نگاری بھی ہوتی رہی۔ مختلف رسالوں کے مالکان کے یہاں اکثر تقریبات ہوتیں اور بلگرامی صاحب مجھے ہمیشہ لے جاتے۔ ہر ایک سے ملواتے۔

مجھے تمام زندگی اللہ کی رحمت سے کامیابیاں ملتی رہیں۔ میں نے جس چیز میں ہاتھ ڈالا کامیاب ہوئی۔ جس راستے کو چُنا منزل کا پتا پایا۔ یہ سب کچھ صرف اور صرف قرآن حکیم کی برکتیں تھیں۔ مجھے ہمیشہ ایک قسم کے تحفظ کا احساس رہا۔ اسکول کے زمانے میں جب نویں اور دسویں جماعت کا ایک ساتھ امتحان ہوتا تھا (میٹرک کے لیے) اس وقت نویں جماعت کا ہوم اگزامینیشن ہوتا تھا۔ ہمارے جیکب لائن اسکول میں نویں جماعت کے پانچ سیکشن تھے۔ نویں کلاس کے سالانہ امتحان میں، میرے پانچوں سیکشن میں سب سے زیادہ نمبر تھے۔ میں تصور ہی تصور میں خود کو اس مقام پر دیکھنا چاہتی تھی اور اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ دن دکھایا۔ میں نے گورنمنٹ کالج فار ویمن فریئر روڈ سے بی ایس سی کیا۔ اس کالج میں ہر سال ہر مضمون میں اول آنے والی لڑکی کو ایک تقریب کے دوران انعام ملا کرتا تھا۔ ایف ایس سی میں تو میں انعام حاصل نہ کر سکی مگر بعد میں بی ایس سی پارٹ ون اور پھر بی ایس سی پارٹ ٹو میں بھی باٹنی میں سب سے زیادہ نمبر لینے پر اول انعام حاصل کیا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اس زمانے میں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ ان کے ہاتھ سے انعام لیتے ہوئے میرے پاس یادگار تصاویر موجود ہیں۔

اب میں آپ کو ایک عجیب سی بات بتاؤں۔ مجھے تقریر کرنا نہیں آتی تھی اور نہ ہی میں نے کبھی تقریر کی تھی۔ مگر مجھے یہ شوق تھا کہ میں اردو ڈیبیٹنگ سوسائٹی کی وائس پریزیڈنٹ بنوں۔ میں اس کرسی پر بیٹھنا چاہتی تھی۔ یہ میری خواہش تھی اور جو خود تقریر نہ کرتا ہو وہ وی پی کی پوسٹ پر کیسے پہنچ سکتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کو میری خواہش پوری کرنی تھی اس لیے یہ ہوگیا۔ میں اپنی کلاس کی سی آر تھی۔ اردو ڈیبیٹنگ سوسائٹی میں بھی اور بزم ادب میں بھی۔ انٹر سائنس میں باٹنی سوسائٹی کی سی آر بھی رہ چکی تھی۔ بہرحال اس وقت بات ہو رہی ہے بی ایس سی کے زمانے کی۔ مجھے سی آر تو چن لیا گیا تھا پھر انہی سی آر لڑکیوں میں سے کسی ایک کو وی پی نامزد کیا جانا تھا۔ سوسائٹی میں پورے کالج کی آرٹس اور سائنس کی تمام کلاسوں کی سی آر شامل تھیں۔ اتفاق یہ ہوا کہ ایک لڑکی نے میرا نام لے دیا۔ پھر اس کے بعد اسی نام پر سب نے اتفاقِ رائے کیا اور یوں میں وی پی بن کر ایک دن اس کرسی پر جا بیٹھی۔ جس کا میں نے خواب

دیکھا تھا اور ایک بڑے تقریری مقابلے کی صدارت کی جس میں کراچی کے کئی کالجز آئے ہوئے تھے۔ پھر یہ سلسلہ بھی چلتا رہا۔ وحیدہ نسیم ہماری باٹنی کی استاد تھیں اور افسانے ناول لکھتی تھیں۔ شاعری بھی کرتی تھیں۔ انہوں نے میری شاعری دیکھی اور سر پیٹ لیا۔

''دکیہ تمہیں ہوا کیا ہے؟ کیا لکھ کر لائی ہو۔ یہ تم مشاعرے میں پڑھو گی؟'' میں نے ان سے کہا آپ اسے ٹھیک کر دیں۔ غرض یہ کہ میرا شوق دیکھتے ہوئے انہوں نے اسے نوک پلک سے درست کیا اور یوں میں نے اپنی یہ خواہش بھی پوری کی۔ میں اپنی ان استاد سے بے حد متاثر تھی۔ وہ بہت اچھا پڑھاتی تھیں۔ کلاس میں بہت سخت تھیں مگر کلاس کے باہر دوستانہ انداز میں گفتگو کرتی تھیں۔ میں چونکہ باٹنی میں اچھی تھی اس وجہ سے وہ مجھے پسند کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھے بے حد چاہا۔ یہ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں۔ کوئی ٹیچر اپنی کسی شاگرد کو اس طرح نہیں چاہے گا۔ 1992ء میں جب حکیم محمد سعید صاحب نے مجھے شامِ ہمدرد میں مہمان بلایا تھا اس دن وحیدہ نسیم صاحبہ بھی مہمانوں میں شامل تھیں (کُل چار مہمان ہوتے تھے) انہوں نے جب یہ دیکھا کہ میرے ہاتھ میں قرآن پاک ہے (میرے ہاتھ کا لکھا ہوا) اور آج اسی حوالے سے مجھے ان کے ساتھ بلایا گیا ہے تو انہوں نے بے اختیار میرے ہاتھ چوم لیے۔ پروگرام کے بعد میری پیشانی پر بوسہ دیا اور بہت اچھی باتیں کیں۔ وہ میری افسانہ نگاری اور ناول نگاری سے بھی بہت خوش تھیں۔ بزم سائنسی ادب کے ایک پروگرام میں وہ مہمانِ خصوصی بن کر آئیں تو اس پروگرام میں، میں نے اپنا افسانہ پڑھا۔ ''فیصلہ'' جو بہت پسند کیا گیا۔ اس دن میری ان سے آخری ملاقات ہوئی تھی پھر ان کا انتقال ہو گیا۔

میں نے باٹنی میں ایم ایس سی صرف اس لیے کیا کیونکہ وحیدہ نسیم نے یہ مضمون بہت اچھا پڑھایا تھا اور مجھے اس مضمون میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ دو سال تک میں سب سے زیادہ نمبر لے کر اول انعام بھی لے چکی تھی۔

یونیورسٹی کے دو سال بہت یادگار ہیں۔ میں نے ایم ایس سی 1965ء میں کیا۔ ان دنوں ہمارا باٹنی ڈیپارٹمنٹ زیرِ تعمیر تھا۔ ہماری کلاسز بیرکس میں ہوتی تھیں۔ بہت تھوڑے اسٹوڈنٹس تھے، ایم ایس سی میں داخل ہونے والے ہم صرف دس طالب علم تھے۔ جن میں آٹھ لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ ہمارے چیئر مین ڈاکٹر ارتفاق علی تھے جو بعد میں v.c بھی بنے۔ ڈیپارٹمنٹ میں بہت زیادہ ڈسپلن تھا۔ سارے اساتذہ بھی اچھے تھے اور ماحول بھی اچھا...... ان دنوں گاؤن کی بڑی پابندی ہوتی تھی۔ ہر اسٹوڈنٹ سیاہ گاؤن میں ہی نظر آتا تھا اور اساتذہ سبز گاؤن میں۔ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے نزدیک ایک کینٹین تھی جہاں سے ہم دوپہر کا کھانا کھاتے تھے۔ اس وقت ہمارے پورے ماہ کے لنچ کا خرچ 5 روپے ہوتا تھا۔ ایک آنے کی روٹی اور دو آنے کا کباب خریدتے اور پیٹ بھر کر کھانا کھاتے۔ ایم ایس سی میں پریویس میں ہم نے کینٹین سے کھانا کھایا لیکن فائنل ایئر میں گھر سے لے کر آتے تھے اور لیب میں کھانا کھاتے تھے۔ شام کی چائے بھی لیب میں بیکر میں بنتی تھی اور چھوٹے بیکروں میں پی جاتی تھی۔ فائنل میں چونکہ special paper ہوتا ہے اس وجہ سے سب لڑکے، لڑکیاں اور کم ہو کر الگ الگ بٹ گئے تھے۔ ہم نے physiology میں داخلہ لیا تھا۔ اور ہم کُل پانچ اسٹوڈنٹس تھے، ایک لڑکا اور چار لڑکیاں...... ہمارے physiology کے استاد ڈاکٹر رفیق تھے جو کہ کلاس نہیں لیتے تھے لیکن topic اور کتابیں بتا دیتے تھے۔ ہم تیاری خود ہی کرتے تھے لیکن پریکٹیکل جو صبح سے شام تک جاری رہتا تھا۔ ہمارے ساتھ واحدی صاحب ہوتے تھے۔ یہ ہم سے صرف دو سال سینئر تھے اور محنتی استاد تھے۔ اپنا خوب رعب رکھتے تھے۔ میں نے اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے پورے دور میں ان سے بہتر استاد نہیں دیکھا۔ وہ بہت اچھا پڑھاتے تھے۔ ہمارے فائنل امتحان سے قبل ہی وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے ہوائی یونیورسٹی

امریکا چلے گئے۔ وہاں انہوں نے اپنا مضمون تبدیل کرلیا اور Genetics میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی اور اب وہ اسی ڈیپارٹمنٹ میں ہیں۔

یونیورسٹی کے دنوں میں بھی میں نے سالانہ پروگرام کے لیے کچھ نہ کچھ لکھا۔ قوالی لکھی اور پیش بھی کی۔ اسی طرح ٹیبلو اور کچھ دوسرے اسکرپٹ' اب یہ سب باتیں خواب معلوم ہوتی ہیں۔

یادوں کی مالا کچھ الجھ سی گئی ہے۔ بہت سے موتی ہیں، میں انہیں ایک لڑی میں پرونا چاہتی ہوں مگر ایسا نہیں کر پاتی اور اگر کوئی کام انسان کرنا چاہے اور کسی وجہ سے کر نہ سکے تو اسے وہ کام اس مقام پر اسی طرح چھوڑ دینا چاہیے۔ بقول ساحر لدھیانوی کے

وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن
اسے اک خوب صورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا

اس لیے فی الحال اس بیان کو اس جگہ چھوڑ کر ہی میں ایک بار پھر اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹ رہی ہوں۔ یعنی قرآن حکیم کی کتابت اور اس سے حاصل ہونے والی مراعات۔

میں نے اپنا تیسرا قرآن پاک 1976ء میں ختم کرلیا تھا۔ اس کے بعد کچھ گیپ آگیا کیونکہ افسانہ نگاری اور ناول نگاری زوروں پر تھی۔ ابھی مشکل سے تین سال گزرے تھے کہ دل اداس ہوگیا۔ قرآن حکیم کو لکھنے کی خواہش شدت اختیار کر گئی۔ اب میں اردو ترجمے کے ساتھ لکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ ایک بار پھر بلگرامی صاحب نے میرے لیے کاغذ کا انتظام کیا۔ مجھے دو طرح کے قلم کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انہوں نے میرے لیے دو قیمتی قلم خریدے۔ ایک شیفر جس سے عربی لکھی گئی اور دوسرا پارکر جس سے اردو ترجمہ لکھا گیا۔ اس کو مکمل کرنے میں پونے تین سال کا عرصہ لگ گیا۔ اس بار میں نے انگریزی تاریخ نوٹ نہیں کی تھی۔ قرآن حکیم پر جو تاریخ درج ہے وہ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۹۹ ہجری ہے اور اس کی تکمیل ۲۳ ذیقعد ۱۴۰۱ ہجری ہے۔

یہ غالباً 1979ء تا 1981ء کا زمانہ تھا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب میرے بے تحاشا افسانے شائع ہوئے اور ناول بھی، بچوں کی کہانیاں الگ تھیں۔ پورے قرآن پاک کو ایک ہفتے کے اندر ختم کر کے دعا مانگنے کا سلسلہ جاری تھا اور میں نہ جانے کتنے کام اللہ میاں سے کروا چکی تھی۔ اپنی بات منوا چکی تھی۔ یقین بہت پختہ تھا، دعا کیوں نہ پوری ہوتی۔ انہی دنوں مجھے ڈاکٹر عبدالغفار کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ ان کا گھر ہمارے گھر سے قریب ہی تھا۔ یہ میرے استاد ہیں plant pathologist، ان ہی کے انڈر بعد میں، میں نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کیا۔

ان کا بڑا بیٹا ان دنوں زیادہ بڑا نہیں تھا۔ وہ نارمل نہیں تھا، اسے مرگی کے دورے پڑتے تھے۔ ایک بار ہم ان سے ملنے گئے تو اسے ہمارے سامنے دورہ پڑ گیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ہر طرح کا علاج کر چکے، امریکا بھی علاج کے لیے لے گئے مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔

رمضان شروع ہونے والا تھا۔ میں نے اس رمضان میں ان کے بیٹے کے لیے قرآن حکیم ختم کیا اور دعا کی، ان سے کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ رمضان ختم ہوئے عید آئی۔ اس کے فوراً بعد ہی ہمارے گھر پاٹنی کے لوگوں کی گیٹ ٹوگیدر ہوئی۔ جس میں ڈاکٹر غفار اور ان کی بیگم بھی مدعو تھیں۔ اس روز میں نے ان کی بیگم سے پوچھا۔

''اب تو آپ کے بیٹے کو دورے نہیں پڑتے ہ؟'' کہنے لگیں۔

''نہیں!'' میں نے کہا۔

''اور اب پڑیں گے بھی نہیں۔'' پھر میں نے انہیں بات بتائی۔ مجھے اپنی دعا پر اس قدر یقین تھا کہ آج اس بات کو کم و بیش 25 سال گزر چکے ہیں، اسے پھر کبھی دورہ نہیں پڑا۔

عرصہ ہوا ان کی بیگم کا انتقال ہو چکا ہے، مرحومہ میرے افسانے شوق سے پڑھتی تھیں۔ سیدھی سادی نیک ملنسار خاتون تھیں۔ بے حد خاطر مدارات کرتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ (آمین)

میں نے پاکستان کے مختلف شہر دیکھے تھے، وقت

گزارا تھا مگر پاکستان سے باہر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ میرے شوہر کی دلی خواہش تھی کہ وہ علی گڑھ کا ایک چکر لگا آئیں اور بیوی بچوں کو بھی اپنے آبائی گھر لے جائیں لیکن کسی نہ کسی وجہ سے یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ شادی کے بعد جانے کا پروگرام بنایا تھا کہ 1971ء میں مشرقی پاکستان الگ ہو گیا اور انڈیا سے مدتوں تعلقات خراب رہے۔ اس وجہ سے جانا ٹل گیا۔ اس کے بعد ایک دفعہ اور ارادہ کیا، ویزا بھی لے لیا مگر انہی دنوں ہندو مسلم فسادات ہونے لگے اور ہمارا جانا پھر ٹل گیا۔

چونکہ میرے شوہر رشتے میں میری امی کے ماموں زاد ہیں، اس وجہ سے جب ان کے بڑے بھائی کی شادی ہوئی تھی اس وقت ہم انڈیا میں تھے تب ہم لوگ بلگرام سے علی گڑھ گئے تھے۔ مجھے بس خواب سا یاد ہے کیونکہ میں بہت چھوٹی تھی۔ ان کا گھر بہت بڑا ہے۔ یہ اللہ والی کوٹھی کے نام سے مشہور ہے کیونکہ کوٹھی کے اوپر ''اللہ'' لکھا ہوا ہے۔ جو لوگ علی گڑھ سے تعلق رکھتے ہیں وہ اللہ والی کوٹھی سے واقف ہیں اور ان کے مکینوں کو بھی جانتے ہیں۔ اس کا کل رقبہ پچیس ہزار مربع گز تھا۔ کوٹھی کے پیچھے دس ہزار مربع گز پر آم کا باغ تھا جسے کچھ سال قبل فروخت کر دیا گیا۔ اب بھی بہت زمین ہے۔ پانچ ہزار مربع گز پر دو منزلہ عمارت ہے اندر تہ خانے میں بھی کمرے ہیں اور تقریباً دس ہزار گز زمین خالی پڑی ہے۔ اس کے اندر کمرے اور اسٹور ملا کر تقریباً پچاس کمرے ہیں۔ اب سب اِدھر اُدھر ہو گئے۔ وہاں چند افراد رہتے ہیں۔ پورے علی گڑھ میں اس سے بڑی اور اس سے زیادہ خوب صورت کوئی اور کوٹھی نہیں۔ اب اس کوٹھی کو علی گڑھ یونیورسٹی کو گفٹ کر دینے کا پروگرام ہے تاکہ اس میں علی گڑھ یونیورسٹی کا ہاسٹل قائم کر دیا جائے۔ ایک ہزار مربع گز کے دو پارک بنائے جائیں گے جنہیں میری دو مرحوم نندوں (پھول آپا اور ڈاکٹر رفعت) کے ناموں سے موسوم کیا جائے گا...... ان دونوں کا انتقال 35 اور 40 سال کی عمروں میں ہو گیا تھا۔ اس طرح یہ کوٹھی اپنی اصلی حالت میں ہی محفوظ رہے گی۔ گھر کے اندر خوب صورت مسجد بھی بنی ہوئی ہے۔ ویسے تو اس کوٹھی کی قیمت کروڑوں میں ہے مگر فروخت کرنے پر اسے مسمار کر دیا جائے اور وہاں Multistoried بلڈنگ کھڑی ہو جائے تو...... یہ صورتِ حال میرے سسرال والوں کو گوارا نہیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی لکھا مجھے وہاں جانا خواب سا یاد ہے۔ اس گھر میں ایک لڑکا سفید کرتا پاجامہ پہنے ایک گیت گاتا تھا۔

جلدی میں لپ اسٹک بھول گئے، رومال پرانا چھوڑ گئے
وہ اپنی یاد دلانے کو اک عشق کی دنیا چھوڑ گئے

یہ گانا فلم جگنو کا ہے جس میں دلیپ کمار اور میڈم نور جہاں نے کام کیا ہے۔ ان دنوں غالباً مقبول رہا ہوگا۔

میں یہ بات اس لیے لکھ رہی ہوں کہ وہی چھوٹا لڑکا جو یہ گیت گاتا تھا، میرا شریکِ سفر بنا۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ گھر میری سسرال ہے۔ مجھے آگرہ جا کر تاج محل دیکھنا اچھی طرح یاد ہے۔ کیونکہ یہ پاکستان آنے سے قبل دیکھا تھا اور ایک عدد تصویر بھی کھنچوائی تھی۔

نہ جانے کتنی یادیں ہیں جو ذہن کی اسکرین پر ابھرتی ہیں اور مٹ جاتی ہیں۔ لیکن بعض یادیں مٹتی نہیں۔ وہ ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔ ان کے اثرات پوری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ یادیں دل میں بستی ہیں، اس میں بسیرا کرتی ہیں، جب تک دل زندہ رہتا ہے یاد بھی زندہ رہتی ہے۔ یاد کو دل سے نکال پھینکنا ناممکن ہوتا ہے اور سچ پوچھیں تو ہمارے پاس ہوتا ہی کیا ہے سوائے یادوں کے۔ یہی یادیں جینے کا سہارا بنتی ہیں، سکون مہیا کرتی ہیں۔ میری ایک تازہ طویل نظم جو یادوں کے حوالے سے ہے اس کے ابتدائی مصرعے کچھ یوں ہیں۔

نہ ہوتی یاد گر دل میں
تو دل خالی مکاں ہوتا
یہ تنہائی یہ بے چینی
یہ سوزِ دل کہاں ہوتا

☆☆☆

یہ داستان جو میں رقم کر رہی ہوں یہ کوئی عام داستان نہیں، نہ ہی عام لوگوں کے لیے کشش کا باعث ہوگی۔ یہ داستانِ عشق ہے۔ اس عشق کی داستان جو اللہ کی کتاب سے کیا گیا۔ عشق میرے نصیب میں لکھ دیا گیا۔ یہ اوپر والے کی نظرِ کرم ہے، اس کی دین ہے، اسی کی عطا ہے، اسی نے یہ راہ دکھائی۔ وہ جسے چاہے جس راستے پر ڈال دے، کسی کے اختیار میں نہیں کہ اس کی مرضی کے خلاف کچھ کر سکے۔ بات عشق اور یادوں کی ہو رہی ہے تو اسی حوالے سے چند تازہ اشعار اس جگہ لکھ رہی ہوں۔

پیارے نبی..... کو من میں بسا کر دل کا نگر آباد کروں
یاد کے موتی چُن چُن کر رکھوں من کو اپنے شاد کروں
ہاتھ بڑھاؤں اشک بہاؤں آپ ﷺ کی جالی چھو نہ پاؤں
من کی چتا کیوں کر پاؤں گر، کس سے فریاد کروں
نور کی کرنیں ہر سو بکھریں دل بھر کر جب یاد کروں
ایک تمنا دل میں بسی ہے خواب میں دیکھوں خواب میں پاؤں
آپ ﷺ کو اپنی نعت سناؤں پوری دل کی مراد کروں

میں آپ ﷺ کو خواب میں دیکھ چکی ہوں، جب بہت چھوٹی تھی تب دیکھا تھا۔ ایک چوکی ہے جس پر آپ ﷺ کے دائیں جانب بیٹھی ہوں اور آپ ﷺ اپنی انگلی مبارک کو قرآن حکیم کے اوپر رکھے کچھ بتا رہے ہیں۔ یہ خواب مجھے اچھی طرح یاد ہے اور بالکل نظروں کے سامنے ہے۔ اس کی تعبیر پچاس سال کے بعد ملی۔ 2005ء کے رمضان المبارک میں جب کراچی یونیورسٹی کے V.C نے مجھے کراچی یونیورسٹی کی لائبریری میں ایک استقبالیہ دیا اور میں نے وہاں اپنا مخطوطہ کلام پاک کا نسخہ دیا تو اس نسخے کو جس طرح وہاں رکھا گیا ہے اس سے اس خواب کی تائید ہوئی ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ نسخہ جو K.U میں ہے اسے میں نے محمد ﷺ کے لیے لکھا تھا اور پھر لائبریری میں جہاں سے داخل ہوتے ہیں وہاں پر ایک شوکیس میں اس قرآن حکیم کو رحل پر کھول کر رکھا گیا ہے۔ یہ ایک بڑے سائز کا قرآن پاک ہے۔ ایسا کچھ ڈاکٹر اخلاق احمد Pro vice chancellor کی ایما پر ہوا۔ میرے دوسرے نسخے جو مختلف جگہوں پر رکھے گئے وہ کہیں بھی رحل پر نہیں ہیں لیکن یہ کلام پاک جو حضور ﷺ کے لیے ہے وہ رحل ہی پر کھلا رکھا ہے۔ شوکیس کے باہر میرا نام آویزاں ہے۔ میں نہیں رہوں گی مگر یہ اسی جگہ رہے گا۔ (انشاءاللہ)

لکھتے ہوئے نہ جانے میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہوں۔ میں وہ سب کچھ لکھ دینا چاہتی ہوں جو میرے دل میں ہے، میری یادوں میں ہے مگر لکھ نہیں سکتی یا لکھنا نہیں چاہتی۔ اب میں اس قرآن حکیم کا تذکرہ کروں گی جو میرا پانچواں قرآن حکیم ہے، چوتھا قرآن حکیم ختم کیے کئی سال ہو چکے تھے۔ اس دوران میرے بے شمار افسانے شائع ہوئے۔ جو ناول شائع ہوئے ان میں ''غمِ دل'' ''اپنی منزل'' ''ستاروں سے آگے'' ''اک دیا بجھا بجھا سا'' کے علاوہ ''بندھن'' ''گئے موسم کے گلاب'' ''موم کی لڑکی'' ''سرابِ زندگی'' ''رہ گزر'' اور ''خلش'' شامل ہیں۔ یہ سارے ناول قسط وار مختلف رسالوں میں چھپے اور مجھے داد ملتی رہی۔ بعد میں کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے۔ ''سرابِ زندگی'' سب سے زیادہ پسند کیا گیا۔ یہ کتابی صورت میں بھی آیا لیکن پاکستان میں شائع ہونے سے قبل یہ دہلی (انڈیا) سے بھی شائع ہو چکا تھا۔ سب سے پہلے ''پاکیزہ'' ڈائجسٹ میں قسط وار شائع ہوا۔ میرے تمام ناول آؤٹ آف مارکیٹ ہیں لیکن اب یہ سب دوبارہ شائع ہو رہے ہیں۔

یہ 1988ء کی بات ہے۔ میں نے ایک بار پھر قرآن حکیم لکھنے کا عزم کیا۔ جب بھی کوئی نیا نسخہ تیار کرنے کا پروگرام بنتا، پہلے سے بہتر کاغذ اور ڈیزائن کا انتخاب عمل میں آتا۔ چنانچہ کتابت شروع ہوگئی۔

(باقی آئندہ)

قسط:16

اعتبارِ وفا

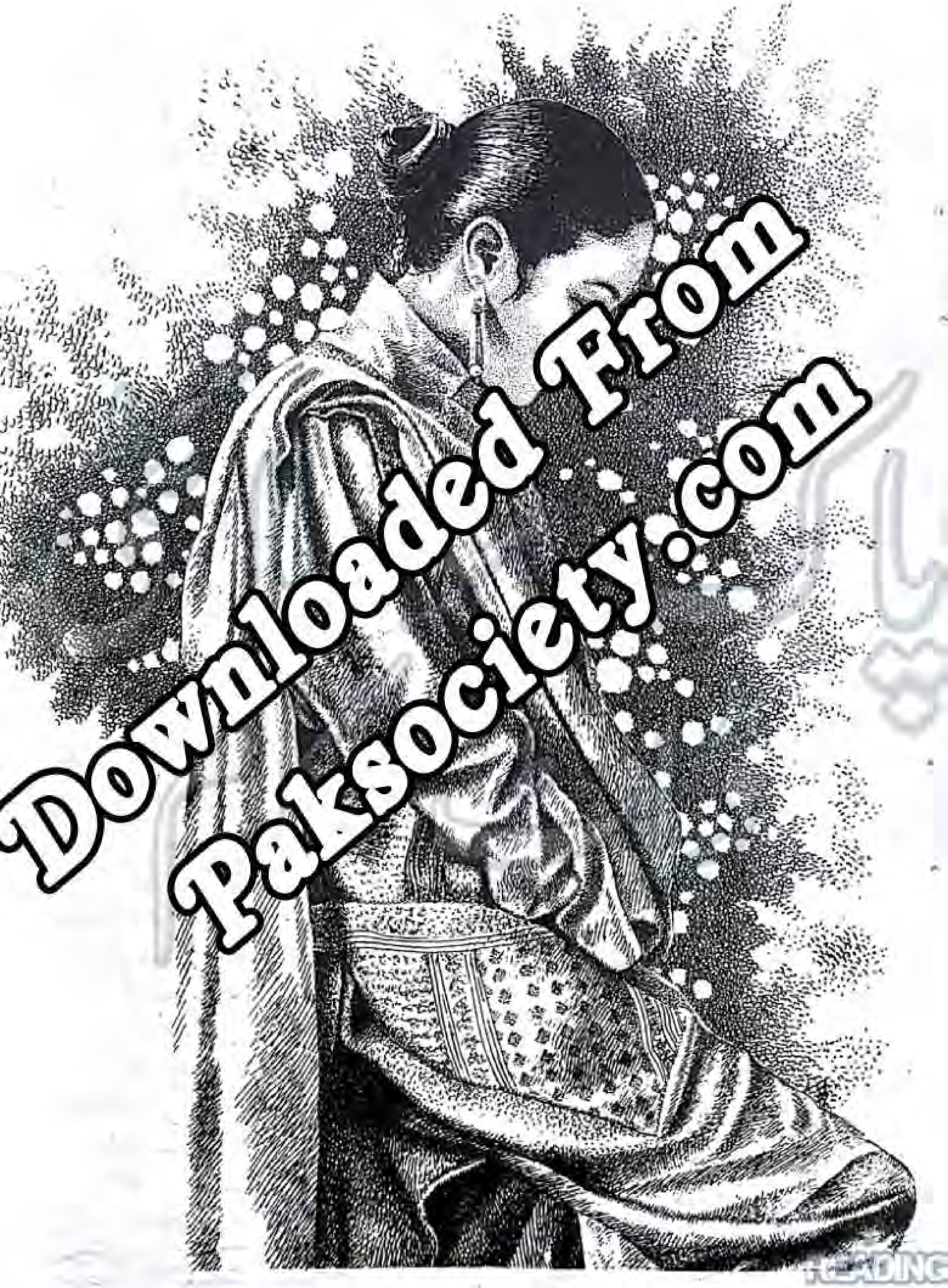
نگہت سیما

یہ سچ ہے کہ محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا... گفتگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف تو کیا دل و دماغ تک پر ایک بے وزن سی کیفیت محسوس ہوا کرتی ہے... کہ دل ودماغ کو کوئی دوسری بات سُجھائی تک نہیں دیتی۔ ایسے حالات میں کسی بھی انسان کے پاؤں جمے نہیں رہتے اور وہ ہر وقت لڑھکتا رہتا ہے۔

مگر خود کو سنبھال کر متوازن رکھنا ہی محبت کا اصل پلیٹ فارم ہے... لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس بے وزنی کے اصول کو بھی محسوس کر لیا جائے... اور مان لیا جائے... کہ محبت کا اوّلین قانون اعتبار ہے... اور وفا کے غنچے وہیں کِھلتے ہیں... جس گلشن میں اعتبار کا بیج بویا جاتا ہے۔

گلاب چہروں پہ دُھول کتنی مسافتوں کی جمی ہوئی ہے
چراغ آنکھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تنے ہوئے ہیں
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی حصّہ
کہاں کا ذکرِ سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رُکے ہوئے ہیں





''کون، کون ہے...... کیا نام ہے ان کا؟'' تجل کی آواز کانپ رہی تھی۔
''حاتی دادا......'' سنہری نے سرگوشی کی۔
''حاتی دادا......؟ تمہیں یقین ہے؟'' تجل کی آواز اب بھی کانپ رہی تھی۔
''نہیں، یقین تو نہیں ہے۔'' سنہری متذبذب ہوئی۔
''لیکن مجھے شک ہے یقین جیسا...... میں نے ظہورے سے سنا تھا، وہ اماں سے کہہ رہا تھا کہ وہ مان کیوں نہیں جاتیں کہ بجو، حاتی دادا کی اولاد ہے اور وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ اسے پورا یقین ہے کہ حاتی دادا ہی بجو کا باپ ہے۔''
''اور...... اور پھر اماں نے کیا کہا؟'' اس نے امید بھری نظروں سے سنہری کی طرف دیکھا۔
''اماں نے اسے ڈانٹ دیا تھا کہ وہ فضول باتیں نہ کرے۔''
تجل کی آنکھیں بجھ گئیں۔
''ہاں، ظہورے کی تو عادت ہے فضول باتیں کرنے کی اور تم بھی سچ سمجھ بیٹھیں۔''
''چلو ظہورے کی بات فضول ہی سہی لیکن تم اماں سے پوچھو تو سہی، اگر اتنا ہی شوق ہے تمہیں جاننے کا تو وہ تمہاری بات نہیں ٹالیں گی...... اتنی تو لاڈلی ہو تم ان کی۔''
''میں نے ایک بار پوچھا تھا لیکن اماں نے کہا انہیں کیا خبر کون ہے میرا باپ۔'' شرمندگی اور ذلت کے احساس سے اس کے رخسار سرخ ہوئے اور آنکھیں جھک گئیں اور وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کچلنے لگی۔
''خیر، اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے کہ اماں کو خبر نہ ہو۔'' سنہری نے دایاں ہاتھ ذرا سا اونچا کر کے جھٹکا۔
''اماں کسی کو منہ ہی کب لگاتی تھیں، بس ایک حاتی دادا تھا یا پھر خان دادا جن کی اماں بہت عزت کرتی تھیں۔ موتیا کہتی ہے، بہت احسان تھے ان کے اماں پر۔''
''اچھا یہ کون لوگ تھے؟'' یک دم ہی تجل کے دل میں تجسس پیدا ہوا۔
''مجھے زیادہ تو نہیں پتا لیکن تمہاری پیدائش سے پہلے ان لوگوں کا بہت آنا جانا تھا چوبارے پر، خان دادا جنہیں وہاں گلی میں سب خانو دادا کہتے تھے، اکثر محفل میں بھی آتے تھے۔ رقص دیکھتے، گانا سنتے تھے لیکن حاتی دادا کبھی محفل میں نہیں آتے تھے۔ بس اماں کے بلانے پر ہی آتے تھے، کبھی کوئی جھگڑا ہو جاتا، کبھی اماں کو کوئی کام ہوتا اور......'' سنہری نے بتایا۔
''تم نے دیکھا تھا انہیں؟'' تجل کے لہجے میں اشتیاق تھا۔
''دیکھا بھی ہو تو مجھے یاد نہیں ہے۔ بیس اکیس سال پہلے میری عمر ہی کتنی تھی بھلا...... ہاں، موتیا اور موراں سے سنا ہے حاتی دادا کی شخصیت بڑی شاندار تھی، بہت وجیہہ تھے اور خانو دادا بھی کچھ کم نہیں تھے لیکن حاتی دادا تو حاتی دادا تھے...... موراں کہتی ہے وہاں تب گلی کی کئی لڑکیاں ان پر مرتی تھیں...... تب ہی تو بقول ظہورے اماں ان پر مرمٹی تھیں۔''
تجل کے دل کی دھڑکن یک دم تیز ہو گئی۔
''تو کیا ظہورا سچ کہتا ہے کہ حاتی دادا......'' اس کے دل میں خیال آیا۔
''دونوں غنڈے، بدمعاش تھے، بڑا رعب تھا ان کا، علاقے میں سب ڈرتے تھے۔ ان کی وجہ سے کسی کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ اماں کے چوبارے پر کوئی دنگا فساد کرے۔''
سنہری نے تفصیل سے بتایا۔
''اچھا...... غنڈے تھے۔'' تجل کا تجسس اور اشتیاق یک دم ختم ہو گیا اور اسے لگا جیسے اس کا دھڑکتا دل ایک لمحے کو ساکت ہو گیا ہو۔

''چل دفع کر تو کیا کرے گی باپ کا نام جان کر مر کھپ گیا ہوگا۔ ظہورا کہتا ہے غنڈے تھے، کسی کو قتل وتل کر کے پھانسی چڑھ گئے ہوں گے۔ زندہ ہوتے تو کبھی تو چوبارے پر آجاتے۔ حاتی دادا نہ سہی، خانو دادا تو خاصے شوقین تھے ناچ گانے کے۔'' سنہری نے مزید تفصیل بتائی۔

''دونوں کا کیا رشتہ تھا؟'' بجل نے یوں ہی پوچھ لیا...... ورنہ اب اسے ان کے متعلق جاننے کی کوئی خواہش نہیں رہی تھی۔ اگر وہ ان میں سے کسی کی بیٹی تھی بھی تو وہ کوئی معزز بندے نہ تھے۔

''خانو دادا تو بڑے استاد تھے اور حاتی دادا غالباً ان کا شاگردِ خاص......'' سنہری ہنسی۔

''بلکہ ولی عہد، تب ہی تو دادا کہلاتا تھا۔'' بجل کا چہرہ یک دم سپاٹ ہوگیا تھا اور وہ خاموش بیٹھی سامنے دیوار کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے اسے اب سنہری کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہ رہی ہو۔

''سن......'' سنہری کی آنکھیں یکا یک چمکنے لگی تھیں۔ اس نے بجل کے بازو پر ہاتھ مارا۔

''سن بجو چل اسے فون کر۔''

''کسے؟'' بجل نے بے دھیانی سے اسے دیکھا۔

''عظام کو اور کسے؟''

''سچ بجو میری بات مان لے، وہ لڑکا تیری محبت میں آدھا مر چکا ہے باقی کا آدھا تو اسے اپنی اداؤں اور باتوں سے مار ڈال۔'' وہ یک دم اٹھی۔

''چل میں اپنا فون لے کر آتی ہوں۔''

بجل نا سمجھی سے اسے دیکھ رہی تھی لیکن وہ تیزی سے دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکل گئی۔

''پتا نہیں عظام کے پاپا آئے ہیں یا نہیں اور پتا نہیں اس نے ان سے بات کی بھی ہے یا نہیں...... اس وقت شاید اس نے جذباتی ہو کر حامی بھر لی ہو اور پھر گھر جا کر جب سوچا ہو تو ارادہ بدل گیا ہو بھلا ایک میرے جیسا بیک گراؤنڈ رکھنے والی لڑکی سے کون شادی کر سکتا ہے لیکن عظام......! سنہری کہتی ہے وہ مختلف ہے، اس نے اس کی آنکھوں میں میرے لیے ایک الوہی محبت کی چمک دیکھی ہے، بڑا پاکیزہ سا جذبہ دیکھا ہے اور شاید سنہری صحیح کہتی ہو۔''

وہ انہی سوچوں میں گم تھی جب سنہری نے لا کر اس کے ہاتھ میں فون پکڑایا۔

''لو میں نے نمبر ملا دیا ہے، بات کرلو۔'' بجل کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی، اس نے سنہری کی طرف دیکھا جو ہونٹوں پر شریری مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے فون لے کر کان سے لگایا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔

☆☆☆

ثمر حیات دونوں بازو پیچھے باندھے بے چینی سے اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں تھیں اور ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔

عظام صوفے پر بیٹھا ثمر حیات کو اِدھر سے اُدھر ٹہلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''پاپا پلیز...... بیٹھ جائیں...... آخر آپ اتنے پریشان کیوں ہوگئے ہیں، یہ ایسی پریشانی والی بات نہیں ہے۔''

''کیسے پریشانی کی بات نہیں ہے، اگر ممتاز خان بروقت نہ پہنچتا تو خدا جانے کیا ہوتا۔''

وہ چلتے چلتے رک کر عظام کو دیکھنے لگا۔

''اور یہ ممتاز خان احمق، اس نے گاڑی کا نمبر تک نوٹ نہیں کیا۔''

''ممتاز خان اور گارڈ دونوں ایک ساتھ ہماری طرف آئے تھے اور وہ لوگ تیزی سے گاڑی بھگا کر لے گئے۔ دراصل وہ غیر متوقع سچویشن دیکھ کر یک دم گھبرا گیا تھا۔''

عظام نے وضاحت کی۔
"اسے گھبرانا نہیں چاہیے تھا...... وہ کوئی نوعمر نوجوان لڑکا نہیں ہے اور اس طرح کے حالات سے پہلی بار سامنا نہیں ہوا تھا اس کا۔"
ثمر حیات نے غصے سے کہا۔
"پاپا پلیز...... ایزی ہو جائیں کچھ نہیں ہوا، سب ٹھیک ہے۔" عظام باپ کو یوں پہلی بار اس طرح غصے میں دیکھ رہا تھا۔
"آج کچھ نہیں ہوا تو کل کچھ ہو بھی سکتا ہے۔"
ثمر حیات کے لہجے سے خفگی اور پریشانی ایک ساتھ جھلک رہی تھی۔
"پاپا پلیز ریلیکس......!" عظام اپنی جگہ سے اٹھا اور ثمر حیات کے دونوں بازوؤں پر ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے اسے بیڈ پر بٹھایا۔
"عظمی......" اس کے تنے ہوئے اعصاب یک دم ڈھیلے ہوئے تھے۔ اس نے عظام کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے جکڑ لیے۔
"سب کچھ کھو کر، گنوا کر میں نے تمہیں پایا ہے اور میں تمہیں کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ اگر وہ لوگ تمہیں کوئی نقصان پہنچا دیتے تو صرف اس تصور سے ہی میرا کلیجا کٹ رہا ہے۔"
"آپ آج بالکل رواحہ کے بابا کی طرح بات کر رہے ہیں۔" عظام ہولے سے ہنسا۔
"رواحہ کے بابا کی طرح......؟" ثمر حیات نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
"ہاں...... وہ بھی اس کے لیے ایسے ہی جذباتی ہو جاتے ہیں۔"
وہ کبھی عظام کے لیے اس طرح جذباتی نہیں ہوا تھا۔ اپنے بیٹے کے لیے دل میں کیا جذبات رکھتا تھا اس نے کبھی اس کا اظہار بھی نہیں کیا تھا، بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ خود بھی اپنے جذبات سے بے خبر تھا، اس نے عظام کے لیے زندگی کی ہر سہولت مہیا کی تھی اور سمجھتا تھا کہ اس نے عظام کے لیے وہ سب کچھ کیا ہے جو کوئی باپ اپنی اولاد کے لیے کر سکتا ہے۔ اس نے اس سے زیادہ عظام کے لیے کبھی نہیں سوچا تھا لیکن جب عظام نے اس کے ساتھ رہنے کی خواہش ظاہر کی اور انہوں نے مری میں اکٹھے کچھ دن گزارے، بس ان ہی دنوں اس پر اپنا آپ ظاہر ہوا...... اور اسے پتا چلا تھا کہ عظام اس کے لیے کیا ہے اور اگر وہ زندہ ہے تو صرف اس لیے کہ اس کے پاس اس کا بیٹا عظام ہے اور اگر عظام نہ ہوتا تو شاید فرحی کے بعد وہ بہت جلد تھک کر ہمت ہار کر آنکھیں بند کر لیتا۔
اس کی آنکھوں میں نمی سی پھیل گئی۔
"تم کل سے یونیورسٹی نہیں جاؤ گے عظام۔"
وہ یک دم جذباتی ہو گیا تھا۔ عظام کے ہاتھ ابھی تک اس نے اپنے ہاتھوں میں جکڑے ہوئے تھے۔
"ہم یہاں نہیں رہیں گے...... میں تمہیں لے کر کہیں اور کسی دوسرے ملک چلا جاؤں گا...... میں تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گا۔"
بہت سے خوف ایک دم ہی اس کے دل سے لپٹ گئے۔ جب سے مٹھا سائیں سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ بہت سے واہموں نے اس کے دل میں بسیرا کر لیا تھا اور انہی واہموں میں گھرے اس نے ممتاز خان کو گارڈ کے ساتھ بھیجا تھا۔
"پاپا......!" عظام نیچے کارپٹ پر بیٹھ گیا۔
"وہ ہمارے دشمن نہیں تھے، نہ ہی وہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ وہ رواحہ کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔"

''وہ رواحہ کو اغوا کرنا چاہتے تھے......لیکن کیوں......؟ کون تھے وہ؟'' اس کے بے قرار دل کو ذرا سا قرار آیا تھا لیکن اب وہ رواحہ کے لیے پریشان ہو رہا تھا۔ عظام کا یہ دوست اسے بہت پسند تھا۔ دل اس کی طرف کھنچتا تھا...... حالانکہ وہ بہت زیادہ نہیں ملا تھا اس سے لیکن جتنی بار بھی اس کی ملاقات ہوئی تھی اس نے اس کے لیے اپنے دل میں عظام جیسی محبت محسوس کی تھی۔

''ہم نے پہچان لیا تھا انہیں۔''

''پہچان لیا تھا تو رواحہ کے بابا کو چاہیے کہ وہ فوراً اپنے قریبی تھانے میں رپورٹ درج کروائیں ان کے خلاف۔ اگر ان کے خلاف کارروائی نہ کی گئی تو وہ پھر بھی ایسی کوشش کر سکتے ہیں۔''

''جی! لیکن رواحہ کے بابا ایسا نہیں چاہتے، دراصل وہ لوگ......''

عظام نے اپنے ہاتھ ثمر حیات کے ہاتھوں سے نکال کر اس کے گھٹنے پر رکھتے ہوئے اسے سب کچھ بتانے کا فیصلہ کیا۔

''رپورٹ کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا پاپا...... دراصل ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور وہ لوگ......''

''آخر کون لوگ ہیں وہ اور دشمنی کی وجہ کیا ہے؟'' ثمر حیات نے اس کی بات کاٹی تھی۔

''ظفری ہمارا یونیورسٹی فیلو ہے، ہم سے سینئر ہے، اس کے فادر ایم این اے ہیں ممتاز سومرو اور اس کے چچا ایم پی اے ہیں، سکندر سومرو لیکن سائیں مٹھا کے نام سے مشہور ہیں۔''

''سائیں مٹھا!''

ثمر حیات کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا......اور اس کے اعصاب پھر کھنچ گئے۔

''بس......اب نہیں......اب نہیں سائیں مٹھا......اب اگر تم نے میرے بیٹے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو ثمر حیات بھول جائے گا کہ وہ کس عہد میں بندھا ہے۔''

اس کی آنکھوں کے سامنے کلینک کے باہر کھڑا سائیں مٹھا آ گیا۔ سانپ کی سی چمک لیے اس کی آنکھیں جیسے اس کا تمسخر اڑا رہی تھیں......اور وہ کہہ رہا تھا کہ سائیں مٹھا اپنی بے عزتی نہیں بھولتا کبھی...... ضرور عظام کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس کے بندے رواحہ کے پیچھے نہیں عظام کے لیے آئے ہوں گے۔ ضرور اس نے کھوج لگا لیا ہوگا کہ عظام میرا...... ''نہیں سائیں مٹھا نہیں اب میں تمہیں وار نہیں کرنے دوں گا......'' اس نے دائیں ہاتھ کی مٹھی بنا کر زور سے بیڈ کی پٹی پر ماری۔

''پاپا......کیا ہوا......؟''

عظام پریشانی سے اس کے چہرے کی بدلتی کیفیات دیکھ رہا تھا۔ اس نے جھرجھری لے کر اس کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کو اس کا جی چاہا وہ آج عظام کو سب کچھ بتا گزرے، ایک ایک لمحے کی روداد سنا دے۔ اسے بتائے کہ یہ وہی سائیں مٹھا ہے جس نے اس کا دل نوچ کر پھینک دیا تھا۔ آج اپنے دل میں چھپی ساری کرچیاں وہ عظام کو دکھائے......سارے زخم، سارے درد......اذیت ناک یادوں کا کرب اس کی آنکھوں اور چہرے سے جھلکنے لگا۔

''پاپا کیا ہو گیا ہے آپ کو......بی لیو می ......کوئی ڈر والی بات نہیں ہے۔''

اس نے بہ مشکل خود کو کمپوز کر کے عظام کو دیکھا۔

''پاپا کوئی بہت بڑا ایشو نہیں تھا، ظفری نے خواہ مخواہ اسے مسئلہ بنا دیا ہے۔''

''تم عظام...... تمہیں یقین ہے کہ وہ لوگ رواحہ کے لیے آئے تھے؟''

''جی پاپا......! ارتقاع ہماری کلاس فیلو ہے۔'' وہ ہولے ہولے پوری بات بتانے لگا۔

''ظفری یونیورسٹی نہیں آ رہا تھا ہم سمجھ رہے تھے وہ شرمندہ ہے بلکہ ہم نے ارتفاع سے کہا تھا کہ اگر وہ سوری کرے تو وہ اس کا سوری قبول کر لے...... معاملہ خود ہی ختم ہو جائے گا...... لیکن آج جب اچانک وہ آ گئے اور رواحہ نے پہچان بھی لیا...... ایک تو ظفری کے چچا کا گارڈ تھا۔''

''رواحہ، پروفیسر صاحب کا اکلوتا بیٹا ہے، اللہ نہ کرے کہ اسے کچھ ہو۔ یہ ظفری، سائیں مٹھا کا بھتیجا ہے تو اسی کی طرح کا ہوگا کینہ پرور، منتقم مزاج......'' اس نے سوچا۔

''یہ اچھا نہیں ہوا...... لیکن مجھے اس وقت عظام کو پریشان نہیں کرنا چاہیے...... صبح میں خود رواحہ کے بابا سے بات کروں گا۔ انہیں بتاؤں گا کہ وہ کس قدر ظالم اور شقی القلب لوگ ہیں۔ وہ رواحہ کو کہیں دور لے جائیں، یا کچھ اور جو بھی انہیں بہتر لگے۔'' وہ اپنی سوچ میں گم تھا۔

''پاپا آپ کیا سوچنے لگے؟ یقین کریں...... سب کچھ ایسا ہی ہے جیسا میں نے آپ کو بتایا۔'' اس نے چونک کر عظام کو دیکھا۔

''مجھے یقین ہے بیٹا لیکن میں رواحہ کے لیے پریشان ہو رہا ہوں۔''

''پریشانی کی بات تو ہے پاپا لیکن ہم کل خود ظفری سے بات کریں گے۔ وہ خواہ مخواہ معاملے کو نہ بڑھائے۔ ارتفاع اپنی مرضی کی مالک ہے وہ جس سے چاہے بات کرے جس سے چاہے بات نہ کرے۔''

عظام نے ہلکے پھلکے انداز میں بات کی تو اس نے صرف سر ہلا دیا۔ وہ عظام کو کچھ بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''پاپا آپ پھر کچھ سوچنے لگے۔ اتنے دنوں بعد ہم ملے ہیں کچھ اچھی باتیں کریں ناں......''

اس نے ثمر حیات کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا۔

وہ کتنا پُرشوق تھا، کتنی بے قراری سے ملا تھا اس سے اور اب بھی بڑی پُرامید نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ عظام کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''ہاں، بتاؤ کیسا وقت گزرا رواحہ کے ساتھ؟''

''بہت اچھا...... بہت خوشگوار......'' وہ مسکرایا اور اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''رواحہ کے بابا بہت شفیق، بہت محبت کرنے والے ہیں۔ وہ بالکل رواحہ کی طرح ہی میرا خیال رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ اگر میں بھی رواحہ کی طرح انہیں بابا کہوں تو انہیں اچھا لگے گا۔ اور مجھے بھی انہیں بابا کہنا اچھا لگا اور پتا ہے پاپا، خدا بخش چاچا بھی بہت شفیق انسان ہیں۔ وہ رواحہ سے اور بابا سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میرا بھی انہوں نے بہت خیال رکھا۔ میں آپ کو ان سے ضرور ملواؤں گا۔ ویسے آپ کتنے دنوں کے لیے آئے ہیں؟''

''پتا نہیں، کچھ کہہ نہیں سکتا۔ پتا نہیں کب جانا پڑ جائے۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ اب کے آؤں تو ہمیشہ کے لیے آؤں...... سو اتنی جلدی آنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن ممتاز خان نے بتایا تم کچھ پریشان تھے۔ پھر مجھ سے رہا نہیں گیا فوراً چلا آیا۔'' اس نے بغور عظام کو دیکھتے ہوئے اس کی پریشانی کا اندازہ لگانا چاہا لیکن وہ اسے پریشان تو نہیں لیکن کچھ بے چین سا لگا۔

''نہیں پاپا میں پریشان نہیں تھا مجھے آپ سے بات کرنا تھی لیکن آپ کا فون بند تھا۔ آپ کا فون کیا رومنگ پر نہیں تھا......؟ آپ واٹس ایپ اور وائبر کیوں یوز نہیں کرتے؟'' اس نے پوچھا۔

''رومنگ پر ہی تھا لیکن کچھ سم کا مسئلہ تھا۔'' ثمر حیات کی نظریں اسی پر تھیں۔

''اور میرے پاس آپ کا کوئی اور کانٹیکٹ نمبر بھی نہیں تھا...... ممتاز خان کے پاس بھی کوئی دوسرا نمبر نہیں تھا...... پاپا پلیز...... اب آپ جائیں تو مجھے کوئی اور نمبر بھی دے جائیے گا۔ وہاں کا کوئی نمبر......؟''

"کیا کوئی خاص بات تھی؟"
ثمر حیات مسکرایا۔
"جی......!" وہ جھجکا۔
"دراصل وہ مجھے......" اس نے جھجک کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ ثمر حیات نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ اس کے اندر کہیں کچھ کلک ہوا......اور بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔
"کیا کوئی لڑکی پسند آگئی ہے میرے بیٹے کو......؟"
"پاپا وہ......"
عظام کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیسے باپ کو تجل کے متعلق بتائے۔ وہ کبھی اپنے پاپا سے بے تکلف نہیں رہا تھا...... ایسے جیسے رواحہ اپنے پاپا سے بے تکلف تھا۔
"کیا نام ہے اس کا......کہاں ملی؟" ثمر حیات کا لہجہ بہت خوشگوار تھا کچھ دیر کے لیے وہ ساری پریشانی بھول گیا تھا۔
"تجل......" اس نے ایک گہری سانس لی۔ ثمر حیات نے خود ہی پوچھ کر اسے مشکل سے نکال دیا تھا۔
"پاپا دراصل مجھے تجل کے متعلق ہی بات کرنا تھی۔" وہ پھر جھجکا۔
"ارے یار کیا بات کرنی ہے...... جو میرے بیٹے کی پسند وہی میری پسند۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔
"کہو تو صبح ہی چلتے ہیں دامن پھیلانے۔"
"پاپا مجھے کوئی جلدی نہیں تھی لیکن اب مسئلہ ہوگیا ہے۔ تجل چاہتی ہے کہ آپ اس کی اماں سے رشتے کی بات کرلیں۔"
"تو کرلیتے ہیں بات......"
ثمر حیات کا موڈ اور بھی خوشگوار ہوا۔
"میرے بیٹے کی پسند کوئی معمولی لڑکی تو نہیں ہوگی۔ اور پھر زندگی تم نے گزارنی ہے...... جانِ من ریلیکس ہوجاؤ......مجھے ظالم سماج کا کردار ادا کرنے کا کوئی شوق نہیں۔"
"میں جانتا ہوں پاپا اور مجھے آپ پر فخر ہے، دراصل......" وہ کچھ بے چین تھا۔
"کیا اس کے والدین رضامند نہیں؟" ثمر حیات سنجیدہ ہوا۔
"پتا نہیں...... پاپا...... یہ تو ابھی علم نہیں ہے۔ وہ تو آپ بات کریں گے تو پتا چلے گا، ایک اور بات بھی ہے۔"
اسے بہرحال ثمر حیات کو سب کچھ بتانا تھا تجل کے متعلق......
"وہ تجل کی اماں اسے اداکارہ بنانا چاہتی ہیں جبکہ تجل کو اداکاری سے کوئی دلچسپی نہیں، وہ شوبز میں نہیں جانا چاہتی۔ اس لیے وہ چاہتی ہے کہ ہم شادی کرلیں تاکہ اس کی والدہ اسے مجبور نہ کرسکیں۔"
"کیا مطلب......؟ شادی کرلیں...... کیسے؟ اس کے والدین کی مرضی کے بغیر......؟" ثمر حیات کے دل میں ایک ساتھ درد کے کئی نوکیلے کانٹے اتر گئے تھے۔ کیا، کیا اذیتیں یاد نہیں آگئی تھیں۔
"نہیں......نہیں پاپا......؟" عظام نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا۔
"تجل چاہتی ہے آپ اس کی والدہ سے رشتے کی بات کریں اور ساتھ ہی فوری شادی کی بھی۔"
"ہوں......" ثمر حیات نے پُرخیال انداز میں سر ہلایا۔
"تمہارا کیا خیال ہے وہ رضامند ہوجائیں گی؟"

''پتا نہیں میں کچھ زیادہ نہیں جانتا ان کے متعلق، بس دو بار سرسری سی ملاقات ہوئی ہے میری ان سے...... لیکن بجل کو یقین ہے کہ اگر کوئی اچھا پروپوزل ہوا تو وہ مان جائیں گی۔''

عظام نے اس کی طرف دیکھا۔

''وہ اسے اداکارہ بنانا چاہتی ہیں، تم نے اس سے پوچھا نہیں کیوں......؟ لوگوں کی خواہش تو ہوتی ہے کہ ان کے بچے ڈاکٹر بنیں...... یہ کیسی خاتون ہیں جو اپنی بیٹی کو اداکارہ بنانا چاہتی ہیں۔''

''شوبز میں پیسہ بہت ہے ناں شاید اسی لیے۔''

''کیا وہ تمہاری کلاس فیلو ہے؟ اس کا فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے؟'' ثمر حیات نے بے حد سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں...... وہ اُدھر رواحہ کے پڑوس میں رہتی ہے۔ یونہی بس اتفاقاً ملاقات ہوئی تھی...... اور......'' وہ فیملی بیک گراؤنڈ والی بات گول کر گیا تھا۔ کم از کم آج کے دن وہ اس کے بیک گراؤنڈ کے متعلق بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''اس کے فادر کیا کرتے ہیں...... کیا نام ہے ان کا؟''

''اس کے فادر نہیں ہیں...... والدہ ہیں، ان کا نام شاہجہان بیگم ہے۔'' وہ چونکا...... اس نام نے یک دم ہی جیسے اسے حال سے ماضی میں پہنچا دیا تھا...... تب ہی عظام کے فون کی بیل ہونے لگی۔

عظام نے پاکٹ سے فون نکال کر دیکھا کوئی انجانا نمبر تھا۔ وہ آف کرنے لگا تھا کہ یک دم رک گیا کہیں بجل کا نہ ہو۔ اس کا دل زور سے دھڑکا اور فون آن کرتا ہوا باپ سے معذرت کرتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ لیکن اس نے عظام کی معذرت نہیں سنی تھی۔ اس نے اسے باہر جاتے دیکھا تھا لیکن نام کی مشابہت نے اسے ماضی میں جلیل خان کے گھر کے ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھا اپنے سامنے سیاہ برقع میں ملبوس شاہجہان بیگم کو دیکھ رہا تھا۔ شاہی محلے کا سن کر اسے اس زور کا دھچکا سا لگا تھا لیکن وہ فوراً ہی حیرت کے اس دھچکے سے باہر آ گیا۔

''آپ کہیں شاہجہان بیگم، کیا مسئلہ ہے؟''

''وہ کیا کہیں صاحب، طیفے بدمعاش نے جینا حرام کر رکھا ہے۔ چوبارہ اجڑ کر رہ گیا ہے...... صرف خان دادا ہی ہماری مدد کر سکتے ہیں۔'' وہ اسے تفصیل بتا رہی تھی اور وہ حیرت سے سن رہا تھا۔ وہ جلیل خان کے ان معاملات سے بالکل آگاہ نہ تھا، نہ ہی جلیل خان نے کبھی اس کے متعلق بتایا تھا۔ پتا نہیں جلیل خان کی زندگی کے کتنے پہلو ابھی اس سے پوشیدہ تھے۔

''آپ نے تھانے میں رپورٹ کی؟''

''تھانے میں رپورٹ؟'' وہ قہقہہ مار کر ہنسی تھی۔

''پولیس تو خود ہڈحرام ہے اور ایسے بندوں سے پیسے کھاتی ہے...... ہمیں تو خان دادا ہی اس بندے سے نجات دلا سکتے ہیں...... بس کسی طرح انہیں اطلاع پہنچا دو کہ شاہجہان بیگم بہت مشکل میں ہے، بہت تکلیف میں ہے۔ خان دادا اڑ کر پہنچیں گے ہماری مدد کو...... بہت انتظار کیا صاحب، بہت صبر کیا کہ خود ہی سب ٹھیک ہو جائے، خان دادا کو تکلیف نہ دیں...... لیکن کیا کریں مجبور ہو گئے ہیں۔ ظہورا صرف بڑک مار سکتا ہے...... شیدا ٹانگیں تڑوا کر بیٹھا ہے۔ وہ کمبخت جیسے ہی قدم رکھتا ہے۔ سب کونوں کھدروں میں گھس جاتے ہیں۔ زنخے بھرے ہیں سب وہاں، کب کب کس کس کی مدد نہیں کی میں نے اور میرے وقت سب ہی منہ چھپا کر بیٹھ گئے۔ کیا کریں جی سب کو اپنی عزتیں پیاری اور اپنا مفاد عزیز ہے اگر گلی والے ایکا کر لیں تو مجال ہے کہ وہ گلی میں گھس سکے۔'' وہ مسلسل بول رہی تھی جب اس نے اسے ٹوک دیا۔

''ٹھیک ہے بی بی میں دادا سے بات کرتا ہوں پھر جو اُن کا حکم ہوا۔''

''بس دادا کو اطلاع مل گئی تو کام ہو گیا صاحب......''
وہ برقع کے کھل جانے والے بٹن بند کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔
''آپ بھی کبھی غریب خانے کو رونق بخشیے...... یقین کیجیے نصیب جاگ اٹھیں گے ہمارے۔''
جاتے جاتے اس نے دعوت دی تھی اور وہ جی بھر کے بیزار ہوا۔
لیکن اگلی صبح وہ ملاقاتی کمرے میں جلیل خان کے سامنے بیٹھا کہہ رہا تھا۔
''آپ نے بھی سر جانے کیا، کیا بکھیڑے پال رکھے ہیں۔''
''بکھیڑے کیسے ثمر حیات...... ایک بار شاہی مسجد کے قریب کچھ لوگوں سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ وہ زیادہ تھے میں اکیلا...... زخمی ہو گیا...... سر پھٹ گیا...... گو میں خالی ہاتھ تھا پھر بھی وہ مار کے بھاگے...... میں ان کے پیچھے تھا...... رات کا وقت تھا...... وہ شاہی محلے میں گھس گئے اور میں بھی ان کے پیچھے...... لیکن شاہجہان بیگم کے دروازے پر ٹھوکر کھا کر گر پڑا...... اور ایسا گرا کہ ابھی تک وہاں ہی گرا ہوا ہوں۔'' اس نے اونچا قہقہہ لگایا تھا۔
''شاہجہان مجھے اندر کھینچ کر لے گئی تھی۔ مرہم پٹی کی...... دو روز دیکھ بھال کی تو بس تب سے اس کے احسان کا بدلہ چکا رہا ہوں۔''
وہ پھر ہنسا تھا۔
''بیچاری عورتیں...... کبھی کبھی مصیبت میں پھنس جاتی ہیں۔ تم ایسا کرنا کل یا آج مغرب کے بعد شیر خان کے ساتھ چکر لگا کر دیکھنا کون پھنّے خان ہے وہ جو......'' اس نے گالی دی تھی پھر جیسے چونکا...... ''کیا نام بتایا تھا تم نے؟''
''طیفا...... سر...... یہی نام بتایا تھا شاہجہان نے؟''
''ہاں...... اوئے...... وہ الو کا...... وہی ہے ناں جس کی ناک پچکی ہوئی ہے اور دائیں آنکھ کے کونے میں بڑا سا مسّہ ہے۔''
''پتا نہیں سر......''
اس نے جلیل خان کی طرف دیکھا تھا۔
''میں نے تو نہیں دیکھا اسے۔''
''ہاں وہی ہے، جانتا ہوں۔'' جلیل خان نے سر ہلایا۔
''آج کل بڑے پر پُرزے نکال رہا ہے۔ کہہ دینا جا کر اسے کہ آج کے بعد اگر شاہجہان کے چوبارے پر قدم رکھا تو ٹانگیں توڑ کر پھینک دوں گا اور ماس...... چیل کو کھلا دوں گا...... بول دینا اسے زیادہ پھنّے خان نہ بنے...... اس نے ابھی صرف جلیل خان کی فیاضی دیکھی ہے۔''
''میں...... سر میں جاؤں وہاں؟''
وہ جھجکا تھا۔ ''شاہی محلے......'' کا نام سن کر اس کی جھجک لازمی تھی۔
''اوکے، تو تم نے کون سا دل پشوری کرنے جانا ہے۔ ایک بیچاری خاتون کی مدد ہی تو کرنی ہے، پھر اتنی سی عمر میں اتنا زاہدِ خشک نہ بن...... ذرا آج اسی بہانے اس گلی کی رونق بھی دیکھ لے۔''
اس نے سر ہلایا تھا لیکن دل میں سوچ لیا تھا کہ وہ وہاں ہرگز قدم نہیں رکھے گا۔ بلکہ شیر خان کے ساتھ کسی اور کو بھیج دے گا۔ ہاں اگر معاملہ نہ سلجھ سکا تو مجبوراً جانا پڑے گا۔ بہر حال وہ ایک مظلوم عورت تھی۔ بھلے لوگوں کے لیے قابلِ نفرت ہی سہی لیکن اس کے ساتھ زیادتی ہو رہی تھی...... لیکن شام کو وہ خود بھی تیار ہو کر شیر خان کے ساتھ چل پڑا تھا۔ پتا نہیں اب یہ صرف ایک مظلوم کی مدد کا خیال تھا...... جلیل خان کے حکم کی تعمیل تھی یا اندر کہیں اس محلے کو دیکھنے

کی چاہ بھی تھی جس کا ذکر وہ سنتا اور پڑھتا چلا آیا تھا..... شاہی مسجد کے قریب گاڑی پارک کر کے وہ پیدل ہی قلعے کی بوسیدہ دیواروں کو تکتے ہوئے سر جھکائے آگے بڑھ رہا تھا۔ دل عجیب طرح سے دھک دھک کر رہا تھا۔ کئی بار خیال آیا کہ وہ یہاں سے ہی پلٹ جائے اور شیر خان کو جانے دے لیکن دل میں آنے والے خیال کے برعکس وہ یونہی سر جھکائے چلتا ہوا شیر خان کے ساتھ گلی میں داخل ہو گیا۔ اندر پیلی تیز روشنیوں والے بلب جل رہے تھے۔ موتیے اور گلاب کے پھولوں کی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ پھولوں والی دکانوں کے پاس سے گزر رہے تھے۔ کہیں کسی دکان سے خریدار پھول خرید رہے تھے۔ وہ تھوڑا سا اور آگے بڑھے تو بوسیدہ لکڑی کی رنگ اُڑی بالکونیوں، دروازوں اور دریچوں پر رنگین آنچل لہرا رہے تھے، کبھی کی پڑھی منٹو کی کہانیوں کے منظر آنکھوں کے سامنے آئے تو اس نے گھبرا کر شیر خان کی طرف دیکھا۔

''شیر خان کسی سے شاہجہان کے گھر کا تو پوچھو۔''

شیر خان نے ایک پان کی دکان پر رک کر شاہجہان کا پتا پوچھا تو اس نے کتھے والی انگلیاں چاٹتے ہوئے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔

''ارے بھی تو ہے سامنے شاہجہان بیگم کا چوبارہ.....'' انہوں نے قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ جانے کس نے شاہجہان بیگم کو خبر کر دی تھی کہ وہ خود ہی لپکتی جھپکتی باہر آ گئی تھی۔

''آیئے..... آیئے صاحب آ جایئے۔'' وہ انہیں لیے اندر داخل ہوئی۔ یہ ایک بڑا ہال نما کمرا تھا جس کے آدھے فرش پر قالین بچھا تھا۔ اور سرخ ساٹن کے غلاف والے گاؤ تکیے رکھے تھے۔ وہ اس ہال نما کمرے سے گزر کر انہیں ایک اور کمرے میں لے آئی تھی جس میں ایک صوفہ اور ایک ڈبل بیڈ تھا۔

''بیٹھیے صاحب.....'' اس نے انہیں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

''شیدے نے آپ کو گلی کی طرف آتے دیکھا اور دوڑتا ہوا آیا اور اس نے بتایا کہ خان دادا کے بندے آ رہے ہیں۔ مانو میں تو قربان ہی ہو گئی۔ مجھے پتا تھا کہ خان دادا میری درخواست پر خاموش نہیں بیٹھیں گے۔''

''نہیں شکریہ ہم بیٹھنے نہیں آئے۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ یک دم ہی اسے کوفت سی ہونے لگی تھی۔

''تمہارا وہ طیفا، بدمعاش نہیں آیا؟''

''آتا ہی ہو گا..... بس آپ بیٹھو آرام سے۔'' اس نے ایک بار پھر انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا اور خود دروازے سے سر نکال کر آواز دینے لگی۔

''موراں..... او موراں..... اِدھر مر جلدی آ دو ٹھنڈی بوتلیں لے آ.....''

''نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے منع کیا۔

تیرہ چودہ سال کی ایک دبلی پتلی سانولی سی لڑکی اندر آئی تھی۔

''جا بھاگ کے پکڑ لا دو بوتلیں.....''

''نہیں..... ضرورت نہیں ہے۔'' اس بار اس نے سختی سے منع کیا تھا۔

''اچھا پان تو لیں گے ناں..... کیا غضب کی گلوری بناتا ہے اپنا شیرو..... گھنٹوں منہ مہکا رہتا ہے، اصلی چاندی کے ورق میں لپیٹ کر دیتا ہے۔'' اس سے بات کرتے کرتے اس نے موراں کی طرف دیکھا۔

''جا ناں..... کھڑی منہ کیا تک رہی ہے، بھاگ کر دو میٹھے خوشبو والے پان پکڑ لا..... شیرو سے کہنا خاص مہمان ہیں۔''

''توبہ کس قدر ربولتی ہے یہ عورت.....'' وہ از حد بیزار ہوا تھا۔ ایک بار تو..... اس کا جی چاہا تھا شیر خان کو اکیلا

چھوڑ کر چلا جائے۔ شیر خان کون سا کسی سے کم ہے۔ نبڑ لے گا خود ہی اس سے...... لیکن پھر اس نے خود ہی اس خیال کو جھٹک دیا...... اب یہاں تک آ گیا تھا تو اس پھنّے خان کو بھی دیکھ لے۔ موراں، شاہجہان کے آرڈر پر بھاگ گئی تھی وہ بیزار سا بیٹھ گیا تھا۔ اور اس نے شیر خان کو بھی بیٹھنے کے لیے کہا تھا...... شاہجہان بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

''کیا بتاؤں صاحب کتنی رونق ہوتی تھی یہاں پر، اس کمبخت نے وہ دنگا فساد کیا یہاں آ کر کہ اب اس کے ڈر سے کوئی جھانکتا بھی نہیں...... کہتا ہے میرے اور میرے بندوں کے علاوہ کسی نے یہاں قدم رکھا تو ٹانگیں توڑ دے گا۔ گردن دبا دے گا۔''

وہ پھر شروع ہو چکی تھی...... اور ابھی نہ جانے کب تک بولتی کہ ظہورا اندر داخل ہوا۔

''وہ آ گیا ہے...... شیرو سے پان بنوا رہا ہے...... تین بندے ساتھ ہیں۔''

شاہجہان بوکھلا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''اندر آنے دو دیکھ لیتے ہیں اسے۔''

''آپ ابھی اِدھر ہی بیٹھو میں دیکھتی ہوں۔'' شاہجہان بڑی پھرتی سے باہر نکل کر غالباً اسی ہال نما کمرے میں گئی تھی۔ لمحہ بھر کے توقف کے بعد وہ بھی شیر خان کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتا ہوا ہال میں آیا تھا۔ شاہجہان ہال کے وسط میں ہراساں سی کھڑی تھی اور ظہورا اس کے استقبال کے لیے دروازے پر کھڑا تھا۔

''ایک بات کا دھیان رکھیے گا صاحب یہاں خون خرابہ نہ ہو...... بس زبانی کلامی سمجھا دیجیے گا۔''

اس نے شیر خان کو ریوالور نکالتے دیکھ لیا تھا۔

''اور اگر وہ زبانی کلامی نہ سمجھا تو......؟'' شیر خان نے ریوالور دوبارہ جیب میں ڈال لیا تھا۔

''ویسے لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔''

''تمہاری بات ٹھیک ہے شیر خان لیکن خون خرابے سے چوبارہ بدنام ہو جاتا ہے، ایک بار......'' وہ پتا نہیں کیا کہنا چاہتی تھی کہ دروازہ زور سے کھلا...... اور وہ اندر داخل ہوا۔ ثمر حیات نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا تھا۔ بوسکی کا کرتا لٹھے کی کلف لگی شلوار، سنہری زری کی کھیڑیاں اور کندھے پر قیمتی چادر...... دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے دائیں مونچھ کو بل دیتا ہوا یہ وہی تھا پچکی ناک اور بڑے سیاہ مسّے والا...... اس کے پیچھے اس کے تینوں بندے بھی اندر آئے تھے۔ ان پر ایک نظر ڈال کر اس نے شاہجہان کی طرف دیکھا تھا۔

''یہ تو نے آج پھر تماش بین اکٹھے کر لیے...... کیا کہا تھا میں نے تم سے کہ اِدھر اب کوئی نہیں آئے گا۔'' وہ بولا۔

''چل اوئے اِدھر سے نکلو...... گم کرو اپنی شکلیں۔'' اس کے بندوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا تھا جبکہ طیفا اسی بے نیازی سے مونچھ کو انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے مروڑتا ہوا کارپٹ کی طرف بڑھتے ہوئے شاہجہان بیگم کے قریب رکا تھا۔

''بلاؤ ذرا اس چھمک چھلو کو آج کچھ ایسا پیش کرے کہ پھڑک اٹھوں۔''

''اوئے تم ابھی تک کھڑے کیا پٹر پٹر تک رہے ہو، ہٹو یہاں سے۔'' اسی بندے نے آگے بڑھ کر شیر خان کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔

وہ شیر خان سے ذرا پیچھے کھڑا گہری نظروں سے طیفے کو دیکھ رہا تھا جب شیر خان نے اس بندے کا ہاتھ جھٹک کر اس کی کلائی پکڑ کر مروڑ دی۔ وہ درد سے بلبلایا تو طیفا بیٹھتے بیٹھتے رک گیا اور شیر خان کو زہریلی نظروں سے گھورنے لگا۔ اس کی پچکی ہوئی ناک کے نتھنے پھڑکنے لگے تھے۔

''کون ہو تم اور تمہیں جرأت کیسے ہوئی طیفے کے بندے کا بازو مروڑنے کی۔ اور سنا نہیں تھا تم نے، چلتے

پھرتے نظر آؤ یہاں سے ورنہ...."

"ورنہ کیا؟"

وہ آگے بڑھا تھا......لیکن اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے طیفے نے اپنے بندوں کو اشارہ کیا۔

"اٹھاؤ انہیں اور پھینک آؤ باہر کسی گندے نالے میں۔" وہ واپس کارپٹ کی طرف مڑا تو اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"ہمیں جلیل خان نے بھیجا ہے۔"

"کون جلیل خان......؟" وہ پلٹتے ہوئے جیسے دہاڑا تھا۔

"تم احسان فراموش، گندی نالی کے کیڑے، تم نہیں جانتے جلیل خان کو؟"

شیر خان جو قدرے اندھیرے میں تھا یک دم روشنی میں آیا۔ اس کی آنکھوں میں روشنی کی چمک نظر آئی پھر یک دم اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور اس کا مونچھوں کو بل دیتا ہاتھ نیچے گر گیا۔ اب ثمر حیات نے آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بہت آہستہ لیکن مضبوط آواز میں اسے جلیل خان کا پیغام دیا تھا۔ طیفے کا سر جھک گیا تھا۔ اس نے سر جھکائے جھکائے اپنے بندوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا تھا۔ اور ان کے جاتے ہی یکا یک ثمر حیات کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔

"معاف کر دیں دادا...... میں جلیل خان کا غلام اس کے در کا کتا...... خان دادا کہے تو میں اپنی گردن خود کاٹ کر اس کے سامنے رکھ دوں...... غلطی ہو گئی...... خان دادا سے کہیں مجھے معاف کر دیں۔" اس نے سر ہلایا تھا۔

"دادا...... میں اپنے باپ کی اولاد نہیں اگر دوبارہ یہاں بلکہ اس گلی میں قدم رکھوں۔"

پہلی بار اس کے لیے دادا کا لفظ طیفے نے استعمال کیا تھا اور اسے دل ہی دل میں ہنسی آئی تھی۔ کیا وہ دیکھنے میں دادا ٹائپ لگتا ہے؟ وہ صوفی نصیر کا بیٹا...... برصغیر میں تقسیم سے پہلے ہندوستان میں اڈوں اور باڑوں کے استاد دادا کہلاتے تھے۔ پتا نہیں اب بھی ایسے اڈے پاڑے ہوں گے۔ وہ نہیں جانتا تھا لیکن وہ نہ تو کسی اڈے کا دادا تھا نہ استاد وہ تو جلیل خان کا ایک کارکن تھا لیکن نہیں جانتا تھا کہ ایک روز لوگ اس کا اصل نام بھول جائیں گے اور ایک طویل عرصے تک دادا کا نام اس کے نام سے جڑا رہے گا۔ پہلے حیات دادا پھر حیاتی دادا اور پھر حاتی دادا......

طیفا اٹھا تھا اور سر جھکائے جا رہا تھا۔

"تم نے اچھی طرح سن لیا ہے ناں پھر کبھی یہاں قدم رکھا اور شاہجہان بیگم کی لڑکیوں کو تنگ کیا تو کان کھول کر سن لو پھر عمر بھر اپنی ٹانگوں پر نہ چل سکو گے۔"

اس نے اسی مضبوط لہجے میں کہا تھا۔ طیفے نے اب زبان سے کچھ نہیں کہا تھا بس ہاتھ جوڑ دیے تھے اور تیزی سے باہر نکل گیا تھا اور اس کے جاتے ہی جیسے سوئے ہوئے چوبارے میں زندگی جاگ اٹھی تھی۔ موراں نہ صرف مراد آبادی نقشین پلیٹ میں چاندی کے ورق میں لپٹے پان لے آئی تھی بلکہ ٹھنڈی ٹھنڈی بوتلیں بھی لے آئی تھی۔ شاہجہان نے منہ کھولے کھڑے شیدے کو گھرکا تھا۔

"منہ کیا دیکھ رہا ہے...... اندر سے موڑھے پکڑ کر لا اور چھوٹی تپائی بھی پکڑ لا۔"

"نہیں بس اب ہم چلیں گے۔ اگر پھر کوئی مسئلہ ہو تو فون کر دیجیے گا۔"

"ارے نہیں ایسے کیسے جانے دوں آپ کو......" شاہجہان ان کی خاطر تواضع کے لیے بچھی جا رہی تھی۔ شیدا موڑھے لے آیا تھا اور تپائی بھی۔ موراں نے جھٹ سے پان اور بوتلیں تپائی پر رکھی تھیں۔ شاہجہان نے پھر اسے ڈپٹا تھا۔

''موراں تجھے کب عقل آئے گی جا گلاس لے کر آ...... اب کیا یہ بوتلیں منہ سے لگائیں گے۔'' اس نے.... بے بسی سے شیر خان کی طرف دیکھا اور بیٹھ گیا۔

''موراں نے گلاسوں میں بوتلوں کا ٹھنڈا مشروب انڈیلا اور گلاس ان کی طرف بڑھائے۔ تب ہی رنگین کپڑوں میں ملبوس مہکتی ہوئی چند لڑکیاں نہ جانے کہاں سے آ کر ہال میں اکھٹی ہو گئی تھیں۔ وہ چہک رہی تھیں۔ خوش ہو رہی تھیں اور اس کی طرف اشارے کر کے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ وہ گھبرا سا گیا تھا۔

''ہم چلتے ہیں۔'' اس نے خالی گلاس تپائی پر رکھا اور اٹھنا چاہا۔

''ارے نہیں صاحب بیٹھیے ناں کچھ دیر تو......'' شاہجہان نے پھر اصرار کیا اور پان پیش کیے۔

اس کے بے حد اصرار پر اس نے پان اٹھا کر منہ میں ڈال لیا اور پان منہ میں ڈالتے ہی اسے نہ جانے کیا کیا کچھ یاد آ گیا تھا۔ وہ جب چھوٹا تھا اور ہر عید پر اماں سے کہہ کر میٹھا پان لے کر آتا اور اصرار کر کے اماں کو بھی کھلاتا...... بڑا ہونے پر بھی اس کی یہی روٹین رہی تھی۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی کتنے سالوں بعد آج اس نے میٹھا پان کھایا تھا۔ اماں، ابا کے چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ وہ اس کا کھلے صحن والا گھر اور برآمدے میں دیوار پر لگا وہ بڑا سا آئینہ جس میں پان کھا کر وہ بار بار اپنے سرخ ہو جانے والے ہونٹ دیکھتا تھا۔ اماں ہنستی تھیں لیکن وہ ان کی ہنسی پر شرمندہ نہ ہوتا تھا۔ پان وہ صرف عید پر ہی کھاتا تھا کیونکہ ابا نے سمجھایا تھا کہ پان کھانے سے دانت گندے ہو جاتے ہیں۔ وہ کھوسا گیا تھا اسے پتا ہی نہیں چلا تھا کہ کب وہ رنگ برنگے کپڑوں والی لڑکیاں غائب ہوئی تھیں اور کب وہ گہرے سانولے رنگ کی بنگالی نقوش والی لڑکی اندر ہال میں آئی تھی۔ کیسے سب کچھ لمحوں میں ختم ہو گیا تھا۔ اس کا گھر، اماں، ابا...... ایک گہرا درد اس کے دل میں ہلکورے لینے لگا اور آنکھوں سے چھلکنے لگا تھا۔

''صاحب اٹھیے...... آرام سے نیچے بیٹھ جائیں، آپ کو کوئل کا گانا سنواتے ہیں۔''

شاہجہان نے کہا تو اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ تب ہی ظہورا بھی آ گیا۔

''ایسا بھلکا ہے ناں کہ سر بھی نہیں اٹھایا۔ گلی کے باہر تک اس کے پیچھے گیا ہوں۔ شاہجہان بیگم آج تو اس خوشی میں کوئل کا گانا سنوا دو۔'' وہ چہکا تھا۔

''ہاں، ہاں اسی لیے تو بلوایا ہے اسے۔''

''ہائے دادا کیا بتاؤں کیا آواز ہے، کیا لوچ ہے، بندہ کوئل کی آواز میں ڈوب جاتا ہے، کھو جاتا ہے۔''

وہ اب اس سے مخاطب تھا۔

وہ احتجاج کرنا چاہتا تھا منع کرنا چاہتا تھا لیکن اندر شاید کہیں کوئی خواہش چھپی بیٹھی تھی۔ خواب کے سے عالم میں وہ گاؤ تکیے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پتا نہیں کب سازندوں نے ساز سنبھالے تھے اور کب اس سانولی لڑکی نے مرتضیٰ برلاس کی غزل شروع کی تھی۔

جب آ کے سناتا ہے عدو تیری خبر ہر روز
ہم پر تو قیامت سی گزر جاتی ہے ہر روز

کوئل کی آواز میں واقعی جادو تھا۔ وہ گم سا ہو گیا تھا۔ یہ پہلی اور آخری بار تھی جب اس نے شاہجہان کے چوبارے پر گانا سنا تھا۔ حالانکہ جب جب وہ شاہجہان کے چوبارے پر آیا تھا اس کا جی چاہا تھا کہ ایک بار پھر اس کا گانا سنے لیکن اس نے کبھی شاہجہان سے کہا نہیں تھا۔ ورنہ شاہجہان تو منتظر رہتی تھی کہ وہ کوئی فرمائش کرے اور وہ اسے پورا کرے۔ اس رات وہ کوئل کا گانا سن کر فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور گلی سے نکلتے ہوئے اس نے عہد کیا تھا کہ وہ اب کبھی یہاں قدم نہیں رکھے گا اگر فرحی کو پتا چلا کہ اب وہ ایسی جگہوں پر بھی جانے لگا ہے تو وہ کتنی خفا ہو گی۔ کبھی

جب جلیل خان آجائے گا اور وہ ایک نئی زندگی شروع کریں گے تب وہ فرحی کو اس کے متعلق بتائے گا...... اور یہ بھی کہ وہاں دو بندوں نے اسے دادا کہہ کر بلایا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں یہاں نہ آنے کے عہد کو کئی بار دُہرایا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ انسان کے ارادے اور عہد تو ریت کی دیوار کی طرح ہوتے ہیں۔ اس روز وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ یہاں ایک بار نہیں کئی بار آئے گا...... اور یہ پہلی بار نہیں تھی اس کے بعد بھی وہ کئی بار آیا تھا۔ ایک بار ریکھا کو پولیس والے تنگ کر رہے تھے...... اس کی لڑکیوں کو باری باری تھانے بلاتے اور بلاوجہ ہی لاک اپ میں بند کر دیتے۔

دراصل ریکھا نے اپنے علاقے کے ایس ایچ او سے پنگا لے رکھا تھا۔ اور وہ جان بوجھ کو اسے تنگ کر رہا تھا۔ ایک بار رانو بیمار پڑ گئی تھی اور اس کے علاج کے لیے نہ تو پیسہ تھا اور نہ ہی کوئی ڈاکٹر اس کا علاج کرنے کے لیے تیار ہوتا تھا۔ ہر بار شاہجہان ہی اس کے پاس آتی تھی یا فون کر دیتی تھی۔ پہلی بار کے بعد اس نے پھر جلیل خان سے نہیں پوچھا تھا وہ سمجھ گیا کہ جلیل خان نے مدد کے لیے آنے والوں کو کبھی انکار نہیں کیا تھا...... وہاں شاہی محلے میں سب ہی اس کی عزت کرتے تھے۔ پھولوں والوں سے لے کر چوبارے والی لڑکیاں تک سب اسے حیاتی دادا کہنے لگے تھے۔ کوئی بھی مسئلہ ہوتا اس کے پاس آتے...... وہ جلیل خان پر حیران ہوتا تھا۔

وہ اب اور بے چینی سے جلیل خان کی رہائی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ہر پندرہ دن بعد خانیوال آجاتا تھا...... فرحی اپنے بچوں میں مگن تھی۔ ہر بار اس کا دل مچلتا کہ وہ پلٹ کر اس دنیا میں نہ جائے اور یہاں ہی خانیوال میں رہ جائے...... وہ دنیا اس کے لیے نہیں تھی...... وہ پندرہ سولہ سال گزرنے کے بعد بھی خود کو اس میں اَن فٹ سمجھتا تھا۔ ایک بار وہ فرحی اور بچوں کے ساتھ ایبٹ آباد جا کر کچھ گھر بھی دیکھ آیا تھا۔ فرحی کو ایک گھر پسند آگیا تھا...... وہ وہاں جلیل خان کے کسی دوست کے ہاں ٹھہرے تھے اور جلیل خان کے کہنے پر ہی وہاں گئے تھے اور جلیل خان کے دوست نے ہی انہیں گھر دکھائے تھے...... تاہم گھر کا سودا نہیں ہو سکا تھا کیونکہ وہ گھر جو فرحی نے پسند کیا تھا اس کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ کچھ دنوں بعد پھر چکر لگائیں گے انہوں نے جلیل خان کے دوست سے کہا تھا کہ وہ ان کے لیے کوئی اچھا لیکن مناسب قیمت والا گھر دیکھ کر رکھے...... لیکن پھر وہ ایبٹ آباد نہ جا سکے تھے حالانکہ جلیل خان کے دوست نے انہیں بلایا تھا کہ ان کی پسند کے عین مطابق ایک گھر مل گیا ہے اور مالک مناسب قیمت مانگ رہا ہے۔ ریحان کی طبیعت ان دنوں بہت خراب رہنے لگی تھی۔ کمزور تو وہ شروع سے تھا لیکن ایکٹو تھا مگر اب اچانک اسے سانس کی تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ بعض اوقات فیڈر لیتے ہوئے بھی اس کی سانس اکھڑتی تھی...... وہ بہت پریشان تھے۔ خانیوال میں فرحی نے کئی ڈاکٹروں کو دکھایا لیکن روز بروز جسے وہ نچڑتا جا رہا تھا۔ پھر ایک ڈاکٹر نے خیال ظاہر کیا کہ اسے لنگز کا نہیں دل کا پرابلم ہے۔ شاید دل میں سوراخ ہے۔ اس نے ہی انہیں ہارٹ اسپیشلسٹ ڈاکٹر شہریار کو دکھانے کا مشورہ دیا تھا جو اُن دنوں اسلام آباد میں تھے اور دل کے ایسے کئی آپریشن کر چکے تھے۔ وہ شیر خان اور دلدار کے علاوہ جلیل خان کے ایک اعتبار کے بندے افضل کو خان ہاؤس میں چھوڑ کر اور سارے معاملات ان کے سپرد کر کے خود فرحی کو اور بچوں کو لے کر اسلام آباد آگیا تھا...... ڈاکٹر شہریار نے تصدیق کر دی تھی کہ ریحان کے دل میں سوراخ ہے۔ ابتدا میں وہ ہوٹل میں رہے تھے لیکن پھر انہوں نے ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر لے کر روحان اور زیتون بانو کو بھی بلا لیا تھا۔ وہ تقریباً دو ماہ اسلام آباد میں رہے تھے۔ ریحان کا آپریشن ہو گیا تھا۔ شروع میں ہر ہفتے اور پھر پندرہ دن بعد وہ اسے ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے لے کر جاتے رہے تھے۔ وہ صحت مند ہو رہا تھا اس کے رخساروں پر سرخی آگئی تھی جب وہ ڈاکٹر سے اجازت لے کر خانیوال آئے تھے۔ لیکن وہاں آنے کے چند دن بعد ہی اس کی طبیعت پھر بگڑ گئی تھی۔ وہ جب لاہور جانے کی تیاری کر رہا تھا، لاہور کا ارادہ ملتوی کر کے ایک بار پھر اسلام آباد آگیا تھا۔ ایک بار پھر اس بچے کو آپریشن کی تکلیف سے گزرنا پڑا تھا لیکن ایک امید تھی جو دل کے تاروں سے جڑی

تھی کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ فرحی کی پلکیں ہر وقت بھیگی رہتیں۔
"فرحی دعا کرو اللہ ہماری دعا ضرور سنے گا۔" وہ اسے تسلی دیتا لیکن سب دعائیں ہتھیلیوں پر ہی اٹکی رہ گئیں اور ریحان نے آنکھیں بند کرلیں۔ یہ بہت کڑا وقت تھا اس کے لیے اور فرحی کے لیے بھی..... فرحی یوں تڑپ، تڑپ کر روتی کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔
"کیا ہماری سزا کبھی ختم نہیں ہوگی ثمر.....؟" وہ بھی منفی انداز میں سوچنے لگی تھی۔
"تم تو ایسی نہیں تھیں فرحی..... پھر اس طرح کیوں سوچ رہی ہو..... یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ یہ بھی ایک آزمائش ہے۔ تم خود ہی تو کہتی تھیں کہ اللہ بعض اوقات اپنے بندوں کو آزماتا ہے۔ اللہ سے صبر کی دعا مانگو اس کی چیز تھی اس نے لے لی۔"
وہ اسے سمجھاتا لیکن بچے کی موت نے ایسا گھاؤ لگایا تھا جسے بھرنے میں وقت لگنا تھا۔ اس گھاؤ نے کتنے ہی پرانے زخموں کے منہ کھول دیے تھے..... فرحی کو سمجھاتے سمجھاتے وہ خود حوصلہ کھو دیتا تھا۔ ریحان کے بعد بھی وہ لاہور نہ جاسکا۔ جب بھی اس نے لاہور جانا چاہا فرحی کے آنسو اسے زنجیر کر لیتے..... وہ سراپا شکوہ تھی۔
"ہمارے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا ثمر؟" وہ بے تحاشا روتی اور اسے اس حال میں چھوڑ کر جانا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔
کبھی فرحی اسے سمجھاتی تھی..... اب اس نے یہ فرض سنبھال لیا تھا..... اور چاہنے کے باوجود لاہور نہیں جا پا رہا تھا۔ اسے لاہور سے آئے تین ماہ ہوگئے تھے..... ان تین ماہ میں کئی ایسے معاملات تھے جنہیں خود ہی شیر خان وغیرہ نے نبٹا دیا تھا کیونکہ جلیل خان نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ وہ ثمر حیات کو پریشان نہ کریں لیکن پھر بھی تین ماہ بعد شیر خان کا فون آ گیا تھا۔
"میں آپ کو اب بھی پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کچھ ایسے معاملات آپڑے ہیں کہ ہم تنہا کچھ نہیں کر سکتے۔ خان دادا سے بھی ملاقات نہیں ہو پا رہی..... آپ کے دکھ کا احساس ہے مجھے لیکن مجبوری ہے۔"
"کہو شیر خان کیا مسئلہ ہے؟"
"بیگم عبدالغفور کو ایک شخص بہت تنگ کر رہا ہے۔ وہ ان کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور انہیں دھمکاتا ہے کہ اگر انہوں نے رشتہ نہ دیا تو لڑکی اٹھا لے گا یا چہرے پر تیزاب ڈال دے گا..... دو تین بار ہم نے زبانی کلامی سمجھایا ہے لیکن وہ باز نہیں آرہا..... خدانخواستہ کچھ ایسا واقعہ ہو گیا تو دادا تو دادا ہم بھی محلے میں سر اٹھا کر نہ چل سکیں گے۔" وہ تفصیل بتا رہا تھا اور ثمر حیات خاموشی سے سن رہا تھا۔
"شاہجہان بیگم بھی دو تین چکر لگا چکی ہیں کافی پریشان ہیں..... کوئی بڑا ہی مسئلہ ہے انہیں بھی..... اور سب سے بڑھ کر بسمل خان، سنگاپور اور ہانگ کانگ سے کافی مال لے کر آیا ہے..... کسی اور سے بھی بات چیت چل رہی ہے اس کی، کہہ رہا تھا کہ اگر ہم نے مال نہ اٹھایا تو کسی اور کو دے دے گا، گولڈ بھی لایا ہے..... اِدھر کسٹمر بھی مال کا تقاضا کر رہے ہیں..... اگر ہم نے....."
"ٹھیک ہے....." ثمر حیات نے اس کی بات کاٹی تھی۔
"میں صبح آرہا ہوں، تم پریشان مت ہو۔" اور پھر پورے تین ماہ بعد اس نے لاہور خان ہاؤس میں قدم رکھا تھا۔ بسمل خان سے سودا کرنے اور مال آگے پہنچانے کے بعد اس نے بیگم عبدالغفور سے ملاقات کی تھی اور شاہجہان بیگم کی طرف جانے کا ارادہ کیا تھا کہ وہ خود ہی آگئی۔ پریشان حال سی وہ بار بار برقع کے بٹن بند کرتی اور کھولتی تھی۔
"دادا آپ کہاں چلے گئے تھے؟" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

''بہت مشکل میں ہیں ہم...... بدمعاش سے جان چھوٹی تو شریف آدمی گلے پڑ گیا۔''
اس نے سوالیہ نظروں سے شاہجہان کو دیکھا تھا۔
''کسی جاگیردار کا بیٹا ہے...... اور اس کا باپ صرف جاگیردار ہی نہیں سیاست دان بھی ہے...... ہماری مدد کرو دادا، ہم تباہ ہو جائیں گے۔''
شاہجہان ہاتھ جوڑنے لگی۔
''کیا کر رہی ہیں آپ ایسا مت کریں۔'' بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔
''کوئل مر گئی حیاتی دادا...... ان ظالموں نے اسے مار ڈالا۔''
شاہجہان رونے لگی تھی۔
''کوئل......!'' اس کے کانوں میں کوئل کی آواز گونجنے لگی۔ رنج اور غصے سے اس نے مٹھیاں بھینچیں۔
''وہ اسے گانا سننے کے لیے لے گئے تھے زبردستی...... اور پھر دو دن بعد اس کی لاش نوگزے کی قبر کے پاس پڑی ملی۔ رات کی تاریکی میں وہاں پھینک گئے تھے۔''
''کون ہے وہ؟'' ثمر حیات نے بہ مشکل اپنے غصے پر قابو پایا تھا۔
''اس کا ملازم اسے مٹھا سائیں کہتے ہیں۔''
''پاپا......'' عظام نے اندر قدم رکھا تو ثمر حیات نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھیں لو دے رہی تھیں۔
اس نے اس کی دمکتی آنکھوں کو دیکھا۔ یقیناً آنے والا فون اسی لڑکی کا ہوگا اور عظام کو اسی کے متعلق بات کرنا ہوگی لیکن وہ ابھی، ابھی ماضی کے سفر سے لوٹا تھا۔ ریحان کی موت کا دکھ اتنے سالوں بعد جیسے تازہ ہو گیا تھا اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار دو سالہ ریحان آ رہا تھا۔ اس کے ننھے ہاتھوں کا لمس جیسے اس کے چہرے پر زندہ ہو گیا تھا...... وہ اس کی گود میں تھا جب اس نے آخری سانسیں لی تھیں۔
''پ...... پا......'' ننھے لبوں سے نکلا تھا۔
اس نے لمحے بھر کو آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تھا اور ہاتھ بلند کر کے اس کے رخساروں کو چھوا تھا پھر اس کے ہاتھ نیچے گر گئے تھے اور وہ خوب صورت آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔
''بیٹا میں اس وقت بہت تھکن محسوس کر رہا ہوں، انشاء اللہ صبح ہم طے کر لیں گے کہ کب جانا ہے نجل کے گھر...... اور بے فکر رہو...... مسز شاہجہان انکار نہیں کریں گی۔ کیونکہ میرا بیٹا ہے ہی اتنا خوب صورت اور اچھا۔''
اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔
''ٹھیک ہے پاپا......!'' اس نے ثمر حیات کے تھکے ہوئے چہرے پر نظر ڈالی اور خدا حافظ کہتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

میں نے اس طور سے چاہا تجھے اکثر جاناں
جیسے مہتاب کو بے انت سمندر چاہے
جیسے سورج کی کرن سیپ کے دل میں اترے
جیسے خوشبو کو ہوا رنگ سے ہٹ کر چاہے
جیسے بارش کی دعا آبلہ پا مانگتے ہیں

وسعتِ دید نے تجھ سے تیری خواہش کی ہے
میری سوچوں میں بھی تو دیکھ سراپا اپنا
میں نے دنیا سے الگ تیری پرستش کی ہے

رواحہ کی بھیجی گئی محسن نقوی کی اس نظم کو پڑھتے ہوئے ارتفاع کے لبوں پر ایک بڑی دلکش سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ آج سنڈے تھا۔ اور ناشتے کے بعد وہ لاؤنج میں ہی بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگی تھی۔ کسی ٹاک شو کا ریپیٹ پروگرام چل رہا تھا۔ اسے اس ٹاک شو کا میزبان بہت پسند تھا۔ اس کا لب ولہجہ، اس کی نالج سب ہی متاثر کن تھے۔ عموماً وہ نشرِ مکرر میں ہی یہ پروگرام دیکھا کرتی تھی۔ وہ بہت دلچسپی سے پروگرام دیکھ رہی تھی جب میسج ٹون ہوئی تھی اس نے فون اٹھا کر دیکھا، رواحہ کا نام اسکرین پر چمک رہا تھا اور اس کی بھیجی ہوئی نظم نے اس کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑائی تھی۔ فون ہاتھ میں پکڑے وہ ایک بار پھر نظم پڑھنے لگی تھی۔

"میں نے اس طور سے چاہا تجھے اکثر جاناں......

یہ رواحہ بھی ناں......" اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"مجھے ہرگز علم نہیں تھا کہ اسے شاعری سے بھی دلچسپی ہے۔" اس واقعے کے بعد ان کے درمیان دوستی کا بہت گہرا اور مضبوط رشتہ ہوگیا تھا۔ یونیورسٹی میں اکثر فری پیریڈ میں وہ اکٹھے کہیں نہ کہیں بیٹھے نظر آتے۔ اکثر عظام بھی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ رواحہ سے متاثر ہوتی جا رہی تھی اور بہت نامحسوس طور پر وہ اس کے حواسوں پر چھاتا جا رہا تھا۔ اس کی سوچوں اور تنہائیوں میں دخیل ہوگیا تھا۔ اس کے شب و روز پر حاکم ہوگیا تھا اور اس کے سارے بھاگتے دوڑتے لمحوں کو اس نے جیسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا دل کب رواحہ کا تمنائی ہوا۔ کب اس میں رواحہ کی محبت نے سر اٹھایا اور کب اسے اس کی محبت کی طلب ہونے لگی

تھی...... لیکن رواحہ کے دل میں کیا تھا وہ نہیں جانتی تھی۔ اس نے کبھی اس طرح کی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے اسے اندازہ ہوتا کہ وہ اس کے لیے اپنے دل میں کیا جذبات رکھتا ہے...... کئی بار اسے گمان تو ہوا تھا کہ رواحہ کے دل میں بھی اس کے لیے کچھ خاص جذبہ ہے لیکن وہ پُریقین نہیں تھی...... اور اپنی یک طرفہ محبت کا خیال اکثر اسے پریشان کر دیتا...... وہ اپنی محبت کا رازداں کس کو بنائے...؟ کس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دے....؟ عالیہ پتا نہیں کیوں اس سے دور ہوگئی تھی...... وہ بہت کم یونیورسٹی آتی اور آتی بھی تو اس سے دور دور اور اُکھڑی اُکھڑی رہتی اور عالیہ کے علاوہ کسی اور سے اس کی اتنی گہری دوستی نہ تھی کہ دل کے ساتھ ہونے والی اس واردات کا بھید اسے دیتی۔ سو وہ محبت کے اس نئے 'نئے احساس سے ہراساں اور پریشان سی رہنے لگی تھی۔ اسے اپنے دل پر اختیار نہیں رہا تھا۔ رواحہ کے تصور سے ہی دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتیں۔ چند ماہ بعد فائنل ایگزام کے بعد سب بچھڑ جائیں گے پھر شاید وہ کبھی رواحہ سے نہ مل سکے اسے نہ دیکھ سکے۔ اس خیال سے ہی اس کا دل بند ہونے لگتا تھا۔ اور رواحہ کو تو شاید کبھی خبر بھی نہ ہو کہ اس کے نوخیز دل میں اس کی محبت کیسے اچانک اتر آئی تھی۔

یہ ابھی کل ہی کی تو بات تھی کہ وہ کلاس چھوڑ کر لان میں آکر بیٹھ گئی تھی...... اور گھاس کے تنکے نوچ نوچ کر پھینک رہی تھی...... ذہن میں سیکڑوں خیالات آرہے تھے۔ وہ تو محبت کا مذاق اڑاتی تھی۔ جب کبھی عالیہ محبت کا ذکر کرتی وہ اسے حماقت اور بے وقوفی کہتی لیکن اب خود اس کا دل اس حماقت میں مبتلا ہو گیا تھا اور وہ بھی یک طرفہ...... عالیہ ہوتی تو آج وہ ضرور اس کے سامنے اعتراف کر لیتی کہ وہ بھی کسی کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے لیکن آج بھی وہ نہیں آئی تھی...... وہ اپنی سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی جب بہت آہستگی سے آکر رواحہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

''رتی کیا ہوا کیا تم کچھ پریشان ہو......؟ تم فوراً کلاس سے نکل آئیں، میں تمہارے پیچھے آنا چاہ رہا تھا لیکن پھر سر آگئے تو نہیں آسکا۔''

''بس یونہی پڑھنے کا موڈ نہیں تھا۔''

''نہیں رتی تم کچھ پریشان لگ رہی ہو...... گھر میں تو سب ٹھیک ہے ناں......'' وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

رواحہ نے اس کی پریشانی کو محسوس کیا...... اس احساس نے اس کے اندر پھول کھلائے تھے۔

''یونہی بس وہ ممتاز حیدر جو جدائی کی نظم سنا رہا تھا اس سے دل اداس ہو گیا۔ چند ماہ کی بات ہے پھر سب بچھڑ جائیں گے۔ کوئی پتا نہیں کسی کو کوئی یاد بھی کرے گا یا نہیں۔''

''کم از کم میرے متعلق تم ایسا نہیں کہہ سکتیں رتی...... میں کبھی کسی کو نہیں بھول سکتا اور تمہیں تو بالکل بھی نہیں...... لیکن تم...... ہوسکتا ہے میں تمہیں یاد بھی نہیں رہوں، لڑکیاں شادی کے بعد اپنے گھر اور بچوں میں کھو کر سب کچھ بھول جاتی ہیں۔''

رواحہ شاید اسے کھوجنا چاہ رہا تھا کیونکہ اس کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔

''ناممکن......'' اس کی آنکھیں جھلملا گئی تھیں۔

''میں....؟ مجھے سب یاد رہیں گے۔''

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا رتی کہ ہمیں ایک دوسرے کو یاد نہ کرنا پڑے اور ہم ہمیشہ اکٹھے رہیں ایک ساتھ؟''

آج اس نے وہ بات کہہ دی تھی جسے سننے کو اس کے کان کب سے منتظر تھے۔ اس کی سماعتوں میں جیسے کسی نے رس گھول دیا تھا۔ اندر ایک ساتھ بہت سارے چراغ جل اٹھے تھے۔

''کیا ایسا ممکن ہے رواحہ......؟'' اس نے بے تحاشا دھڑکتے دل سے پوچھا تھا۔

''ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہے رتی...... اگر تم بھی چاہو تو......''

''میں بھلا کیوں نہ چاہوں گی؟'' بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا اور پھر اس کی پلکیں جھلک گئی تھیں۔ رخساروں پر جیسے آگ سی دہک اٹھی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے رواحہ بے حد دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا اور اس کی نظروں کی حدت سے اس کا دل پگھلا جا رہا تھا۔

''رتی......'' اس کی آواز جذبات سے مغلوب تھی۔

''کیا میرے کانوں نے صحیح سنا......؟ کیا واقعی تم بھی ایسا ہی چاہتی ہو؟'' اور اس نے نگاہیں جھکائے جھکائے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''تھینک یورتی...... تھینک یو۔'' اس نے رواحہ کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھے تھے لیکن اس کے لہجے سے چھلکتی خوشی کو محسوس کر رہی تھی...... یعنی اس کی محبت یک طرفہ نہیں تھی اگر اس کا دل رواحہ کا اسیر ہوا تھا تو رواحہ بھی اس کے لیے اپنے دل میں ایسے ہی جذبے محسوس کرتا تھا۔

''بہت دنوں سے میں سوچ رہا تھا کہ میں تمہیں بتاؤں کہ تم میرے لیے کیا ہو...... اور یہ کہ میں بری طرح تمہاری محبت میں گرفتار ہو چکا ہوں اور اب اس محبت کے جال سے نکلنا میرے لیے ممکن نہیں...... میں بے بس ہو چکا ہوں...... اور یہ ابھی کی بات نہیں، بہت پہلے کی بات ہے جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا جب ہی تم نے میرے دل میں اپنی مسند سنبھال لی تھی۔ میں کبھی ایک نظر کی محبت کا قائل نہیں رہا...... لیکن یقین کرو رتی، میں پہلی نظر میں ہی تمہارا گھائل ہو گیا تھا اور جب جب تمہیں دیکھا دل نے ہمیشہ تمہاری رفاقت کی چاہ کی۔'' دھیمے دھیمے لہجے میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے رواحہ کا ہر لفظ اس کے دل پر نقش ہوتا چلا ہو گیا۔

''پتا ہے؟'' وہ ہولے سے ہنسا۔

''میں ہر روز جب گھر سے نکلتا تھا تو یہ عہد کر کے نکلتا تھا کہ آج میں تم سے ضرور حالِ دل کہوں گا اور تم سے تمہاری عمر بھر کی رفاقت کی چاہ کروں گا لیکن ہر روز ہمت ہار دیتا...... تمہاری ناراضی کا خیال مجھے روک دیتا...... حالانکہ میرے بابا چاہتے تھے کہ میں جلد تم سے بات کروں...... پتا نہیں انہیں اتنی بے چینی کیوں ہے؟''

''کیا......؟ کیا تم نے اپنے بابا سے بات کی میرے متعلق......؟'' وہ ازحد حیران ہوئی۔

''ہاں......'' وہ مسکرایا تھا۔

''میرے بابا میرے بہت اچھے دوست ہیں۔'' اپنے بابا کے ذکر سے اس کی آنکھوں میں جگمگاہٹیں سی اتر آئی تھیں۔

''اور وہ اب چاہتے ہیں کہ میں تم سے بات کروں اور تمہاری اجازت ہو تو وہ تمہارے گھر آئیں۔''

''تم نے اتنا سوچ لیا اور مجھے بتایا تک نہیں۔'' وہ حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''تو...... کیا کرتا...... تمہاری ناراضی سے ڈرلگتا تھا ناں کہ کہیں تم خفا ہو جاؤ تو چند لمحوں کی رفاقت سے بھی محروم ہو جاؤں۔''

''تم بہت فضول ہو، تمہیں مجھے بتانا چاہیے تھا ناں کہ تم مجھ سے......''

اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

''تو اب بتا تو دیا ہے ناں......'' وہ شریر نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''اچھا بتاؤ اگر پہلے بتا دیتا تو کیا کرتیں؟'' اور وہ اسے یہ نہیں کہہ سکی تھی کہ اگر پہلے بتا دیتے تو میں اتنی پریشان نہ ہوتی۔

''تو بابا کو بھیج دوں؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''نہیں ابھی نہیں...... پہلے میں اپنے پاپا کو بتا دوں تمہارے متعلق پھر......''

''تمہارے پاپا......'' اس کی خوب صورت آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے فکر کا سایہ سا لہرایا تھا۔

''تمہارے پاپا ایک بزنس مین ہیں اور میرے بابا پروفیسر گو کسی چیز کی کمی نہیں لیکن شاید تمہارے پاپا جتنی دولت نہ ہو ہمارے پاس تو کیا وہ پھر بھی......؟''

''میرے پاپا مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی چیز سے مجھے منع نہیں کیا...... اور انہوں نے ایک بار خود کہا تھا مجھے کہ وہ میری پسند کو ہر حال میں ترجیح دیں گے۔ ہاں ہوسکتا ہے ماما کو کچھ اعتراض ہو...... لیکن بہر حال فیصلہ تو پاپا کا ہی مانا جائے گا۔''

اور وہ مطمئن ہو گیا تھا۔

''او کے...... تم پاپا سے بات کر کے بتانا...... میرے بابا کو بہت جلدی ہے۔'' وہ ہنسا تھا۔

''بھلا کتنی جلدی؟'' وہ بھی ہنسی۔

''ابھی تو ہمارے ایگزام ہونے ہیں۔''

''تو ایگزام کے بعد ہی سہرا باندھ لیں گے۔'' وہ شوخ ہو رہا تھا۔

''بس تمہیں اپنے نام کر لیں۔ تم آج ہی اپنے پاپا سے بات کرنا۔''

اس نے تاکید کی تھی لیکن پاپا کل رات ہی لاہور سے آئے تھے اور آج ناشتا بھی انہوں نے اپنے کمرے میں کیا تھا۔ یوں بھی اس کا آج بات کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا پھر کسی روز مناسب موقع دیکھ کر بات کرے گی بلکہ پہلے کسی بہانے پاپا کو رواحہ سے ملوا دے گی...... رواحہ نے محبت کا اظہار کیا کر دیا تھا کہ کل سے اب تک وہ ڈھیروں میسج کر چکا تھا۔

اس نے ایک بار پھر نظم پڑھنی شروع کی ہی تھی کہ افنان نے پیچھے سے آ کر اس کا فون پکڑ لے۔

''ایسا کیا لطیفہ سینڈ کیا ہے کسی نے کہ جنابہ کے ہونٹوں سے مسکراہٹ ہی نہیں جدا ہو رہی۔''

''نہیں وہ لطیفہ تو نہیں۔''

وہ ذرا سا گھبرائی۔

''عالیہ نے ایک نظم بھیجی ہے۔'' اس نے فون لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن افنان نے ہاتھ ذرا سا بلند کرتے ہوئے پڑھا۔

''میں نے اس طور سے چاہا تجھے اکثر جاناں......

جیسے مہتاب کو بے انت سمندر چاہے......''

واؤ...... یہ عالیہ کو شاعری سے کب شغف ہوا۔؟'' اور شوکیس میں رکھے کرسٹل کے ڈیکوریشن پیس نازو سے صاف کرواتی ایمل نے چونک کر ارتفاع کی طرف دیکھا...... اور اس کی نظریں اس کے چہرے پر ٹھہر سی گئیں۔

''اسے نہیں ہے شغف شاعری سے، کسی فرینڈ نے بھیجی ہو گی تو اس نے مجھے بھیج دی۔''

ارتفاع کو بروقت بات سوجھ گئی تھی۔

''اچھا مجھے دو فون......'' اس نے پھر ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔

''پڑھنے تو دو کتنی خوب صورت نظم ہے، بھیجنے والی بڑی رومینٹک ہے۔'' اس نے ہاتھ پیچھے کیا لیکن ارتفاع نے ہاتھ بڑھا کر اس سے فون لے لیا...... تب ہی ڈور بیل ہوئی۔

''وہ میرا دوست آ گیا ہے...... میں چلتا ہوں لیکن رتی اسے ڈیلیٹ مت کرنا میں آ کر پڑھوں گا۔ بہت خوب صورت نظم ہے۔''

ارتفاع نے سر ہلایا تو وہ ایمل کی طرف مڑا۔

''اوکے ماما! میں جنید کے ساتھ جا رہا ہوں، جلدی آجاؤں گا۔''

ایمل نے سر ہلایا تھا اس کی نظریں اب بھی ارتقاع پر تھیں جس نے فون ہاتھ میں لیتے ہی رواحہ کا میسج بہت تیزی سے ڈیلیٹ کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ افنان، رواحہ کا نام دیکھے۔ تب ہی پھر سے میسج ٹون ہوئی اس نے دیکھا رواحہ نے پھر شعر بھیجا تھا۔

''دل یہ کہتا ہے کہ شاید ہو فسردہ تو بھی
دل کی کیا بات کریں دل تو ہے ناداں جاناں''

اور ساتھ ہی افسردگی ظاہر کرتا کارٹون۔ فوراً ہی ایک اور میسج آ گیا۔

''اب تو ایک دن گزارنا بھی مشکل ہے..... کیا بابا کو آج ہی بھیج دوں......؟'' اس کے ہونٹوں پر حیا آلودی مسکراہٹ جمی تھی اور آنکھیں دمکنے لگی تھیں اور ارتقاع کی طرف دیکھتی ایمل کو جانے کیا اور اک ہوا کہ اس نے ہاتھ میں پکڑا کرسٹل کا گلدان نازو کو پکڑایا اور خود وہاں ہی صوفے پر بیٹھ گئی لیکن اس کی نظریں ارتقاع کے چہرے پر ہی تھیں۔ جہاں رنگ بکھرے ہوئے تھے، یہ رنگ اسے چونکا رہے تھے۔ ارتقاع کی انگلیاں تیزی سے موبائل فون سیٹ پر حرکت کر رہی تھیں۔ وہ رواحہ کو میسج ٹائپ کر رہی تھی۔ ارتقاع تو ہمیشہ اس سے خفا خفا اور ناراض ناراض سی رہتی تھی لیکن پچھلے کئی دنوں سے وہ کچھ بدلی بدلی لگ رہی تھی لیکن ایمل نے آج سے پہلے غور نہیں کیا تھا... وہ بہت خوش لگتی تھی اور خوشی کے یہ رنگ جو اس کے ہونٹوں پر کھلے ہوئے تھے اور آنکھوں میں دمک رہے تھے یہ رنگ تو......

''وہ کیوں اتنی خوش تھی آخر ایسا کیا مل گیا ہے اسے؟'' وہ پوچھنا چاہتی تھی لیکن جھجک گئی اس کے اور ارتقاع کے درمیان کبھی اتنی دوستی نہیں رہی تھی کہ ارتقاع اس سے اپنی ہر بات شیئر کرتی...... وہ اس سے کبھی اتنی بے تکلف نہیں تھی۔ یک دم یہ احساس بڑی شدت سے اس کے اندر پیدا ہوا کہ اس کے اور اس کی بیٹی کے درمیان بہت فاصلے ہیں اتنے کہ چند ماہ پہلے وہ اسے اپنی سوتیلی ماں سمجھ رہی تھی۔ اور کیا پتا اب بھی اس کے دل میں ایسا ہی کچھ خیال ہو...... ایک احساسِ زیاں یک دم ہی اس کے اندر پیدا ہوا۔ اسے ارتقاع کو خود سے دور نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ اسے یاد آیا کہ ممی نے ایک بار کہا تھا۔ ''ماؤں کو اپنی بیٹیوں کا دوست ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے دل کی ہر بات اپنی ماؤں سے کر سکیں۔'' لیکن وہ تو کبھی اس کے اتنے قریب نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے دل کی ہر بات باپ سے ہی کرتی تھی لیکن بہت سی ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جو بیٹیاں اپنے باپوں سے نہیں کر سکتیں...... اس نے ارتقاع کو خود سے دور رکھ کر بڑی غلطی کی تھی۔ وہ بہت چھوٹی تھی جب افنان پیدا ہوا۔ وہ اتنی جلدی دوسرا بچہ نہیں چاہتی تھی لیکن افنان کو دنیا میں آنا تھا سو آ گیا تھا اور پھر افنان تھا بھی بہت کمزور...... وہ اسی کی وجہ سے ارتقاع کو توجہ نہ دے پاتی تھی۔

جس کے نتیجے میں ارتقاع چڑچڑی ہوتی چلی گئی تھی۔ ایسے میں بابر نے ارتقاع کو سنبھال لیا تھا اور وہ اس کے لیے بابر کی ممنون تھی اور یہ ممنونیت آج بھی اس کے دل میں موجود تھی...... اور پھر جب افنان کچھ بڑا ہو گیا تھا...... تب بھی ارتقاع، بابر کے ساتھ ہی اٹیچڈ رہی...... یہاں اس سے غلطی ہوئی تھی اسے ارتقاع کو اس کے حال پر چھوڑنے کے بجائے اس پر توجہ دینی چاہیے تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا اور ارتقاع خودسر ہو گئی تھی۔ وہ اپنی من مانی کرتی تھی اور اس کی باتیں اگنور کر دیتی تھی۔ کاش اس کے اور ارتقاع کے درمیان بے تکلفی ہوتی تو اسے آج اس سے بات کرتے ہوئے اتنی جھجک نہ ہوتی۔ اس نے پھر ارتقاع کی طرف دیکھا...... اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں بلا کی نرماہٹ اور ملائمت تھی۔

''یہ نرماہٹ اور ملائمت تو محبت کی عطا ہوتی ہے۔ تو کیا ارتقاع کسی سے......؟ نہیں۔'' اس نے خود ہی اپنے خیال کی تردید کی۔

''نہیں...... یہ تو بہت معصوم اور سادہ ہے......'' ہر ماں کی طرح وہ بھی اپنی بیٹی کے لیے ایسی ہی رائے رکھتی تھی اور پھر اسے بھلا انسانوں کی کیا پہچان...... یہ دنیا تو دھوکے باز اور فریبی لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس کے اندر کسی اذیت ناک یاد نے چٹکی بھری......

''مجھے اس سے بات کرنی چاہیے...... اسے سمجھانا چاہیے کہیں میری طرح یہ بھی محبت کے دھوکے میں نہ آ جائے...... مجھے اس سے پوچھنا چاہیے...... لیکن میں کیا پوچھوں گی......'' وہ یک دم ہی بہت مضطرب اور بے چین نظر آنے لگی...... ''کیا بابر سے بات کروں......؟ لیکن نہیں۔'' ان دنوں بابر کا بی ہیویر بھی کچھ عجیب سا ہو رہا تھا۔

رواحہ نے پھر میسج کیا تھا۔

''میں عظمی کی طرف جا رہا ہوں، واپس آ کر بات کروں گا۔''

''اوکے......'' اس نے ریپلائی کیا اور فون وہیں صوفے پر رکھ کر پاس پڑا ریموٹ اٹھا کر آواز قدرے بلند کی اور تب ہی ایمل کی نظروں کا ارتکاز محسوس کر کے اس نے ایمل کی طرف دیکھا۔

''کیا ہوا ماما آپ اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں مجھے؟''

''کچھ نہیں......'' ایمل چونکی۔

''میں سوچ رہی تھی کہ بیٹیاں کتنی پیاری ہوتی ہیں، لیکن ایک دن بابل کا گھر سُونا کر جاتی ہیں۔ ایک دن میری پیاری بیٹی بھی ہمارا آنگن سُونا کر جائے گی۔'' اس کی آواز میں نمی تھی...... ارتقاع کا دل جیسے یک دم پگھلا تھا...... ایک روز اسے بھی اپنا گھر چھوڑنا پڑے گا...... اپنا گھر، اپنا کمرا، پاپا، افنان سب کو چھوڑ کر وہ پیا دیس چلی جائے گی۔ سب کچھ پرایا ہو جائے گا...... لیکن اس کے ساتھ کچھ انوکھا نہیں ہوگا۔ سب لڑکیوں کو ایک روز بابل کا گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔ ہاں انوکھا اور خوب صورت رواحہ کا ساتھ ہوگا۔ رواحہ کتنا شاندار ہے، کتنا لونگ...... اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دمکی اور آنکھیں لو دے اٹھیں۔ اس نے انہی دمکتی آنکھوں سے ایمل کی طرف دیکھا۔

''لیکن آپ تو لکی ہیں ماما، آپ تو بابل کے گھر سے رخصت ہو کر بابل کے گھر میں ہی رہی تھیں۔''

''نہیں تو......'' ایمل اس کی مسکراہٹ میں کھو گئی تھی...... وہی مدثر جیسی مسکراہٹ......

''میں رخصت ہو کر تمہارے پاپا کے گھر گئی تھی۔'' مدثر اور بابا نے اس کا کتنا شاندار استقبال کیا تھا۔ پورا گھر پھولوں سے سجا دیا تھا...... تازہ گلابوں کی خوشبو سے پورا گھر مہک رہا تھا...... اور مونا نے اس کے گاڑی سے اترتے ہی ٹیپ چلا دی تھی۔ ''بہارو پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے۔''

''لیکن...... پاپا تو نانو کے گھر میں ہی رہتے تھے۔'' ارتقاع کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''ہاں......'' وہ چونکی۔

''لیکن وہ پہلے میں رخصت ہو کر تمہارے دادا ابو کے گھر گئی تھی۔''

''ہاں، وہ تو چند دن کے لیے گئی ہوں گی پھر تو واپس آ گئی ہوں گی۔''

''ہاں پھر واپس آ گئی تھی۔'' اندر جیسے کسی پرانے زخم سے کھرنڈ اتر گیا تھا۔ بہت جلن اور دکھن ہو رہی تھی۔ ''کاش وہ واپس نہ آتی...... کاش وہ ہمیشہ وہاں ہی رہتی...... محبتوں کے سائے تلے...... مدثر ایسا نہ ہوتا...... بے وفا، دھوکے باز۔'' زخموں سے جیسے خون رسنے لگا تھا۔

''پاپا تو آپ کے کزن تھے ناں اور نانو نے انہیں بیٹا بنا رکھا تھا تو کیا آپ شادی سے پہلے انہیں پسند کرتی تھیں۔ پہلے سے آپ کی شادی ان سے طے تھی یا پھر اچانک طے ہوئی تھی؟''

وہ ارتقاع کے اس سوال پر حیران ہو کر اسے تکنے لگی۔ ارتقاع سے اس کی ایسی بے تکلفی تو کبھی نہ تھی کہ وہ اس

سے اس طرح کا سوال کرتی...... اور یہ آج کیسی باتیں کر رہی ہے۔ اس نے تو ایسی باتیں کبھی نہیں کی تھیں بلکہ اس نے تو کبھی اس سے کوئی فالتو بات کی ہی نہیں تھی۔

''بتائیں ناں ماما! کیا آپ پاپا کو پہلے سے ہی پسند کرتی تھیں؟'' اس کی آنکھوں میں شرارت سی کوندی تھی۔

ایک بار اس نے بھی ممی سے ایسا ہی سوال کیا تھا اور یہ تب کی بات تھی جب پہلے پہل اس کے دل میں مدثر کی محبت کا احساس جاگا تھا تو کیا ارتفاع...... اس نے ہراساں ہو کر ارتفاع کی طرف دیکھا۔

''چلیں، آپ بتانا نہیں چاہتیں تو نہ سہی۔'' اس نے ہولے سے سر جھکا اور آنکھوں میں کوندتی شرارت ہونٹوں کی مسکراہٹ سے بھی جھلکنے لگی۔

''نہیں......'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''شادی سے پہلے میں نے تمہارے پاپا کے متعلق اس طرح کبھی نہیں سوچا تھا...... بس حادثاتی طور پر......''

اس نے یک دم بات ادھوری چھوڑ دی...... اگر اس نے مدثر سے محبت نہ کی ہوتی اگر وہ اسے دھوکا نہ دیتا...... بے وفائی نہ کرتا تو شاید وہ کبھی بابر سے شادی نہ کرتی...... اس نے کبھی بابر کو پسند نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ اسے ناپسند کرتی تھی...... حالانکہ اسے ناپسند کرنے کی بظاہر کوئی وجہ بھی نہیں تھی بس وہ بغیر کسی وجہ کے اسے ناپسند کرتی تھی...... لیکن وہ اذیت ناک رات جس نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔ ساری ترجیحات بدل گئیں۔ پسند، ناپسند، سوچ، فکر...... اس رات کی اذیت نے اس کی آنکھوں میں دھند سی بھر دی اور دل کٹنے لگا جیسے برسوں پرانی اذیت دل میں پھر سے کچوکے لگا رہی ہو...... اس نے ارتفاع کے چہرے سے نظریں ہٹالیں اور سر جھکا کر اس اذیت کو برداشت کرنے کی کوشش کرنے لگی...... اس رات مدثر کو فون کرنے کے بعد وہ بے دم سی ہو کر بیڈ پر ڈھے گئی تھی...... اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ چیخیں مار مار کر روئے...... دیواروں سے سر پٹخے...... تکلیف، درد اور اذیت سے اس کا وجود چور چور ہو رہا تھا...... مدثر نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا...... بلکہ خود اس نے اپنے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا مدثر جیسے شخص سے محبت کر کے...... بے وفا، دھوکے باز شخص سے محبت کر کے اسے چاہ کر...... اسے لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے دماغ کی رگیں پھٹ رہی ہوں اور اندر جیسے کوئی چھریاں چلا رہا تھا، اذیت سی اذیت تھی...... جانے کب تک وہ اذیت برداشت کرتی رہی تھی...... لیکن پھر جیسے سب کچھ ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا...... وہ ہمت ہارنے لگی تھی۔ اس نے بیڈ سائنڈ ٹیبل پر پڑا فون اٹھایا تھا اور ڈیڈی کے فون کا نمبر ملایا تھا۔

''ڈیڈی پلیز ممی سے بات کروادیں۔'' اس نے بہ مشکل خود کو سنبھالتے ہوئے کہا تھا۔

''کیا ہوا بیٹا خیریت ہے؟'' ممی پوچھ رہی تھیں......

''ممی کی آواز سنتے ہی اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

''ممی...... میں مر رہی ہوں...... بہت تکلیف میں ہوں...... بہت اذیت ہو رہی ہے آپ ابھی واپس آجائیں پلیز......''

''کیا ہوا...... میری جان...... کیا ہو گیا؟'' ممی گھبراہٹ سے بار بار ایک ہی بات دُہرا رہی تھیں۔

''ممی، مجھے لگ رہا ہے جیسے کوئی مجھے کند چھری سے ذبح کر رہا ہو...... میرے پورے وجود میں درد کی تیز لہریں اٹھ رہی ہیں اور میرا سر...... ممی میرا سر پھٹ جائے گا۔'' وہ رونے لگی تھی...... اونچی آواز میں......

''حوصلہ کرو...... میری بچی...... بابر کدھر ہے......؟ اسے کہو فوراً تمہیں اسپتال لے جائے...... ہم پہلی دستیاب فلائٹ سے آرہے ہیں...... حوصلہ کرو جانو اللہ سے دعا کرو......''

''بابر بھائی تو خالہ سے ملنے چلے گئے تھے۔'' اس نے بہ مشکل کہا تھا۔

''نہیں...... وہ آ گیا ہوگا...... اسے پتا تھا کہ ہم گھر پر نہیں ہیں تو اس نے رات تک آ جانا تھا۔تم ماسی کو بھی ساتھ ہی لے جانا۔''

''اچھا......!'' وہ ریسیور کریڈل پر ڈال کر اٹھی تھی لیکن پھر جیسے زمین آسمان گھوم گئے تھے۔اس نے گرتے ہوئے بیڈ کی پٹی پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ لہرا کر گر گئی تھی۔ ہوش کھونے سے پہلے اس نے فون کی گھنٹی کی آواز سنی تھی جو تسلسل بج رہی تھی۔ پھر اسے پتا نہیں چلا تھا کہ کب بابر اس کے بیڈ روم میں آیا تھا اور کب ماسی اور چھوٹی ملازم لڑکی کی مدد سے اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈال کر اسپتال لایا تھا...... اسے جب لیبر روم میں لے جایا جا رہا تھا تب لمحہ بھر کے لیے اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور اسٹریچر کے ساتھ ،ساتھ چلتے بابر کو دیکھ کر اذیت کی ایک تیز لہر اس کے اندر اٹھی تھی...... ''یہاں تو مدثر کو ہونا تھا'' اس کا دل جیسے پاتال میں گر رہا تھا...... نیچے ہی نیچے اور اس کی آنکھیں پھر بند ہوگئی تھیں...... پھر کیا ہوا تھا اسے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ جیسے گہری غنودگی میں اپنے اردگرد باتوں کی بھنبھناہٹ محسوس کر رہی تھی۔ لیکن باوجود کوشش کے وہ آنکھیں نہیں کھول پا رہی تھی جیسے اس کے پپوٹوں پر کوئی بھاری بوجھ آ پڑا ہو...... اور پھر ہولے ہولے یہ مدھم آوازیں بھی معدوم ہوگئی تھیں پھر جب اس کی آنکھ کھلی تھی تو وہ روم میں تھی اور ممی اس کے بیڈ کے پاس بیٹھی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے اسے کچھ یاد نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے اور اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔

''ممی......!'' اس نے اٹھنے کی کوشش کی تھی۔

''نہیں...... نہیں مت اٹھو......''

ممی نے اپنا ہاتھ اس کے اوپر رکھ کر اسے روکا تھا...... اور تب ہی اسے یاد آ گیا تھا کہ اس کی طبیعت خراب تھی اس نے ممی کو فون کیا تھا اور ممی کو پاس بیٹھے دیکھ کر اس نے بے حد طمانیت محسوس کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ممی آ گئی تھیں اور وہ زندہ تھی لیکن آنکھیں بند کرتے ہی اسے یکایک اپنے اندر کسی خالی پن کا احساس ہوا۔

''ممی......'' اس نے گھبرا کر پھر آنکھیں کھول دیں۔

''ممی میرے بچے۔''

''مبارک ہو اللہ نے تمہیں بیک وقت اپنی نعمت اور رحمت سے نوازا ہے۔''

اس نے متلاشی نظروں سے کمرے میں دیکھا...... کمرے میں کوئی کاٹ وغیرہ نہیں تھا...... ممی نے اس کی نظروں کا مطلب سمجھ لیا تھا۔

''وہ فی الحال نرسری میں ہیں، شام تک آ جائیں گے تمہارے پاس......''

''ممی میں اپنے بچوں کو دیکھنا چاہتی ہوں۔'' اس کا دل انہیں دیکھنے کو مچلنے لگا تھا۔ابھی سسٹر آتی ہے تو میں بات کرتی ہوں سسٹر سے...... اچانک ہی تمہارا بی پی بہت شوٹ کر گیا تھا۔ ڈاکٹر کہہ رہی تھی کہ شاید تم نے کچھ زیادہ ٹینشن لی ہے۔ تمہاری اور بچوں، دونوں کی زندگیوں کو خطرہ تھا سو فوری آپریٹ کرنا پڑا۔ بابر نے فون پر ہم سے بات کر کے ہماری اجازت سے آپریشن کے اجازت نامے پر دستخط کیے تھے۔ میں تو اس خیال سے تمہارے ڈیڈی کے ساتھ چلی گئی تھی کہ ڈاکٹر نے پندرہ دن بعد کی ڈیٹ دی تھی۔''

ممی نے اسے تفصیل بتائی تھی۔

''صبح تو تم بالکل ٹھیک تھیں بیٹا پھر ایسا اچانک کیا ہو گیا تھا......؟ کیا مدثر نے کچھ کہا......؟ اس سے بات ہوئی تمہاری......؟ تمہارے ڈیڈی نے یہاں پہنچتے ہی اسے فون کیا تین چار بار لیکن کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا تو وہ لوگ گھر پر نہیں ہیں یا پھر فون خراب ہے۔'' اس نے ممی کی پوری بات جیسے سنی ہی نہیں تھی...... اس کے اندر جیسے درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

''ہاں بیٹا تم نے بتایا نہیں کیا ہوا تھا اچانک...... اب تو ٹینشن والی کوئی بات نہیں تھی...... تم نے ایک اچھا فیصلہ کیا تھا...... تمہاری طرف سے اطمینان ہو جائے تو تمہارے ڈیڈی خود جا کر مدثر کو بتا آئیں گے۔''

''نہیں...... میرا فیصلہ غلط تھا ممی...... بالکل غلط......'' وہ رونے لگی تھی۔

''مجھے مدثر کے ساتھ نہیں رہنا...... ہرگز نہیں...... مجھے طلاق چاہیے...... طلاق......'' وہ چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔ ممی گھبرا کر اسے تسلی دینے لگی تھیں لیکن اس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔

''ایما...... ایما میری جان...... میری زندگی جو تم کہو گی جیسا تم چاہو گی ہم ویسا ہی کریں گے۔''

ممی اسے تسلی دے رہی تھیں...... لیکن اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے اور جسم بے جان ہو رہا تھا...... پھر اگلے دو دن اس کی حالت بہت خراب رہی اور اسے آئی سی یو میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ وہ ذرا دیر کے لیے آنکھیں کھولتی اور پھر غنودگی میں چلی جاتی۔ چار دن بعد اسے کمرے میں منتقل کیا گیا تو اس نے بچوں کو دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ ممی، بیٹی کو اس کے پاس لائی تھیں...... اسے گود میں لیتے ہوئے جیسے اس کا دل بھر آیا تھا۔ کانوں میں مدثر کی آواز گونجنے لگی تھی۔

''جس روز ہمارے شہزادوں نے دنیا میں قدم رکھا اور اس روز تم دیکھنا میں اسپتال میں بھنگڑا ڈالوں گا...... بھلے اسپتال والے مجھے پاگل سمجھیں...... اور پورے اسپتال میں مٹھائی تقسیم کروں گا......'' اس کی آنکھوں کے کونوں سے آنسوؤں کی لکیریں سی بہنے لگیں۔

''میرا بیٹا، ممی اسے بھی تو لائیں۔''

ہاتھوں کی پشت سے اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے ممی سے کہا تھا۔

''وہ...... دراصل ابھی ٹھیک نہیں ہے اسے انکیوبیٹر میں رکھا گیا ہے۔'' ممی نے نظریں چرائی تھیں۔

''مجھے وہاں لے جائیں پلیز...... بس ایک نظر دیکھ لوں۔'' اس روز ممی اسے ٹالتی رہی تھیں لیکن دوسرے روز وہ جیسے بے بس سی ہو گئی تھیں اور انہوں نے پاس بیٹھے بابر سے کہا تھا۔

''تم ہی اسے سہولت سے بتا دو بیٹا۔ میری تو ہمت نہیں ہو رہی۔''

''کیا...... کیا ہوا میرے بیٹے کو؟'' وہ ہراساں سی ہو کر ممی اور بابر کو دیکھنے لگی تھی۔

بابر اس کے پاس بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

''میری بات تحمل سے سنو ایما...... اور حوصلے سے اس کو برداشت کرو، تمہارا بیٹا بیمار تھا...... پیدائش کے فوراً بعد ہی ڈاکٹر نے مجھے بتا دیا تھا کہ اس کے بچنے کے چانسز بہت کم ہیں...... اس کے پھیپھڑوں میں پرابلم تھا...... وہ پیدائش کے وقت رویا بھی نہیں تھا۔''

''نہیں...... وہ رو رہا تھا بابر بھائی۔'' اس نے ضد کی تھی۔

''میرے کانوں میں پہلے ایک بچے کے رونے کی آواز آئی تھی اور پھر چند منٹ کے وقفے سے دوسرے بچے کی۔''

''شاید ایسا ہو لیکن......'' بابر نے اس کی تائید کی تھی۔

''وہ چلا گیا۔ ڈاکٹر اسے بچا نہیں سکے۔ آئی ایم سوری......''

''وہ چلا گیا اور میں نے اسے دیکھا بھی نہیں۔'' وہ رونے لگی تھی اور بابر اسے ہولے ہولے تھپک رہا تھا۔

''آپ اس کی تصویر ہی بنا لیتے میں دیکھ تو سکتی، وہ جس کے دنیا میں آنے کا ہم کتنی شدت سے انتظار کر رہے تھے وہ کیسا تھا...... اس کی آنکھیں کیسی تھیں...... اس کے ہونٹ...... اس کی ناک......'' وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''وہ بالکل تمہارے جیسا تھا۔'' بابر نے اسے بتایا تھا۔

''جب تم ٹھیک ہو جاؤ گی تو میں تمہیں اس کی قبر پر لے جاؤں گا۔''
''ممی آپ ہی ڈیڈی سے کہہ کر اس کی تصویر بنوا لیتیں۔'' اس نے روتے، روتے ممی سے گلہ کیا تھا۔
''ہمیں ہوش ہی کب تھا ایسا...... ہمیں تو تمہاری زندگی کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ میں تو تمہارے بیڈ کے پاس سے ہلی تک نہیں اور تمہارے ڈیڈی...... صدقے کے بکرے یتیم خانوں میں بھجوا رہے تھے...... مسجدوں میں جا کر تمہاری زندگی کے لیے دعائیں کروا رہے تھے۔ بابر نے ہی بچے کی ڈیڈ باڈی لی اور دفن وغیرہ کروایا...... سچ پوچھو تو میں نے بھی بس ایک نظر ہی اسے دیکھا تھا۔''
نازو نے شوکیس میں رکھے سب پیس صاف کر کے رکھ دیے تو اس کی طرف دیکھا۔

''باجی یہ کام تو ہو گیا ہے اب کیا کرنا ہے۔''
''ہاں......'' اس نے چونک کر نازو کی طرف دیکھا۔
''کچھ نہیں...... تم جاؤ جا کر کچن میں دیکھ لو اور کوئی کام ہے تو......''
اور نازو سے ہوتی ہوئی اس کی نظریں ارتفاع پر واپس پڑیں جو کچھ الجھی، الجھی سی بیٹھی تھی۔ اس کا ذہن ابھی تک ایمل کے اس ادھورے جملے میں اٹکا ہوا تھا۔
''حادثاتی طور پر...... کیا ماما اور پاپا کی شادی حادثاتی طور پر ہوئی... ؟ شاید میری مما کی ڈیتھ کے بعد نانو نے ماما سے کہا ہو گا آخر وہ پاپا کو ایک بیٹے کی طرح چاہتی ہیں تو یوں حادثاتی طور پر ماما کی پاپا سے شادی ہو گئی ہو گی؟''
وہ دل ہی دل میں واقعات کے تانے بانے بن رہی تھی اور آج پھر اس کے اندر وہی شک پیدا ہوا تھا کہ ایمل اس کی سگی ماں نہیں ہے۔ کتنی مشکل سے اس نے افنان کے کہنے پر خود کو یقین دلایا تھا کہ ایمل ہی اس کی سگی ماما ہیں لیکن آج پھر یہ یقین متزلزل ہو رہا تھا...... بے حد مضطرب ہو کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ تب ہی اس کا فون بج اٹھا۔ اس نے مڑ کر صوفے پر پڑا اپنا سیل اٹھایا۔ ''رواحہ کالنگ......'' اس نے ایک نظر ایمل پر ڈالی اور پھر بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے فون آن کر کے کانوں سے لگایا۔
''رتی...... رتی سنو...... شاید پھر تم مجھے کبھی نہیں سن سکو...... میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں، دل اور روح کی گہرائیوں سے۔''
''کیا...... کیا ہوا ہے روی تم اس طرح کی باتیں کیوں کر رہے ہو؟'' وہ بے چین ہوئی۔
''میرا بہت خوفناک ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ میرا بہت خون بہہ رہا ہے... سر سے بازو سے...... پتا نہیں کہاں کہاں......'' اس کی آواز ڈوب گئی۔
''روی...... رواحہ......'' اس نے بے قراری سے پکارا۔
''سنو...... میرے بابا سے ضرور ملنا'' اس کی آواز پھر ابھری تھی اور وہ رک رک کر بول رہا تھا۔ ''انہیں کہنا میں ان سے بہت محبت کرتا ہوں اور وہ دنیا کے سب سے اچھے بابا ہیں۔''
''تم...... تم کہاں ہو رواحہ؟ یہ ایکسیڈنٹ کہاں ہوا ہے... ؟ تم تو عظام کی طرف جا رہے تھے...... تم مذاق کر رہے ہو ناں...... کہہ دو۔'' اس کے آنسو اس کے رخساروں کو بھگو رہے تھے۔
''نہیں...... آئی...... لو......'' اس کی آواز بہت مدھم تھی پھر اسپیکر سے بہت ساری آوازوں کا شور سنائی دیا اور ساتھ ہی جیسے موبائل بند ہو گیا۔ شاید آف ہو گیا تھا یا گر گیا تھا۔
''نہیں......'' اس کے لبوں سے نکلا اور پھر وہ نہیں، نہیں کی تکرار کرتی ہوئی زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

(جاری ہے)

خطا آئے نظر سے پہلے

شبانہ شوکت



"مجھے ہینڈ بیگ لینا ہے خوب بڑا سا، یہ چھوٹے چھوٹے کلچ اور پرس مجھے کبھی پسند نہیں آتے۔"

نوال نے ناک چڑھائی۔

"ہر جگہ بڑا سا بیگ بھی اچھا نہیں لگتا، تمہارے پاس تو پہلے بھی جمبو سائز کا ہینڈ بیگ موجود ہے۔"

منال نے بحث کی، سیلز مین کے ہونٹوں پر دبی سی مسکراہٹ پھیلی تو دونوں کھسیا کر بیگز کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ نوال نے خوب بڑا سا ہینڈ بیگ لیا تھا۔ منال کو چھوٹا سا پرس لینا پڑا کیونکہ پیسے ہی اتنے بچے تھے۔ گھر آ کر جب نوال نے بیگ الٹایا تو منال کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

''یار مجھے میک اپ کا کچھ سامان لینا ہے اور ہیئر کیچر اور کلپس وغیرہ بھی...... آؤ، ذرا میرے ساتھ چلو۔''
عافیہ نے نوال کو ساتھ گھسیٹا تھا۔
''اس لپ اسٹک کی کیا پرائس ہے؟''
''450 روپے۔'' سیلز گرل نے بتایا۔ عافیہ نے وہ لپ اسٹک لے لی اور base کا جو کلر بتایا وہ کاؤنٹر پر موجود نہیں تھا۔ سیلز گرل دوسرے شیلف سے لینے مڑی، جھٹ نوال نے دو لپ اسٹکو اٹھا کر اپنے ہینڈ بیگ میں ڈال لیں۔ پاس کھڑی عافیہ کو بھی اس کا علم نہ ہوسکا کیونکہ اس کی توجہ مکمل طور پر سیلز گرل کی طرف تھی یہی عمل نوال نے دوسری چیزوں کے ساتھ کیا تھا۔ جب وہ گھر آئی تو اس کے بیگ سے ایک مہنگا ہیئر کلر، ہیئر برش، دو کیچر اور دو لپ اسٹکو نکلیں جن کی ادائیگی ایک روپے کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اتنی مہارت سے یہ کام کرتی تھی کہ عملے میں سے کسی کو شک بھی نہیں ہوتا تھا۔ شروع شروع میں اس کے ہاتھ کانپتے تھے۔ دل ایسے دھڑکتا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا لیکن رفتہ رفتہ اس کا اعتماد اتنا بڑھ گیا کہ اب تو وہ ذرا سا بھی نہیں ہچکچاتی تھی۔

☆☆☆

''نوال چلیں؟''
ارسل نے زور سے آواز دی تھی، وہ تیزی سے دوپٹا شانوں پر برابر کرتی کمرے سے باہر آئی تھی۔
''جی چلیں۔''
وہ ایک بڑے سپر اسٹور آئے تھے۔ ارسل فوڈ کورٹ میں رک گیا تھا، جبکہ نوال لفٹ کے ذریعے اوپر لیڈیز یا بچگانہ سامان کے اسٹور پر چلی گئی تھی۔ ارسل نے کچھ چیزیں پیک کروائیں اور کاؤنٹر کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ کر یونہی غیر دلچسپی سے سامنے لگے مانیٹرز کو دیکھنے لگا، جہاں مال کے مختلف فلورز پر چلتے پھرتے، شاپنگ کرتے لوگ نظر آرہے تھے۔ معاً اسے نوال نظر آئی۔ ارسل کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ ابھری۔ وہ اس وقت بچگانہ فلور پر تھی اور شاذل اور باذل کے کپڑے سلیکٹ کررہی تھی۔ اس نے تین، تین سوٹ الگ کیے اور سر گھما کر ارد گرد دیکھا اور ایک سوٹ ہینگر سے اتار کر اسے طے کر کے اپنے بڑے سے ہینڈ بیگ میں ڈال لیا اور باقی کے پانچ ہینگرڈ سوٹ اٹھا کر کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی۔ ارسل کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ مسکراتے ہوئے لب سکڑ گئے اور وہ کشیدہ اعصاب کے ساتھ وہاں سے اٹھنے ہی لگا تھا کہ سامنے موجود سیلز مین کو لپک کر فون کا ریسیور اٹھاتے دیکھ کر اسے صورتِ حال سمجھنے میں ایک لمحہ ہی لگا تھا۔ اس نے فوراً اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے منع کرنا چاہا، اس نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔
''پلیز اسے رکھیں، کسی کو انفارم مت کریں۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔ میں اس سوٹ کی پے منٹ آپ کو دے دیتا ہوں۔ یہ میری مسز ہیں۔ ان کے ساتھ تھوڑی سی سائیکی پرابلم ہے۔ اس لیے یہ ایسا کر جاتی ہیں، پلیز۔'' مارے شرمندگی کے اس کی آواز بہت دھیمی پڑ گئی تھی۔ اسے بہت سخت شاک لگا تھا مگر اس وقت اپنے اعصاب پر قابو پا کر اس نے حاضر دماغی کا ثبوت دیا تھا۔ سیلز مین کو بھی اس کے چہرے پر پھیلی ندامت نے متاثر کیا تھا جب ہی وہ قدرے ڈھیلا پڑ گیا تھا۔
''لیکن یہ کتنی غلط حرکت......''
''میں مانتا ہوں یہ یقیناً غلط ہے، بہت غلط۔ لیکن آپ اس بات کو یہیں رہنے دیں۔ آپ مجھے معلوم کر کے بتائیں اس سوٹ کی کیا قیمت ہے، میں ادائیگی کررہا ہوں۔''
جب تک وہ لڑکا اوپر سے فون کر کے قیمت پوچھتا اس نے نوال کو سیل فون پر کال کر کے نیچے آنے کے لیے کہا۔
''مگر ابھی تو بہت سی چیزیں رہتی ہیں۔'' اس نے احتجاج کیا۔
''مجھے بہت ضروری کام ہے، تم فوراً نیچے آجاؤ۔'' اس کے لہجے میں خود بخود سختی آگئی تھی۔
''سر بائیس سو پچھتر روپے۔''

"جی یہ لیجیے۔" اس نے جلدی سے والٹ سے رقم نکال کر ادائیگی کی۔ ہر چند کہ دل تاسف سے بھر گیا تھا۔ اتنی سی رقم کے لیے چوری...... "کیا کمی ہے نوال تمہیں کہ تم نے یہ کیا، میں تمہیں کیا سمجھا تھا اور تم کیا نکلیں۔" وہ مڑا تو حیران پریشان نوال اس کے پیچھے ہی کھڑی تھی۔ گھر آ کر وہ لاؤنج میں بیٹھ گیا تھا۔

"آپ کو تو کہیں جانا تھا ناں؟"

اسے آرام سے بیٹھتے دیکھ کر وہ حیرت سے بولی۔

"ہاں، تم بھی بیٹھ جاؤ اور دکھاؤ کیا، کیا لیا ہے؟"

نوال تو حیران ہی رہ گئی۔ اس سے پہلے اس نے کب اس طرح دلچسپی لی تھی۔

"بس جلدی میں یہی لے سکی۔"

اس نے وہی پانچ سوٹ دکھاتے ہوئے کہا تھا۔

"وہ سوٹ بھی دکھاؤ ناں جو تمہارے ہینڈ بیگ میں موجود ہے۔" ارسل نے بہت سکون سے اس کے اعصاب پر بم دے مارا تھا۔

"کک، کون سا سوٹ؟" وہ پوری کی پوری ہل گئی تھی۔ ہینڈ بیگ کو یوں دونوں ہاتھوں میں جکڑا جیسے وہ اس سے چھین لے گا۔

"وہی، جو تم نے اپنے تئیں تو چھپا لیا تھا مگر کیمرے کی آنکھ سے نہ جانے کس کس نے دیکھا مجھ سمیت۔"

نوال کا رنگ اتنا سفید ہو گیا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

"کیا بہت کم پیسے تھے تمہارے پاس کہ تمہیں چوری کی ضرورت پیش آئی؟"

وہ اسی طرح گنگ بیٹھی تھی۔

"اب اس طرح کیوں بیٹھی ہو۔ میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔ اس کا جواب دو مجھے...... تمہیں لگتا ہے شاپنگ کے لیے رقم کم ہے تو تم اور لے لیا کرو...... اے ٹی ایم کارڈ اور کریڈٹ کارڈ سب کچھ تو تمہارے پاس ہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے تم میرے بچے کو چوری کے کپڑے پہنانے لگی تھیں۔ کیا میرے بچے اسی قابل ہیں؟ تو پھر میں کس لیے کماتا ہوں کہ میری بیوی کھلم کھلا اتنے بڑے مال میں چوری کرتی پھرے....؟ اتنی گھٹیا حرکت، تم تصور تو کرو اس کا رزلٹ کیا نکلنے والا تھا۔"

وہ بہت کوشش کر رہا تھا کہ اس کی آواز بلند نہ ہو۔

"یہ یقیناً تم نے پہلی بار نہیں کیا۔ تمہارا انداز بہت ماہرانہ تھا۔ یقینی طور پر تم اس کی عادی ہوگی اور بہت خوش قسمت بھی کہ کبھی پکڑی بھی نہیں گئیں ورنہ اتنے کیمروں اور لاتعداد ملازمین کی موجودگی میں ایسی کھلم کھلا چوری کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔"

نوال کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔ مارے شرمندگی کے اس سے بات نہیں ہو پا رہی تھی کہ وہ اپنی صفائی کے لیے کچھ کہہ پاتی۔

"تمہیں معلوم ہے، میں نے اس کاؤنٹر مین کو کیسے روکا تھا جو اسی فلور والوں کو فون کر کے تمہارے بارے میں انفارم کرنے لگا تھا۔ اس کے بعد تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوتا۔ وہ تم خود تصور کر سکتی ہو۔ آج میں

نے جتنی شرمندگی محسوس کی ہے وہ میں بتا نہیں سکتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ تمہارا شوہر ہونے کی وجہ سے آج میں بہت شرمسار ہوا ہوں۔"

وہ تلخی سے کہتا وہاں سے اٹھ کر چلا گیا اور وہ وہیں پتھرائی ہوئی سی بیٹھی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

منال حیرت سے پھٹی آنکھوں سے وہ سارا سامان دیکھ رہی تھی جو نوال کے ہینڈ بیگ سے نکلا تھا۔

"یہ......یہ......" وہ ہکلا سی گئی تھی۔

"یہ ہے بڑے بیگ کا صحیح استعمال۔" وہ فخریہ مسکرائی۔ "کیا کچھ آگیا اس کے اندر اور وہ بھی بالکل فری ورنہ ہماری امی تو ہمیں جو پیسے دے کر بھیجتی ہیں، اس میں تو ہم یونہی حسرت بھرے دل کے ساتھ واپس آجائیں...... یہ میری "کارکردگی" ہے اور کچھ نہیں تو کم از کم شاباش ہی دے دو۔"

"مگر یہ تو چوری ہے، بہت بری بات بلکہ سراسر گناہ......" منال نے کمزور سا احتجاج کیا۔

"چھوڑ یار، اب ہم کوئی غلط طریقے سے کسی لڑکے سے تو نہیں گفٹ نکلوا رہے ناں، لڑکیاں تو کیا کیا غلط حرکتیں کرتی ہیں۔ اللہ معاف کرے۔ میں نے ایسا کوئی غلط کام نہیں کیا صرف اپنا "فن" استعمال کیا ہے۔" وہ بڑے فخریہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

اس کی مہلت کافی لمبی تھی، تبھی تو اس کا کیا کرایا چھپتا رہا۔ ارسل اس کا کزن تھا، خوب امیر وکبیر، اسے نوال اتنی بھائی کہ شادی کر کے ہی چھوڑی۔ اب وہ دو بیٹوں کی ماں بن چکی تھی اور ہر طرح سے خوش حال زندگی گزار رہی تھی۔ کہیں کوئی کمی نہیں تھی پھر...... پھر یہ تو اس کی عادت بن چکی تھی۔ وہ ایک آدھ چوری کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھی، پر آج اس کی مہلت تمام ہو چکی تھی۔ اس کی رسی کھینچ لی گئی تھی۔ وہ کس طرح سے پکڑی گئی تھی۔ کس بری طرح سے ارسل کی نظروں سے گری تھی کہ اٹھنے کے لیے صدیاں درکار تھیں۔ جب وہ ایک انسان ہو کر اتنا ناراض تھا تو وہ رب جو ہر بار اسے چوری کرتے دیکھتا رہا تھا، وہ کتنا ناراض ہوگا۔ اسے یہ خیال کیوں نہیں آیا، وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔

☆☆☆

"پلیز ارسل مجھے معاف کر دیں، آئندہ آپ کو میری طرف سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

وہ بیڈ پر اس کے بالمقابل آبیٹھی۔ ارسل نے ناراض نظر اس پر ڈالی۔

"معافی مجھ سے نہیں، اللہ تعالیٰ سے مانگو۔ جس نے چوری کرنے والے سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "تو اردگرد انسانوں کی موجودگی کا اندازہ تو کرتا ہے کہ کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا لیکن مجھے کیا اتنا کمتر سمجھتا ہے کہ میں سب دیکھ رہا ہوں اور تو پھر بھی چوری کرتا ہے۔"

نوال مارے ندامت کے سر نہیں اٹھا پائی۔

"تم نے غلطی نہیں گناہ کیا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو اور سچے دل سے توبہ کرو کیونکہ......"

ارسل نے رک کر نوال کا چہرہ دیکھا جو ندامت کے آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا، وہ ہلکے سے کھنکارا۔ "کیونکہ چور، چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں۔"

نوال نے شرمندگی سے اسے دیکھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔ ارسل کو اس پر اتنا غصہ تھا کہ آج تین دن سے اس نے اس سے بات تک نہیں کی تھی۔ ورنہ وہ ایک بہت اچھی بیوی تھی۔ اسے نوال سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی۔ پر اب جو شکایت ہوئی تھی تو اس نے ٹھیک ٹھاک طریقے سے اس پر اپنا غصہ ظاہر کیا تھا۔

اب وہ اتنی شرمندہ تھی کہ ارسل کو امید تھی کہ وہ آئندہ ایسا نہیں کرے گی...... وہ اسے ایک بار ضرور چانس دینا چاہتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اس قبیح حرکت سے باز رکھے کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ چوری انسان سے اس کا نفس کرواتا ہے۔ جب انسان نفس کی خواہش پر چلنے لگے تو پھر گناہ کا احساس باقی نہیں رہتا اور اب نوال کا احساسِ ندامت صاف عیاں تھا۔

سوئی کے ناکے سے دھاگے تک

فریدہ لاکھانی



"ایک سلائی مشین تم نے کیا خرید لی جس کے لیے پورا گھر تم نے الٹ پلٹ کیا ہوا ہے۔ اور اب اسے رکھنے کی لیے جگہ ڈھونڈ رہی ہو۔" شوہر نے کھٹ پٹ کی صدا پر کہا۔ "آخر یہ کیا ماجرا ہے بیگم، اس گھر میں کبھی کوئی چیز ٹھکانے پر یا وقت پر ملتی ہی نہیں...... دیکھو میری جرابیں بھی نہیں مل رہی ہیں۔ تم نے تو نہیں دیکھیں؟" وہ الجھے ہوئے انداز میں بولے۔

"نہیں، میں تو خود اپنی الجھن میں ہوں اور جگہ بنانے کی کوشش کر رہی ہوں۔" میں اپنی دُھن میں تھی۔

"جگہ تو تم نے اپنی آج سے اٹھارہ سال پہلے ہی بنالی تھی۔"

"اور کہاں بنائی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"جناب ہمارے دل میں بھلا اور کہاں۔"

"ارے وہاں تو اب کوئی اور رہتی ہے۔" میں نے جتانے والے انداز میں کہا۔

"تم نے اتنی جگہ لے رکھی ہے کہ اور جگہ کی گنجائش ہی نہیں...... ماشاء اللہ صحت اچھی ہے تمہاری اور یہ کیا تم نے تو موضوع ہی بدل دیا ہے۔" شوہر نے کہا۔

"ارے بھئی موضوع بدلا ہے ارادہ تو نہیں۔" میں اپنے کام میں مشغول ہوتے ہوئے بولی۔

"یہ تم کس الجھن میں ہو؟ جس کی وجہ سے پورا گھر الٹ پلٹ کر رکھا ہے۔" شوہر نے پھر دُہرایا۔

"پاپا آپ کی جرابیں ضرور جہاں مشین رکھی جائے گی وہیں سے نکلیں گی۔" بیٹے عارف نے پیچھے سے آواز لگائی۔

"میرا خیال ہے مجھے ماتھے پر ایک neon sign لکھ کر لگانا پڑے گا کہ میری پریشانی کی وجہ کیا ہے۔ چلیں دوبارہ بتا دیتی ہوں کہ میری پریشانی کی وجہ کیا ہے۔" میں نے گلا کھنکھارا۔ "دراصل میں نے جو ایک عدد سلائی کی مشین خریدی ہے جس کے لیے گھر میں ایک موزوں جگہ ڈھونڈ رہی ہوں اور میں اسے کھڑکی کے پاس رکھنا چاہ رہی ہوں وہاں سے روشنی آئے تاکہ بجلی کا خرچ بھی بچے اور اس سے میری کچھ کمائی بھی ہو سکے۔" میں نے پوری بات بتائی۔

"کھڑکی کے پاس رکھنے سے تو تم ہر وقت کھڑکی کھلی رکھا کرو گی اور یہ بات مجھے بالکل پسند نہیں...... کیونکہ مجھے نزلہ فوراً پکڑ لیتا ہے۔" شکیل صاحب نے ایک بیخ لگائی۔

"لو اب یہ ایک اور مسئلہ نکل آیا۔ بھئی توبہ ہے اتنے نازک تم کب سے ہو گئے؟ لگتا ہے تمہاری اماں نے بڑے لاڈ میں تمہیں پالا ہے اور لاڈ میں پلنے والے بچے کبھی نہ

زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں اور نہ ہی جلد بڑے ہوتے ہیں۔ بس ذرا دبلے ہو جاتے ہیں اور لمبے لگنے لگتے ہیں۔ جسے بڑا بڑا سمجھا جانے لگتا ہے۔اب یہ سن کر تمہارے منہ پر بارہ کیوں بجنے لگے ہیں، شاید سچ سننے سے ڈرتے ہو اسی لیے میرے پوچھے ہوئے سوالوں کے جوابوں کو دل میں دفن کر دیا ہے تم نے۔ خیر اس وقت تو یہ سوچنا ہے کہ اس کا حل تلاش کرنا سب سے پہلے ضروری ہے کہ مشین کے لیے کوئی موزوں جگہ نکل آئے۔"

"اچھا، تم ایسا کرو یہ کونے کا می والا کمرا لے لو اور اسے سجا بنا لو میری جان چھوڑو اور مکڑی کی طرح مجھ سے مت چپکی رہو اپنے سوالوں کو لے کر۔" میاں صاحب بولے۔

"خدا کی پناہ ہے شکیل، ارے وہ کمرا تو صندوق جیسا ہے، بند بند سا، اسے سجایا نہیں جا سکتا، اس میں یقین جانو سجاوٹ نہیں حراست ہوگی اور میری سہیلیاں بھی کبھار جب سلائی کے کام کے دوران آئیں گی تو انہیں کیسے وہاں بٹھاؤں گی۔ خاصی پشیمانی ہوگی۔" میں نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

"میرا خیال ہے پریشانی سے تو پشیمانی بہتر ہے۔" شکیل نے کہا۔ "اچھا اس کا ایک حل یہ بھی ہے کہ اپنی پشیمانی دور کرنے کو اور دوستوں میں سر اونچا رکھنے کے لیے ایک ترکیب اور ہے اور وہ یہ ہے کہ جب بھی ایسا مسئلہ درپیش آئے تو تم کھڑکی کے پیچھے ایک گدھا رکھ لو اور اس کے کان کھینچ کر اپنا غصہ نکال کر دیا کرنا کہ دھوبی اکثر یہاں سے میرا گدھا چرا لے جاتا ہے اسی لیے میں نے اس کمرے کو سلائی کا کمرا بنایا ہے تاکہ اس پر نظر بھی رہ سکے اور تمہارا غصہ بھی نکل جائے۔" شکیل نے تمسخرانہ انداز اختیار کیا۔

"بات یہ ہے کہ گدھے کے کان کھینچنے سے غصہ تو نکل جائے گا لیکن اس گدھے کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تم اس دھوبی کے ساتھ مت جانا۔ کسی نے خوب کہا تھا کہ گدھے کے کان کھینچ کر اسے چلایا نہیں جا سکتا، نہ ہی اس سے کمرے کی خوبی میں اضافہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کا سائز بدلا جا سکتا ہے۔" میں نے ان کی بے تکی بات کا فوری جواب دیا۔

"تو فرزانہ، رہ گئی بات کمائی کی تو یہ بتاؤ کہ میں تمہیں کافی پیسے جب دیتا ہوں اور تمہیں کافی خوش بھی رکھتا ہوں تو پھر پیسے کمانے کی کیا حاجت تمہیں پیش آ گئی ہے۔" انہیں پیسے کی بات بڑی بری لگی تھی۔

"واہ اللہ کی پناہ، آج تو ہوا کے ہاتھ بھی اپنے ہنر کو دیکھنے لگے گویا وہ اپنے دردِ دل کو دیکھنے لگے۔" میرے منہ سے اچانک یہ نکلا۔ وہ مجھے دیکھتے رہ گئے۔

"پہلی وجہ پیسہ کمانے کی یہ ہے کہ پیسہ کمانے کے معنی ہیں آئندہ کے لیے کچھ بچت لیکن اتنا بھی نہیں کہ محل اس سے کھڑا کر لیا جائے... بس بچوں کا اضافی خرچ اس سے نکل آئے گا اور دوسری بڑی وجہ ذرا غور سے سنو......اور وہ یہ ہے کہ اس سے دماغ چلتا رہے گا اور یہ بڑھاپے میں ذہن کے لیے افاقہ دے گا اس سے بڑھاپے میں dymentia سے انسان بچا رہ سکتا ہے کیونکہ ذہن جتنا بزی رہے گا اتنا ہی عمر رسیدگی کے لیے اچھا عمل ہے۔" میں نے انہیں اخلاقی طور پر سہارا دیا۔

"یہ ہوئی نہ بات کہ ہماری بیگم خواہ کیسی بھی ہوں اپنی بات منوانا خوب جانتی ہیں اور سونے پر سہاگا کہ انہیں تو اندھیرا ہو کہ وہ غصے میں ہوں، اپنی سوئی تلاش کرنا خوب آتی ہے۔" شکیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بھئی تم نے میرے دل کی گہرائیوں میں جب ایسی سچائی کو جنم دے ہی دیا ہے تو ایسا لگ رہا ہے کہ اب می والا کمرا خوب سجا، سجا نظر آ رہا ہے اور لاؤ اسی پر اکتفا کر لیتے ہیں، کپڑے بھی سل جایا کریں گے اور دھوبی کی چوری بھی پکڑی جائے گی، اُدھر دوست بھی خوش، خوش آ جایا کریں گی بچوں کے خرچ سے بھی نمٹا جا سکے گا اور ......اور میں بھی دو روٹی زیادہ کھا کر بڑھاپے کی بیماری کو مات دے سکوں گی۔" میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"بھئی سوئی سے دھاگے تک کا حل آسان نہ تھا۔ خصوصاً میاں صاحب کی عقل کو کھولنے کے لیے تو بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔" پوری کہانی اپنی سہیلی کو سنا کر آخر میں میں نے یہ جملہ لگایا تو وہ ہنستے ہوئے مجھے داد دینے لگی۔



تم بن

کائنات غزل

انسان جب خواہشات پر انحصار کرنے لگتا ہے تو منہ کے بل گرتا ہے مگر وہ اسے منہ کے بل گرنے سے بچانا چاہتا تھا۔

وہ ایک سنہری شام تھی...... گاڑی گھر میں داخل ہوئی تو دونوں اپنی، اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر گئے۔ واصفہ زوردار انداز میں دروازہ بند کر کے اندر کی طرف بڑھ گئی۔ جبکہ جاذب اپنی طرف کے دروازے سے کمر ٹیک لگائے اس کی پشت کو دیکھتا رہا۔

جب سے انا بی نے واصفہ کو جاذب کے نام کی انگوٹھی پہنائی تھی تب سے واصفہ کے انداز اسی طرح کے ہو گئے تھے جبکہ بچپن کے کئی سال اور جوانی میں رکھتے قدم دونوں نے پیار محبت اور شرارتوں میں ایک ساتھ گزارے تھے...... کبھی لڑتے جھگڑتے تو اگلے پل ہنس دیتے۔

لیکن اب......؟ جاذب کے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔

وہ اس کے عشق میں پور، پور ڈوبا ہوا تھا...... اس سے جدا ہونے کا تصور ہی روح فرسا تھا...... لیکن واصفہ کی بے لگام ہوتی خواہشات اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھیں۔

☆☆☆

حسین ولا جب آباد ہوا تھا تو اس وقت بھی یہاں افراد کی قلت ہی تھی وقت گزرنے کے ساتھ بڑھنے کے بجائے مزید کم افراد ہوتے گئے۔

میجر حسین نے بڑی محبت کے ساتھ اپنا آشیانہ بنایا تھا کئی خواب تھے ان کی آنکھوں میں دو بیٹوں محارب حسین، ثاقب حسین اور شریک حیات قانتہ کے ساتھ وہ یہاں شفٹ ہوئے تھے...... چند دن اپنے اس آشیانے میں گزار کر وہ شہید کا درجہ پا گئے تھے۔ قانتہ بیگم جنہیں بچے انا بی کہتے تھے انہوں نے اپنے بچوں کو کبھی باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ ماں اور باپ دونوں بن کر پالا...... اتنے بڑے گھر میں محض تین نفوس زندگی گزار رہے تھے۔ بیٹوں نے قد نکالا تو انہیں گھر کی رونق بڑھانے کا خیال آیا......

محارب حسین اپنی کلاس فیلو زاریہ وقار میں انٹرسٹڈ تھے۔ وہ چھان بین کر کے اسے خوش دلی سے بیاہ لائیں لیکن زاریہ وقار کو سو برسی انا بی تو پسند تھیں پر ان کے اصول پسند نہ تھے۔ چند ماہ میں انہوں نے بالا ہی بالا کینیڈا جانے کا پروگرام بنالیا...... جہاں ان کی آدھی فیملی آباد تھی۔ محارب حسین نے کینیڈا کی ایک کمپنی میں انٹرویو دیا اور اپائنٹمنٹ لیٹر ملتے ہی دونوں کینیڈا سدھار گئے۔ انا بی نے ایک بار بھی نہ روکا،

وہ جانتی تھیں پرندے کے جب پر لگ جائیں تو وہ اپنی اڑان سے رکتا نہیں۔

ثاقب حسین بھائی کے اس عمل سے شاکڈ رہ گئے۔ انہوں نے اپنی شادی کا فیصلہ انا بی پر چھوڑ دیا سو وہ اپنی بھتیجی سنبل کو بیاہ کر لے آئیں۔

سنبل کے آتے ہی خاموش گھر میں قہقہے گونجنے لگے جو کہ زاریہ کے آنے سے بھی نہ گونجے تھے، وہ زیادہ تر باہر نکل جاتی جبکہ سنبل نے آتے ہی گھر کے سارے کام اپنے ذمے لے لیے تھے...... سارا دن بولتی رہتی...... اس کی ہنسی کے جھرنے بہتے رہتے، وہ امید سے ہوئی تو انا بی نے اس کی ساری ذمے داریاں واپس لے لیں اور اسے ہتھیلی کا چھالا بنالیا......

ادھر محارب حسین بھی ایک بیٹے کے باپ بن گئے تھے۔ زاریہ سے بچہ بالکل نہ سنبھلتا اس نے گورنس رکھی اور خود سارا سارا دن گھر سے غائب رہتی۔ ایک دن محارب حسین جلدی گھر آ گئے۔ انہوں نے جو منظر دیکھا تو سر سے پاؤں تک لرز گئے۔ اگر چند لمحے بھی دیر کر دیتے تو اپنے بیٹے کو کھو دیتے۔

گورنس ٹیرس پر کھڑی ہنس ہنس کر کسی سے باتیں کر رہی تھی اور جاذب حسین نے نیا، نیا چلنا سیکھا تھا۔ وہ گورنس کی بیک سائڈ کی گرل پر لٹکا ہوا تھا اس کی آنکھیں باہر کو ابلی ہوئی تھیں۔ خوف کے مارے اس کی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ محارب حسین نے اسے جلدی سے اچک کر تھاما...... اور ایک فیصلہ کرلیا...... وہ اب حیرت زدہ اس بات پر تھے کہ زاریہ نے ماں ہوتے ہوئے.... مروتاً بھی منع نہیں کیا تھا۔ اگلے ہفتے وہ جاذب کے ساتھ انا بی کے سامنے تھے۔ وہ جاذب کو انا بی کی جھولی میں ڈال آئے تھے۔ جاذب بہت ہی صابر بچہ تھا۔ بہت آرام سے یہاں ایڈجسٹ ہو گیا تھا۔ دن گزرتے رہے...... انا بی کا دل تو سنبل کے آنے سے ہی بہل گیا تھا اب جاذب کی آمد نے انہیں اور مصروف کر دیا تھا۔ کچھ وقت اور سرکا۔ ثاقب اور سنبل بھی

ایک بیٹی کے والدین بن گئے۔ انا بی نے اس کا نام واصفہ رکھا...... بچی بہت کمزور تھی اسے ایک ہفتہ اسپتال میں انکیوبیٹر میں رہنا تھا جبکہ سنبل کی چھٹی ہوگئی تھی۔ ثاقب حسین، سنبل کو اس کی والدہ کے گھر چھوڑنے جارہے تھے کہ ایک تیز رفتار ٹرک نے دونوں کو اجل کا نوالہ بنا ڈالا...... انا بی پر یہ غم پہاڑ کے مانند ٹوٹا تھا۔ جاذب کا ساتھ نہ ہوتا تو وہ زندگی کی بازی ہار جاتیں۔ محارب حسین کے پہنچنے تک ان دونوں کو دفنا دیا گیا تھا۔ وہ چھوٹے بھائی سے آخری ملاقات بھی نہ کرسکے...... بس چند دن ٹھہر کر واپس اپنے دیس لوٹ گئے۔

انا بی کے لیے ایک بار پھر امتحان تھا انہوں نے دونوں بچوں کی پرورش شروع کردی۔ جاذب بہت سمجھدار تھا جبکہ واصفہ چلبلی سی، دونوں میں چند سال کا ہی فرق تھا یونہی لڑتے جھگڑتے دونوں بڑے ہوگئے۔ جاذب، واصفہ کو اکثر نصیحتیں کرتا کبھی وہ مان جاتی کبھی کانوں پہ مار دیتی...... لیکن اب جب سے انا بی نے دونوں کو ایک دوسرے کے نام کیا تھا...... واصفہ اکھڑی، اکھڑی سی رہنے لگی تھی اور آج تو واصفہ نے حد ہی کردی تھی...... انا بی کی اجازت سے وہ اسے شاپنگ پر لے کر گیا تھا۔ واصفہ جس سوٹ پر ہاتھ رکھتی وہ آستینوں کے بغیر ہوتا...... جاذب اسے منع کردیتا...... آخری شاپ پر وہ جاذب پر چلا اٹھی......

"مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ...... ابھی سے شوہر بننے کی کوشش نہ کرو...... تمہیں کس نے حق دیا ہے کہ تم میرے معاملات میں دخل اندازی کرو...... ساری زندگی انا بی اور تمہاری مرضی کے کپڑے پہنے ہیں، کیا اتنا بھی حق نہیں میرا کہ میں اپنی مرضی کی شاپنگ کروں...... کس سے ملنا ہے......؟ کیا کھانا ہے......؟ کیا پہننا ہے......؟" سب لوگ رک رک کر انہیں دیکھنے لگے...... جاذب اس کے بولنے کی پروا کیے بنا اسے گھسیٹتا ہوا گاڑی تک لایا اور اندر پٹخ کر اپنی سیٹ پر آکر فوراً گاڑی اسٹارٹ کردی......

موبائل کی بیپ پر وہ چونکا تھا۔ انا بی کی کال تھی۔ وہ تیزی سے اندر کی طرف بڑھ گیا تھا۔

اب وہ کمرا لاکڈ کیے بیٹھی تھی۔ انا بی پریشان ہوگئی تھیں جبھی جاذب کو کال کی انہوں نے۔ گھر آئے ہوئے اسے آدھا گھنٹا ہوگیا تھا مگر وہ باہر ہی کھڑا اپنی سوچوں میں گم تھا۔

"دماغ خراب ہوگیا ہے محترمہ کا، سلیولیس ڈریس لے رہی تھیں منع کیا تو آپے سے باہر ہوگئیں، وہیں شاپ پر ایک تماشا کھڑا کردیا...... اس سے پوچھ لیں اگر اسے ہمارے رشتے پر اعتراض ہے تو آپ یہیں اس بات کو ختم کردیں۔" وہ جان بوجھ کر زور زور سے بول رہا تھا...... وہ یک دم دروازہ کھول کر باہر آئی۔

"ہاں...... ہاں ختم کرو...... آزاد کردو مجھے ان پابندیوں سے...... ساری زندگی غلامی میں نہیں گزارنی مجھے۔" وہ سرخ چہرے اور سوجی آنکھوں سے اسے

گھورتی ہوئی بولی اور زور سے دروازہ بند کر دیا۔

''دیکھ لیا آپ نے......!'' جاذب برداشت کی منازل سے گزر رہا تھا۔

انا بی نے بھی ایک فیصلہ فوری کیا اور اس نام نہاد منگنی کو ختم کر دیا۔ دونوں ایک ہی گھر میں اجنبی بن گئے۔

جنید اسی ایریے میں رہتا تھا اس کی والدہ نے جب پہلے واصفہ کا ہاتھ مانگا تو انا بی نے خاموشی اختیار کر لی تھی اور جاذب اور واصفہ کو ایک دوسرے کے نام کی انگوٹھی پہنا دی تھی مگر اب ان حالات کے تحت انہوں نے واصفہ کی رضامندی سے جنید کی والدہ کو ہاں کر دی...... جاذب نے خود کو پتھر کر لیا...... واصفہ نے اپنی منگنی کی ساری شاپنگ اپنی دوست ندا کے ساتھ کی تھی...... اس کے علاوہ گھر میں پہننے کے تمام جوڑے وہ جان کر سلیولیس لے کر آئی اور انہیں پہن کر جتاتی نظروں سے جاذب کو دیکھتی...... جاذب لب بھینچ کر رہ جاتا...... انا بی نے اسے جنید سے ملنے کی اجازت تو دی تھی لیکن کہیں باہر ساتھ جانے کی نہیں...... وہ اکثر گھر چلا آتا...... جاذب سے اس کی واصفہ پر پڑتی نظریں برداشت نہ ہوتیں...... گو کہ وہ اس کا ہونے والا شوہر تھا لیکن ابھی تھا تو نامحرم ہی۔ وہ سر سے پاؤں تک اسے ایکسرے کے انداز میں دیکھتا تو جاذب کا خون کھول جاتا وہ اس جگہ سے ہی ہٹ جاتا...... ساتھ رہتے ہوئے بھی اس نے کبھی واصفہ پر بری نگاہ نہ ڈالی تھی اور جنید...... اس دن تو حد ہوگئی...... جاذب ٹیرس پر کھڑا سگریٹ پھونک رہا تھا...... نیچے لان میں واصفہ، جنید کے ساتھ لان چیئر پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ دونوں سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ واصفہ کا چہرہ شرم سے سرخ پڑتا جا رہا تھا۔ جنید اس کے مزید قریب ہوا اور اس کے بنا آستین کے گورے گورے بازو پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تو واصفہ کے چہرے پر کچھ ناگوار تاثرات ابھرے تھے۔ جیسے اسے جنید کا یہ عمل پسند نہیں آ رہا ہو...... وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی جیسے فرار کا راستہ ڈھونڈ رہی ہو...... جاذب سے یہ سب برداشت نہیں ہوا۔ وہ تیر کی طرح نیچے پہنچا اور اپنے چہرے کے تاثرات کو بدلتے ہوئے ان کے سر پر پہنچ گیا۔ جنید جو کسی اور ہی دنیا میں پہنچا ہوا تھا...... اسے دیکھ کر یک دم سنبھلا، اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا......

''ایکسپو چل رہے ہو؟ بہت زبردست ایگزی بیشن لگی ہے۔'' ساتھ ہی اس نے جنید کو آفر کی۔

''تم اس حلیے میں جاؤ گے یار؟'' جنید نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا...... ڈھیلا، ڈھالا ٹراؤزر اور کہنی تک فولڈ ہوئی آستینیں اوپر سے بنا استری شرٹ...... منہ بھی شاید صبح کا دھلا تھا...... ''تم چینج کر لو میں اتنی دیر ویٹ کر لیتا ہوں۔'' اس کے مزید رکنے کا سن کر جاذب کو لگا واصفہ گھبرا رہی ہے۔

''نہیں یار، مرد ہر حلیے میں جچتے ہیں تم آؤ تو میرے ساتھ۔'' وہ اسے اپنے ساتھ لیے پورچ میں آ گیا اور دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ جاذب نے جنید کے ناگوار تاثرات کی بھی پروا نہ کی۔ ایکسپو سے واپسی پر اس نے جنید کو گھر چھوڑ دیا تھا۔ وہ واصفہ کی مرضی کے بنا کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا لیکن جنید کو آئندہ وہ گھر بھی نہیں بلا سکتا تھا۔ کچھ بھی تھا واصفہ اس کی عزت تھی۔ اس گھر کا واحد مرد وہی تھا۔ اسی نے واصفہ کی حفاظت کرنا تھی...... لیکن کوئی حل اس کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا...... وہ گھر آ کر سیدھا اپنے کمرے میں جا رہا تھا تبھی انا بی نے کھانے کا پوچھا اس کی بھوک مر چکی تھی لیکن انہیں نہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کھلائے بنا نہ چھوڑتیں۔

''دوست کے ساتھ کھا لیا۔'' کہہ کر وہ اپنے روم میں آ گیا...... اور جوتوں سمیت بیڈ پر دراز ہو گیا...... اس کا ذہن منتشر ہو رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے کس طرح اسے روکے...... یک دم دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ آنے والی واصفہ تھی۔ وہ پوری آستینوں کی قمیص پہنے دوپٹا اچھی طرح ڈھکے دروازے کے بیچ کھڑی اپنی انگلیاں مروڑ

رہی تھی۔

جاذب کو اتنی ٹینشن میں بھی واصفہ کے طرز پر ہنسی آنے لگی۔

"اندر آجاؤ...... وہاں کیوں کھڑی ہو......؟"

واصفہ اندر آئی اور اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

"مجھے معاف کردو جاذب...... میں بہک گئی تھی۔" کہہ کر اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رودی۔...... جاذب نے کچھ دیر اسے رونے دیا پھر اس کے کندھے پر اپنا بھاری مضبوط ہاتھ رکھا تو اس کے آنسوؤں کو جیسے بریک لگ گیا۔ وہ چہرہ اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

"تمہیں یہی لگتا تھا ناں کہ ہم تم پر پابندیاں لگاتے ہیں......؟" جاذب اب اٹھ کھڑا ہوا۔

"ایک چھوٹی سی مثال ہے...... تم ایک دس روپے کا نوٹ لے کر نکلتی ہو...... وہ تم ہاتھ میں لے کر نکل جاؤ گر جائے یا لوگ دیکھیں تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا پر تم سونا لے کر نکلو گی تو اس کی تھوڑی حفاظت کا بھی سوچو گی۔ پانچ سو، ہزار، پانچ ہزار کے نوٹ چھپا کر رکھو گی اور سونا لے کر نکلو گی تو بالکل ہی اندرونی جیب میں رکھو گی اور اگر تمہارے پاس ہیرا ہو...... تو اسے اپنے ساتھی کو بھی بتانا پسند نہیں کرو گی...... بولو...... کچھ بات سمجھ آرہی ہے یا نہیں......؟"

واصفہ کو دراصل جنید کی محبت کی حقیقت پتا چل گئی تھی کہ وہ محض وقت گزاری کررہا تھا...... واصفہ کو ایک شام نے ہی سبق سکھا دیا تھا۔ انا بی نے بھی بعد میں شکر ادا کیا کہ وقت پر سب کچھ ہی سامنے آگیا اور واصفہ کو بھی عقل آگئی۔

واصفہ سر جھکائے بس اسے سنے جارہی تھی......

اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔

"میرے نزدیک تم سونے، ہیرے سے بھی زیادہ قیمتی ہو واصفہ......" اب وہ اس کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھا تھا۔

"بہت قیمتی ہو، بہت زیادہ قیمتی...... اب اپنے یہ

16 دسمبر پشاور کے بچوں کے نام

اپنے ماں باپ کے معصوم سے پیارے بچے
اے وطن! تجھ پر فدا ہوگئے سارے بچے
مائیں روتے ہوئے آپس میں یہ کہتی ہوں گی
ابھی اسکول سے آئیں گے ہمارے بچے
وہ مسلمان کیا، انسان نہیں ہو سکتے
جن درندوں نے بلکتے ہوئے مارے بچے
ارضِ پاک کی اے میری بہادر ماؤں
قوم کا فخر ہیں، دراصل تمہارے بچے
لاشے ہاتھوں پہ اٹھا کر بھی کہتے ہوں گے
یہ ہمارے تھے بڑھاپے کے سہارے بچے
پیکرِ صبر وفا ہیں کہ جنہوں نے چپ چاپ
قبر میں اپنے ہی ہاتھوں سے اتارے بچے
کوئی بھی عہد انہیں بھول نہ پائے گا ظہور
مشعلِ راہ ہیں وہ سب چاند ستارے بچے

شاعر: ظہور چوہان۔ انتخاب: زارا میرانی، لیہ

آنسو صاف کرلو...... اب مجھے یہ دوبارہ نظر نہ آئیں۔ شکر ہے خدا کا کہ تم بھٹکنے سے پہلے لوٹ آئی ہو۔"

"تم نے مجھے معاف کردیا ناں جاذب......؟"

وہ نم پلکوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کوئی اپنے پیار سے بھی بھلا ناراض رہ سکتا ہے...... ایسی بات نہیں کہ میں تم سے پیار نہیں کرتا لیکن میں وقت پر اس کے اظہار کا قائل ہوں...... تم نادان ہو، ابھی ناسمجھ ہو، بچے پیار اور بے باکی کے فرق کو نہ سمجھ پائیں۔" وہ نرم لہجے میں اسے سمجھا رہا تھا۔

"نہ جانے کتنی لڑکیاں جنید جیسے بے باک لڑکوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہیں جو پیار کے بہانے ان کی عزت تار، تار کرنے میں دیر نہیں لگاتے اور معصوم دل لڑکیاں اسی سراب کے پیچھے بھاگنے لگتی ہیں۔" جاذب نے سوچتے ہوئے اک ٹھنڈی آہ بھری اور انا بی کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

قسط 6

آخری امید

قیصرہ حیات

مکاں فانی ، مکیں آنی ، ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تُو جاوداں تُو ہے

ایک ایسی لڑکی کی کہانی . . . جوحق کی جستجو میں اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے اور اس ابدی، لافانی حقیقت کو پالینے کے اس سفر میں اسے جن مسائل، جن شدائد کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہماری مصنفہ نے اپنے ماہرانہ قلم سے اسے بہت خوب صورت اور پُراثر انداز میں اُجاگر کیا ہے۔

اس کہانی کی اشاعت نوجوان نسل کی اسلام کے بارے میں معلومات مطالعے اور علم کو مزید وسعت دے گی۔

مایہ ناز مصنفہ کے منفرد انداز بیاں کا

ایک اور شاہکار





آمنہ اب گھر کے تھوڑے بہت کام کرنے لگی تھی۔ جمیلہ کے ساتھ کچن میں ان کا ہاتھ بٹاتی اور پھر اس کے بعد یا تو اسلامی کتابوں کا مطالعہ کرتی یا پھر نیٹ پر مصروف رہتی...... اس نے قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ جرمنی سے ہی پڑھنا شروع کر دیا تھا سو اسے یہاں بھی جاری رکھا۔ نیٹ پر وہ زینب اور دوسری خواتین کے ساتھ رابطے میں رہتی۔ سب خواتین اسے بہت مس کر رہی تھیں اور اس کی واپسی کا بار، بار پوچھتیں مگر آمنہ انہیں یہ بتا کر مایوس کر دیتی کہ... فی الحال اس کا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں...... اسے عبدالرحمٰن کی فیملی کے ساتھ رہنا بہت اچھا لگ رہا ہے۔ سب اس سے کرید، کرید کر پوچھتیں کہ اس کی سسرال کیسی ہے؟ لوگ کیسے ہیں؟ اس کے ساتھ محبت کرتے ہیں یا نہیں......؟ اور وہ سب کو بہت پُرامید جواب دیتی کہ وہ بہت خوش ہے اور سب لوگ اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ خاص طور پر... عبدالرحمٰن اور اس کی ماں...... وہ سب اس کی باتیں سن کر خوش ہوتیں...... مگر اب آمنہ نیٹ پر بھی باتیں کر کے تھکنے لگی تھی۔ عبدالرحمٰن اپنے اسکول میں بہت زیادہ مصروف ہو گیا تھا۔ آج کل وہ اسلامک آرٹ سے متعلقہ ایک زبردست سی نمائش پلان کر رہا تھا اور دن رات اسی میں مصروف تھا۔ آمنہ نے بھی اس کا اسکول جوائن کرنے کا سوچا تو عبدالرحمٰن سے بات کی۔

''ٹھیک ہے، تم کل میرے ساتھ چلنا...... پھر دیکھوں گا تم کیا کر سکتی ہو...... آئی مین...... ہم لوگ تو زیادہ تر Islamic calligraphy (اسلامی خطاطی) کے بارے میں پلان کر رہے ہیں۔'' عبدالرحمٰن نے بیڈ پر تھکے ہوئے انداز میں لیٹتے ہوئے کہا۔

''او کے...... میں تو زیادہ اسکیچز بناتی تھی مگر اب اسکیچنگ چھوڑ دی ہے اب تو کافی عرصہ ہو گیا ہے کوئی اسکیچ بنائے ہوئے۔'' آمنہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''آمنہ اسکیچنگ...... پورٹریٹس sculptures بنانا تمہارا شوق تھا، جنون تھا اور اب تم سب کچھ چھوڑ چکی ہو...... کبھی دل میں خواہش پیدا نہیں ہوتی کہ وہی کام کرو جو مسلم ہونے سے پہلے کرتی تھیں؟'' عبدالرحمٰن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر قدرے مجسس انداز میں پوچھا۔

''عبدالرحمٰن...... مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میری زندگی کا کوئی ایسا دن نہ گزرا ہو...... جب میں نے اسکیچنگ نہ کی ہو...... کوئی ڈرائنگ نہ بنائی ہو...... مجھے کچھ ڈرا کیے بغیر نیند نہیں آتی تھی اور اب میں اس کے بارے میں سوچتی تو ہوں مگر بہت کم...... صرف یہ سوچ کر کہ اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے تو میں اپنی خواہش کو دبا لیتی ہوں۔ عبدالرحمٰن...... میں کبھی اللہ سے اتنی محبت بھی کروں گی، اب مجھے کبھی، کبھی خود پر بھی حیرت ہوتی ہے کہ وہ کیتھی جو کرائسٹ سے بہت پیار کرتی تھی مگر اس نے کبھی اس کی محبت میں کچھ چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ کیتھی کی محبت superiecial تھی مگر آمنہ کی محبت کتنی اسٹرانگ ہے۔ آمنہ اللہ کی محبت میں اب سب کچھ کر سکتی ہے یہاں تک کہ تمہیں بھی چھوڑ سکتی ہے۔'' آمنہ نے انتہائی صاف گوئی سے کہا تو عبدالرحمٰن ایک دم چونک گیا۔

''مجھے بھی......؟'' وہ قدرے ہکلا کر بولا۔

''ہاں...... تمہیں بھی......'' اس نے مطمئن لہجے میں کہا۔

''کیا...... تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں......؟'' عبدالرحمٰن نے گھبرا کر پوچھا۔

''کرتی ہوں، بہت زیادہ...... اس دنیا میں تم مجھے سب سے زیادہ عزیز ہو اور میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں مگر عبدالرحمٰن، تم ایک انسان ہو...... اللہ کے بنائے ہوئے انسان...... تمہارا اور میرا رشتہ تب تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا۔ اگر وہ تمہیں مجھ سے ابھی چھین لے اور ہم دونوں ایک دوسرے سے ابھی جدا ہو جائیں تو ہم کیا کر سکیں گے...... اللہ نے پہلے مجھے انسانوں کی محبت اور ان سے جدائی کا گہرا تجربہ کرایا اور پھر اپنی محبت میرے دل میں اتنی

شدید ڈال دی کہ اب میرے لیے انسانوں کی محبت اس طرح اہمیت نہیں رکھتی جس طرح اللہ کی رکھتی ہے.........
عبدالرحمٰن میں نے زندگی میں جتنے کرائسسز دیکھے انہوں نے اللہ سے میرا رشتہ بہت مضبوط کر دیا ہے۔ اب مجھے صرف یہی محسوس ہوتا ہے کہ اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت صرف اور صرف اللہ ہے۔ باقی سب عارضی اور وقتی رشتے اور باتیں ہیں۔'' اس نے گہری سانس لے کر کہا تو عبدالرحمٰن پُر ستائش نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

'' آمنہ...... I really appreciate you اللہ نے تمہیں جس حقیقت سے آشنا کیا ہے۔ تم پر اللہ کی نظرِ کرم ہے۔ تم واقعی اللہ کی طرف سے بخشی گئی ہو۔'' عبدالرحمٰن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"yes I think so" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

'' آمنہ...... جس محبت کا تجربہ تم کر رہی ہو...... یہی پکے اور سچے مسلمان کی نشانی ہے اور مسلمانوں کی اسی محبت سے دنیا ڈرتی ہے اور مسلمانوں کو خواہ مخواہ شدت پسند کہتی ہے مگر حقیقت میں محبت کا یہ عرفان مومنین کے لیے اللہ کا تحفہ ہے جو کسی اور مذہب کے ماننے والوں کو کبھی نہیں مل سکتا۔'' عبدالرحمٰن نے مسکرا کر جواب دیا۔

'' کیوں......؟'' آمنہ نے چونک کر پوچھا۔

'' کیونکہ جس مذہب میں خدا فاصلے پر ہو...... اور اس کو پانے کے لیے انسان کو بہت سی رسومات اور اپنے جیسے مذہبی نمائندوں کا سہارا لینا پڑے تو اس خدا سے تعلق اتنا مضبوط نہیں ہوسکتا بہ نسبت اس خدا کے جو ہر لمحہ انسان کے ساتھ، ساتھ، اندر اور باہر ہو...... اور پھر انسان کو خود اس کی موجودگی کا انتہائی شدت سے احساس بھی ہو...... اور اس شدید احساس کی وجہ سے انسان اپنا سب کچھ اپنے اللہ کو سونپ دے۔ جس طرح تم نے سونپا ہے اور حقیقت میں یہی اسلام کی روح اور سچا اسلام ہے۔ مجھے فخر ہے کہ اللہ نے مجھے تم جیسی صاحبِ ایمان بیوی سے نوازا ہے۔'' عبدالرحمٰن نے فرطِ جذبات سے لبریز ہو کر اس کی پیشانی کو محبت سے چومتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دی۔ اسی لمحے ان کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تو آمنہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی اور بڑھ کر دروازہ کھولا۔ اس کے سامنے ہاجرہ قدرے غصے میں کھڑی تھی۔

'' آپ......!'' آمنہ نے حیرت سے کہا...... تو ہاجرہ نے اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور منہ بنا کر اندر داخل ہوگئی۔ عبدالرحمٰن نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔

'' بھیا...... مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' ہاجرہ نے قدرے خفگی سے آمنہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو عبدالرحمٰن اس کا اشارہ سمجھ گیا۔

'' آمنہ...... پلیز...... میرے لیے ایک کپ چائے لے آؤ۔'' عبدالرحمٰن نے کہا تو وہ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

'' جی...... بھائی...... خیریت تو ہے...... آپ بیٹھیں تو سہی......'' عبدالرحمٰن نے کہا۔

'' خیریت ہوتی تو میں اس وقت تمہارے پاس نہیں آتی۔'' ہاجرہ نے اس کے بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

'' کیوں، کیا ہوا......؟'' عبدالرحمٰن نے حیرت سے پوچھا۔

'' میں پوچھنے آئی ہوں...... یہ ہمارے سروں پر اسلام کا ڈنڈا کب تک برستا رہے گا؟'' ہاجرہ غصے سے بولی۔

'' کیا مطلب...... میں سمجھا نہیں......؟'' عبدالرحمٰن نے حیرت سے پوچھا۔

''تم یہ جو اپنی بیوی کی صورت میں ملانی لے آئے ہو...... جو ہر وقت ہمیں فتوے سناتی رہتی ہے اور ہمیں مسلمان کم اور کافر زیادہ سمجھتی ہے۔ کام بعد میں کرو...... اسلام کا کوڑا پہلے برسنے کو تیار ہوتا ہے۔ بھیا ہم نے کیا گناہ کر دیے ہیں کہ ہماری جان بخشی ہی نہیں ہو رہی۔ اس نے تو ہماری زندگیاں مصیبت میں ڈال دی ہیں۔ بچے الگ پریشان ہیں، شوہر، بیویوں سے لڑنے لگے ہیں۔ یہ کون سی فتنہ ہمارے گھر آ گئی ہے۔ بھیا ہماری تو جان چھڑاؤ اس مصیبت سے۔'' ہاجرہ انتہائی غصے میں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی تو عبدالرحمٰن حیرت سے بھاوج کی طرف دیکھنے لگا۔

''بھابی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ وہ تو اس گھر میں رحمت بن کر آئی ہے۔ وہ کتنی نیک اور مومن عورت ہے اور آپ اسے فتنہ کہہ رہی ہیں، کچھ تو خدا کا خوف کریں۔'' عبدالرحمٰن نے خفگی سے جواب دیا۔

''بھیا! وہ رحمت ہوگی تمہارے لیے، ہمارے لیے تو زحمت ہی زحمت ہے۔ ہمیں نہیں چاہیے ایسی رحمت، ہم جیسے پہلے رہ رہے تھے، ٹھیک رہ رہے تھے، بتاؤ بھلا، ہم کوئی کافر تھے جو یہ ہمیں مسلمان بنانے آ گئی ہے۔ اپنے اسلام کو تو سنبھال لے۔ خدا معلوم مسلمان ہے بھی یا نہیں...... ہمیں تو سارا ڈھونگ لگا ہے۔'' ہاجرہ غصے سے بولی تو عبدالرحمٰن کو بھی شدید غصہ آ گیا۔

''بھابی! بس اب میں آمنہ کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سنوں گا اور جس طرح کی آپ مسلمان ہیں سب جانتے ہیں، صرف کلمہ پڑھ کر اپنے آپ پر مسلمانیت کی مہر لگا لینی کافی نہیں ہوتی۔ اپنے ایمان کو ثابت بھی کرنا پڑتا ہے اور آمنہ کتنی سچی اور پکی مسلمان ہے۔ اسے آپ سے کوئی سرٹیفکیٹ لینے کی ضرورت نہیں۔ اس پر خدا کی بہت رحمت اور نظر کرم ہے۔ اسے میری اور ہمارے اس گھر کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے ملک میں یہاں سے اچھی زندگی گزار سکتی ہے۔'' عبدالرحمٰن نے خفگی سے کہا۔

''ہاں تو لے جاؤ اسے واپس...... ہم سے اس کا اسلام ہضم نہیں ہوتا۔ بڑی آئی مسلمان ہونہہ......'' ہاجرہ منہ بگاڑ کر بولی جبھی آمنہ ٹرے میں چائے کے دو مگ لیے اندر آنے لگی۔ اس نے ہاجرہ کی ساری بات سن لی تھی۔ اسے دیکھ کر ہاجرہ غصے سے منہ بناتی کمرے سے باہر چلی گئی۔ آمنہ نے افسوس بھرے انداز میں عبدالرحمٰن کی طرف دیکھا۔ وہ شرمندگی سے نظریں چرانے لگا۔ وہ ٹرے ٹیبل پر رکھ کر اس کے قریب آئی۔

''پلیز آپ ٹینشن مت لیں۔ میں نے خود بھی کئی بار آبزرو کیا ہے کہ گھر کے لوگ مجھ سے کتنے بیزار ہیں۔ ان کو میرا یہاں رہنا بہت ناگوار گزر رہا ہے۔'' آمنہ نے آہ بھر کر کہا۔

''آئی ایم سوری...... یہ لوگ سمجھ نہیں رہے کہ تم ان سب کے لیے کتنی بڑی رحمت ہو۔'' عبدالرحمٰن نے بیچارگی سے کہا۔

''عبدالرحمٰن......! ایسی سچویشن میں ہمارے پیغمبر ﷺ ہمارے لیے سب سے بڑی inspiration ہیں۔ انہوں نے لوگوں کو مسلمان بنانے کے لیے کیا کیا تکلیفیں نہیں اٹھائی تھیں مگر ایک وقت آیا کہ پھر سب کو ماننا ہی پڑا۔ آپ بھی پریشان مت ہوں۔ میں ان کی باتوں سے بالکل نہیں گھبراتی۔'' اس نے عبدالرحمٰن کا ہاتھ پکڑ کر مسکراتے ہوئے کہا تو عبدالرحمٰن نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''تھینک یو ویری مچ آمنہ...... تم کتنی گو آپر یٹو ہو۔'' عبدالرحمٰن نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

☆☆☆

عاصمہ اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹی تھی اور قدرے مضطرب ہو کر کروٹیں بدل رہی تھی۔ کالج جاتے ہوئے

شرٹ پھٹنے کا واقعہ اس کے ذہن میں ایسا بیٹھ گیا تھا کہ دو دن گزر گئے تھے مگر وہ ابھی تک اس خوف سے باہر نہیں نکل رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ شبینہ کی بات کہ ”اللہ کے ہر حکم میں انسان کے لیے فائدہ ہے۔“

اس کے ذہن میں بار بار یہ بات گونج رہی تھی۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتی کہ اس کے پاس چادر تھی اگر نہ ہوتی تو وہ کیا کرتی؟ اس نے گھر آکر کسی کو یہ بات نہیں بتائی تھی اور نہ ہی شبینہ نے کسی سے ذکر کیا تھا مگر اس کے اندر اس واقعے نے عجیب سی ہلچل مچادی تھی۔ وہ اپنے اندر کی کیفیت کسی دوسرے سے بیان کرنا چاہتی تھی۔ شبینہ کے ایگزامز چل رہے تھے۔ وہ ایک دو بار اس کے پاس گئی مگر اسے مصروف دیکھ کر لوٹ آئی۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بیڈ سے اٹھی اور آمنہ کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ آمنہ کمرے میں اکیلی بیٹھی ایک آیتِ قرآنی کے بیک گراؤنڈ کی اسکیچنگ کر رہی تھی۔ عاصمہ نے دستک دی تو آمنہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”اوہ...... عاصمہ آؤ آجاؤ......“ آمنہ نے مسکرا کر کہا تو عاصمہ اندر داخل ہوگئی اور قدرے جھجکتے ہوئے اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”آپ کیا بنا رہی ہیں؟“ عاصمہ نے اس کے اسکیچ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”عبدالرحمٰن کی آرٹ ایگزی بیشن کے لیے کچھ ڈرا کر رہی ہوں۔“ آمنہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”چاچی، آپ سے ایک بات پوچھوں؟“ عاصمہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”ہاں، پوچھو کیا بات ہے؟“ آمنہ نے قدرے حیرت سے کہا۔

”چاچی! آپ مسلمان کیوں ہوئیں؟“ عاصمہ نے اچانک سوال کیا تو آمنہ نے ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیوں، تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“ آمنہ نے حیرت سے پوچھا۔

”آپ اتنی پکی مسلمان کیسے بن گئیں؟ یہ سوال اکثر میرے ذہن میں آتا ہے۔“ عاصمہ نے صاف گوئی سے پوچھا تو آمنہ نے گہری سانس لی اور مسکرا کر اسے دیکھنے لگی۔

”اللہ کی مہربانی ہے۔“ آمنہ نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔“ عاصمہ نے چونک کر کہا۔

”اللہ تعالیٰ جب انسان کو ہدایت دینا چاہتا ہے تو اس کے دل میں اپنی، اپنے نبی ﷺ کی اور اپنے دین کی محبت ڈال دیتا ہے۔ جب انسان کا دل ان سب محبتوں پر سچے دل سے ایمان لے آتا ہے تو وہ پکا مسلمان بن جاتا ہے۔“ آمنہ نے مسکرا کر جواب دیا تو عاصمہ کی آنکھیں یک دم نم ہونے لگیں۔

”چاچی! ہم آپ کی طرح اچھے اور پکے مسلمان کیوں نہیں ہیں؟“ عاصمہ نے ندامت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”عاصمہ میں نے سارے مذاہب کا مطالعہ کیا اور ان سب میں مجھے اسلام سب سے ٹھیک مذہب لگا۔ جب اس کو سوچ سمجھ کر اسٹڈی کیا تو اس کی ہر بات اور ہر حکم میں مجھے کوئی نہ کوئی لاجک دکھائی دینے لگی۔ میں نے ہر اینگل سے اسے پرکھا، خدا کے تصور کا اچھی طرح تجزیہ کیا۔ جب اتنی سچائیوں کو پایا تو پھر اللہ سے دعا کی کہ اب وہ مجھے اپنے اور اپنے پیارے نبی ﷺ کے راستے پر لے آئے۔ عاصمہ، جب آپ اللہ کے راستے پر چلنے کا اپنے آپ سے وعدہ کرتے ہیں تو وہ خود بخود راستے کھولنا شروع کر دیتا ہے اور ان راستوں کو آسان بھی کر دیتا ہے۔ پھر کچھ بھی مشکل نہیں لگتا۔“ آمنہ نے مسکرا کر بتایا۔

”کیا آپ کو کچھ بھی مشکل نہیں لگا؟“ عاصمہ نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں شروع شروع میں جب صبح صبح گرم گرم بستر سے نماز کے لیے اٹھنا پڑتا تھا تو پرابلم ہوتی تھی لیکن جب یہ بات ذہن میں آتی کہ یہ اس کا حکم ہے، جس کو پانے کے لیے میں نے کتنی جدوجہد کی ہے اب میں اس کو جان کر بھی اس کا حکم نہیں مانوں گی تو کتنی گناہ گار ہوں گی۔ میں فوراً بستر سے اٹھتی اور نماز پڑھتی تو مجھے یوں محسوس ہونے لگتا کہ اللہ میرے بہت قریب آ گیا ہے۔ بہت قریب اور بہت محبت سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ قرب اور محبت کا ایسا احساس مجھے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس محبت اور قرب میں آہستہ آہستہ مجھے بہت لطف محسوس ہونے لگا اور میں باقی نمازوں کا شدت سے انتظار کرتی۔ اب میں نماز میں اتنا لطف محسوس کرتی ہوں کہ کیا بتاؤں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اس گھر کے لوگ کس طرح اپنی نمازیں مس کر کے اتنی بڑی نعمت سے محروم ہیں مگر شاید انہیں اس قرب کا احساس ہے اور نہ ہی محبت کا۔'' آمنہ نے آہ بھر کر افسردہ لہجے میں کہا۔

''چاچی! آپ واقعی بہت اچھی اور سچی مسلمان ہیں۔ ہم سب بہت گناہ گار ہیں جو آپ کو نہیں سمجھے......'' عاصمہ نے سسکی بھر کر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''ارے......ارے......یہ کیا!'' اس نے محبت سے عاصمہ کو اپنے ساتھ لگایا اور اس کا ماتھا چومنے لگی۔ محبت کا یہ والہانہ انداز اسے متاثر کرنے لگا، اس کی اپنی ماں نے کبھی اسے اپنے ساتھ یوں لگا کر محبت سے پیار نہیں کیا تھا۔ بات نہیں کی تھی۔ آمنہ اسے بہت لاڈ سے اپنائیت سے چپ کرانے لگی۔

''تم رو کیوں رہی ہو؟'' آمنہ نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''شرمندگی سے۔'' عاصمہ نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔

''کیا مطلب......؟'' آمنہ نے حیرت سے پوچھا۔

''یہی کہ ہم کیسے مسلمان ہیں جنہوں نے کبھی ان باتوں پر ایسے نہیں سوچا جس طرح آپ سوچتی ہیں۔ ہمارے دلوں میں اللہ، اس کے رسول ﷺ اور دین کے لیے ویسی محبت کیوں نہیں جیسی آپ کے دل میں ہے۔ ہم کتنے کمزور انسان ہیں، مجھے بہت افسوس اور دکھ ہو رہا ہے۔'' عاصمہ نے آہ بھر کر کہا۔

''اس میں دکھ کی کوئی بات نہیں۔ تمہارے اندر شرمندگی کا احساس پیدا ہوا ہے۔ یہ اچھی بات ہے لیکن تم اپنی اس شرمندگی کو مٹا سکتی ہو۔ اگر تم آج سے ہی اس سچے راستے پر عمل کرنے کا ارادہ کر لو......'' آمنہ نے مسکرا کر کہا تو اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''عاصمہ......اسلام کا سب سے پازیٹو پوائنٹ جانتی ہو کیا ہے؟ جب انسان کے دل میں شرمندگی کا، ندامت کا، کوئی احساس پیدا ہوتا ہے اور وہ اللہ سے معافی مانگ کر اس کے راستے پر چلنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے معافی کے لیے کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اسی وقت ڈائریکٹ اللہ کے سامنے جاتا ہے اور اسے فوراً معافی مل جاتی ہے۔ پھر اسے کوئی شرمندہ نہیں کرتا اس کا گناہ، اس کی معافی، اس کی شرمندگی، اس کی توبہ سب اس کے اور اس کے اللہ کے درمیان ایک راز بن کر رہ جاتے ہیں۔ تم بھی پازیٹو ہو کر سوچو......'' آمنہ نے گہری سانس لے کر مسکراتے ہوئے کہا تو عاصمہ نے پُرامید انداز میں اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر اپنی آنکھوں کو رگڑنے لگی۔

''تھینک یو چاچی......! اب میں چلتی ہوں، رات بہت ہو رہی ہے۔ کیا چاچو ابھی تک نہیں آئے؟'' عاصمہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''وہ ایگزی بیشن کے سلسلے میں بہت مصروف ہیں۔ لیٹ آئیں گے۔ آمنہ نے مسکرا کر بتایا۔

''ٹھیک ہے، اب میں چلتی ہوں، اللہ حافظ......'' عاصمہ دھیمے سے مسکرا کر چلی گئی اور آمنہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ عاصمہ دبے قدموں چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی اور رات بھر آمنہ چاچی کی باتوں پر سوچتی

رہی اور بار بار دیوار پر لگے کلاک کی طرف دیکھتی رہی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بالآخر فجر کی اذانیں سنائی دینے لگیں تو وہ جلدی سے گرم بستر سے اٹھی۔ باہر خاصی سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو یخ ہوا کا جھونکا اندر آیا۔ اس نے جھرجھری لی۔ آمنہ کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔

''مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اللہ میرے قریب، بہت قریب آ رہا ہے اور بہت محبت سے مجھے دیکھ رہا ہے۔''

عاصمہ نے گہری سانس لے کر ارد گرد اندھیرے میں دیکھا اور باہر صحن میں چلی گئی۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ اس کی نورانیت دیکھ کر اس کے اندر عجیب سا پُرلطف احساس پیدا ہونے لگا۔ اس کے اندر توانائی سی بھر گئی۔ اس نے نل کھولا تو ٹھنڈے یخ پانی سے اس کے اندر کپکپی سی پیدا ہوئی مگر اس نے نظر انداز کر کے وضو کیا۔ وہ وضو کر کے مڑی تو اس کے پیچھے شبینہ کھڑی مسکرا کر اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''شبینہ...... تم......؟'' عاصمہ نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں، نماز کے لیے وضو کرنے آئی ہوں۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''لو...... کرلو......'' عاصمہ نے کہا اور جلدی سے وہاں سے چلی گئی۔ شبینہ مسکرا کر اسے دیکھ کر وضو کرنے لگی۔

''آئے...... ہائے...... یہ کس کمبخت نے پانی کا نل کھول رکھا ہے۔ سارا پانی ضائع ہو گیا ہوگا۔'' شبنم اپنے کمرے سے پانی کے گرنے کی آواز سن کر بڑبڑاتی ہوئی باہر آئی تو شبینہ کو دیکھ کر چونکی۔

''تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟'' شبنم نے حیرت سے پوچھا۔

''وضو کرنے آئی ہوں، نماز کا وقت ہو رہا ہے۔'' شبینہ نے جواب دیا۔

''لواب تمہیں بھی نمازی بننے کا خبط ہونے لگا ہے۔'' وہ خفگی سے بڑبڑائی۔

''عاصمہ نماز پڑھ رہی ہے۔ میں پڑھنے جارہی ہوں۔ آپ بھی وضو کر کے نماز پڑھ لیں تو اچھا ہے۔'' شبینہ نے تولیے سے اپنا چہرہ پونچھتے ہوئے کہا تو شبنم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''لو...... جی...... اب سارے گھر میں اسلام پھیلنے لگا ہے۔ واہ جی کیا کہنے......'' شبنم نے منہ بنا کر کہا۔

''چاچی! چراغ سے ہی چراغ جلتا ہے۔'' شبینہ نے مسکرا کر کہا۔

''سب جانتی ہوں۔ کیا ہو رہا ہے اس گھر میں اور کیا ہونے والا ہے۔'' شبنم نے خفگی سے کہا۔

''چاچی صبح صبح اچھا...... اچھا...... سوچیں...... آپ بھی نماز پڑھ کر اللہ سے توبہ کرلیں اور سارے وہم دل و دماغ سے نکال دیں۔'' شبینہ کہہ کر چلی گئی اور وہ منہ بسورتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔ واش بیسن کے قریب آئی تو پانی کھول کر چیک کیا۔

''اُف اتنا ٹھنڈا پانی...... نہ بابا مجھے تو ٹھنڈے پانی سے ویسے بھی زکام ہو جاتا ہے جو پھر ٹھیک ہی نہیں ہوتا۔ جاؤ تم پڑھتی پھرو نمازیں اور بخشواؤ اپنے اپنے گناہ......'' وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی اور جا کر گہری نیند سو گئی۔

عاصمہ نے آمنہ چاچی کی باتوں کو سوچتے ہوئے نماز ادا کی تو اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کی نماز میں خود بخود خشوع و خضوع پیدا ہو گیا ہو۔ اس کے اندر بھی قرب اور محبت کا وہی احساس پیدا ہونے لگا جو چاچی نے اسے بتایا تھا۔ اسے بھی نماز پڑھنے میں لطف محسوس ہونے لگا اور محبت کے اس احساس سے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ اس قدر شدت سے رونے لگی کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ وہ آنکھیں بند کر کے چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ کر رو رہی تھی اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ رفتہ رفتہ اللہ کے بہت قریب ہو رہی ہے۔ وہ کتنی دیر جائے نماز پر یونہی بیٹھی رہی اور اسے بے انتہا سکون ملنے لگا۔ اس کے اندر جو کئی روز سے بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ شاید آنسوؤں کی صورت میں دل کا غبار قدرے کم ہو چکا تھا۔

صبح وہ کالج جانے کے لیے تیار ہونے لگی تو بہت اہتمام سے اس نے چادر کو اچھی طرح سر پر اور جسم پر لپیٹا۔ آج چادر لیتے ہوئے اسے عجیب سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ خوشی جسم اور سر کو ڈھانپنے سے نہیں بلکہ اس بات سے ہو رہی تھی کہ وہ اپنے رب کا ایک حکم دل سے ماننے جا رہی تھی اور اطاعت کے اس احساس نے اس کے دل کو خوشی اور سکون سے بھر دیا۔ اب اسے محسوس ہونے لگا کہ آمنہ چاچی سچی اور پکی مسلمان کیوں ہیں! یقیناً وہ بھی ایسا ہی احساس اپنے اندر محسوس کرتی ہوں گی اور فرمانبرداری کا یہ احساس اتنا پُرکیف اور خوش کُن ہوتا ہے کہ انسان کو خود بخود اللہ کی فرمانبرداری کے راستے پر ڈال دیتا ہے۔

وہ چادر لے کر باہر نکلی تو ماں نے صحن کے ایک کونے میں واشنگ مشین لگا رکھی تھی اور وہ کپڑے دھونے میں مصروف تھی۔ اس نے عاصمہ کی طرف بغور دیکھا اور ایک گہری سانس لی۔

''شبینہ جلدی باہر آؤ، کالج سے دیر ہو رہی ہے۔'' عاصمہ نے قدرے بلند آواز میں شبینہ کو پکارا۔

''آ رہی ہوں۔'' شبینہ نے اپنے کمرے سے آواز دی۔

آمنہ کچن سے باہر نکلی تو عاصمہ کو یوں چادر لپیٹے دیکھ کر مسکرائی۔

''کتنی اچھی لگ رہی ہو۔'' آمنہ نے مسکرا کر اس کے قریب آتے ہوئے کہا تو اسی لمحے شبینہ بھی سر پر حجاب اچھی طرح لپیٹے باہر نکلی۔

''واؤ گڈ......'' آمنہ نے انتہائی خوش ہو کر کہا اور دونوں کی پیشانیوں کو محبت سے چوما۔ شبنم دور کھڑی منہ

بنانے لگی۔
''کتنی......اب ہمارے بچوں کو بھی ہم سے دور کرنے کی کوشش کررہی ہے۔اب تو اس کا کچھ کرنا ہی پڑے گا۔''شبنم نے خفگی سے دل میں سوچا اور پھر کپڑے دھونے میں مصروف ہوگئی۔

☆☆☆

عبدالرحمٰن کی کیلی گرافی ایگزی بیشن بہت کامیاب رہی تھی۔آمنہ مکمل حجاب میں آرٹ اسکول جاتی تھی اور اسٹوڈنٹس کے ساتھ مل کر اس نے بہت محنت کی۔وہ اسٹوڈنٹس کے ساتھ آیات کا بیک گراونڈ ڈسکس کرتی، خاص طور پر عبداللہ کے ساتھ جو عبدالرحمٰن کا رائٹ ہینڈ تھا اور جس نے آرٹ اسکول کو اسٹیبلش کرنے میں بہت مدد کی تھی۔عبداللہ بہت زیادہ ٹیلنٹڈ تھا اور آمنہ بھی کسی سے کم نہیں تھی۔وہ آئندہ کا سوچنے میں زیادہ دیر نہ لگاتی اور جلدی سے اسکیچنگ کرکے انہیں دکھاتی۔سب بہت حیران ہوتے اور اس کی بہت زیادہ تعریفیں کرتے۔عبداللہ،عبدالرحمٰن کی قسمت پر رشک کرتا کہ خدا نے انتہائی قابل قدر اور انمول نگینہ آمنہ کی صورت میں اسے عطا کیا تھا اور عبدالرحمٰن، آمنہ کی اتنی تعریفیں سن کر خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔نیک عورت دنیا میں مرد کے لیے کتنا بڑا تحفہ ہوتی ہے۔اسے اب اندازہ ہورہا تھا۔اس کی بھابیاں جس ٹائپ کی عورتیں تھیں ان میں آمنہ کا وجود واقعی قدرت کا انعام تھا۔

عبدالرحمٰن اور اس کی ساری ٹیم نے دو ماہ کی انتہائی محنت کے بعد آرٹ ایگزی بیشن کا اہتمام کیا تھا جس کا سارے شہر میں خوب چرچا ہوا۔میڈیا تک بھی یہ خبر پہنچی تو نیوز چینلو کے نمائندے ان کے انٹرویو کے لیے آئے۔عبدالرحمٰن نے خوشی خوشی آمنہ کو بھی بولنے کی اجازت دی۔اس نے نقاب میں ہی انٹرویو دیا۔نیوز چینلو نے سب لوگوں سے زیادہ آمنہ کو کوریج دی اور خاص طور پر جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ وہ ایک نومسلم خاتون ہے اور اسلام قبول کرکے پاکستان آئی ہے تو تصویر کا رخ ہی بدل گیا۔وہ آرٹ ایگزی بیشن کے علاوہ اس کی پرسنل لائف کو زیادہ ڈسکس کرنے لگے۔نیوز میں بار بار اس کا انٹرویو دکھایا جانے لگا۔سارے محلے میں خوب شہرت ہونے لگی۔ہر طرف جمیلہ کی بہو کے چرچے ہونے لگے۔کئی ایک عورتیں تو گھر آئیں اور جمیلہ کو مرچ مسالے کے ساتھ مبارک باد دینے لگیں۔جمیلہ کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ان باتوں پر خوش ہو یا رنجیدہ......ہاجرہ اور شبنم کو باتیں بنانے کا موقع مل گیا۔

''امے اماں ویسے تو تیری بہو بڑی باپردہ بنی پھرتی ہے اب دیکھو کیسے ٹی وی پر گھر گھر میں اس کی شہرت ہورہی ہے۔بھلا آج تک ہمارے گھر کی بہو، بیٹیاں یوں اسکرینوں پر آئی ہیں؟ جتنے لوگوں نے اسے دیکھا ہوگا سب یہی کہہ رہے ہوں گے یہ جمیلہ اور شریف الدین کی بہو ہے۔اوپر سے نئی بات کہ بی بی رانی نے نیا نیا اسلام کا کلمہ پڑھا ہے۔بھیا خوب نام اور عزت کمارہی ہے تمہاری بہو۔پورا محلہ چسکے لے رہا ہے۔اس کا مکھڑا دیکھنے کو بے تاب ہورہے ہیں لوگ بیچارے۔''ہاجرہ نے خوب مسالا لگا کر ساس پر طنز کرتے ہوئے کہا جو کچن میں بیٹھی ساگ بنارہی تھیں۔شبنم بہانے سے برتن دھونے آئی تھی کہ ہاجرہ بھی پیچھے آگئی اور جمیلہ کے کان بھرنے لگی۔جمیلہ بھی لوگوں کے منہ سے بھانت بھانت کی باتیں سن کر پہلے ہی بھری بیٹھی تھیں۔

''ہاں مجھے خود بھی یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔عبدالرحمٰن آتا ہے تو اس سے بات کرتی ہوں۔'' جمیلہ نے ناگواری سے کہا تو دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگیں۔ان کا تیر عین نشانے پر لگا تھا۔شبنم بھی برتن وہیں چھوڑ کر ان کے پاس آگئی۔

''ہاں اماں بڑی سبکی ہورہی ہے۔پہلے ہر کسی کو کیا خبر تھی کہ عبدالرحمٰن کسی کافرہ کو مسلمان بنا کر لایا ہے پر اب تو

ہر طرف یہی باتیں ہو رہی ہیں کہ بھیا ان کو خاندان میں سے کسی نے لڑکی نہ دی۔ اماں جو بھی ہے تم بھوا پنے خاندان سے لاتیں تو آج یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔'' شبنم نے منہ بنا کر کہا تو اسی لمحے آمنہ جوٹرے میں برتن لیے کچن کی طرف آ رہی تھی، ان کی باتیں سن کر ٹھٹکی اور اس کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی۔

''اماں، اب بھی سوچ لو کچھ نہیں بگڑا۔ بھلا گوری چمڑی میں کہاں... وفا ہوتی ہے۔ یہ آج ایک مرد کے ساتھ تو کل دوسرے کے ساتھ...... یہ تو ہمارے ہاں کی عورتیں ہوتی ہیں جو مر کر ہی شوہر کی دہلیز چھوڑتی ہیں۔'' ہاجرہ نے منہ بنا کر کہا تو آمنہ نے افسوس بھری نگاہوں سے کچن کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے۔ عاصمہ کسی کام سے اپنے کمرے سے باہر نکلی تو آمنہ کو کھڑے دیکھ کر اس کے قریب آئی۔ وہ چاچی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر چونکی۔

''چاچی آپ رو رہی ہیں؟'' عاصمہ نے حیرت سے پوچھا تو اسی لمحے شبنم کی تیز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''اماں میں تو کہتی ہوں اب بھی وقت ہے، سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لو۔ یہ موقع اچھا ہے، اسی کو بنیاد بنا کر عبدالرحمٰن سے کہو کہ آمنہ کو فارغ کرے۔ یہ جائے اپنے ملک اور تم عبدالرحمٰن کے لیے خاندان سے لڑکی لے آؤ۔ کیوں اس کا مستقبل خراب کرنے پر تلی ہوئی ہو۔'' شبنم نے رائے دی تو جمیلہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ آمنہ نے سسکی بھری اور اپنے کمرے کی طرف واپس جانے لگی۔ عاصمہ کو ماں کی باتیں سن کر انتہائی غصہ آیا تھا۔

''چاچی آپ کو ڈٹ کر ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ رونے سے کام نہیں چلے گا۔ چلیں میرے ساتھ۔'' عاصمہ نے ٹرے اس کے ہاتھ سے پکڑی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اسے اپنے ساتھ کچن میں لے گئی۔ تینوں ایک دم بوکھلا گئیں۔

''امی یہ آپ چاچی کے بارے میں کیا فضول باتیں کر رہی ہیں۔ تائی اماں آپ بڑی ہو کر انہیں سمجھانے کے بجائے ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی ہیں اور دادی آپ بھی ان کی باتیں سن رہی ہیں۔'' عاصمہ نے غصے سے کہا۔

''عاصمہ بکواس بند کرو۔ تمہیں بڑوں کی باتوں میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔'' شبنم نے غصے سے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

''بڑے باتیں بھی تو ڈھنگ کی کریں ناں...... کیا قصور ہے چاچی کا جو آپ سب ان کے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ ان کا جینا حرام کر رہی ہیں۔ کیا قیامت آ گئی ہے جو وہ ٹی وی پر آ گئیں اور وہ بھی نقاب میں باپردہ ہو کر...... تائی اماں کیا آپ کو فریحہ آپا دکھائی نہیں دیتیں جو ننگے سر اور آدھے کپڑوں کے ساتھ کالج میں لڑکوں کے ساتھ پڑھنے جاتی ہیں۔ تب آپ کو کیوں برا نہیں لگتا۔'' عاصمہ نے غصے سے کہا تو ہاجرہ بری طرح تلملانے لگی۔

''ارے تو بالشت بھر کی لڑکی مجھ سے منہ ماری کرنے لگی ہے۔ ارے مجھ، اپنی تائی کو ذلیل کر رہی ہے؟ ارے لوگو دیکھو یہ دن بھی مجھے دیکھنا تھا۔ ہماری اولادیں ہم پر ہی ڈنڈے برسانے لگی ہیں۔ دہائی ہے دہائی......'' ہاجرہ نے چیختے ہوئے دونوں ہاتھ بلند کر کے اپنا سر پیٹنا شروع کر دیا۔ شبینہ اور فریحہ بھی بھاگتی ہوئی کمرے سے آ گئیں...... فریحہ نے اس وقت سلیولیس شرٹ پہن رکھی تھی۔

''سن مردود، تیری وجہ سے مجھے طعنے سننے کو مل رہے ہیں۔ بوڑھی ماں کو بے عزت کروا رہی ہے۔'' ہاجرہ نے جان بوجھ کر فریحہ کو پیٹنا شروع کر دیا اور اس کے ننگے بازوؤں کو اپنے ناخنوں سے کھرچ کر زخمی کر دیا۔ وہ بلند آواز سے رونے چلانے لگی۔ آمنہ اور عاصمہ یہ منظر دیکھ کر پریشان ہو گئیں...... سب فریحہ کو چھڑانے لگیں۔

''امی یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟'' شبینہ نے غصے سے ماں کو پرے دھکیل کر فریحہ کے بازوؤں کو چھڑایا۔ فریحہ

روتی پیٹتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''کمبخت نامراد تیری وجہ سے فریحہ بیچاری کو مار پڑی ہے۔'' شبنم نے دانت کچکچا کر عاصمہ کو زور سے تھپڑ لگایا تو وہ ہکا بکا ماں کو دیکھنے لگی۔

''اے شبنم اس بیچاری کو کیوں کوس رہی ہے۔ اس تماش بین کو بول جو سارے فساد کی جڑ ہے۔ ارے آج تک ہمارے گھر سے کسی نے اونچی آواز نہیں سنی اور آج اس کی وجہ سے سارا محلہ لنگ' لنگ کر ہمارا تماشا دیکھ رہا ہے۔'' ہاجرہ، آمنہ کو گھورتی ہوئی جان بوجھ کر صحن میں جا کر دہائی دینے لگی اور لوگ اس کے رونے چلانے کی آوازیں سن کر اپنی دیواروں سے انہیں دیکھنے لگے۔ آمنہ سسکیاں بھرنے لگی۔

''آمنہ چاچی، چلیں آپ اپنے کمرے میں۔'' عاصمہ اس کا بازو پکڑ کر اسے اس کے کمرے میں لے گئی۔

''ہاجرہ اب بس بھی کر دے۔ کیوں سارے زمانے کو اپنا تماشا دکھا رہی ہے۔'' جمیلہ نے اس کے قریب آ کر غصے سے اس کا بازو پکڑ کر اس کے کمرے کی طرف رخ کیا۔

''ہاں...... ہاں سب مجھے ہی کوسنا...... اس کٹنی کو کچھ نہ کہنا جس نے یہ ساری آگ لگائی ہے۔'' وہ بلند آواز سے چلا رہی تھی کہ عبدالرحمٰن، عبدالوہاب اور عبدالرب گھر میں داخل ہوئے۔ گھر کا منظر دیکھ کر تینوں پریشان ہو گئے۔ ہاجرہ ابھی تک بلند آواز سے لعن طعن کر رہی تھی۔ شبنم اسے چپ کرا رہی تھی۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' عبدالوہاب نے خفگی سے پوچھا۔

''بات اتنی نہیں تھی جتنی کہ بڑھ گئی۔'' جمیلہ نے اسے ساری بات سنائی تو عبدالرحمٰن کو شدید افسوس ہوا۔

''مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آمنہ نے کیا غیر شرعی حرکت کی؟ اس نے تو نقاب میں انٹرویو دیا تھا اور وہ بھی میری اجازت سے اور انٹرویو میں بھی کوئی خاص بات نہیں تھی پھر کس بات کو اتنا بڑا ایشو بنایا گیا؟'' عبدالرحمٰن نے دونوں بھابیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو ان کے پاس کچھ کہنے کو نہیں تھا۔ دونوں کھسیا کر منہ بنانے لگیں۔

''ہاں بولو، بتاؤ، کس بات پر تم لوگوں کو اعتراض ہے؟ اور ہاجرہ تم نے جان بوجھ کر گھر کو اکھاڑا کیوں بنایا۔ یہ ساری آگ تم نے ہی لگائی ہے۔ تم سے بھی وہ معصوم برداشت نہیں ہو رہی؟'' عبدالوہاب نے غصے سے بیوی کو جھنجوڑتے ہوئے کہا تو اس نے پھر واویلا مچانا شروع کر دیا۔

''بھائی جان، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' عبدالرحمٰن نے اسے روکا۔

''پہلے بھائی کو بھڑکا لیا اور اب اسے کیوں روک رہے ہو...... سب سے بڑے فسادی تو تم خود ہو۔ جو اس کٹنی کو بیاہ کر گھر لے آئے۔ جب سے وہ آئی ہے اس گھر کا سکون برباد ہو گیا ہے۔'' ہاجرہ، عبدالرحمٰن پر چلاتے ہوئے بولی۔

''افوہ، اس بیچاری کا کیا قصور ہے۔ یہ تم دونوں کا حسد اور جلن ہے کہ اسے برداشت نہیں کر پا رہیں۔ فساد کی جڑ تو تم دونوں ہو۔'' اب کی بار عبدالرب نے اپنی بیوی اور بھابی کو ڈانٹتے ہوئے کہا تو شبنم کو طیش آ گیا۔

''ہاں...... ہاں تم تو اس بیچاری کے فیور میں ہی بولو گے۔ کیونکہ اس کی گوری چمڑی پر تم بھی تو عاشق ہوئے بیٹھے ہو۔'' شبنم طنز کرتے ہوئے بولی۔

''کیا......؟'' عبدالرحمٰن چلاتے ہوئے بھائی کو دیکھنے لگا۔

''بکواس بند کرو، ذلیل گھٹیا عورت......'' عبدالرب نے زور سے شبنم کو تھپڑ لگاتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ہاں مجھے ہی مارو...... تمہارا بھانڈا جو پھوڑ رہی ہوں۔ دے دو مجھے طلاق اور کر لو اس کٹنی سے شادی۔'' شبنم پھر چلائی۔

''بھائی، بس اب اس سے آگے میں ایک لفظ بھی نہیں سنوں گا۔ وہ میری بیوی ہے کوئی مذاق نہیں...... جس کا جو دل چاہے اسے کہتا پھرے۔ اب نہ وہ اس گھر میں رہے گی اور نہ ہی میں......'' عبدالرحمٰن نے شدید غصے اور صدمے کی حالت میں کہا اور اپنے ...کمرے کی طرف چلا گیا۔

''ارے......ارے بیٹا خدا کے لیے ایسا مت کرنا۔'' جمیلہ اس کے پیچھے جا کر روتے ہوئے اسے روکنے لگیں۔

''اماں آپ مجھے جواب روک رہی ہیں تو آپ نے اپنی بہوؤں کو اس وقت کیوں نہ روکا۔ جب وہ یہ سارا فساد کھڑا کر رہی تھیں۔'' وہ غصے سے بولا۔

''ہاں، یہ میری ہی غلطی ہے جو ان کی باتوں میں آ گئی۔'' جمیلہ سسکتے ہوئے بولیں۔

''اماں، جب تک میں اور آمنہ اس گھر میں رہیں گے یہ لوگ یونہی فتنے کھڑے کرتے رہیں گے اس لیے اب ہمارا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔'' عبدالرحمٰن نے حتمی انداز میں کہا اور آگے بڑھ کر اپنے کمرے کا دروازہ کھولنے لگا۔ اندر جا کر اس نے دیکھا آمنہ بیڈ پر بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھی جب کہ عاصمہ اس کے پاس بیٹھی اسے تسلی دے رہی تھی۔

''آمنہ تمہیں میرے ہوتے ہوئے یوں رونے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اب ہم اس گھر میں نہیں رہیں گے۔'' عبدالرحمٰن اس کے قریب آ کر ٹھوس لہجے میں بولا تو آمنہ نے گیلی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا...... جمیلہ بھی روتی ہوئی اندر آ گئی تھیں۔

''بہو مجھے معاف کر دو۔ میں ان لوگوں کی باتوں میں آ گئی۔ خدا کے لیے تم ہی عبدالرحمٰن کو سمجھاؤ۔ تم دونوں یہ گھر چھوڑ کر مت جاؤ۔'' جمیلہ نے آمنہ کے پاؤں کو ہاتھ لگا کر روتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم گھبرا گئی۔

''اماں آپ یہ کیا کر رہی ہیں؟'' آمنہ نے پاؤں ہٹا کر ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے کہا۔

''اماں ہمیں جانے دیں۔ سب لوگ سکون میں آ جائیں گے۔'' عبدالرحمٰن خفگی سے بولا۔

''وہ تو سکون میں آ جائیں گے مگر ماں کے دل کو سکون کیسے آئے گا؟ عبدالرحمٰن تم جانتے ہو میں تمہیں سب سے زیادہ چاہتی ہوں۔ جس دن تو دکھائی نہ دے تو مجھے چین نہیں آتا۔ جب تو باہر پڑھنے گیا تھا تو میں کتنی بیمار ہو گئی تھی۔ میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتی بیٹا...... پھر اگر تجھے کہیں جانا ہے تو میں بھی تیرے ساتھ ہی جاؤں گی۔'' جمیلہ نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، میں کل ہی کوئی گھر کرائے پر دیکھتا ہوں۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں......'' عبدالرحمٰن نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تو جمیلہ نے آہ بھر کر اُن کی طرف دیکھا اور خاموشی سے کمرے سے چلی گئیں۔ عاصمہ بھی ان کے ساتھ وہاں سے چلی گئی۔

''عبدالرحمٰن، میں سوچ رہی ہوں جرمنی واپس چلی جاؤں۔ میری وجہ سے تمہارے گھر والے بہت پریشان ہیں۔'' کچھ دیر بعد آمنہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''اور میں؟ کیا تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟'' عبدالرحمٰن نے پوچھا۔

''تمہاری ماں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

''اور تم......؟'' عبدالرحمٰن نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔'' اس نے نم آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس بات کا کیا مطلب ہے؟'' عبدالرحمٰن نے چونک کر پوچھا۔

''میں تنہا زندگی گزارنے کی عادی ہوں مگر تمہارے گھر والے تمہارے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ تمہیں کھونا نہیں چاہتے۔ پلیز تم مجھے جانے دو۔'' آمنہ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''کیا تمہاری زندگی میں میری بس اتنی ہی اہمیت ہے کہ میں ہوں یا نہ ہوں تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا......؟'' عبدالرحمٰن نے افسردگی سے پوچھا۔

''اگر ایسی بات ہوتی تو میں سب کچھ چھوڑ کر تمہارے ساتھ یہاں کیوں آتی لیکن اب مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ میں یہاں مس فٹ ہوں۔ تمہارا ماحول، تمہارے لوگ مجھے قبول کرنے کو تیار نہیں۔ میں زبردستی اپنے آپ کو ان پر مسلط نہیں کرنا چاہتی۔ میں اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگی ہوں کہ میری وجہ سے سب لوگ تکلیف میں ہیں۔ تمہارے گھر کا سکون میری وجہ سے خراب ہو رہا ہے۔'' وہ سسکی بھر کر بولی۔

''آمنہ، جب دو اجنبی لوگ میاں بیوی کے رشتے میں بندھتے ہیں تو وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے سب سے اہم ہو جاتے ہیں۔ ان کے دکھ، سکھ، خوشی، غم اور تکلیف سب ایک ہو جاتے ہیں اور جب دونوں ایک دوسرے کو جدا جدا سمجھتے ہیں تو پھر ان کا رشتہ کبھی قائم نہیں رہ پاتا۔ میں نے تمہیں کبھی اپنے سے جدا نہیں سمجھا۔ پھر تم کیوں مجھے اپنے سے علیحدہ دیکھتی ہو؟'' عبدالرحمٰن نے اس کے قریب آ کر قدرے جذباتی انداز میں کہا۔

''عبدالرحمٰن! شاید تم میری نیچر کو نہیں سمجھ پائے کہ جس سے محبت کرتی ہوں اس کے لیے اپنی ہر خوشی قربان کر سکتی ہوں۔ میری خوشی، میری محبت تم ہو لیکن میں جب تمہاری ماں کے چہرے کی طرف دیکھتی ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ ان کی اصل خوشی تم ہو اور میں ان کی خوشی ان سے چھیننا نہیں چاہتی۔ میں ان کی خوشی کے لیے اپنی خوشی قربان کر دوں گی۔'' وہ اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بولی۔

''ایسا تم سوچنا بھی مت...... میں، تم اور اماں...... ہم سب ساتھ رہیں گے۔'' عبدالرحمٰن نے اس کے کندھے پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور اسے تسلی دینے لگا۔ آمنہ کے دل کو بھی سکون ملنے لگا اور وہ مسکرا کر عبدالرحمٰن کی طرف دیکھنے لگی۔

''میری محبت کو اتنا کمزور مت سمجھنا۔ میں تمہیں کبھی ٹوٹنے نہیں دوں گا۔'' عبدالرحمٰن نے پیار بھری سرگوشی کی تو وہ مسکرا دی۔

☆☆☆

عبدالرب انتہائی غصے میں اپنے کمرے میں کھڑا مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ دانت کچکچا کر بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے چلا رہا تھا۔ پھر کبھی اسے مارنے کو دوڑتا۔ عاصمہ بار، بار باپ کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ابو پلیز اب بس کریں۔ چھوڑیں غصہ...... امی سے غلطی ہو گئی ہے انہیں معاف کر دیں۔'' عاصمہ نے مفاہمت کے انداز میں باپ کا بازو پکڑ کر اسے روکتے ہوئے کہا۔

''کیسی غلطی اور کس بات کی معافی......؟ میں نے کون سا جھوٹ بولا ہے۔ پوچھ اپنے باپ سے، کیا وہ اس میمنی پر بری نظر نہیں رکھتا۔'' شبنم غصے سے چلائی۔

''بکواس بند کرو، ذلیل گھٹیا عورت۔ تم نے یہی بکواس کر کے میرے بھائی کے دل میں میرے لیے شک ڈال دیا ہے۔ میں کیا اتنا بے غیرت انسان ہوں کہ اپنے بھائی کی بیوی پر نظر رکھوں گا۔ تمہیں تو شک کرنے کی بیماری ہے۔ میں جس عورت کی طرف بھی دیکھوں تجھے شک پڑ جاتا ہے۔ تیرے دماغ میں خناس ہے، گندگی سے بھرا ہوا ہے تیرا دماغ......'' عبدالرب نے مزید غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

دو ہنسوں کا جوڑا

ہیٹ اسٹروک نے ہزاروں لوگوں کے پیاروں کی طرح ہم سے بھی ہمارے ماں، باپ چھین لیے...... مرے ابا کی پرسنالٹی بڑی شاندار تھی۔ امی خوب صورت ہی نہیں خوب سیرت بھی تھیں۔ ابا، امی میں ایک چیز مشترک تھی اپنے پرائے کی تفریق کے بغیر ہر ایک کی مدد کرتے۔ زندگی سکون سے گزر رہی تھی کہ اچانک کالی آندھی نے گھر کے در و دیوار گرا دیے۔ ابا نے دو بچوں کی ماں سے اور اس دو بچوں کی ماں نے اپنے شوہر کو چھوڑ کر تین بچوں کے باپ سے شادی کر لی۔ بارہ سالہ ازدواجی زندگی میں دراڑ پڑ گئی، امی نے یہ ستم سہہ لیا۔ جب کچھ وقت گزرا تو ابا کو احساس ہوا کہ سب کچھ برباد ہو گیا ہے۔ ابا ہمارا اور امی کا پہلے جیسا خیال رکھنے کی کوشش کرتے ہم نے کبھی تنگی کی زندگی نہیں گزاری۔ خدا نے ابا کو امی کے اور ہم تینوں بچوں کے نصیب سے بہت نوازا تھا۔ ابا اکثر کہتے بیٹا مجھے معاف کر دینا تم لوگوں کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ وہ کہتے میں ایسا نہیں چاہتا تھا امی نے کوئی شکایت نہیں کی یہ حقیقت ہے میرے ابا بہت اچھے انسان تھے۔ ابا نے امی کو ملکہ بنا کر رکھا تھا۔ ابا کا اکلوتا بیٹا جسے وہ پیار سے چاند میاں کہتے، ہم دو بیٹیاں ابا کی جان تھیں۔ اپنی بیوی، بچوں میں نہ جانے کس کی نظر لگ گئی ہمارے گھر کو...... پھر جب تبدیلی آئی تو ہر دم خوش رہنے والے ابا اکثر خاموش رہنے لگے وہ بھی، کبھی یہ گنگناتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتے تھے دو ہنسوں کا جوڑا بچھڑ گیو رے...... امی سورۂ رحمٰن اور ابا درودِ تاج کی جب تلاوت کرتے تو جیسے وقت کی رفتار تھم سی جاتی۔ عرش پر فرشتے بھی سبحان اللہ کہتے ہوں گے۔ امی کی سسرال میں بڑی عزت تھی۔ چچا کہتے یہ میری ماں ہے، چھوٹی پھوپی نے ان کا دودھ پیا تھا تو بالکل ماں کی طرح محبت کرتی۔ بڑی پھوپی کو قرآن پڑھایا تو استاد کا درجہ پایا۔ جیٹھ کہتے یعنی میرے تایا کہتے میں نے گودوں میں کھلایا ہے میری تو بیٹی ہے یہ۔ خاندان کے سب بچے آج تک امی کی عزت بھی کرتے ہیں اور محبت بھی مگر جیون ساتھی کے رویے سے جو تکلیف پہنچی اس کا ازالہ ممکن نہیں تھا۔ بھائی کی چھوٹی عمر میں شادی ہو گئی۔ امی نے بچوں کو قرآن پڑھانا شروع کر دیا خود کو مصروف رکھنے کے لیے۔ پھر ہم دونوں بہنوں کی بھی شادیاں ہو گئیں۔ امی نے فیکٹری میں جاب کر لی وقت بھی تو گزارنا تھا اور پھر کون تھا ان کا خیال کرتا یا وہ کسی کا انتظار کرتیں۔ امی کبھی بڑی بیٹی کے پاس رہتیں کبھی اپنے بیٹے کے پاس رہنے چلی جاتیں مگر وہ مستقل میرے پاس رہتی تھیں۔ صبح اٹھ کر فیکٹری جاتا رمضان

’’آپ لوگوں کو ذرا سا بھی خیال نہیں آ رہا کہ آپ کی جوان بیٹی آپ کے پاس کھڑی ہے اور آپ ایک دوسرے کے بارے میں ایسی بے ہودہ باتیں کر رہے ہیں۔‘‘ عاصمہ نے غصے سے کہا تو دونوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

’’اگر اس میں شرم، حیا اور ذرا سا احساس ہوتا تو میرے سارے گھر والوں کے سامنے مجھے یوں ذلیل و رسوا نہ کرتی۔ اللہ نے میاں، بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے عیب اور برائیوں کو چھپاتے ہیں مگر یہ ایسی بیوی ہے جو شوہر کا لباس تار تار کر کے اسے سب کے سامنے خوب رسوا کر رہی تھی۔ اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ شرم سے کہیں ڈوب مروں مگر اس عورت کو ذرا سا بھی احساس نہیں ہو رہا تھا۔‘‘ عبدالرب نے سسکی بھر کر اپنی نم آنکھوں کو صاف کیا تو عاصمہ بھی افسردہ ہو گئی۔ عبدالرب کمرے سے باہر نکل گیا۔ شبنم اب شرمندہ ہونے لگی تھی۔ عاصمہ بھی افسردہ ہو گئی۔ عاصمہ نے قدرے خفگی سے ماں کی طرف دیکھا۔

’’امی آپ نے واقعی بہت برا کیا ہے۔ ابو کو تو میں نے آج تک یوں افسردہ نہیں دیکھا۔ آپ نے صرف ابو کی ہی نہیں چاچی کی بھی بے عزتی کی۔ چچا بھی بہت ہرٹ ہوئے ہوں گے۔‘‘ عاصمہ نے ماں سے کہا تو وہ منہ بنا کر اسے دیکھنے لگی۔

’’ہاں، اب سب مجھے ہی برا کہو...... میں ہی گناہ گار ہوں۔ باقی تو سب بہت اچھے اور معصوم ہیں۔‘‘ شبنم آنسو بہاتے ہوئے بولی۔

’’دادی کو بھڑکانے میں آپ سب سے آگے تھیں۔ چاچی اور میں باہر کھڑی آپ کی ساری باتیں سن رہی تھیں...... آپ ہی ان کو چچا کی دوسری شادی کے لیے کہہ رہی تھیں ناں......‘‘ عاصمہ نے خفگی سے کہا تو شبنم بوکھلا گئی۔

میں روزے رکھنا، قرآن ختم کرنا امی نے ساری زندگی بھی قصداً نماز قضا نہیں کی، جاگنے والی راتوں کا اہتمام کرتیں خدا نے انہیں بڑا حوصلہ اور ہمت دی تھی امی کہتی تھیں یہ جو ہوا قسمت میں تھا ورنہ تمہارا باپ ایک شریف اور دردمند دل کا انسان تھا اسے مجھ سے اور اپنے بچوں سے بڑا پیار تھا۔ وہ کہتی تھیں جو وقت گزر گیا کبھی واپس نہیں آئے گا اب ہم سب خدا کے گھر ملیں گے یہ ان کا ایمان تھا امی کو السر تھا اپنی ضرورتیں اپنی سیلری سے پوری کرتیں۔ ہم تینوں کے بچوں کے لیے ایک جیسی چیزیں خریدتیں کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ بڑی غیور اور خوددار تھیں۔ ابا سے کوئی شکایت نہیں کی اور ہمیں بھی ابا سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا وہ ہمیں بہت چاہتے تھے میں ان کی سب سے لاڈلی بیٹی تھی، چھوٹی تھی ناں...... ایک اسپتال میں ابا ایڈمٹ تھے دوسرے میں امی...... جب میں ابا کو دیکھنے گئی تو وہ زور، زور سے اللہ کو یاد کر رہے تھے۔ اور بلند آواز میں کلمہ پڑھ رہے تھے۔ انہیں آکسیجن لگی تھی مجھے دیکھ کر ہاتھ اٹھایا، میں نے سر جھکایا تو ماتھے پر ہمیشہ کی طرح پیار کیا میں نے بھی ان کا ماتھا چوما تھا دوسرے دن جب دیکھنے گئی تو وہ کلمہ پڑھتے، پڑھتے خاموش ہو گئے تھے اور 6 جولائی کو سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے...... 8 جولائی کو وہ عورت جو تمام زندگی ان کے نام پر بیٹھی رہی پاس جانے میں دیر نہ کی۔ امی کا ایمان بھی سچا تھا اور وعدہ بھی جو انسان کسی کو کھو کر پچھتائے جس کی یاد بے چین کرے اصل میں وہی محبت ہے۔ میرے دوسرے بہن، بھائی میری امی کو بڑی امی کہتے ہیں، بہت عزت کرتے ہیں امی بھی ان سے اور ان کے بچوں سے پیار کرتی تھیں۔ مرے سب بہن، بھائی امی کے انتقال میں آئے سوئم میں شرکت کی قرآن پڑھا ایصالِ ثواب کیا...... اب وہ پاؤں سمٹ گئے ہیں جن کے نیچے ہم تینوں بہن بھائی کی جنت تھی جو ہاتھ دعا کے لیے اٹھتے تھے سینے پر دھرے ہیں جو آنکھیں ہمیں دیکھ کر چمکتی تھیں بند ہو گئیں ہیں جو لب مسکراتے تھے خاموش ہو گئے ہیں، مرے باپ کو اللہ نے آخر وقت میں کلمہ کی توفیق دی اور ماں کو 21 ویں شب رمضان کی ملی۔ میں تو پہلے بھی کوشش کرتی تھی کہ میری ذات سے کسی کو تکلیف نہ ہو اب اور خیال رکھوں گی کہ اب ہمارے سروں پر دعاؤں کا آسمان نہیں ہے۔ میرے پیارے والدین کے لیے آپ سب دعا کریں اللہ ان کے درجات بلند کرے اور ہم جب تک زندہ رہیں ان کے لیے صدقۂ جاریہ بنے رہیں آپ کی دعاؤں کی طالب۔

نجمہ ناز اصغر...... کراچی

''اچھا...... تو...... تو...... باہر کھڑی ہو کر ماں کی جاسوسی کر رہی تھی...... بے حیا تجھے ذرا شرم نہیں آئی......'' شبنم اس کے پیچھے پڑ گئی۔

''میں نے تو چاچی کو وہاں کھڑے روتے ہوئے دیکھا تو ان کے پاس چلی گئی اور آپ کی باتیں سن کر مجھے بھی غصہ آ گیا۔'' عاصمہ نے صاف گوئی سے بتایا۔

''شاباش بھئی، سگی ماں کی دشمن اور سوتیلیوں کی سجن...... تجھ جیسی اولاد بھی اللہ کسی کو نہ دے۔'' شبنم اسے غصے سے دیکھتے ہوئے بولی۔ وہ اپنی ہٹ دھری پر قائم تھی۔

''امی خدا کے لیے اپنا رویہ بدلیں۔ چاچی ہماری مہمان ہیں اور بہت اچھی انسان ہیں۔ وہ اسلام قبول کر کے مسلمان ہو کر یہاں آئی ہیں۔ کیا سوچیں گی کہ مسلمان ایسے فسادی اور جھگڑالو ہوتے ہیں۔ انہوں نے تو اسلام کو آئیڈیل مذہب سمجھ کر قبول کیا ہے اور ہم جو اس مذہب کے ماننے والے ہیں، اس پر کتنا عمل کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر ان کو کتنا شاک لگتا ہے۔'' عاصمہ نے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''اچھا، اچھا مجھے اب سبق نہ پڑھا۔ بہت بے عزتی کرالی ہے۔ اب میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔'' شبنم نے سر پر دوپٹے کی پٹی باندھی اور منہ موڑ کر لیٹ گئی۔ عاصمہ افسوس بھری نظروں سے ماں کو دیکھتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی اور فریحہ اور شبینہ کے کمرے میں چلی گئی۔ فریحہ کے بازوؤں پر ناخنوں کے رگڑنے سے خون رسنے لگا تھا اور بازوؤں پر سوجن بھی ہو گئی تھی۔ شبینہ نے ان پر ٹیوب لگائی تھی مگر فریحہ کو بہت تکلیف، ہو رہی تھی۔

''آپا کے بازوؤں کا اب کیا حال ہے؟'' عاصمہ نے شبینہ کے قریب آ کر پوچھا۔

''جا مٹھی بھر مرچیں لے آ اور وہ ان پر چھڑک دے۔ چڑیل تو نے ہی فساد ڈالا تھا تو نے ہی اماں کو میرا

طعنہ دیا تھا اور انہوں نے میرا یہ حال کر دیا۔'' فریحہ نے روتے اور غصے سے چلاتے ہوئے عاصمہ کو کہا تو وہ شرمندہ ہونے لگی۔

''آپا میں نے جان بوجھ کر کچھ نہیں کیا۔ تائی اماں نے جانے کا کس کا غصہ تم پر نکال دیا۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔'' عاصمہ نے آگے بڑھ کر فریحہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا پر اس نے زور سے اسے دھکا دیا۔

''کتنی کہیں کی...... جا دفع ہو جا یہاں سے۔'' فریحہ چلائی۔

''آپا...... آپا اب بس بھی کرو...... کیا ہو گیا ہے تجھے؟'' شبینہ نے گھبرا کر بہن کو سمجھاتے ہوئے کہا تو عاصمہ روتے ہوئے وہاں سے جانے لگی۔

''عاصمہ...... عاصمہ...... رکو......'' شبینہ نے اسے پیچھے سے آواز دی مگر وہ کمرے سے چلی گئی تھی۔

''آپا تم بھی حد کرتی ہو، کیا اس نے امی کو کہا تھا کہ وہ تمہارے بازوؤں کو یوں چھیل ڈالیں؟ امی اور چاچی کو تو خواہ مخواہ آمنہ چاچی سے بیر ہو گیا ہے۔ وہ بیچاری ان سب کو کیا کہتی ہیں مگر دونوں کو کون سمجھائے۔'' شبینہ غصے سے بڑبڑانے لگی۔

''جاؤ تم بھی باہر، چھوڑ دو مجھے اکیلا......'' فریحہ غصے سے چلائی تو شبینہ بھی منہ بنا کر باہر چلی گئی۔ عاصمہ برآمدے میں تخت پوش پر بیٹھی رو رہی تھی۔ شبینہ بھی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''عاصمہ یہ ہمارے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ آج جو کچھ ہوا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ میں تو ڈر ہی گئی تھی۔ ابھی تک دل سے خوف نہیں جا رہا۔'' شبینہ نے گھبرا کر کہا۔

''انسان کا حسد اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ امی اور تائی امی کے حسد نے انہیں اس قدر باؤلا بنا دیا ہے کہ وہ غصے میں اپنا ذہنی توازن کھونے لگی ہیں۔ کتنے لوگوں کو آج انہوں نے ہرٹ کیا ہے۔'' عاصمہ نے آہ بھر کر رنجیدگی سے کہا۔

''پھر کیا کریں...... فریحہ آپا بھی ان کی طرح ہی ہیں۔'' شبینہ نے ناگواری سے کہا۔

''ہاں اور افسوس بھی اسی بات کا ہے کہ کوئی سمجھنا ہی نہیں چاہتا۔ کوئی بھی اپنی غلطی پر شرمندگی محسوس نہیں کر رہا۔'' عاصمہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''چچا اس گھر کو چھوڑنے کی بات کر رہے تھے اگر وہ چاچی کو لے کر یہاں سے چلے گئے تو......؟'' شبینہ نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر بہت برا ہوگا۔ چچا کے ساتھ دادی بھی چلی جائیں گی۔ وہ چاچو کے بغیر ایک دن بھی کہیں نہیں رہتیں اور پھر گھر میں صرف ہماری مائیں اور ان کی ہم خیال فریحہ آپا، ہم دونوں کے خلاف محاذ بنا لیں گی۔'' عاصمہ نے فکرمندی سے جواب دیا۔

''ہاں یہ تو ہے...... پھر وہ سب ہم سے جھگڑا کریں گی۔ عاصمہ...... جس طرح اللہ نے مجھے سبق سکھایا تو میں سمجھ گئی...... کیا وہ ان کو کوئی سبق نہیں سکھائے گا؟'' شبینہ نے گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

''معلوم نہیں ہر کوئی تمہاری طرح نہیں ہوتا کہ اس واقعہ کو اپنے لیے سبق بنا کر کچھ سیکھ لے۔ میں ابھی امی کو اتنا سمجھا کر آئی ہوں مگر وہ الٹا مجھ پر برستی رہیں۔ کچھ سننے کو، سوچنے سمجھنے کو تیار ہی نہیں...... کیا، کیا جائے؟'' عاصمہ نے آہ بھر کر کہا اور انہیں خیال ہی نہیں رہا کہ عبدالوہاب اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھا اندھیرے میں ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ہاجرہ بیڈ پر منہ موڑے خراٹے لے رہی تھی۔ عبدالوہاب نے آہ بھر کر ہاجرہ کی طرف دیکھا اور پریشانی سے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''اس گھر کے نظام کو ٹھیک کرنے کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔ ورنہ اس گھر کا شیرازہ بکھر جائے گا اور گھر کا نظام ٹھیک چلے...... اس کی سب سے بڑی ذمّے داری گھر کے سب سے بڑے فرد ہی پر ہوتی ہے یعنی کہ مجھ پر...... ابا جان کی جگہ مجھے ہی اب گھر کا بڑا بن کر فیصلے کرنے چاہئیں۔'' عبدالوہاب نے گہری سانس لے کر سوچا اور بیڈ پر لیٹ کر حالات پر غور وفکر کرنے لگا۔

جمیلہ رات بھر کروٹیں بدلتی رہیں۔ یہ سوچ سوچ کر انہیں ہول اٹھتے تھے کہ وہ کیسے یہ آبائی گھر اور دوسرے بیٹوں کو چھوڑ کر چلی جائیں۔ شریف الدین کے ساتھ انہوں نے پچاس سال اس گھر میں گزارے تھے۔ اس گھر کی ایک، ایک اینٹ سے انہیں پیار تھا۔ اس کے آنگن میں ان کے بیٹوں نے اپنا بچپن اور جوانی گزاری تھی اور انہوں نے بیٹوں کے بچوں کو کھلایا تھا۔ سب کو چھوڑ کر چلے جانا کتنا مشکل ہوگا لیکن وہ عبدالرحمٰن کے بغیر بھی نہیں رہ سکتی تھیں اور عبدالرحمٰن آج جتنا تیخ پا ہو رہا تھا۔ اس سے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اب وہ اس گھر میں مزید نہیں رہے گا۔

جمیلہ رات بھر روئیں اور دعائیں کرتی رہیں کہ خدا کوئی سبیل پیدا کردے اور کوئی بھی کسی سے جدا نہ ہو مگر اب انہیں یہ بہت مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ سب ایک دوسرے سے بدظن ہو گئے تھے۔ انہوں نے اتنی زیادہ ٹینشن لی تھی کہ صبح انہیں بخار ہو گیا۔ وہ فجر کی نماز کے لیے نہ اٹھیں تو عاصمہ کو فکر لاحق ہوئی اور وہ دادی کے کمرے میں آئی تو دیکھا انہیں شدید بخار ہے۔ وہ پریشان ہوگئی اور جلدی سے چچا کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ وہ دونوں بھی نماز فجر کی تیاری کر رہے تھے۔ عاصمہ نے انہیں دادی کے بخار کا بتایا تو وہ دونوں گھبرائے ہوئے ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ جمیلہ کا کمرا عبدالوہاب کے کمرے کے ساتھ ہی تھا۔ اس نے عبدالرحمٰن کو اماں، اماں پکارتے ہوئے سنا تو جلدی سے اٹھ کر ان کے کمرے میں گیا اور انہیں دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

جلد ہی گھر کے دوسرے لوگ بھی ان کے کمرے میں جمع ہوگئے۔ عبدالرحمٰن انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانے پر مصر تھا مگر وہ نہیں مان رہی تھیں۔ عبدالوہاب نے انہیں اپنے کمرے سے دوا لا کر کھلائی اور ان کے پاس بیٹھ کر ان کا سر دبانے لگا۔ عبدالرحمٰن ان کے پاؤں دبا رہا تھا جبکہ عبدالرب ان کے پاس بیٹھا پریشانی سے بڑبڑا رہا تھا۔

''یہ ضرور اماں نے ٹینشن لی ہے۔ اسی وجہ سے بیمار پڑ گئی ہیں۔'' وہ عبدالرحمٰن کی طرف دیکھنے لگا مگر عبدالرحمٰن نے خفگی سے منہ پھیر لیا۔ اس نے ایک بار بھی بڑے بھائی کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ عبدالوہاب دونوں کی طرف خاموشی سے دیکھ رہا تھا اور ان کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا رہا تھا کہ وہ کیا سوچ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جمیلہ بیگم کی حالت سنبھلی اور انہوں نے آنکھیں کھولیں تو عبدالوہاب نے دونوں بھائیوں کی طرف دیکھ کر گہری سانس لی۔

''عبدالرحمٰن، تم کان کھول کر سن لو۔ تم اس گھر سے کہیں نہیں جاؤ گے۔ میں ابا جان کی جگہ اب اس گھر کا بڑا ہوں اور یہی میرا فیصلہ ہے۔'' عبدالوہاب نے قدرے ٹھوس لہجے میں کہا تو عبدالرحمٰن نے چونک کر بھائی کی طرف دیکھا۔ جمیلہ بھی ایک دم حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''ہرگز نہیں بھائی، اب ایسا ممکن نہیں۔ رات کو جو کچھ ہو چکا ہے کیا اب آپ اس سے بڑا تماشا دیکھنا چاہتے ہیں......؟ لیکن میں یہ سب کسی طرح بھی برداشت نہیں کر سکتا۔'' عبدالرحمٰن نے آہ بھر کر کہا۔

''اوپر چھت پر دو کمرے خالی پڑے ہیں...... میں انہیں ٹھیک کرا کے تم دونوں کے لیے سیٹ کرا دیتا ہوں تم لوگ اوپر کے پورشن میں رہو گے۔ کوئی بھی تم لوگوں کی زندگی میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گا۔ اماں جان کو آزادی ہوگی وہ تمہارے ساتھ رہیں یا ہم سب کے ساتھ...... اس گھر کی مالکن اماں جان ہیں۔ میرا خیال ہے میرے اس فیصلے سے تم دونوں کو کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔'' عبدالوہاب نے چھوٹے بھائی اور بھاوج کی طرف دیکھتے

ہوئے کہا۔

''ہاں، ہاں اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔'' جمیلہ جلدی سے بولیں اور ایک دم ان کے چہرے پر اطمینان کا سایہ لہرا گیا۔ عبدالرحمٰن اور آمنہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کچھ نہ بولے۔

''عبدالوہاب تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے، میں اپنے بچوں کو ایک دوسرے سے جدا ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔'' جمیلہ نے نم آنکھوں سے بیٹے کے چہرے کو دیکھا اور پھر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

''آپ فکر نہیں کریں اماں، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میں کل سے اوپر کا کام شروع کرواتا ہوں لیکن تب تک کوئی بھی ایک دوسرے سے نہیں الجھے گا۔ جو کل ہو چکا اب دوبارہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہاجرہ اور شبنم اگر تم دونوں میں سے اب کسی نے بحث کی یا زیادتی کرنے کی کوشش کی تو اس کا اس گھر میں آخری دن ہوگا۔ میں یا عبدالرب...... کوئی بھی اپنی بیوی کو طلاق دینے سے گریز نہیں کرے گا۔ کیوں عبدالرب کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟'' عبدالوہاب نے بھائی سے پوچھا۔

''ہاں آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔'' عبدالرب نے خفگی سے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے اب تم سب لوگ یہاں سے جاؤ۔ اماں جان کو آرام کی ضرورت ہے۔'' عبدالوہاب نے اٹھتے ہوئے کہا اور سب لوگ وہاں سے چلے گئے۔ جمیلہ خوش ہو کر اسے دعائیں دینے لگیں عبدالوہاب نے مسکراتے ہوئے لڑکیوں کی طرف دیکھا ان دونوں کے چہروں پر بھی اطمینان تھا۔ اس نے کمرے سے جاتے ہوئے عاصمہ کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھا تو وہ مسکرانے لگی۔

☆☆☆

عبدالوہاب نے ایک ماہ کے اندر، اندر چھت کے اوپر دو کمرے، کچن، باتھ روم اور لاؤنج کی سیٹنگ کروا کر... عبدالرحمٰن اور آمنہ کے لیے بہت اچھا پورشن تیار کروا دیا تھا۔ جس میں ضرورت کی ہر چیز تھی اور تمام سیٹنگ بھی جدید انداز میں ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر ہاجرہ اور شبنم کے سینے میں ابال اٹھتے تھے۔ انہوں نے تو ساری زندگی ایک ایک کمرے میں گزاری تھی۔ بیٹیاں جوان ہوئیں تو ایک ایک کمرا اور مل گیا مگر وہ کمرے سب پرانی طرز کے تھے۔ فرنیچر بھی پرانا ہو چکا تھا۔ کچھ بھی ڈھنگ کا نہیں تھا۔ انہوں نے تو آمنہ کو گھر سے نکالنے کی پلاننگ کی تھی اور خدا نے اسے ان سے بھی بہتر رہائش دے دی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اوپر جا کر بہت پرسکون ہو گئی تھی اور وہ دونوں اسے دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتیں۔ جمیلہ نیچے ہی رہتی تھیں کیونکہ ان کا بڑے بیٹوں کے پاس رہنا زیادہ مناسب تھا۔ جب دل چاہے تو وہ اوپر آمنہ کے پاس جا سکتی تھیں اور یوں وہ دن میں کئی بار آمنہ کے پاس جاتیں۔ اس کے کئی کام کر دیتیں اور آمنہ بھی ان سے بہت محبت سے پیش آتی۔ شبینہ اور عاصمہ بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد اوپر چاچی سے ملنے جاتیں تو کئی کئی گھنٹے اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتی رہتیں۔ آمنہ انہیں اپنے بچپن کے کالج لائف کے اور مسلمان ہونے سے پہلے کے واقعات سناتی تو وہ بہت توجہ سے مزے لے، لے کر سنتیں اور اسی میں انہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہتا۔ دونوں کی مائیں نیچے بیٹھ کر انہیں کوسنے دیتیں اور آوازیں لگاتیں جب وہ نیچے جاتیں تو ان کی وہ بے عزتی ہوتی کہ خدا کی پناہ۔ مگر دن میں ایک دوبار جب تک وہ آمنہ کے پاس چکر نہ لگا آتیں تو انہیں بھی چین نہ ملتا تھا۔ آمنہ کے کمروں کے آگے ٹیرس بنایا گیا تھا اور وہاں کھڑے ہو کر نیچے گلی میں اور محلے میں جھانکا جا سکتا تھا۔ آمنہ پردے کا بہت خیال رکھتی تھی اس لیے وہ شاذ و نادر ہی ادھر جاتی تھی۔

(جاری ہے)

نورِ دیارِ دل

غزالہ عزیز

''تمہارے نزدیک محبت کیا ہے مایا......؟''

ذویا نے بڑی سنجیدگی سے مایا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ مگر شاید وہ غیر سنجیدہ موڈ میں تھی۔ اس لیے برجستہ بولی۔

''یہی کہ ٹین ایج کی محبت نادانی ہوتی ہے اور میچور ایج کی کہانی!''

اور ذویا جو اس کی طرف سے کسی سنجیدہ رویّے کی توقع کررہی تھی۔ اس کے نان سیریس ایٹی ٹیوڈ اور



ہونٹوں میں دبی مسکراہٹ دیکھ کر اسے گھورے بنا نہیں رہ سکی۔

''واٹ...... ! میں تم سے محبت کے بارے میں تمہارے خیال اور سوچ کی بات کر رہی ہوں...... اور تم مجھے محبت کے سائنڈ ایفیکٹس بتا رہی ہو۔ مذاق مت کرو مایا...... میں بہت سیریس ہوں، کسی کی زندگی کا سوال ہے، سو پلیز...... بی سیریس......''

ذویا کی جھاڑ پر مایا بے ساختہ ہنسنے لگی۔ جانتی تھی محبت کے بارے میں اس کے نادر خیالات جان کر ذویا کو ایسے ہی شاک لگنا تھا...... مگر ذویا واقعی سیریس موڈ میں تھی اور شاید تھوڑی سی پریشان بھی...... لہٰذا مایا کو بھی سیریس ہونا پڑا اور اگلے لمحے وہ سچ مچ کسی انٹلیکچوئل کی طرح جیسے ٹرانس کی کیفیت میں چلی گئی۔

''محبت ایک سمت میں سفر کرنے کا نام ہے۔ ایک جگہ ٹھہر جانا، پڑاؤ ڈال لینا۔ صرف ایک کو دیکھنا، ایک ہی کو سوچنا...... محبت واحد اور یکتا ہوتی ہے۔ یہی محبت کا اصل فلسفہ ہے۔ محبت کبھی اپنی سمت نہیں بدلتی...... اور اگر محبت اپنی سمت بدل لے تو پھر وہ محبت نہیں ہوتی۔''

ذویا نے اسے سیریس ہونے کے لیے کہا تھا اور مایا نے خود پر سنجیدگی طاری کرنے کی پوری کوشش بھی کی تھی...... لیکن جب مایا بولی تو اس کی سنجیدگی پر ذویا حیران ہوئے بغیر نہیں رہی...... محبت کے بارے میں مایا کی سوچ اتنی گہرائی رکھتی ہوگی اسے ہرگز بھی اندازہ نہیں تھا۔

''امیزنگ یار...... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ہر بات کو مذاق میں اڑانے والی مایا محبت کے بارے میں اتنا گہرا، دل پذیر اور راست فلسفۂ نظر رکھتی ہوگی۔''

ذویا نے خوشگوار تاثر کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا۔

''شاید اس لیے کہ میں بھی ایک لڑکی، یعنی عورت ہی ہوں۔ اور محبت کے بارے میں ہر عورت کا یہی نظریہ اور سوچ ہوتی ہے۔ عورت کی محبت اکثر ایک ہی سمت اور ایک دائرے میں ہی گھومتی ہے۔ اس لیے وہ مرد سے بھی یہی توقع رکھتی ہے مگر افسوس...... مرد کی فطرت میں ٹھہراؤ اور پڑاؤ نام کی شے مشکل سے ہی ملتی ہے۔ اس لیے میرا تمہارے لیے مشورہ ہے۔ تم بھی زین سے زیادہ توقعات کے پل مت باندھ لینا...... کہیں ایسا نہ ہو کہ آخر میں نتیجہ اس کی فطرت کے مطابق نکلے۔''

اور مایا کے حقیقت پسندانہ تجزیے نے ذویا کے چہرے پر ہراس پھیلایا تھا۔ وہ زین کی محبت کے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ زین کے لیے ایک سمت، ایک دائرہ نہیں ہوگی۔ جس کے گرد ہمیشہ سفر کرتے کرتے کوئی اپنی زندگی تمام کر دے۔

''تم مجھے ڈرا رہی ہو مایا۔''

اس نے برجستہ شکایتی لہجے میں کہا۔

''نہیں...... زندگی کی حقیقی سچائی بیان کر رہی ہوں...... ہم لڑکیوں کی مخلوق بہت خوش فہم ہوتی ہے۔ مگر انسانی فطرت کے اسرار و رموز تو زندگی سے بھی زیادہ پیچیدہ اور الجھاؤ کے حامل ہوتے ہیں اور مرد کی فطرت اس سے بھی کہیں زیادہ پیچیدگی اور گہرائی کی حامل ہوتی ہے۔'' مایا نے رسانیت سے کہا۔

''مگر میں تم سے مشورہ مانگ رہی ہوں مایا...... کیونکہ تم میری بیسٹ فرینڈ ہو...... اور تم سے زیادہ میری بہتری کے بارے میں کوئی اور نہیں سوچ سکتا۔''

ذویا نے معصوم لہجے میں کہا تو ایک لمحے کے لیے مایا کو اس پر پیار آیا۔ وہ اس کا دل توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے صرف یہی کہہ سکی۔

''ایک بیسٹ فرینڈ کا مشورہ میں تمہیں پہلے ہی دے چکی ہوں۔''

مایا نے سنجیدگی سے جواب دیا تو ذویا بے اختیار ملتجی لہجے میں بولی تھی۔

''تو پھر تم میرے لیے دعا کرنا...... میرا فیصلہ کبھی غلط ثابت نہ ہو۔ تم میرے لیے دعا کرو گی ناں مایا؟''

ذویا کے لہجے میں التجا کے ساتھ امید بھی تھی۔

''ٹھیک ہے، پھر میں تمہارے لیے یہی دعا کروں گی کہ خدا کرے...... تمہیں تمہاری محبت کبھی نہ ملے...... کیونکہ محبت مل جائے تو قدر کھو دیتی ہے۔

رول دیتی ہے۔''
مایا نے بڑی بے رحمی سے کہا تو ذویا کی آنکھیں صدمے سے چھلکنے کو بے تاب ہوئیں اور ذویا کی رونی شکل دیکھ کر مایا کو بے ساختہ ہنسی کا دورہ پڑا تھا۔
''میں تمہیں جان سے ماردوں گی مایا...... تم مجھے دعا دے رہی ہو یا بد دعا......؟''
ذویا نے خفگی سے گھورتے ہوئے مایا کی طرف دیکھا۔ ذویا کے چہرے کے تاثرات ایسے ہی تھے کہ جیسے واقعی اسے مایا کے لفظوں سے شدید صدمہ پہنچا ہو...... لیکن مایا کے چہرے پر کوئی افسوس یا شرمندگی کا تاثر نہیں تھا...... اور اس کے اسی تاثر نے ذویا کو ناراض کردیا تھا۔ اور وہ اٹھ کر جانے لگی تو مایا نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ کے روکا تھا۔
''پلیز ذویا...... مجھے غلط مت سمجھو...... میں مذاق نہیں کررہی ، میں سیریس ہوں، میں نے محبت میں لوگوں کے بھرم ٹوٹتے ہوئے دیکھے ہیں۔ میں نے محبت کو محبت کے ہاتھوں مٹی ہوتے دیکھا ہے۔ یہ محبت صرف انسان کو اپنے پیچھے خوار کرواتی ہے۔ نہ ملے تو سدا کسک بن کر دل میں چبھتی ہے اور اگر مل جائے تو عمر بھر کا پچھتاوا بن جاتی ہے۔'' ذویا اسے ملامت کرنے کے بجائے خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور مایا اسے ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی پھر بھی نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ذویا کے دل کو دکھی اور ڈپریشن میں مبتلا ضرور کرگئی تھی۔ ذویا پھر بھی خاموش رہی تھی اور اسے ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے اسے...... پہلی بار دیکھ رہی ہو اور شاید مایا کو ذویا کی خاموش نگاہوں کا مفہوم سمجھ آگیا تھا۔ اسی لیے برجستہ بولی تھی۔
''ایسے کیا دیکھ رہی ہو ذویا! بے فکر رہو...... مجھے محبت کرنے کا کوئی ذاتی تجربہ نہیں ہوا ہے۔ یہ صرف آبزرویشن ہے اور پلیز ...... اب یہ مت کہنا کہ خدا کرے...... مجھے بھی کسی سے محبت ہوجائے۔ کیونکہ اگر ایسا ہو بھی گیا ناں تو میں کبھی محبت کا ہاتھ نہیں تھاموں گی۔ میں تجربہ کرنے کے بجائے مشاہدے سے سیکھتی ہوں۔ اور ایسی غلطی انجانے میں بھی نہیں کروں گی۔''
مایا نے قطعی لہجے میں کہا تھا...... جیسے وہ ناقابلِ تسخیر ہستی ہو۔
''ایسے مت کہو مایا...... محبت کے ہونے یا نہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہوتی...... نہ ہی اس کے ہونے یا نہ ہونے میں انسانی خواہش کا دخل ہوتا ہے۔ یہ تو بس ایک نرم ونازک سا احساس ہوتا ہے۔ ایک کومل جذبہ جو اچانک ہی دل کی سرزمین سے سر ابھارتا ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دل میں جڑ پکڑ لیتا ہے۔ گویا دل کی زمین کو جکڑ لیتا ہے پھر نہ ہم اسے اکھاڑنے پر قادر ہوتے ہیں اور نہ اجاڑنے پر......'' ذویا کے جواب نے مایا کو خاموش کردیا تھا۔ شاید اس کے دلائل میں زیادہ وزن تھا مگر وہ ذویا کے ساتھ بحث کرنے نہیں بیٹھی تھی۔
''اگر تمہیں کبھی کسی سے محبت ہوگئی تو تم کیا کروگی مایا؟'' اور ذویا کے اگلے سوال نے مایا کو چونک کر اپنی خاموشی توڑنے پر مجبور کردیا تھا۔
''اگر ایسا ہوگیا تو میں اپنے ہاتھوں سے اپنے دل کا گلا گھونٹ دوں گی۔ کیونکہ یہ کم بخت محبت سب سے پہلے دل پر ہی وار کرتی ہے۔ سو نہ رہے گا دل اور نہ بجے گی محبت کی بانسری......'' مایا نے ہنستے ہوئے بڑے بےسُرے انداز میں کہا تھا۔ اور ذویا ایک بار پھر اسے گھورنے لگی تھی۔
''آخر کس مٹی سے بنی تھی یہ لڑکی......'' ذویا نے خفگی سے سوچا تھا۔
''اب گھر چلو ذویا...... مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ اور تم جانتی ہو مجھ سے بھوک برداشت نہیں ہوتی ہے۔''
اگلے لمحے مایا ہنستے ہوئے آڈیٹوریم ہال کی بیرونی سیڑھیوں سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی کیونکہ وہ ایک بار پھر سے اپنے نان سیریس موڈ میں واپس آچکی تھی۔ اس لیے مجبوراً ذویا کو بھی اٹھنا پڑا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اب مایا سے اس بارے میں سنجیدگی کی توقع کرنا عبث ہوگا۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ جب مایا کو کسی بارے میں مزید بات نہ کرنی ہو تو وہ اسی طرح بات کو مزاح کا

رنگ دے کر ادھورا چھوڑ دیا کرتی تھی۔ شاید بروکن فیملی کے بچے ایسے ہی رویوں کے مالک بن جاتے ہیں۔ جہاں زندگی میں سب کچھ ادھورا رہ جاتا ہے پھر ان کی اپنی ذات بھی ادھورے پن کا حصہ بن جاتی ہے۔

مایا، کیمپس کے پارکنگ ایریا کی جانب بڑھنے لگی اور ذویا نے وہیں کھڑے کھڑے سوچا تھا کہ وہ مایا کو کبھی محبت ہو جانے کی دعا نہیں دے گی۔ کیونکہ محبت نصیب سے ہوتی ہے اور نصیب سے ملتی ہے اگر خدا نے اس کی قسمت میں محبت نام کا ستارہ لکھا ہوگا تو وہ مایا کے دل کے آسمان پر ایک دن ضرور چمکے گا۔

☆☆☆

وہ دونوں ایک دوسرے کی بہترین دوست ہی نہیں ایک دوسرے کی اچھی پڑوسی بھی تھیں۔ اسلام آباد کے ایک پوش علاقے کی رہائشی کالونی میں ان کے گھر کی دیواریں ساتھ، ساتھ ملی تھیں...... ذویا اور زوار صرف دو بہن بھائی تھے...... ذویا سے بڑا زوار اپنے ایم بی اے کے لیے لندن بزنس اسکول میں زیرِ تعلیم تھا۔ جبکہ ذویا اسلام آباد کی مقامی یونی ورسٹی سے مایا کے ساتھ ماسٹرز کر رہی تھی۔ ذویا کے والد پرائیویٹ سیکٹر میں جاب کرتے تھے جبکہ مایا نانی کے انتقال کے بعد اپنے نانا حشام حسن کے ساتھ رہتی تھی۔ حشام حسن ایک سرکاری آفیسر رہ چکے تھے۔ انہوں نے بڑی diciplened لائف گزاری تھی لیکن مایا کو بڑی محبت اور پیار سے پالا تھا اور اسے ہر طرح کی جائز آزادی دے رکھی تھی۔ ایک دوسرے کے پڑوسی ہونے کے باعث دونوں گھرانوں کے آپس میں اچھے تعلقات تھے۔

ذویا کیمپس کے بزنس ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ کے زین ملک کو پسند کرتی تھی...... اور یہ پسندیدگی پچھلے چند سالوں کی دوستی کے ساتھ اب محبت میں بدل چکی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور دونوں نے شادی کا فیصلہ بھی کر لیا تھا...... جو کہ ان دونوں کی اسٹڈیز کے مکمل ہونے پر طے کی جانی تھی......

البتہ زین اپنا ایم بی اے کمپلیٹ کرنے سے پہلے ذویا کے گھر اپنا پروپوزل بھجوانا چاہتا تھا کیونکہ وہ کسی بھی صورت ذویا کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے زین نے اس سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اگلے ہفتے اپنے پیرنٹس کو اس کے گھر بھیج رہا ہے...... لیکن ذویا نے ابھی اسے ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔ کیونکہ ذویا کو اس بارے میں اپنی بیسٹ فرینڈ مایا سے ضروری بات کرنی تھی۔ وہ مایا سے شیئر کیے بغیر کوئی فیصلہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا مایا سے بہتر مشورہ اسے کوئی دوسرا نہیں دے سکتا تھا۔ اسی لیے انہوں نے آج دن کی تمام کلاسز آف ہونے کے بعد آڈیٹوریم کا رخ کیا تھا۔

وہ دونوں اکثر کیمپس کے آڈیٹوریم ہال کی بیرونی سیڑھیوں پر سر جوڑے بیٹھی پائی جاتی تھیں۔ پورے کیمپس میں یہ ان کی فیورٹ پلیس تھی اور ذویا کے بات کرنے پر مایا نے اس کی زندگی کے اتنے اہم فیصلے سے متعلق کوئی بہت اہم مشورہ دینے کے بجائے انتہائی غیر سنجیدہ رویے کا مظاہرہ کیا تھا۔ اسے اپنے دل و دماغ سے محبت نامی خناس کو نکالنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ محبت کے ذکر پر ایسے ہی نان سیریس رویہ اختیار کر لیتی تھی۔

ذویا یہ بھی جانتی تھی وہ محبت کے منکرین میں سے نہیں تھی مگر محبت کو وقت کا زیاں ضرور قرار دیتی تھی۔ شاید اس لیے کہ محبت پر سے اس کا اعتبار بہت پہلے اٹھ چکا تھا۔ وہ ایک بروکن فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ جہاں اس نے آپس میں محبت کی شادی کرنے والے والدین کا حشر دیکھ لیا تھا، ان میں ڈائیورس ہو چکی تھی۔ جب وہ کلاس فورتھ یا ففتھ میں تھی۔ اس لومیرج کے دس سال بعد مایا کے پاپا منصور خان کی زندگی میں ایک دوسری عورت آ گئی جس کی محبت میں مبتلا ہو کر انہوں نے اپنی بیوی مائرہ کو طلاق دے دی۔ منصور نے مائرہ کو چھوڑ کر سارہ نامی حسین بلا سے شادی کر لی...... اور سارہ کے ساتھ ہمیشہ کے لیے امریکا سیٹل ہو گئے۔

اگرچہ مائرہ نے منصور خان سے اپنی فیملی کی مخالفت کے باوجود پسند کی شادی کی تھی مگر منصور کے

ڈائیورس دینے کے بعد مائرہ کی فیملی نے اسے معاف کر کے اپنے پاس بلالیا تھا۔ اس کی فیملی اتنی گئی گزری نہیں تھی کہ بیٹی اور نواسی کو سپورٹ نہ کرتی...... البتہ مائرہ کے دل سے منصور کی بے وفائی کے باعث محبت کا خمار اتر جانے کے بعد اس کے والدین نے اسے زندگی کی تلخ سچائیوں کا آئینہ ضرور دکھا کر اتنا سمجھایا کہ منصور خان کی بے وفائی کو روگ بنانے کے بجائے اسے زندگی سے اپنے حصے کی باقی خوشیاں پانے اور سب کچھ بھول کر نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ مائرہ نے اپنی مرضی کا فیصلہ کر کے اس کا انجام دیکھ لیا تھا۔ سو اس بار اس نے ماں، باپ کے فیصلے پر خاموشی سے رضامندی کی مہر ثبت کر دی تھی۔ جس کے بعد اس کے بابا حشام حسن نے اس کی دوسری شادی کر دی۔ مایا کو انہوں نے اپنے پاس ہی رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جسے مایا کی بھلائی کے پیشِ نظر مائرہ نے مان لیا تھا اور منصور کی طرح مائرہ بھی اپنے کزن کے ساتھ بیاہ کر انگلینڈ سیٹل ہو گئی۔ حالانکہ مائرہ بیٹی کو اپنے ساتھ انگلینڈ لے کر جانا چاہتی تھی لیکن حشام حسن نے یہ کہہ کر بیٹی کو سمجھا لیا کہ دس سالہ بیٹی کو کسی دوسرے شخص کو باپ کی حیثیت سے قبول کرنے میں وقت لگنے کے ساتھ بہت سی دیگر مشکلات بھی پیش آ سکتی ہیں۔

یوں مائرہ ماں، باپ کے سمجھانے اور تسلی دلانے پر منصور خان کی بے وفائی کا داغ دل میں چھپا کر عون رضوی کے ساتھ انگلینڈ رخصت ہو گئی۔ اور تب سے مایا کی پرورش اس کے نانا، نانی نے کی تھی جنہیں وہ ماں کی طرح بابا، اماں کہتی تھی۔

یونہی ماہ و سال کی گردش میں گم ہو کر مائرہ اور منصور خان اپنی اپنی نئی زندگیوں میں مگن ہو کر معصوم بیٹی کو فراموش کر بیٹھے۔ مائرہ کے تو اکثر لندن سے فون آتے رہتے لیکن منصور نے سارہ کے ساتھ اپنی نئی زندگی شروع کر کے پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا تھا۔ جیسے انہیں خوف ہو کہ پلٹ کر پیچھے دیکھنے والے پتھر کے ہو جاتے ہیں۔ دوسری جانب مایا کی تعلیم و پرورش کی

> سچائی: ایسی دوا ہے، جس کی لذت کڑوی مگر تاثیر شہد سے زیادہ میٹھی ہے۔
> ذہانت: ایسا نادر پودا ہے جو محنت کے بغیر نہیں لگتا۔
> خوش اخلاقی: ایسی خوشبو ہے جو میلوں دور سے محسوس ہو جاتی ہے۔
> گناہ: ایسی لعنت ہے جو قلب کو سیاہ کر دیتی ہے۔
> دعا: ایسا عمل ہے جو تقدیر کو مات دے لیتا ہے۔
> توبہ: ایسا دروازہ ہے جو موت کی ہچکی تک کھلا رہے گا۔
>
> مرسلہ: عذرا رضوی، کراچی

ذمے داری اس کے نانا حشام حسن نے بخیر و خوبی .... اٹھائی تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے خوش اسلوبی سے نبھایا تھا مگر افسوس کہ اس سفر میں ان کی شریکِ سفر زیادہ عرصے ساتھ نہیں رہ سکیں...... اور طبعی موت کے باعث انہیں تنہا چھوڑ گئیں...... لیکن مایا کے ساتھ نے انہیں تنہا رہنے نہیں دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ مایا کی محبت اور ذمے داری کے احساس نے حشام حسن کو کمزور نہیں ہونے دیا تھا۔

ان دنوں وہ اسلام آباد میں ریٹائرڈ... زندگی گزار رہے تھے۔ اگرچہ نواسی کی پرورش میں انہوں نے کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ مگر ماں، باپ کی فطری محبت اور حیثیت کا خلا وہ اس کی زندگی میں کبھی پُر نہیں کر سکتے تھے۔ اور مایا کی زندگی میں ماں، باپ کے یوں چھوڑ کر چلے جانے سے محبت پر اعتبار کرنے کا خانہ ہمیشہ کے لیے خالی رہ گیا۔ جس کو وہ چاہ کر بھی پُر نہیں کر سکے تھے۔ اگرچہ وہ بے حد ذہین اور خود اعتماد لڑکی تھی لیکن شفقتِ پدری اور ممتا کی محبت پر اس کا اعتماد کبھی بحال نہیں ہو سکا۔ اس نے اس چھوٹی عمر میں ماں، باپ کا ساتھ ہی نہیں کھویا...... بلکہ مقدس محبت کے ان رشتوں پر سے اپنا اعتماد بھی ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا۔

اگرچہ وہ محبت کی انکاری نہیں تھی مگر اسے محبت میں بننے والے رشتوں پر اعتبار نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سب کچھ

جانتے ہوئے بھی ذویا کو مایا سے شکایت نہیں تھی۔ وہ اس سے ناراض بھی نہیں تھی۔ وہ مایا سے ناراض رہ بھی نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ وہ مایا کو بچپن سے جانتی تھی اور اسے مایا سے ہمدردی نہیں' محبت تھی...... اور کیا ہوا جو مایا کو محبت میں بننے والے رشتوں پر اعتبار نہیں تھا۔ اسے اپنی اور ذویا کی دوستی پر تو اعتبار تھا ناں...... اور ذویا کے لیے یہی اعتماد کافی تھا......

☆☆☆

"تو پھر کیا سوچا تم نے ذویا......؟"

"کس بارے میں......؟" ذویا نے چونک کر زین کی آنکھوں میں دیکھا۔ جہاں جواب کے بجائے خفگی کا ہلکا سا تاثر جھلک رہا تھا۔ آج وہ بہت دنوں بعد زین کے اصرار پر مارگلہ ہلز کے دامن میں نئے کھلنے والے شاندار سے ریسٹورنٹ کے کافی ہال میں بیٹھے تھے۔ موسم بھی بارش کے بعد بہت خوب صورت ہو رہا تھا اور زین نے ٹیکسٹ کر کے اسے یہیں بلایا تھا۔ ورنہ زین کے ساتھ ہوٹلنگ کرنے کی وہ بالکل عادی نہیں تھی۔ اس نے ماں، باپ کی دی ہوئی آزادی اور اعتماد کا کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا تھا...... مسئلہ چونکہ بہت سیریس تھا سو اس کا آنا بنتا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ زین کی آنکھوں سے جھلکتی خفگی کا تاثر مزید گہرا پڑتا۔ ذویا نے فوراً سے بیشتر اس سے معذرت کر لی۔ لہٰذا زین نے سنجیدگی سے نئے سرے سے اپنی بات کا آغاز کیا تھا۔

"میں اپنی اور تمہاری شادی کی بات کر رہا تھا ذویا...... اپنا پروپوزل لے کر میں اپنے پیرنٹس کو تمہارے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہماری اسٹڈیز کمپلیٹ ہونے سے پہلے کم از کم ہمارا رشتہ طے ہو جائے اسی لیے پچھلے ایک ہفتے سے تم سے ملاقات کے لیے وقت مانگ رہا ہوں اور تم اب تک فیصلہ ہی نہیں کر پائی ہو کہ انکل، آنٹی سے اس بارے میں کب بات کرو گی۔"

شرمندگی کا تاثر اب ذویا کے چہرے پر تھا۔

"آئی ایم سوری زین...... ایکچوئلی وہ میں نے مایا سے......"

"او کم آن ذویا...... پلیز اب یہ مت کہنا کہ تم اس بارے میں مایا سے مشورہ لے کر فیصلہ کرو گی۔ کیونکہ اگر تم نے ایسا کیا تو یاد رکھنا ہماری لو اسٹوری کا دی اینڈ یہیں پر ہو جائے گا اور میں کنوارہ مرنا نہیں چاہتا۔" اس نے بڑے جذباتی انداز میں آخری جملہ ادا کیا۔ اس بار ذویا نے خفگی سے گھور کے زین کی طرف دیکھا۔

"اسٹاپ اٹ زین...... آئندہ کبھی مرنے' مارنے کی بات مت کرنا۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" خفا ہوتے ہوئے ذویا کے لہجے میں کپکپاہٹ کے ساتھ آنکھیں بھی چھلکنے کو بے تاب تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ باقاعدہ زین کی مرنے والی بات پر آنسو بہانے بیٹھ جاتی زین نے بے ساختہ دونوں ہاتھوں سے اپنے دونوں کانوں کو پکڑ لیا۔ ذویا اس کی بے ساختہ حرکت پر روتے' روتے ہنس پڑی پھر چند لمحوں بعد سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

"آئی ایم سوری زین...... مگر مایا میری دوست ہے، مجھے بہت عزیز بھی ہے۔ وہ جانتی ہے ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے کیا حیثیت رکھتے ہیں...... وہ محبت کے منکرین میں سے نہیں ہے زین...... بس محبت میں بننے والے رشتوں پر اسے اعتبار نہیں ہے۔ اور ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ تم بھی جانتے ہو...... وہ ہماری محبت کے خلاف بھی نہیں ہے۔ تم بے فکر رہو۔ اس نے مجھے کوئی غلط مشورہ بھی نہیں دیا ہے۔ بس وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اس لیے ...میری بہت پروا ہے اسے......" ذویا نے نرمی سے مایا کی پوزیشن کلیئر کی۔

"میں مایا سے بدگمان نہیں ہوں ذویا...... مگر اتنا ضرور جانتا ہوں۔ اگر تم اپنی دوست کو خوش اور ایک نارمل زندگی جیتے دیکھنا چاہتی ہو تو مایا کا محبت کے رشتوں پر اعتماد ایک ہی صورت میں بحال ہو سکتا ہے۔ جب وہ کسی کی محبت پر اعتبار کرے...... اسے کسی سے

سچی محبت ہو جائے۔''

''مگر ایسا ہونا ممکن نہیں ہے زین۔''

زویا نے برجستہ کہا۔

''تو پھر میں دعا کروں گا کہ مایا سے کسی شخص کو سچی محبت ہو جائے۔ اسے واقعی کسی محبت کرنے والے شخص کا ساتھ مل جائے جو اس کے ٹوٹے ہوئے اعتبار کو پھر سے جوڑ دے، کبھی نہ ٹوٹنے کے لیے۔'' زین نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔

''اللہ کرے...... ایسا ہو جائے۔'' زویا نے اس کی بات پر دعائیہ انداز میں کہا۔

''ایسا ہونا ناممکن بھی نہیں ہے زویا......''

''ہاں...... اور ہماری بھی لو میرج ہوگی...... ہمارے ساتھ تو مایا کے پیرنٹس کی طرح نہیں ہوگا ناں زین......؟ تم کبھی میرا ساتھ تو نہیں چھوڑو گے...... میرا اعتماد تو نہیں توڑو گے؟'' یہ شاید مایا کی باتوں کا اثر تھا۔ زویا کے لہجے میں مستقبل کے حوالے سے ہراس در آیا تھا۔ اس کے لہجے میں یاسیت دیکھ کر زین نے پورے خلوص کے ساتھ اپنا ہاتھ زویا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''ہر شخص منصور خان جیسا نہیں ہوتا زویا...... اور ضروری نہیں ہے کہ ہر لو اسٹوری یا لو میرج کا انجام ناکامی ہی ہو...... محبت آسانی سے ختم ہونے والی چیز تو نہیں ہوتی...... اور نہ ہی محبت کا جذبہ اتنا کمزور ہوتا ہے، میرا یقین کرو زویا...... میری محبت تمہارے لیے کبھی کمزور نہیں پڑے گی۔ میں کبھی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔'' زویا کی آنکھیں تشکر سے چھلک پڑیں اور اس بار اس کی آنکھوں میں خوشی کا تاثر ہلکورے لے رہا تھا، زین کی محبت کے یقین کا گہرا تاثر...... اب شاید زویا کو کسی یقین دہانی کی ضرورت نہیں پڑنے والی تھی۔ وہ دونوں بڑے خوشگوار موڈ میں کافی پی کر وہاں سے اٹھے تھے۔ واپسی پر زویا نے وعدہ کیا تھا کہ وہ آج ہی اپنے پیرنٹس سے اس پروپوزل کے بارے میں بات کرے گی اور زویا کو یقین تھا کہ اس کے پیرنٹس زین کے گھر والوں کو کبھی مایوس نہیں کریں گے۔

☆☆☆

اور کچھ دن بعد ایسا ہی ہوا تھا۔ زین اپنے پیرنٹس کے ساتھ ذویا کے گھر آیا تھا۔ جہاں زین کے ماں، باپ نے بڑی محبت و انکساری سے ذویا کے لیے اپنے بیٹے کا پروپوزل پیش کیا تھا۔ ذویا کے پیرنٹس کو زین اور اس کی فیملی پسند آئی تھی۔ اس کے اسٹرانگ فیملی بیک گراؤنڈ اور برائیٹ فیوچر نے ذویا کے پیرنٹس کو اس پروپوزل پر غور کرنے پر مجبور کردیا۔ زین کے پاپا کا اپنا لیدر گارمنٹس کا بزنس تھا جسے آگے جا کر زین نے ہی سنبھالنا تھا۔ لہٰذا انہوں نے جواب دینے کے لیے کچھ وقت مانگا تھا۔

اور یوں ٹھیک ایک ماہ بعد ذویا اور زین کی منگنی کی رسم طے کردی گئی۔ شادی دونوں کی اسٹڈیز مکمل ہونے پر رکھی گئی۔ وہ دونوں بہت خوش تھے اور مایا اپنی دوست کی خوشی میں واقعی خوش تھی۔

☆☆☆

آج ذویا اور زین کی زندگی کا بہت بڑا دن تھا۔ ان کی منگنی کی رسم ادا کی گئی تھی اور اس خوشی کے موقع پر ان دونوں کے ساتھ، ساتھ ان کے ساتھ تعلق رکھنے والا ہر شخص اس خوشی میں خوش تھا۔ چاہے وہ مایا اور اس کے نانا حشام حسن ہوں یا ذویا کی فیملی اور دیگر دوست...... سوائے ایک شخص کے جو اس خوشی کے موقع پر اداس نظر آیا تھا۔ آج پہلی بار مایا نے اس شخص کی آنکھوں میں محبت کی جگہ گہری اداسی کی دبیز دھند کو اترتے دیکھا تھا۔

عالیان، زین کا جگری دوست ہی نہیں کلاس فیلو بھی تھا اور ان دونوں کا یونیورسٹی فیلو بھی تھا۔ اس لیے آج وہ بھی ان دونوں کی خوشی میں شریک تھا...... لیکن مایا کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ہمیشہ نظر آنے والی مایا کی محبت کی جگہ اداسی کے رنگوں نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ شاید اس لیے کہ مایا نے دانستہ طور پر ہمیشہ کی طرح آج بھی عالیان کی ذات کو اگنور کیا تھا۔ اور اسی بات نے شاید اسے ہرٹ کیا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں لکھی داستان کا مفہوم جانتے ہوئے بھی انجان بنی رہتی...... اسی لیے ذویا اور زین کے اصرار کے باوجود وہ مزید وہاں نہیں رکا۔

رات گئے جا کر پارٹی کا اختتام ہوا تھا۔ مایا نے بینکوئیٹ ہال سے واپسی پر رات کو اپنے نانا کو انگیجمنٹ پارٹی کا احوال بتانے کے بجائے اپنے روم کا رخ کیا۔ کیونکہ حشام حسن اپنی طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے اس میں شریک نہیں ہوسکے تھے اور انہوں نے پہلے ہی معذرت کرلی تھی۔

اس وقت نیند مایا کی آنکھوں سے غائب تھی۔ وہ چینج کر کے آ کر دریچے کے پاس کھڑی ہوگئی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی سوچوں کا رخ عالیان کی طرف خود بخود ہوگیا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں کی گہری اداسی نے مایا کو سوچنے پر مجبور کردیا۔ وہ عالیان کی آنکھوں کے رنگوں سے واقف تھی بلکہ اس میں لکھی تحریر کو بھی بخوبی پڑھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ کیونکہ عورت فطری طور پر اپنے اوپر پڑنے والی مرد کی ہر نظر کے مفہوم کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مایا بھی عالیان کے دل کے احوال سے بے خبر نہیں تھی مگر انجان ضرور بن جاتی تھی۔ اس کی زندگی میں اس محبت نامی جذبے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ محبت میں کوئی نیا رشتہ بنانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ سالوں بعد محبت کی پھر ایک نئی کہانی شروع ہوجائے۔ جس کا انجام بالآخر اس کے والدین کی محبت جیسا ہو اور ایک نئی مایا پھر سے جنم لے۔ وہ اس اذیت میں کسی اور کو مبتلا نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ جس اذیت میں وہ خود مبتلا تھی۔ اور گزرتے وقت کے ساتھ اس اذیت میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ اسی لیے عالیان کے اپنے لیے جذبات کی آنچ سے لودیتی آنکھوں میں دیکھنے سے گریز برتتی آئی تھی۔ وہ اس راستے پر قدم رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ جس پر چل کر سفر کے اختتام پر تھکن وجود پر ہی نہیں دل و دماغ پر بھی اتر آتی ہے۔

اور شکر تھا کہ ذویا اس سچائی سے بے خبر تھی۔ شاید عالیان نے بھی زین کو اس بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ ورنہ ذویا نے تو عالیان کی وکالت میں مایا کے دل

کی چوکھٹ پکڑ لینی تھی۔ اور وہ تب تک ہار نہیں مانتی...... جب تک مایا، عالیان کی محبت کو اعزاز و احترام کے ساتھ قبول نہیں کر لیتی۔ سو اب وہ پُرسکون تھی کہ عالیان نے اپنی وارداتِ قلبی کی ہوا کسی کو بھی لگنے نہیں دی تھی۔ مایا کے لیے یہ اطمینان کافی تھا اور اسے یقین تھا کہ ایک دن عالیان اس کی طرف سے مایوس ہو کر تھک کر اپنی سمت بدل لے گا۔ کیونکہ مایا کے نزدیک مرد کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ سمت بدلنے والی، پڑاؤ دوسری جگہ ڈال لینے والی۔ البتہ ذویا اور زین کو اس نے خلوصِ دل سے دعائیں دی تھیں۔

وہ جانے کب سے دریچے کے ساتھ لگی کھڑی اپنی سوچوں میں گم تھی۔ باہر بارش شروع ہو چکی تھی۔ یک دم تیز ہوا کے ساتھ پھوار نے مایا کے رخسار کو بھگویا تو وہ چونک کر دریچے کے پار لان میں برستی بارش میں بھیگتے پودوں کو دیکھنے لگی۔ جو لان میں جگہ جگہ لگے پوسٹ لیمپ کی روشنی میں ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔

وہ رات دیر تک کھڑی بارش دیکھتی رہی تھی پھر تھک کر آ کر سو گئی۔ بے خوابی سے زیادہ سوچوں کی تھکن نے نڈھال کر دیا تھا۔

اگلی صبح زین اپنی خوشی کو سیلیبریٹ کرنے کے لیے اپنے جگری یار عالیان کو ٹریٹ دینے کافی شاپ میں موجود تھا۔ پچھلی رات شہر میں خوب بارش ہوئی تھی۔ جس کے باعث موسم کسی حد تک خوشگوار ہو گیا تھا۔ اور آج کی صبح بہت نکھری ستھری اور خوش رنگ نظر آ رہی تھی۔ یا پھر زین کو ہی اپنے دل کے خوش رنگ موسم کی طرح باہر کے سارے منظر بھی خوش رنگ نظر آ رہے تھے۔ ورنہ بارشوں کے موسم ہمیشہ اداس کر دینے والے ہوتے ہیں۔ اور اس وقت عالیان کے چہرے پر بھی خزاں کا زرد اداس موسم اترا ہوا تھا۔ وہ اپنی محبت کا اظہار زین کے سامنے اس طرح کر رہا تھا جیسے میدانِ کارزار میں ہارنے والا کھلاڑی اپنی شکست کا اعتراف کرتا ہے۔

”میں اپنے آپ سے لڑتے لڑتے ہار گیا ہوں

زین......اور محبت مجھ سے جیت گئی ہے مگر میں جانتا ہوں میں تمہاری طرح خوش نصیب نہیں ہوں۔ مجھے میری محبت کبھی نہیں ملے گی۔ کیونکہ وہ محبت کے منکرین میں شامل ہے۔ وہ کبھی میری محبت کو قبول نہیں کرے گی۔ وہ کبھی میری محبت پر بھروسا نہیں کرے گی۔'' اور زین حیرت و استعجاب سے شکست خوردہ جذبات سے نڈھال سامنے بیٹھے عالیان کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس وقت واقعی ہارا ہوا لگ رہا تھا۔ زین کو اب اس کی حالت پر دکھ ہو رہا تھا۔

''محبت......؟ تم کس سے محبت کرتے ہو عالیان؟'' زین کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

اور عالیان نے جواب دینے کے بجائے اس کی طرف افسردہ نگاہوں سے دیکھ کر ایسے سر جھکا لیا جیسے اب اس میں کچھ بھی کہنے کا حوصلہ باقی نہیں رہا ہو۔

''کون ہے وہ؟ تم نے پہلے کبھی بتایا کیوں نہیں عالیان......تم کسی سے محبت کرتے ہو...... میں تو تمہارا بیسٹ فرینڈ ہوں......مگر تم نے اتنی بڑی بات مجھ سے شیئر نہیں کی؟''

زین کے لہجے میں اب حیرت کی جگہ شکوے نے لے لی تھی۔

''میں تو اس کے سامنے ہی اس سچائی کا اعتراف نہیں کر سکا زین......! پھر تمہیں کس حوصلے کے ساتھ بتاتا...... میں جس سے محبت کرتا ہوں، وہ میری طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی...... حالانکہ میں اسے بتانا چاہتا تھا مگر شاید وہ آنکھوں کی زبان پڑھنے کی ماہر نکلی......اس نے میری آنکھوں میں اپنا عکس دیکھ کر مجھے اتنی بری طرح اگنور کیا ہے کہ میں دوبارہ اس کا سامنا کرنے کا حوصلہ تک کھو بیٹھا ہوں۔'' زین افسردگی اور پُرتاسف انداز میں عالیان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں جانتا ہوں، میں اس کے بغیر زندگی جی نہیں سکوں گا، پر میں اسے کبھی یہ نہیں کہہ سکوں گا زین......کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔''

اور زین کا دل اپنے بے حد وجیہہ، خوبرو اور مضبوط اعصاب کے مالک، جگری دوست کو اس شکستہ حالت میں دیکھ کر دکھ سے رو رہا تھا۔

''کون ہے وہ......؟ پلیز...... یہ مت کہنا کہ وہ ہمارے ہی کیمپس میں پڑھتی ہے۔'' اور اس نے ڈرتے ڈرتے عالیان کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

زین نے واقعی خوف زدہ لہجے میں عالیان کی سرخ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ ہمارے ہی کیمپس میں پڑھتی ہے اور تم اس سے اچھی طرح واقف ہو۔''

اور اب کسی شک کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ عالیان کے لبوں سے نکلے لفظوں نے زین کے دل کے سارے خدشوں کی لمحوں میں تصدیق کر دی تھی۔ اس کے لبوں سے بے ساختہ کسی کا نام ادا ہوا تھا۔

''مایا...ہ تم مایا سے محبت کرتے ہو عالیان......؟''

زین نے ایسے لہجے میں کہا جیسے کہہ رہا ہو کہ اس نے غلط اندازہ لگایا ہے۔ جیسے عالیان ابھی کہہ دے گا کہ نہیں وہ لڑکی مایا نہیں ہے مگر عالیان نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا اور عالیان کی خاموشی سے جواب اخذ کر کے زین چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا تھا مگر جب بولا تو عالیان کو لگا کہ زین کہہ رہا ہو۔

''اب تم کیا کرو گے عالیان......؟'' اور عالیان کو لگا جیسے زین کہہ رہا ہو کہ اب تم زندہ کیسے رہو گے۔ عالیان اب بھی خاموش رہا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد خود کو کمپوز کرنے کے بعد بولا تھا۔

''اگر آنکھوں کی زبان پڑھنے والے دل کا حال جان کر بھی انجان بنے اپنے قدم آپ کی جانب سے موڑ لیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ ان کی زندگی اور دل میں آپ کی کوئی وقعت نہیں اور مایا کی آنکھوں کے سرد تاثر اور رویّے نے مجھے اسی وقت باور کرا دیا تھا کہ میں واقعی ہار گیا ہوں۔ میں کبھی اس سے جیت نہیں سکوں گا۔''

اور اپنے عزیز ترین دوست کو مایوسی و شکستگی کی آخری حدوں پر دیکھ کر زین کا دل بھر آیا تھا۔

''تم ہاری ہوئی بازی جیت بھی سکتے ہو عالیان......!'' عالیان کے مایوس شکستہ جھکے ہوئے

چہرے نے بے ساختہ غیر یقینی انداز میں سامنے بیٹھے زین کی طرف پُر امید نگاہوں سے دیکھا۔

وہ مایوسی کی جس انتہا پر تھا وہاں کچھ بولنے سے زیادہ امید کی چھوٹی سی کرن کو بھی تھامنا چاہتا تھا۔ اسی لیے خاموش رہا تھا۔

''اگر تم ہاری ہوئی بازی جیتنا چاہتے ہو تو اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔'' زین نے سنجیدہ اور بڑے مستحکم لہجے میں کہا۔

''وہ کیا ہے زین......؟ تم بتاؤ...... میں ہر راستے پر چلنے کے لیے تیار ہوں۔''

عالیان نے بے ساختہ کہا تھا۔

''تم مایا سے اپنی محبت کا اظہار ہرگز مت کرنا...... اسے مت بتانا کہ تم اس سے کتنی محبت کرتے ہو۔''

''کیا...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو زین؟'' عالیان نے حیرت واستعجاب بھرے لہجے میں کہا۔

''اگر تم مایا کو پانا چاہتے ہو تو سیدھے طریقے سے اس کے گھر اپنا پروپوزل بھیج دو۔ وہ چاہے محبت نہ کرے مگر شادی تو اسے کرنی ہی پڑے گی پھر چاہے وہ تم ہو یا کوئی اور شخص...... اور اس کے بعد سب کچھ قسمت پر چھوڑ دو کیونکہ ہم انسانوں سے لڑ سکتے ہیں مگر اپنی قسمت سے نہیں۔''

اور عالیان خاموش ہو گیا تھا۔ اب اس کی آنکھوں میں اداسی اور مایوسی کی جگہ امید نے لے لی تھی۔ وہ خوش نما آس جس نے عالیان کے دل کے ساتھ اس کے وجود کو بھی ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔ زین نے صدقِ دل سے اپنے عزیز از جان دوست کی خوشیوں کی دعا کی تھی۔

☆☆☆

لندن سے مائرہ کا فون آیا تھا۔ ناشتے کی ٹیبل پر حشام حسن بہت خوش نظر آرہے تھے۔ مایا خاموشی سے ناشتا کرنے میں مگن تھی۔

''مایا...... آج صبح لندن سے تمہاری ماما کا فون آیا تھا۔'' حشام حسن نے بڑی سنجیدگی سے جملہ کہا تھا۔

اور فوک میں فرائڈ ایگ کا پیس پھنساتے ہوئے

سیاست

ایک برطانوی طالب علم اپنی دوست طالبہ سے کہہ رہا تھا۔ ''میں پہلے جا کر اپنا بیروزگاری الاؤنس کا چیک لوں گا پھر یونیورسٹی جا کر دیکھوں گا کہ میرا تعلیمی وظیفے کا چیک ابھی تک کیوں نہیں پہنچا...... اس دوران میں تم اسپتال سے اپنا فری چیک اپ کرا لینا اور واپس آتے ہوئے فری ہیلتھ سینٹر سے میرا چشمہ بھی لیتی آنا۔ وہاں سے تم فوڈ اسٹیمپ لینے چلی جانا اور کوآپریٹو اسٹور سے مفت کھانے پینے کی چیزیں لیتی آنا...... ٹھیک تین بجے تم مجھے 10 ڈاؤننگ اسٹریٹ کے سامنے ملنا...... وہاں ہم حکومت کے خلاف جلوس میں شریک ہوں گے۔''

رونے کا فائدہ

امریکا کے ایک ممتاز ماہرِ نفسیات ڈاکٹر ولیم فیری نے اپنی طویل تحقیق کے بعد انکشاف کیا ہے کہ آنسوؤں کا انسان کی صحت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ ان کی تحقیق کے نتیجے میں یہ بات ظاہر ہوگئی ہے کہ جذباتی دباؤ کے وقت انسانی جسم میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور جسم کے اندر مختلف غدودوں سے ایک خاص مواد نکل کر خون میں شامل ہو جاتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ رونے کے بعد انسان خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔ ڈاکٹر فیری کا خیال ہے کہ جذباتی دباؤ کے نتیجے میں جسم میں کیمیاوی عمل ہوتا ہے۔ وہ آنسوؤں کے ذریعے زائل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ روتے نہیں ہیں وہ مختلف قسم کے امراض اور بالخصوص السر کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر فیری نے تحقیق کی ہے کہ عورتوں کی نسبت مرد زیادہ السر کے مریض ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ جذباتی آنسو پیاز کے ذریعے بہنے والے آنسوؤں سے کیمیاوی طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر فیری نے سو افراد کو پیسے دے کر ان کے آنسو حاصل کیے اور ان پر مختلف تجربے کیے ہیں۔

مرسلہ: فاطمہ حسن، اسلام آباد

مایا نے چونک کر سپاٹ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ البتہ اس کی آنکھوں میں تعجب ضرور تھا۔ انہیں بھی اس کے سرد ردِعمل کا اندازہ تھا۔ اسی لیے بات کو خود ہی آگے بڑھایا تھا۔

''وہ تمہیں اپنے پاس لندن بلوانا چاہتی ہے۔ تمہیں یاد ہے ناں...... اس نے تم سے وعدہ کیا تھا۔''

''اور اتنے سالوں بعد انہیں اپنے وعدے کی پاسداری کا خیال آیا ہے؟'' مایا کے لہجے میں طنز نہیں تھا۔ شکایت بھی نہیں تھی البتہ لہجے میں بے پروائی ضرور تھی۔ جیسے اب اسے کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حشام حسن خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''اس وقت تمہارے لیے یہی مناسب تھا مایا...... کیا میں نے اپنی پرورش اور محبت میں کوئی کمی رکھی؟'' وہ سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''نہیں بابا...... آپ نے کہیں کوئی کمی نہیں رکھی۔ اسی لیے میری زندگی میں کسی اور محبت کی ضرورت نہیں ہے...... اور پھر اب میں وہاں جا کر کیا کروں گی...... میری وجہ سے خواہ مخواہ ان کی پرسنل فیملی لائف ڈسٹرب ہوگی۔ آپ انہیں منع کر دیں بابا...... میں وہاں نہیں جانا چاہتی...... میں آپ کے پاس ہی خوش ہوں۔'' وہ ناشتا ادھورا چھوڑ کے اٹھنا چاہتی تھی۔ تب حشام حسن نے برجستہ کہا۔

''تو پھر تمہیں کہیں اور جانا پڑے گا مایا...... کیونکہ اب میں تمہیں اس گھر میں زیادہ دن نہیں رکھ سکتا۔''

اور مایا شاکڈ کھڑی بابا کے پُرسکون چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اور تب اسے ہونقوں کی طرح سراسیمہ دیکھ کر حشام حسن کو اس پر ترس آ گیا۔ وہ شگفتگی سے مسکرانے لگے۔

''ارے بھئی...... میں نے ساری زندگی تمہیں اس گھر میں بٹھا کر تھوڑی رکھنا ہے۔ تمہاری اسٹڈیز کمپلیٹ ہو رہی ہیں، میں تمہاری شادی کے بارے میں سوچ رہا ہوں اور ایک بہت اچھا پروپوزل بھی تمہارے لیے آیا ہوا ہے۔'' اس بار واپس چیئر پر...... بیٹھتے ہوئے مایا نے شکایتی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

''آپ مجھے بوجھ سمجھنے لگے ہیں بابا؟'' مایا کی آنکھوں میں افسردگی بھرا شکوہ تھا۔

''بوجھ نہیں بیٹا...... ذمے داری......! تم میری ذمے داری ہو بیٹا...... اور بیٹیوں کی ذمے داری سے جتنی جلدی ہو سکے فارغ ہو جانا بہتر ہوتا ہے۔ تم چاہو تو لڑکے سے مل سکتی ہو...... مجھے تو وہ لڑکا اور اس کی فیملی بہت پسند آئے ہیں مگر تمہاری رضا مندی پہلے ضروری ہے پھر میں کوئی فیصلہ کروں گا۔''

''آپ میری مرضی کے بغیر ایسا کیسے کر سکتے ہیں بابا؟''

''پلیز مایا...... اب یہ مت کہنا کہ تم شادی کرنا نہیں چاہتی ہو...... بھئی میرے نزدیک اس دنیا میں خودکشی کرنے والے اور شادی نہ کرنے والے دونوں ہی بزدل اور ابنارمل ہوتے ہیں اور میں جانتا ہوں میری بیٹی بہت بہادر ہے۔''

حشام حسن نے محبت اور مان سے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ وہ محبت کرے نہ کرے مگر شادی تو اسے کرنا ہی پڑے گی۔ وہ بابا کا دل نہیں توڑ سکتی تھی پھر کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کون ہے، کیا کرتا ہے، پاپا کے پاس ہزار دلائل ہوتے اسے قائل کرنے کے لیے...... مگر انہیں اس سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ اس کی خاموشی نے انہیں فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا تھا۔ حد یہ ہے کہ مایا نے ان سے لڑکے کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ نہ تصویر دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ذویا اور زین کو تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ مایا اتنی آسانی سے شادی کے لیے مان جائے گی۔ دوسرے زین نے عالیان کی سچائی بتا کر ذویا کو اس بارے میں مایا سے کوئی بھی بات کرنے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ لہٰذا ذویا نے بھی خوشی کے اظہار کے سوا کوئی سوال جواب نہیں کیے تھے۔ اور یہ یقین حقیقت میں جلد ہی بدل گیا۔ جب چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے مصداق مایا بیاہ کر ان دونوں کی شادی سے پہلے سسرال سدھار گئی۔

ذویا اور زین سے زیادہ آج حشام حسن خوش تھے۔ انہوں نے بہت بڑی ذمے داری ادا کردی تھی۔ اور پھر سب نے مایا کی دائمی خوشیوں کی دعا کے ساتھ اسے رخصت کیا تھا۔

☆☆☆

وہ کافی دیر سے فریش پھولوں سے ڈیکوریٹ کیے گئے ماسٹر بیڈروم کے لگژری بیڈ پر بیڈ کراؤن کے ساتھ رکھے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے ایزی ہو کر بیٹھی تھی اور اس شخص کی آمد کی منتظر تھی جسے بابا نے اس کے لیے زندگی بھر کا ساتھی چنا تھا۔ مگر آنے والے کا اب تک کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ وہ تھکنے لگی تھی جب بائیں جانب سے کسی کے گمبھیر اور مانوس لہجے نے مایا کو چونک کر اسی جانب دیکھنے پر مجبور کردیا۔

''محبت ایک سمت میں سفر کرنے کا نام ہے، ایک جگہ ٹھہر جانا، ایک جگہ پڑاؤ ڈال لینا۔ صرف ایک کو دیکھنا، صرف ایک ہی کو سوچنا...... محبت صرف واحد اور یکتا ہی ہوتی ہے۔ محبت کبھی اپنی سمت نہیں بدلتی۔ اگر محبت ہو تو...... اگر محبت کی سمت بدل جائے تو پھر وہ محبت نہیں ہوتی۔ اور میں محبت میں سمت بدلنے والوں میں سے نہیں ہوں مایا......'' یہ الفاظ اور یہ سوچ مایا کو حیرانی ہوئی تھی۔ بھلا کوئی دوسرا شخص مایا کی طرح ہی محبت کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ مایا حیرت و تعجب سے عالیان کی طرف دیکھ رہی تھی جو بیڈ کی بائیں جانب کھڑا مسکرا رہا تھا۔

نکاح کے وقت وہ اپنی سوچوں میں اس حد تک مگن تھی کہ اسے عالیان کے نام تک کی گردان کا احساس بھی نہیں ہوا۔ مگر محبت کے بارے میں جس سوچ کو لفظوں کا اظہار عالیان نے دیا تھا وہ تو اس کی اپنی سوچ تھی۔ پھر عالیان نے کیسے اس کی سوچوں تک رسائی پائی تھی۔ وہ حیرت و تعجب کی کیفیت میں گھری اسی کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

''تو کیا عالیان کی محبت میں اتنی طاقت اور صداقت تھی کہ اس نے اسے پا کر اپنا آپ منوا لیا تھا؟''

مایا نے دل میں سوچا تھا۔ جبکہ عالیان نے اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھتے ہوئے بیڈ پر اس کے سامنے بیٹھ کر اس کے نازک ہاتھ کی مخروطی انگلیوں کو تھام لیا تھا۔

''زین نے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتادیا ہے۔ میرا یقین کرو مایا...... میں اس کے بعد سے تمہیں پہلے سے زیادہ چاہنے لگا ہوں۔'' مایا جو عالیان کے پہلے جملے پر ساکت ہوئی تھی اگلے جملے پر سپاٹ تاثر کے ساتھ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ جہاں ہمیشہ کی طرح آج بھی صرف محبت نظر آرہی تھی اور اس محبت میں مایا کے وجود کا ہی عکس تھا۔

''تم چاہے میری بات کا یقین مت کرو...... مگر مجھے یقین ہے۔ ایک دن ایسا ضرور آئے گا، جب میں محبت سے بنے اپنے اور تمہارے اس رشتے کو اتنا مضبوط بنادوں گا اور محبت میں بنے رشتوں پر تمہارا اعتماد بحال کرنے میں ضرور کامیاب ہوجاؤں گا۔'' مایا کی آنکھوں میں سے سپاٹ تاثر غائب ہوا تھا۔ اس کی جگہ بے پروائی نے لے لی تھی۔ وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونا نہیں چاہتی تھی مگر عالیان اس کا ہاتھ تھامے جانے محبت کی کن خوش نما وادیوں کی سیر کر وا رہا تھا۔ وہ تو بس خاموشی سے سامنے بیٹھے شخص کے چہرے پر یقین کی روشنی کو دیکھے جا رہی تھی۔

نورِ دیارِ دل اصل میں محبت ہی ہے، محبت دل کا نور ہے اور اب یہ وقت ہی بتاتا کہ عالیان اپنے اس یقین کو کس طرح ثابت کرتا ہے۔

☆☆☆

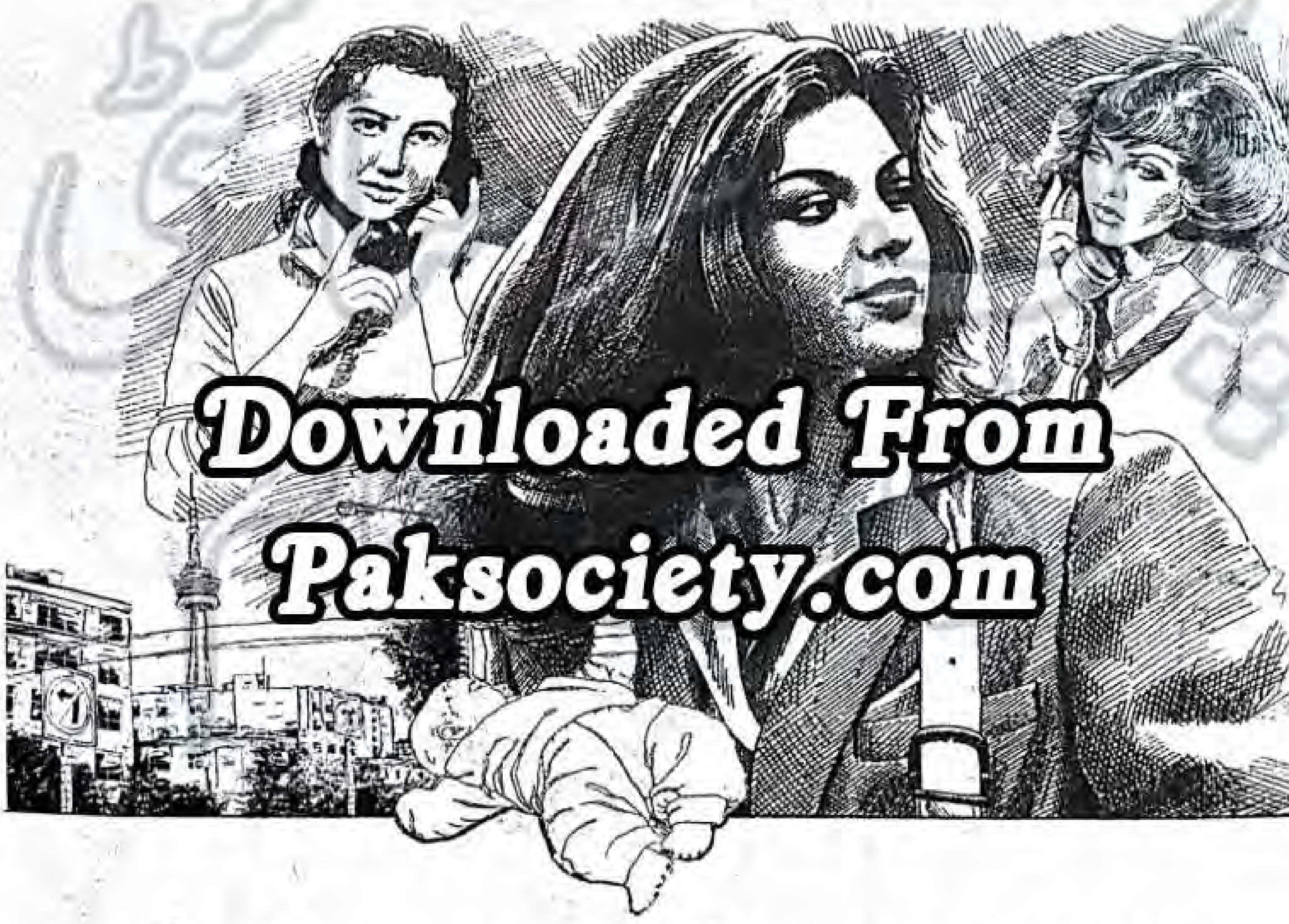
حشام حسن نے فون کر کے مائرہ کو مایا کے لندن جانے کے سلسلے میں صاف انکار کے بارے میں بتادیا تھا۔ اور تب مائرہ نے مایا کی شادی میں پاکستان آکر اسے ڈھیروں دعاؤں کی چھاؤں میں اور ڈھیروں تحائف کے ساتھ عالیان کی ہمراہی میں رخصت کیا تھا۔ اس یقین اور امید کے ساتھ کہ ایک دن مایا کا اپنے اِن کھوئے ہوئے رشتوں پر اعتماد بھی بحال ہوجائے گا۔

منی ناول

چھٹا اور آخری حصہ

زندگی خاک نہ تھی

شیریں حیدر



میرا نام حنا ہے...... اس وقت میں عمر کی پانچویں دہائی کے وسطی سالوں میں ہوں، میری چار بیٹیاں ہیں جو سب شادی شدہ اور اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں۔ آج میں زندگی میں فیصلے کے جس مقام پر کھڑی ہوں، اس کے بارے میں، میں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا...... کم از کم اس وقت تو ہرگز نہیں سوچا ہوگا جب میں کم سن اور حسین تھی، اپنے چہرے کی خوب صورتی اور اپنی ذہانت کو اپنا بہترین سرمایہ سمجھتی تھی



اور معصوم عمر میں بھی اسے برتنا جانتی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ خوب صورت عورت عمر بھر مرد کے دل پر راج کرتی ہے...... میں نے اٹھارہ برس کی معصوم عمر میں اپنے حسن کا جادو اپنی سہیلی کے منگیتر کے سر چڑھ کر بولتا ہوا دیکھا، جسے دیکھ کر میرے اپنے دل کی دھڑکنیں بھی بے ترتیب ہوگئی تھیں۔ کرن کی منگنی ٹوٹی اور میرا نام دانیال سے جڑ گیا۔ میں خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھنے لگی جو انیس برس کی عمر میں خوشیوں کے ہنڈولے میں سوار... ہوگئی تھی۔

میں نے دانیال کو پالیا تو سمجھا کہ ہفت اقلیم کی دولت میرے ہاتھ لگ گئی۔ میں خود کو اپنی ہم جماعتوں سے ممتاز سمجھنے لگی جو ابھی تک کالج جانے کے لیے جوتیاں چٹخا رہی تھیں۔ کیا مقصد ہوتا ہے اتنا پڑھنے کا بھلا؟ اچھی جگہ شادی ہو جانا بس! تو میں نے اپنا مقصد دوسروں سے بہت جلد پالیا تھا۔

زندگی میں پہلا جھٹکا مجھے اس وقت لگا جب میں اپنی پہلی بیٹی کی پیدائش کے وقت اسپتال میں تھی، میں نے ایک پیاری سی بچی کو جنم دیا تھا۔ دانیال اور میں دونوں ہی خوش تھے۔ بچی میرا پرتو تھی اور گلابی گل گوتھنی سی بچی نرسوں کی خصوصی توجہ کی حقدار ٹھہری، جو نرس بھی ڈیوٹی پر آتی وہ خاص طور پر میری بیٹی کو دیکھنے آتی اور میں دانیال کی نظروں کے زاویے دیکھتی جو نرسوں کو تول رہے ہوتے۔ مجھے کرن کی بددعا یاد آئی کہ ”دانیال جس حسین چہرے کو دیکھے، اسی کی طرف لپکے۔“ میں نے خود کو برا کہا کہ زندگی اور موت کی کشمکش میں رہ کر ایک زندگی کو جنم دیا تھا، خود ابھی تک اسپتال میں پڑی تھی اور دانیال پر شک شروع کر دیا تھا مگر اس سوچ کے باوجود بھی میں خود کو دانیال کی نظروں پر پہرہ دینے سے نہ روک سکی۔

پھر یہ ہوا کہ دانیال مجھے خود بتاتے کہ فلاں پارٹی میں فلاں عورت نے انہیں غیر شادی شدہ سمجھا اور ان پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی، فلاں لڑکی نے فلاں حرکت کی، تو میں نے دانیال کو ایک معصوم مرد سمجھنا شروع کر دیا کہ میں بھی تو اسے دیکھ کر پہلی نظر میں محبت کا شکار ہوگئی تھی...... ایک تو مردوں کو یہ فائدہ ہے کہ ان کی شخصیت اور جسم پر شادی یا بچوں کی پیدائش کوئی اثرات مرتب نہیں کرتی، ساری جسمانی و ذہنی تبدیلیاں اور مسائل عورتوں کو لاحق ہوتے ہیں۔ میں ابھی پہلی بچی کی پیدائش کی کمزوری سے سنبھلی بھی نہ تھی کہ دوسرے بچے کی آمد کی خبر سن لی، میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے، دانیال اور میں سر جوڑ کر بیٹھے مگر فیصلہ وہی ہوا جو اللہ کو منظور تھا۔ میں اب کی بار اماں کی طرف چلی گئی کہ ایک چند ماہ کی بچی اور دوسرے بچے کی آمد کو اکیلے نہیں سنبھال سکتی تھی، اماں کی مدد سے میرا کام آسان ہو گیا تھا۔ دانیال تھے جو میری اماں کی بھی عزت کرتے تھے اور مجھ سے کافی چھوٹی بہن ثانیہ کو اپنی بیٹی جیسا سمجھتے تھے۔ اماں میری اور میرے بچوں کی دیکھ ریکھ میں مصروف ہوتیں اور ثانیہ کو وقت نہ دے پاتیں تو دانیال اسے اپنی بیٹی کی طرح سنبھالتے بلکہ وہ دانیال سے اتنی مانوس ہوگئی کہ انہی کے پاس زیادہ وقت رہتی اور کبھی سو بھی جاتی۔ اماں کو اس ریں ریں کرتے رہنے والی بچی کے مسئلے سے بھی نجات مل گئی تھی جو پانچ چھ برس تک بھی اماں کی توجہ حاصل کرنے اور اپنا وجود اس گھر میں منوانے سے محروم رہی تھی۔ جانے اماں کو اس بیچاری سے کیا بغض تھا، اس کی آمد کو وہ اپنے لیے شرمندگی سمجھتیں...... شاید وہ ان چاہی بچی تھی مگر میں سوچتی کہ یہ ان چاہا بچہ ایک لڑکا ہوتا تو اماں کے انداز مختلف ہوتے۔ اسی لیے میں ثانیہ سے شروع دن سے ہی پیار کرتی تھی۔ مجھے خود سے سالوں چھوٹی بہن ملی تھی جو بڑی ہو کر میرے لیے دکھ سکھ بانٹنے والی سہیلی بن جاتی......

پھر بھائی کی شادی ہو گئی اور اس کے ہاں بچوں کی پیدائش کا سلسلہ چل پڑا تو میرے لیے اماں کی طرف جانا اور رہنا ممکن نہ رہا۔ بھابیوں کی آمد پر بیٹیوں کا میکے میں مان اسی طرح کم ہو جاتا ہے، سو باقی دو بیٹیوں کی پیدائش اپنے گھر پر رہ کر ہی ہوئی مگر بھلا ہو

تانیہ کا جو اَب بڑی ہوگئی تھی اور دانیال اسے جا کر لے آتے۔ اماں کو بھی اسے میری طرف بھجوانے پر کوئی اعتراض نہ ہوتا، تانیہ نے میری سب بیٹیوں کو اپنے بچوں کی طرح پالا، اسے اللہ نے کوئی اولاد نہ دی اس لیے مجھے اس کے بچوں سے پیار کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔

میں بچوں کی مصروفیات میں ایسی الجھی کہ دانیال کی طرف سے غافل ہوتی گئی۔ یہ ہر عورت کے لیے بالکل نارمل ہے اور میرے ساتھ کچھ انوکھا نہ ہو رہا تھا۔ میں ہر بچے کی پیدائش کے بعد خود کو نئے سرے سے فٹ کرنے کی کوشش کرتی تو علم ہوتا کہ اگلے بچے کی آمد کی نوید ہے...... چار بیٹیوں کی پیدائش کو کافی جان کر ہم نے مشترکہ فیصلہ کیا کہ اب ہمیں مزید بچے نہیں چاہئیں۔ دانیال میرے ساتھ اچھے تھے اور بیٹیوں میں تو ان کی جان تھی۔ کبھی انہوں نے مجھے بیٹا پیدا نہ کرنے کا طعنہ نہ دیا۔ میں اول روز کی طرح دانیال سے محبت کرتی رہی اور یہی سمجھتی رہی کہ میرے بعد ان کی زندگی میں کوئی اور عورت نہیں آ سکتی، جس کو بھی دانیال کے ساتھ مبتلا پایا...... میں اسی کو غلط سمجھتی رہی۔ مجھ سے ذرا سا بھی رشتہ یا تعلق رکھنے والی جو لڑکی یا عورت مجھے دانیال کے ساتھ مشکوک تعلق سے بندھی نظر آتی، میں اسے اپنی زندگی سے ہی نکال باہر کر دیتی مگر...... یہی میری بھول تھی، وہ سب صرف میری زندگی سے نکلیں پر دانیال کی زندگی میں وہ جوں کی توں رہیں...... میں انہیں غلط سمجھتی رہی اور جو غلط تھا اس کے ساتھ میں پھر بھی زندگی کی گاڑی کو گھسیٹتی رہی۔

☆☆☆

''تم نے خود کو بہت ڈل کر لیا ہے حنا......''

دانیال نے ایک دن مجھ سے کہا۔

میں سمجھی نہیں تھی کہ وہ مجھے ڈل کیوں کہہ رہے تھے۔ میں تو ہمہ وقت کام میں مصروف رہتی، دانیال، بچیاں اور گھر، میں کسی طرف سے غافل نہ تھی، گھر میں پکنا کیا ہے، سودا سلف کیا آئے گا، دھوبی کو بھیجے جانے والے کپڑوں کی تفصیل، کام کرنے والیوں کے مسائل، لان میں کون سے پودے لگنے ہیں اور سبزیوں والے حصے میں کون سی سبزیاں، خاندان میں کس موقع پر کس طرح لین دین کرنا ہوگا، بچیوں کی صحت کے مسائل اور تعلیم سے متعلق تمام فیصلے...... میں نے دانیال سے وضاحت کی کہ مجھ پر کیا کیا ذمے داریاں تھیں اور میں انہیں کس طرح نبھا رہی ہوں۔

''اور مزید کیا چاہتے ہیں آپ دانیال؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''یار مجھے تو وہی اسٹائلش سی، چست لڑکی چاہیے جس پر میں پہلی نظر میں مر مٹا تھا، جسے صرف اپنا خیال رکھنا آتا تھا، جس کے انداز دوسروں سے جدا تھے......''

''لڑکی سے عورت اور عورت سے ماں بننے کا سفر کر کے کوئی عورت ماضی کی بے پروا لڑکی نہیں بن سکتی دانیال! مجھ پر گھر کی، آپ کی اور بچیوں کی ذمے داریاں ہیں اور ان کو پسِ پشت ڈال کر میں بے پروا سی لڑکی نہیں بن سکتی۔'' میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''تمہیں بے پروا ہونے کو کس نے کہا ہے...... میں نے اسٹائلش کہا ہے حنا!'' دانیال نے چڑ کر کہا۔ ''مجھ جیسے لوگوں کی بیویاں گھر داری کو جانتی تک نہیں، اگر جانتی بھی ہیں تو ان کاموں میں نہیں الجھتیں جن کے لیے ملازم گھروں میں رکھے جاتے ہیں۔ تم چاہو تو کوئی سیکرٹری نما بندی رکھ لو جو گھر کے معاملات کو سنبھال سکے اور تم وہ کام کرو جیسے بڑے آدمیوں کی بیویاں کرتی ہیں...... کوئی ادارہ چلاؤ، کوئی چیریٹی...... تقریبات میں فیتے کاٹو، ساڑیاں باندھ کر تقریبات کی جان نظر آؤ، سماجی شخصیت بنو، کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرو جس سے تمہاری لوگوں سے جان پہچان ہو، نت نئے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہو، اخبارات میں تمہاری کوریج ہو......''

''مجھے کوئی ایسا شوق نہیں ہے دانیال، میں اپنی ہستی میں خوش ہوں اور میرا گھر میری جنت ہے۔''

''کم آن ڈارلنگ، تم نے تو میری تتلی جیسی حنا کو قتل ہی کر دیا ہے۔'' دانیال کے لہجے میں ناراضی تھی۔

بعد میں میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ کیا دانیال اس لیے دائیں بائیں منہ مارتے تھے کہ میں نے خود کو نظر انداز کر دیا تھا، یا مجھ سے شادی کرتے وقت ان کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ میں ہمیشہ ویسی ہی کم سن رہوں گی۔ تب میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب ساری بچیاں اسکول جاتی ہیں تو میں بھی اپنے لیے کوئی مصروفیت ڈھونڈوں، میرا ذہن بھی بٹے گا اور دانیال کو بھی لگے گا کہ ان کی بیوی میں کوئی مثبت تبدیلی آ رہی ہے۔ دانیال سے میں نے کہا کہ میں بوتیک کا کام شروع کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں اور اس کے لیے ابھی بات میں نے پوری بھی نہ کی تھی کہ دانیال کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور انہوں نے کہا کہ وہ فوراً میری ضرورت سے بہت زیادہ رقم میرے اکاؤنٹ میں منتقل کر دیں گے......

''پیسے کی پروا نہ کرو حنا، چاہے تمہیں لاکھوں کروڑوں کا نقصان اٹھانا پڑ جائے، بس میں چاہتا ہوں کہ اچھی سی سویرے، سویرے اٹھ کر تیار ہو کر گھر سے نکلو، کام پر جاؤ، اپنے ہنر کو آزماؤ، کسی بھی فیلڈ میں......''

میں مسکرا دی، اتنے میں ہی دل خوش ہو گیا کہ دانیال میرے لیے کتنا اچھا سوچتے تھے۔

☆☆☆

میں نے شوقیہ بوتیک کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس کے لیے دو درزی، دو کڑھائی کا کام کرنے والے، ایک ماسٹر صاحب کو بھرتی کیا تھا۔ گھر میں پچھلے حصے میں ملازمین کے کوارٹرز تھے، وہیں پر دانیال نے فوری طور پر اوپر نیچے چار کمروں کی تعمیر شروع کروا دی تھی کیونکہ میں کام کرنے پر تو تیار تھی مگر گھر چھوڑنے پر نہیں۔

اس سارے کام کی نگرانی کے لیے میں نے انٹرویو کے ذریعے ایک چست سی لڑکی کا انتخاب کیا۔ اس کا نام تھا ''توجہ'' جو کافی مختلف تھا اور دوسرے اسے اس کام کا تجربہ بھی تھا۔ وہ سب کی نگرانی کرتی، گاہکوں سے کام لیتی، ڈیزائننگ کرتی اور اس کے بعد مجھ سے منظوری کروا کر کام شروع کرواتی۔ کام کے معاملے میں توجہ ایک ماہر لڑکی تھی، میں اس پر پورا اعتماد کرتی تھی کیونکہ کام اچھا چل رہا تھا۔ کام کے علاوہ میں اس کا خیال اپنی بیٹیوں کی طرح ہی کرتی تھی۔ جب وہ فارغ ہوتی تو وہ گھر کے اندر آ جاتی، کبھی کھانے کا وقت ہوتا یا چائے کا تو ہم اسے اپنے ساتھ شامل کر لیتے...... مجھے اس کام میں مزہ آنے لگا اور میں سوچتی کہ عمر کا کتنا حصہ میں نے بیکار رہ کر گزار دیا تھا۔ دانیال شام کو یا بسا اوقات رات کو دیر سے بھی گھر آتے تھے اس لیے مجھے توجہ پر کسی قسم کی پابندی لگانے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ یوں بھی رات کو نو بجے وہ اپنے گھر چلی جاتی تھی، ڈرائیور اسے نزدیکی اسٹاپ سے ویگن پر سوار کرواتا تھا۔

اس روز میں اپنی لیڈی ڈاکٹر کے پاس معمول کے معائنے کے لیے گئی تو میں نے توجہ کو وہاں دیکھا، میں حیرت زدہ رہ گئی کہ میرے پاس چند ہزار کی ملازمت کرنے والی ملازمہ کیونکر ڈاکٹر یاسمین کے پاس جانے کی سکت رکھتی ہے...... اس نے غالباً مجھے نہیں دیکھا کیونکہ وہ ڈاکٹر یاسمین کی اوٹ میں تھی...... اس سے قبل کہ میں اس سے کچھ پوچھتی ڈاکٹر اسے معائنے کے لیے پردے کے عقب میں لے گئیں۔

''تو پھر آپ نے پکا ارادہ کر لیا ہے کہ آپ کو یہ بچہ نہیں چاہیے؟'' ڈاکٹر یاسمین نے سوال کیا تھا۔

''جی جی......'' اس نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟'' ڈاکٹر یاسمین نے سوال کیا تھا۔

''چھ ماہ!'' اس کا جواب ہولے سے دیا گیا۔

''شادی کے تین چار ماہ کے بعد امید سے ہو جانا کوئی غیر معمولی بات تو نہیں...... اچھا ہے کہ ایک

بچے کے بعد آپ لوگ وقفہ دے لینا۔"
"نہیں ہم پہلا بچہ ہی ابھی نہیں چاہتے۔" اس نے اعتماد سے جواب دیا تھا۔
"کوئی خاص وجہ اس کی؟" ڈاکٹر نے سوال کیا۔" سسرال کی طرف سے کوئی پریشر ہے کیا؟"
"نہیں...... میرے شوہر ہی نہیں چاہتے۔" اس نے اپنا جواب مکمل کیا تو میں حیران ہوگئی تھی، میں نے اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کبھی پوچھا ہی نہ تھا۔ یہ تک نہ جانتی تھی کہ اس کی شادی کب ہوگئی تھی، جب میں نے اسے کام پر رکھتے ہوئے انٹرویو کیا تھا۔ اس وقت تو وہ غیر شادی شدہ تھی۔
"شوہر کہاں ہیں آپ کے؟" ڈاکٹر نے اس سے سوال کیا تھا۔
"جی وہ بھی ساتھ ہی آئے تھے مگر انہیں کہیں کام سے جانا تھا اس لیے وہ جلدی میں تھے، واپسی پر وہی مجھے لینے آئیں گے۔"
"اگرچہ میں ایسے کاموں میں ہرگز نہیں پڑتی مگر جس حوالے سے آپ آئی ہیں، میں انہیں نہ نہیں کر سکتی، اب وہ خود بھی باہر آئی بیٹھی ہیں۔" ڈاکٹر یاسمین کہہ رہی تھیں اور میں حیرت سے ان کی بات کا مطلب جاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرے حوالے سے؟ ان کے کمرے میں تو میرے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔
"کیسی ہیں آپ مسز دانیال؟" ڈاکٹر نے باہر نکل کر پوچھا۔
"میں ٹھیک ہوں......" میں نے کمزور سی آواز میں کہا تھا۔ میں ان کی بات کا مطلب پوچھنا چاہ رہی تھی۔
"آپ کو خود آنا تھا تو پھر دانیال صاحب کو کیوں زحمت دی آپ نے؟" اس نے سوال کیا۔
"کس بات کی زحمت؟" میں کچھ نہ سمجھی تھی۔
"ارے بھئی وہی تو اس لڑکی کو لے کر آئے ہیں، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی باہر نکلے ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ یہ آپ کی دور پار کی رشتے دار ہے اور اس کا بچہ...... میرا مطلب ہے کہ یہ اس بچے کو پیدا نہیں کرنا چاہتی۔" میں ڈاکٹر کی بات سن کر خاموش رہی، تبھی توجہ بھی باہر نکل آئی تھی۔ میری آواز تو وہ سن ہی چکی تھی اور ڈاکٹر کے الفاظ بھی اس لیے اس نے خود پر قابو پالیا تھا۔
"کس کا بچہ ہے یہ توجہ؟" میں نے کنویں کی گہرائی میں گر کر اس سے سوال کیا تھا، جواب میں اس نے سر جھکا لیا تھا۔
"کیا یہ لڑکی شادی شدہ نہیں ہے؟" ڈاکٹر یاسمین نے حیرت سے پوچھا تھا۔
"نہ یہ شادی شدہ ہے اور نہ ہی میری رشتے دار...... یہ میرے بوتیک پر ملازمہ ہے۔" میں نے انکشاف کیا تھا۔
"تو کیا اسے آپ نے نہیں بھیجا تھا میرے پاس؟"
"ہرگز نہیں......" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔
"اٹھو بی بی جاؤ یہاں سے......" ڈاکٹر یاسمین نے غصے سے اس سے کہا تو وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔" مگر دانیال صاحب نے جھوٹ کیوں بولا اور وہ اس کو کیوں ساتھ لے کر آئے؟"
"مرد کسی گائنا کالوجسٹ کے پاس یا شریکِ حیات کے ساتھ جاتا ہے ڈاکٹر یاسمین یا شریکِ جرم کے ساتھ!" اتنا کہہ کر میں ڈاکٹر یاسمین کے چہرے پر ہر سوال کو بے جواب چھوڑ آئی تھی۔

☆☆☆

چند دن کے بعد وہ آئی تو رو رو کر اپنی معصومیت کی کہانی سنانے لگی مگر مجھے اب کسی کے آنسو متاثر نہیں کرتے تھے...... میں نے اسے نکال دیا، اپنے گھر سے، اپنی زندگی سے اور میں سمجھی کہ اس طرح شاید وہ دانیال کی زندگی سے بھی نکل گئی ہوگی مگر مجھے پورا یقین تھا کہ دانیال اس کے بعد بھی اسے کہیں نہ کہیں ملتے رہے ہوں گے، مجھے تو یہ بھی علم نہ ہو سکا کہ وہ اس سے پہلے

کہاں ملتے تھے۔

☆☆☆

میں نے جان لیا کہ دانیال کے اندر ایک ایسا حریص جانور ہے جو دنیا کی ہر عورت کو اپنی طرف مائل کر لیتا ہے۔ وہ عورتیں رشتوں کی پہچان بھول جاتی ہیں، دوستیوں کے تعلق ہوں یا احسان کرنے والی ہستیاں...... جب انہیں اپنی ہوس پوری کرنا ہوتی ہے تو باقی سب پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ کوئی پیسے کے لیے مائل ہوتی ہے، کوئی اپنے پیاروں کو دھوکا دیتی ہے، کسی کی حریص فطرت کو دوسری جگہ منہ مارے بغیر قرار نہیں آتا۔ ہاں اپنے شوہروں اور بیویوں کو دھوکا دینے والے...... ایک جیسی فطرت کے لوگ ایک دوسرے کو ڈھونڈ ہی لیتے ہیں، جانے کیوں دنیا کی ہر ''ضرورت مند'' ---- عورت کا پالا دانیال سے پڑ جاتا تھا۔

میں عمر بھر اس کام میں مصروف رہی کہ جو عورت دانیال کے منہ کو لگ جائے اسے اپنی زندگی سے نکال دوں۔ کئی بار میں نے دانیال کا سامنا کیا، انہیں بتایا کہ میں ان کے سارے ''کارنامے'' جانتی ہوں۔ انہیں جوان بچیوں کے وجود سے بھی ڈرایا، کہ کبھی کوئی بیٹی ان کے کردار کے بارے میں جان لے گی تو ان کے لیے ان پیار کرنے والی بیٹیوں کا سامنا کرنا مشکل ہو جائے گا۔ شاید یہی میری غلطی تھی کہ جو کام وہ چھپ چھپ کر کرتے تھے اب انہیں چھپانے کی ضرورت نہ رہی تھی، کئی بار وہ مجھے خود ہی بتا دیتے کہ وہ فلاں عورت کے ساتھ تھے...... ''کیا کروں، اس کا شوہر گھر پر نہیں تھا اور وہ اکیلی پریشان ہو رہی تھی۔'' وہ ڈھٹائی سے وہ ایسی فضول بات کہہ دیتے جس پر میں عموماً یقین نہ کرتی تھی، میں سمجھتی کہ وہ طنز سے ایسا کہہ رہے ہیں...... جب تک انہیں پکڑے جانے کا خوف تھا وہ کسی حد میں تھے مگر اب کھل کر کھیلتے تھے۔

پہلی بار جب رانیہ نے مجھے وضاحت سے بتایا کہ اس نے پاپا اور آنٹی راحیلہ کو ہمارے گھر کے ڈرائنگ روم میں کس حالت میں دیکھا تھا تو میں نے دانیال سے پہلے راحیلہ کا سامنا کیا تھا۔

''کوئی شرم و حیا نہ آئی تمہیں، اپنے سادہ سے شوہر کو دھوکا دیتے ہوئے، بے غیرت عورت!''

''مجھے کیا کہہ رہی ہو...... اپنے شوہر سے بات کرو جو جگہ جگہ منہ مارتا پھرتا ہے۔'' اس نے ڈھٹائی سے کہا تھا۔

''وہ کیا تمہیں تمہارے گھر سے جا کر لایا تھا؟'' میں نے غصے سے پوچھا۔ ''میری غیر موجودگی میں تم میرے گھر پر آئیں کیوں؟''

''اس نے فون کر کے اس روز بلایا تھا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔'' اس نے کندھے اچکا کر کہا۔

''تو تم کیا ڈاکٹر ہو جو تمہیں کال کر کے بلایا جاتا اور تم بھاگی بھاگی چلی آتیں؟''

''مجھ پر چیخنے کی ضرورت نہیں حنا جان!'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا جسے میں نے غصے سے جھٹک دیا۔ ''اس دنیا میں سب اسی طرح چلتا ہے، دوستوں میں چھوٹی موٹی خوشیاں شیئر کرنے میں کوئی حرج نہیں...... میری دانیال سے دوستی ہے تو تم ثقلین سے دوستی کر لو، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا! تم کچھ زیادہ ہی شدید ردعمل کا اظہار کر رہی ہو۔''

''ڈوب مرنے کا مقام ہے تمہارے لیے راحیلہ...... اس کے بعد میں زندگی بھر تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتی اور نہ ہی تم کبھی پلٹ کر دانیال سے رابطہ کرنا۔'' مجھے اس کی بات سن کر اس قدر گھن آئی کہ میں کرسی کو ٹھوکر مار کر اس ریستوران سے نکل آئی۔ بعد ازاں مجھے دانیال سے علم ہوا کہ راحیلہ کے ہاں بیٹی ہوئی تھی۔ میں نے حیرت سے دانیال سے پوچھا کہ ان کا اس سے کہاں رابطہ ہوا، انہوں نے بہانہ تو اس کے شوہر ثقلین سے ملاقات کا کیا مگر میرے دل میں پھانس سی چبھ گئی کہ یقیناً ان کا رابطہ راحیلہ سے قائم تھا۔

''ثقلین بھائی بیٹی کی مبارک ہو آپ کو۔'' میں نے اپنا شک رفع کرنے کو انہیں کال کی تھی۔

''بہت شکریہ بہن کہ آپ کو چھ ماہ کے بعد

مبارک باد کا خیال آ گیا۔'' انہوں نے کہا تو میں حیران رہ گئی۔

''سوسوری...... مگر ہمیں تو علم ہی اب ہوا ہے، آپ نے دانیال کو بتایا ہی اب ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں نے دانیال کو بتایا ہے؟'' ان کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''میں نے دانیال کو کیسے بتانا ہے، میری تو اس سے جانے کب ملاقات ہوئی تھی، ہاں مجھے راحیلہ بتاتی رہتی ہے کہ اس کی ملاقات تم لوگوں سے ہوتی رہتی ہے۔'' سو میرا اندیشہ درست تھا۔

''راحیلہ آپ کو آدھا سچ بتاتی ہے ثقلین بھائی۔ میری بھی اس سے ملاقات عرصہ ہوا نہیں ہوئی۔''

''کیا بات ہے، کس وجہ سے آپ دونوں سہیلیاں اب آپس میں نہیں ملتیں؟ اگر نہیں ملتیں تو راحیلہ مجھ سے جھوٹ کیوں کہتی ہے؟''

''وہ مجھ سے تو نہیں البتہ دانیال سے ملتی رہتی ہے...... ابھی تک مل رہی ہے حالانکہ جب میں نے ان کے آپس میں غلط تعلقات کے بارے میں جان کر اسے اپنی زندگی سے نکالا تھا تو میں سمجھی تھی کہ اسے عقل آ گئی ہوگی مگر بے حیا لوگوں کو عقل کم ہی آتی ہے...... ویسے آپ ڈی این اے ٹسٹ کروا کر اپنی بیٹی کی ولدیت ضرور چیک کر لیجیے گا، آپ کے لیے اچھا ہو گا۔'' میں نے غصے میں کہہ کر فون بند کر دیا۔ اگر ابھی تک راحیلہ نے اپنی روش نہیں بدلی تھی تو اس کے شوہر کو ایک دھوکے باز عورت کے ساتھ زندگی گزارنے کی سزا سے تو آزاد کر دیا تھا میں نے۔ اس دن کے بعد مجھے یقین ہے کہ راحیلہ نہ دانیال کی زندگی میں رہی ہوگی نہ ثقلین بھائی کی۔

''آپ اب بھی راحیلہ سے ملتے رہتے ہیں ناں؟'' میں نے دانیال سے پوچھا تھا۔

''مجھے معاف کر دو حنا...... اب میں آج کے بعد وعدہ کرتا ہوں کہ اس سے نہیں ملوں گا۔'' انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھ سے معافی مانگی، میں نے تو اس شخص کو خود سے بڑھ کر چاہا تھا، معاف کیسے نہ کرتی، الٹا دل ہی دل میں خود سے شرمندہ تھی کہ ان پر ایسی نوبت میری تفتیش کی وجہ سے آئی تھی۔

☆☆☆

پائل نام کی چست سی ملازمہ جو گھر پر صفائی کے کام پر مامور تھی، اپنا کام اتنی صفائی اور قرینے سے کرتی کہ مجھے اس نے کبھی شکایت کا موقع ہی نہیں دیا۔ کام کار سے فارغ ہو کر وہ بچیوں کے ساتھ بیٹھ جاتی اور ان کی کتابوں میں سے تصاویر دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی، غالباً اس نے کبھی اسکول کی شکل دیکھی ہوگی جو وہ ان کی اردو کی کتابوں میں سے کوئی لفظ پہچان لیتی تو اس کی خوشی دیدنی ہوتی۔

میں نے بچیوں سے کہا کہ اگر اسے شوق ہے تو اسے کچھ نہ کچھ پڑھا دیا کریں۔ اس مقصد کے لیے میں نے اردو کی ابتدائی کتب اور کاپیاں وغیرہ بھی اسے لا کر دی تھیں۔ بچوں کے اسکولوں میں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں تو ہم سہیلیوں نے مل کر ایک فلاحی ادارے کی بنیاد ڈالی اور غریب بچوں کے لیے تعلیم کے کام کا بیڑا اٹھایا۔ اللہ کا شکر تھا کہ میری بیٹیاں اب خود کو سنبھال لیتی تھیں اور ربنا کے اپنا اسکول کا کام بھی کر لیتی تھیں۔ میں صبح سویرے نکل جاتی، اس کے بعد دانیال بھی ناشتا کر کے کام پر نکل جاتے تھے۔ پائل کے وہاں رہنے سے مجھے تسلی تھی کہ بچیاں گھر پر اکیلی نہیں ہوتی تھیں، میرے گھر لوٹنے تک وہ وہیں رہتی تھی۔

''مما...... آپ پائل کو نکال دیں۔'' نیلم نے مجھ سے کہا تو میں اس کا منہ حیرت سے دیکھنے لگی۔

''کیوں بیٹا...... وہ تو اچھی ہے اور کام بھی اتنا اچھا کرتی ہے...... میں اور پاپا گھر پر نہیں ہوتے تو وہ آپ لوگوں کے پاس ہوتی ہے جس سے مجھے تسلی رہتی ہے۔'' میں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر کہا۔

''مگر مجھے وہ اچھی نہیں لگتی۔'' اس نے منہ بسورا۔ ''وہ بہت گندی ہے......''

''مگر کیوں بیٹا؟'' میں نے سوال کیا۔ ''کیا کیا اس نے جو وہ آپ کو گندی لگتی ہے؟''

"وہ جب پاپا کی اسٹڈی کو صاف کر کے نکلتی ہے تو میں غور کرتی ہوں ماما کہ اس کے گریبان میں سے لال نوٹ جھانک رہے ہوتے ہیں۔" اس نے الجھے سے لہجے میں کہا۔

"اچھا میں پاپا سے کہوں گی کہ وہ آئندہ سے اسٹڈی میں اپنے پیسے نہ چھوڑ کر جایا کریں...... ہم کسی کو موقع دیتے ہیں تو وہ اس سے فائدہ اٹھاتا ہے ناں" میں نے کہا۔ "یا یہ کہ جب وہ پاپا کی اسٹڈی کو صاف کرنے جائے تو آپ بہنوں میں سے کوئی اس کے ساتھ وہاں رہے......"

"مگر اس کے اسٹڈی میں جاتے ہی پاپا دروازہ اندر سے بند کر لیتے ہیں مما......" اس نے لرزتی ہوئے آواز میں کہا۔" اور میں نے ایک دفعہ اندر جھانک کر بھی دیکھا تھا مما......" اس کا چھوٹا سا وجود لرز رہا تھا، میں نے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔" پاپا نے......" اس نے مزید وضاحت کی۔" اور پھر پاپا نے اسے خود پیسے دیے تھے مما!"

دانیال کا معیار اس قدر گر گیا تھا۔ میری ناک کے نیچے، گھر میں بچپن کی حدود سے نکلتی ہوئی چار بچیوں کی موجودگی میں وہ اپنے گھٹیا رازوں کے افشا ہو جانے کے خوف سے بھی بے نیاز تھے اور میں کیسی بے فکر تھی کہ بچیاں محفوظ ہیں، کبھی سوچ بھی نہ آئی کہ کیا اور غیر محفوظ ہو سکتا تھا۔

میں نے دانیال کو نیلم کے روبرو بٹھانے کا سوچا مگر بیٹی اور باپ کے بیچ عزت اور احترام ختم نہ ہو...... سوچ کر خاموش رہی اور پائل کو ملازمت سے فارغ کرنے کے لیے میں نے اگلے دن کا بھی انتظار نہ کیا۔ اپنی زندگی کے ایک اور غلیظ باب کے اوراق کو اپنے ہاتھوں سے پھاڑ کر میں پھر فکر سے آزاد ہو گئی کہ شاید اس کے بعد اس دنیا میں کوئی اور عورت ایسی نہیں رہی جس کے ساتھ دانیال کا تعلق قائم ہو سکتا ہے۔

دوسروں کے بچوں کو تعلیم دینے کا ارادہ ختم کیا اور میں نے گھر پر رہنے کا عزم کیا، چاہے اب دانیال کچھ بھی کہیں، میں ان کی باتوں میں نہیں آنے والی۔

"ارے حنا، تم اب تک گھر پر ہو؟" دانیال تیار ہو کر کافی دیر اپنے اسٹڈی روم میں بیٹھ کر غالباً پائل کا انتظار کرتے رہے تھے اور اس کے نہ آنے پر نیچے اترے تو مجھے اس "بے وقت" گھر پر بیٹھے دیکھ کر بولے تھے۔

"جی!" میں نے بہ مشکل تھوک نگل کر کہا۔ "اچھا وہ پائل کہاں ہے......؟" انہوں نے بے پروائی سے پوچھا، میرے تو سر سے لگی اور تلووں پر بجھی۔

"کیا کام ہے آپ کو پائل سے؟"

"میرے اسٹڈی روم کی صفائی کرنا تھی اسے......" انہوں نے بے نیازی سے ناشتے کا آغاز کیا۔" میں نہیں چاہتا کہ وہ میری غیر موجودگی میں صفائی کرے اور میرا کوئی کاغذ ادھر سے اُدھر ہو۔"

"اب پائل نہیں آئے گی دانیال!" میں نے دانت پیس کر کہا، بچیاں ابھی تک اپنے کمروں میں تھیں، میں نے خود ہی انہیں ان کے کمروں کی صفائی کا کام دیا تھا۔" آپ اپنی اسٹڈی روم کی صفائی مجھ سے ہی کروا لیا کریں، اور ہاں اس کے لیے آپ کو لال نوٹ بھی نہیں دینے پڑیں گے۔"

دانیال کے حلق میں نوالہ پھنس گیا...... انہیں کھانسی کا شدید دورہ پڑا، کھانس کھانس کر اور پانی پی پی کر ان کی حالت سنبھلی۔" اس بات کا کیا مطلب ہے؟"

"اس بات کا مطلب آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں دانیال!" میں نے غصے سے کہا۔" میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میں کتنی ہی تو جاہیں اور کتنی ہی پائلیں اپنے گھر سے نکال کر باہر پھینک دوں، اپنی کتنی ہی سہیلیوں کو دھتکار دوں مگر آپ کے منہ کو لگا ہوا نشہ...... کہیں نہ کہیں۔ بلکہ ہر جگہ مل جاتا ہے، آپ کا معیار کس قدر گر گیا ہے دانیال، شرم بھی نہیں آتی آپ کو اس طرح کی حرکتیں کرتے ہوئے، اس گھر میں، اسی چھت کے نیچے، بچیاں آپ کی چوریاں پکڑتی ہیں اور مجھے بتاتی ہیں، آپ کی حرکتوں نے انہیں وقت سے بہت پہلے سمجھدار کر دیا ہے، خدا کے لیے کچھ حیا کریں، بند کر دیں اپنی یہ

غلیظ حرکتیں، اگر آپ کو بہت زیادہ مسئلہ ہے تو تین اور شادیاں کر لیں مگر بے حیائی کا یہ سلسلہ بند کر دیں اب۔'' میں نے ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کہا۔

☆☆☆

رفتہ رفتہ میں بچیوں اور ان کے مسائل میں الجھتی چلی گئی، دانیال نے اپنے کاروبار کی جڑیں کئی دوسرے شہروں میں پھیلا لیں اور اس سلسلے میں وہ بھی کہیں اور کبھی کہیں ہوتے، بچیوں کی تعلیم کے بعد ان کے رشتے طے کرنے کے مراحل میں بھی میں خود کو تنہا ہی پاتی تھی، دانیال کی طرف سے مجھے مکمل مالی تعاون تو حاصل تھا مگر اس سے زیادہ سے وہ ہمیشہ معذوری کا اظہار کر دیتے کہ انہیں عورتوں کے ان معاملات کا علم نہیں۔ بات جب کسی حتمی مرحلے میں پہنچتی تو اس وقت دانیال لڑکے اور اس کے والدین سے ملنے پر تیار ہوتے، رانیہ، نیلم اور فاطش کی شادیاں باہر طے ہوئیں، سارے معاملات مجھے ہی نمٹانا پڑے...... ہاں فاطش کی شادی کے معاملے میں دانیال نے مخالفت کی، وہ بھی اس لیے کہ انہیں کسی حوالے سے لڑکے کے مشکوک کردار کے بارے میں سن گن مل گئی تھی، جسے فاطش نے بری طرح رد کر دیا اور کہہ دیا کہ اگر اس کی شادی اشعر سے نہ ہوئی تو وہ کسی اور سے بھی نہیں کرے گی۔

میں نے دانیال کو کافی سمجھایا مگر انہوں نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی، تب فاطش نے خود اکیلے میں دانیال سے بات کی اور جانے کس طرح بات کی کہ وہ مان گئے، دل سے انہیں یہ رشتہ پسند نہ تھا نہ ہی مجھے مگر جہاں جوان خون سرکشی پر اتر آئے وہاں ہار ماننا پڑتی ہے۔ وقت نے جلد ہی فاطش کے فیصلے کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ میں اب کئی بار سوچتی ہوں کہ ہم نے دل سے اس شادی کو قبول ہی نہ کیا تھا اس لیے ہم نے اس شادی کو ٹوٹنے سے بچانے کی کوئی کوشش بھی نہ کی...... کیا تھا کہ اگر اشعر لالچی تھا، جائیداد چاہتا تھا یا رقم تو ہم اسے دے دیتے، علیحدہ گھر یا اپارٹمنٹ لے دیتے...... ہمارے بعد بھی تو یہ سب کچھ انہی بیٹیوں کا ہی تھا۔

دانیال نے تو اس ''لفنگے'' کو پھوٹی کوڑی بھی دینے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے دبے لفظوں میں کہا بھی تو خود فاطش نے کچھ بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

''عورت کے پاس اپنی ذات کا بھرم ہی تو ہوتا ہے مما جو اسے گھر والوں سے ٹکر لینے پر آمادہ کر دیتا ہے...... میں نے آپ لوگوں کی مخالفت کے باوجود اس سے اس لیے شادی کی کہ مجھے اس کی محبت سچی لگی تھی، مگر جلد ہی اس کے چہرے سے نقاب اتر گئی...... میں جان گئی ہوں کہ میری ذات بے وقعت ہے، اس کی نظر ستاروں پر تھی جن پر وہ میری مدد سے ہی کمند ڈال سکتا تھا۔ میں اس کے کسی مطالبے کو ماننے پر تیار نہیں مما کیونکہ اس کے یہ مطالبات آخری ثابت نہیں ہوں گے، ایک مطالبے کی منظوری اس کے اور آپ کے درمیان کا حجاب ختم کر دے گی اور وہ آئے روز کوئی نہ کوئی اور مطالبہ لے کر آ جائے گا...... میں نے اسے جاننے اور سمجھنے میں غلطی کی مما تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم عمر بھر اس کی سزا بھگتتے رہیں۔'' فاطش نے واضح الفاظ میں کہا تو میری تجویز رد ہو گئی اور یوں ایک گھر ٹوٹ گیا، ایک خاندان کا شیرازہ بکھر گیا۔ اسود جیسا پیارا بچہ اپنی شناخت کا حوالہ کھو بیٹھا، میرا دل تو اسی میں اٹک گیا، میں اسود کے ساتھ مصروف ہو گئی اور دانیال سے دور ہوتی چلی گئی۔

دانیال میرے پاس ہوتے بھی تو مجھے لگتا کہ وہ میرے پاس نہیں ہیں۔ مجھ سے ان کا تعلق اتنا پھیکا اور سرد سا ہو گیا کہ مجھے کوفت ہونے لگی۔ میں اگر اپنے ساتھ کچھ یہ سوچ کر کرتی تھی کہ یہ دانیال کو اچھا لگتا ہے تو مجھے اس کی پروا ختم ہو گئی...... مجھے صاف لگتا تھا کہ دانیال کے پاس میرے لیے جو کچھ ہے وہ فقط بچا کچھا ہے، دوسری عورتوں کے پاس جانے والے مرد کے اطوار ہی اور ہو جاتے ہیں۔ مجھے ان سے گھن آنے لگی۔

☆☆☆

میں تین بیٹیوں کی شادیوں کے بعد صدف کے بارے میں بالکل بے فکر تھی کہ اس کا رشتہ دانیال کی بہن

نے بہت پہلے مانگ لیا تھا۔ ان کا بیٹا احمد ہمارا داماد بننے والا تھا، بہت پیارا اور سمجھ دار بچہ...... کہ میں صدف کے نصیب پر نازاں تھی۔صدف میری بہت پیاری بیٹی، مجھے اس سے جتنا زیادہ پیار تھا وہ اتنا ہی دانیال سے قریب تھی، اس کا دلی لگاؤ باپ کی طرف زیادہ تھا۔ کبھی جو بچیوں کے ساتھ مل کر کسی کھیل یا مقابلے میں گروپ بندی ہوتی تو تینوں بڑی میرے ساتھ اور وہ تنہا دانیال کے ساتھ ہوتی مگر ہم پھر بھی انہیں جتا کر خود ہار مان لیتے۔ مجھے صدف کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر عجیب سا دکھ ہوتا تھا، مجھے یقین تھا کہ احمد اسے خوش رکھے گا۔

احمد ایک بار میرے پاس عجیب سی درخواست لے کر آیا تھا کہ اسے مجھ سے تنہائی میں ملنا تھا مگر میں نے تو یہی جانا کہ تنہائی میں دو مرد و زن کے بیچ تیسرا شیطان ہوتا ہے، چاہے وہ میرے بیٹے کی عمر کا تھا مگر پھر بھی ملازمین کے منہ کون بند کر سکتا ہے۔ مجھے شرمندگی بھی ہوئی کہ میں نے اسے صاف الفاظ میں کہا کہ میں اس کے ساتھ تنہائی میں نہیں مل سکتی...... ''ٹھیک ہے، آپ دروازے بند نہ کریں!'' اس نے کہا تھا۔ ''مگر جب ہم بات کر رہے ہوں تو کوئی مداخلت نہ کرے......'' میں نے اس کا یہ مطالبہ منظور کر لیا، اس نے لیپ ٹاپ پر مجھے سی ڈی لگا کر آن کر کے دی اور خود باہر لاؤنج میں جا کر بیٹھ گیا، باہر ملازمین اپنے کام کار میں مصروف تھے۔

اس کے بعد تو کوئی شک رہا تھا نہ شبہ...... میری آنکھوں کے پردے ایک ایک کر کے چھٹ چکے تھے۔ میں اگر دانیال کی کسی ایک بھی بات پر یقین کرتی تھی تو اب وہ یقین بھی نہ رہا تھا۔ وہ میری نظروں سے ہی نہیں گرے تھے بلکہ میرے دل سے بھی نکل چکے تھے۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں اب مزید دانیال کی زندگی میں نہیں رہ سکتی تھی مگر......

☆☆☆

احمد کے جانے کے بعد میں نے اپنے وجود کی لاش کو بہ مشکل گھسیٹا اور اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر گر گئی، وہ سارے آنسو جو میری آنکھوں کے بند کے پیچھے تھے، وہ بند توڑ کر باہر نکل آئے اور میں نے پہلی اور آخری بار اپنی شکست پر آنسو بہائے...... وہ شکست جس کا ذمے دار میں نے کرن کی بددعاؤں کو ٹھہرایا تھا۔ میں نے دانیال کو کرن سے چھینا تھا، اس نے اس شخص کے چھینے جانے پر آنسو بہائے تھے اور منتیں کر کر کے مجھ سے مانگا تھا، یہاں تک کہ اس نے کہا کہ مجھے چاہے نہ لوٹاؤ مگر اس کی خاطر ہماری برسوں کی دوستی سے منہ نہ موڑو۔ میں نے اپنے زعم میں اس وقت اس کی ایک نہ سنی اور اب اس وقت میں اس لیے آنسوؤں کا سیلاب بہا رہی تھی کہ میرے نصیب میں ایسا برا شخص کیوں لکھا گیا تھا؟ میرے کس گناہ کی سزا تھا وہ شخص؟

کاش...... میں نے اس کی بدنیتی کو محبت نہ سمجھا ہوتا! اتنے سارے کاش تھے جو قطار در قطار میرے سامنے کھڑے تھے، کاش میں اس سے شادی نہ کرتی، کاش اس کا اصلی رنگ مجھے شادی سے پہلے نظر آ جاتا، کاش کسی اولاد کی پیدائش سے پہلے اس کی اصلیت مجھ پر کھل جاتی...... میں نے رو رو کر آنکھیں سوجا لی تھیں۔ اس روز میں کسی کا سامنا نہیں کر سکتی تھی اس لیے سر درد کا بہانہ کر کے منہ سر لپیٹ کر سو گئی حالانکہ سر ہی نہیں پورا جسم اور روح دکھ رہے تھے......

ان ثبوتوں کو کہیں تو چھپانا تھا...... اس گندگی کو سب کی نظروں سے دور رکھنا تھا، حالانکہ دل چاہ رہا تھا کہ اسے ساری بیٹیوں کو کاپی کر کے بھجواؤں مگر پھر بھی مجھے ہی شرم آئی کہ ان کا باپ ہے، اس کا کیا بھرم رہ جائے گا بیٹیوں کے سامنے۔ اپنی الماری کی چابی میں دانیال کی دراز میں رکھتی ہوں، وہاں سے چابی نکالنے کے لیے دراز کھولی تو میں دھک سے رہ گئی...... احمد کے ہاتھ سے جو انگوٹھی غائب تھی وہ وہاں پڑی تھی۔ وہ تو کہہ رہا تھا کہ اسے کھلی ہے اور اسی کے پاس ہے۔ میں نے وہ انگوٹھی اٹھا لی۔ اب میں نے اپنی دراز کی چابی کا ٹھکانا بدل لیا تھا کیونکہ میں دانیال کا سامنا پوری تیاری کے ساتھ اور کسی مناسب وقت پر کرنا چاہ رہی تھی۔

''احمد بیٹا......'' میں نے اسے کال کی۔'' آپ سے کچھ پوچھنا تھا۔''

''جی ممانی جان......'' اس نے انتہائی مؤدب لہجے میں کہا۔

'' آپ اپنی انگوٹھی مجھے ابھی دے کر جا سکتے ہیں، میں بازار جارہی ہوں اور اسے آپ کے ناپ کے مطابق کروادیتی ہوں۔''

''وہ......وہ!'' وہ ہکلایا۔

''کہیں وہ انگوٹھی گم تو نہیں ہوگئی بیٹا......؟'' میں نے اندازہ لگایا۔''اگر ایسا ہی ہے تو میں چپکے سے اور بنوا دیتی ہوں بیٹا۔''

''ارے نہیں ممانی جان!'' اس نے فوراً کہا۔ ''وہ میں نے ماموں کو دی تھی۔''

''ماموں کو......وہ کیوں بیٹا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''اصل میں......'' اس نے مجھے ساری بات کہہ سنائی، میں اپنے سن ہوتے ہوئے دماغ کے ساتھ ہمہ تن گوش اس کی بات سن رہی تھی۔

''ٹھیک کہتے ہو بیٹا......'' میں نے رسان سے کہا۔'' کوئی بھی لڑکا ایسے آدمی کا داماد بننا پسند نہیں کرے گا...... بلکہ جو بن بھی چکے ہیں انہیں بھی اگر کسی روز علم ہو گیا کہ وہ کس شخص کے داماد ہیں تو وہ بھی میری بیٹیوں کو سزا کے طور پر گھر واپس بھیج دیں گے......'' میرے دل میں درد اٹھا۔''کرے کوئی اور بھرے کوئی، اسی کو تو کہتے ہیں۔''

''بخدا ممانی جان...... میں نے تو یہ سب ڈراما اس لیے کیا تھا کہ شاید ماموں کو اپنی بیٹیوں کے مستقبل کا سوچ کر ہی کچھ......'' غالباً وہ کہنا چاہتا تھا کہ' کچھ شرم آجائے'۔

''چلو بیٹا، کوئی بات نہیں...... تمہیں فیصلے کا پورا حق ہے، بعد میں کوئی فیصلہ کرنے سے بہتر ہے کہ تم نے ابھی سوچ لیا، میری بیٹی بہت حساس ہے، ابھی تو اسے کسی نہ کسی طرح سمجھا لوں گی مگر بعد میں وہ فاطش کی طرح آ کر بیٹھ جاتی ساتھ کوئی اور اسود جیسا لیے تو وہ زیادہ تکلیف دہ ہوتا، ہمارے لئے بھی اور صدف کے لیے بھی۔''

''پلیز ممانی جان!'' اس نے شرمندگی سے کہا''میں کہہ رہا ہوں ناں کہ میرا ہرگز مقصد وہ نہ تھا جو میں نے کیا، ماموں جو کچھ بھی کر رہے ہیں اس سے ان کی دنیا اور آخرت دونوں خراب ہو رہی ہیں...... میں صدف کو چھوڑنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا، اس سے شادی کی خواہش میں نے اس لیے نہیں کی تھی کہ وہ ماموں کی بیٹی ہے......اس لیے کہ وہ آپ کی بیٹی ہے ممانی جان، ہمارے خاندان کی بہترین ماں کی اولاد......''

''تم پر کوئی زور زبردستی نہیں ہے بیٹا!''

''میں اپنی انگوٹھی واپس لینے ابھی آرہا ہوں ممانی جان!'' اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔'' اس سے پہلے کہ صدف اس انگوٹھی کی غیر موجودگی کو محسوس کرے۔'' میں نے فون بند کر کے اللہ کا شکر ادا کیا۔

☆☆☆

صدف کی شادی ہوگئی تو میں نے اپنے بارے میں سوچنا شروع کیا، میری ساری ذمے داریاں اب پوری ہو چکی تھیں۔ اب میرے پاس کوئی جواز نہ رہا تھا کہ میں اس زنجیر میں بندھی رہتی...... میں نے اس زنجیر کو توڑنے کا ارادہ کر لیا، سب سے پہلے مجھے اپنی بیٹیوں کو اعتماد میں لینا تھا، پھر اس کے بعد میں وانیال کو صرف اطلاع کرتی اور انہیں اپنے گھر کی جنت سے بے دخل کر دیتی تا کہ وہ آزاد ہوں، جو کچھ کرنا چاہیں کریں، جس سے چاہے تعلق رکھیں، جس سے چاہیں توڑیں، مجھے ان کی کسی حرکت سے کوئی تکلیف نہ ہوتی۔ میں ان کے غلط سلط کاموں کی فکر سے پہلے ہی آزاد تھی، اب مجھے مزید بے فکری ہو جاتی۔ اپنے ساتھ میں نے برا کیا جو اس شخص کی فطرت کو سمجھ نہ سکی اور اس کے جال میں پھنس گئی مگر اب مزید نہیں، مجبوریوں کی ڈور میں بندھا ہوا یہ بندھن اب ٹوٹنا ہی ہے۔ میں

نے رانیہ، نیلم اور صدف کو بھی اپنے ارادے سے مطلع کر دیا اور گھر میں فاطش سے بھی بات کی۔

''آپ پریشان نہ ہوں مما...... ہم سب آپ کے ساتھ ہیں، آپ کے ہر فیصلے کی تائید کریں گی، پاپا اگر آپ کے ساتھ زیادتی کرتے رہے ہیں اور ابھی تک کر رہے ہیں تو پھر انہیں اس کی سزا مل کر رہے گی۔'' فاطش نے میرے ارادے کی تائید کی۔

''بس یہ دکھ کاٹتا ہے میری جان کہ تم میں سے کسی کا گھر میری وجہ سے خراب نہ ہو......'' میں نے اس کے بال سہلائے۔

''فکر نہ کریں مما، سب بہنوں کے قدم اپنے گھروں میں مضبوط ہیں، اللہ کا کرم ہے۔'' اس نے یقین سے کہا۔'' رہی میں ...... تو میں شاید اسی لیے واپس آ گئی ہوں کہ آپ تنہا نہ رہیں، میں آپ کے ساتھ رہوں گی مما!''

''تمہارے پاپا اب بھی کئی عورتوں سے دوستی اور تعلق رکھے ہوئے ہیں، ٹیلی فون اور دیگر ذرائع سے فحش گفتگو ہوتی ہے، ان سے ملتے ہیں، دکھ تو یہ ہے کہ ان عورتوں کو بھی احساسِ گناہ نہیں ہے اور تمہارے پاپا تو اس قسم کے ہر احساس سے عاری ہیں...... میں سوچتی ہوں کہ اس طرح کے شخص سے میرا کیوں پالا پڑا۔ میں نے تو عمر بھر ان کے علاوہ کسی مرد کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گناہ سمجھا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے خود کہا ہے کہ جیسے مرد ہوں گے ویسی انہیں بیویاں ملیں گی...... میں تو ویسی نہیں ہوں ...... مجھے کیوں ایسا شوہر ملا ہے؟'' میری خالی نظروں میں وہ سوال تھا اور میں جس کا جواب تلاشنے کے لیے اس کا منہ تک رہی تھی۔

''ایسا نہیں ہے مما جو آپ سوچ رہی ہیں، پاپا کو ویسی ہی عورتیں ملتی رہی ہیں جیسے وہ خود ہیں، ہاں آپ کے لیے آزمائش ہے...... بعض اوقات اللہ کے احکامات کو سمجھنے میں ہم غلطی کر جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور میں جو کچھ فرمایا ہے، اسے آپ ایک دفعہ دوبارہ تفصیل سے پڑھیں! خود سوچیں اور سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں، مجھے علم ہے کہ آپ جس فیصلے پر پہنچی ہیں بہت سوچ سمجھ کر ہی پہنچی ہوں گی کم از کم ہم سب بہنوں کو بتانے سے پہلے آپ نے بار ہا اس پر نظرِ ثانی کی ہو گی...... آپ اپنے فیصلے میں خود کو کبھی تنہا نہیں پائیں گی۔ میں سب بہنوں سے بات کروں گی، آپ جو بھی کرنا چاہیں گی ہم اس میں آپ کی تائید کریں گی۔'' اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

''اس بات کی شرم مجھے کھائے جاتی ہے بیٹا کہ میں نے تمہارے باپ کے راز تمہارے سامنے آشکار کر دیے ہیں، خود کو جہنم کا ایندھن بنا رہی ہوں...... میں نے خود جب تک ان کے بارے میں جانا نہیں تھا تب تک پوجا کی طرح ان سے محبت کی، قسم کھا کر کہتی ہوں کہ خود سے بڑھ کر ان سے محبت کی، ان کی کئی غلطیوں کو معاف کرتی رہی...... جب وہ معافی مانگتے تو میں خود کو زمین میں گڑتا ہوا محسوس کرتی کہ انہیں شرمندگی ہوئی اور اب میں نے تمہارے باپ کو تم سب کی نظروں میں بے پردہ کر دیا ہے۔ مجھے ان سے محبت رہی ہے نہ دل میں ان کا احترام...... اب مجھ سے مزید برداشت نہیں ہوتا، مجھے گھن آنا شروع ہو گئی ہے یہ سوچ کر کہ میں کس طرح کے شخص کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوں، مجھے مجبوری کیا ہے بھلا؟'' میں سسک رہی تھی، دل سے ندامت محسوس کر رہی تھی۔'' سوچتی ہوں کہ تم نے اچھا ہی کیا کہ اشعر کے ساتھ اپنی ساری زندگی کو سزا کی طرح نہیں گزارا، اپنے لیے جو مناسب سمجھا کیا اور جس تکلیف میں بھی ہو کم از کم اپنی نارسائی کا دکھ تو تمہیں نہیں مارتا ناں...... وہ ایک تلخ باب تھا جس کے انجام میں تم نے اپنے لیے بہترین انتخاب کر لیا، میں بھی اسے غلط سمجھتی رہی اور دنیا نے بھی غلط کہا مگر تم ہی عاقل ٹھہریں کہ تم نے اپنے لیے مناسب فیصلہ کیا۔ میں تو اتنی زنجیروں میں جکڑی ہوئی عورت ہوں کہ اس کینسر جیسے شخص کو بھی اپنی زندگی سے علیحدہ کرتے وقت سو بار سوچنا پڑا ہے......''

''آپ کو بھی کوئی مجبوری نہیں اور نہ ہی آپ کو شرمندہ ہونے کی ضرورت ہے مما......'' اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔'' کیا ہم اتنی بے خبر ہیں کہ ہمارے بچپن سے لے کر ہماری جوانی تک اس گھر میں بھانت بھانت کی عورتوں کے ساتھ پاپا......'' اس نے مجھے کندھوں سے پکڑ لیا......'' ہم تینوں کو کچھ نہ کچھ اندازہ ہے مما، صرف صدف کو پاپا کے بارے میں کچھ علم نہیں۔''

''اسے نہ ہی معلوم ہو تو اچھا ہے......'' میں نے التجا کی۔

☆☆☆

تانیہ کی اچانک موت نے مجھے توڑ کر رکھ دیا، دانیال بھی بکھرے بکھرے سے تھے، انہوں نے تانیہ کو بیٹیوں کی طرح سمجھا تھا ہمیشہ، کبھی میرا دل چاہتا کہ انہیں سمیٹ لوں، انہوں نے مجھ سے تانیہ کی موت کا افسوس بھی کیا......

''مجھے تو آپ سے افسوس کرنا چاہیے دانیال!''

''وہ کیوں مما؟'' فاطش نے سوال کیا تھا، مجھے لگا کہ وہ کچھ الجھی الجھی سی تھی۔

''کیونکہ وہ دانیال کی پانچویں بیٹی جیسی تھی، انہوں نے اس کو بچپن سے......'' میں ہچکیوں سے رونے لگی ...۔ فاطش میرے چہرے کو گھور رہی تھی۔

''ہاں مما...... بچپن سے!'' فاطش کہہ کر سسکنے لگی، میں نے اس کے بال سہلائے، میں جانتی تھی کہ اسے تانیہ سے اور تانیہ کو اس سے بہت پیار تھا۔ فاطش کی زندگی کے المیے نے تانیہ کو بہت پریشان کر دیا تھا، وہ کہتی تھی کہ ہمیں اس کا گھر بچانے کے لیے کاوش کرنا چاہیے تھی...... اس کے بے جا لاڈ اور پیار کا ہی شاخسانہ تھا کہ میں نے فاطش کو بارہا اس کے ساتھ بدتمیزی سے بات کرتے اور جواب میں کمالِ برداشت سے تانیہ کو مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ تانیہ نے خودکشی سے پہلے بھی خاص طور پر فاطش کو بلایا تھا اور مجھے شک نہیں بلکہ یقین تھا کہ وہ اس کی خودکشی کے اسباب سے کچھ نہ کچھ واقف تھی مگر پرسش کے باوجود اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ میں تانیہ کے سسرال والوں پر مقدمہ کرنا چاہتی تھی مگر فاطش نے ہی مجھے منع کر دیا کہ جب ان کے سارے خاندان کو خودکشی کا علم ہوگا تو خالہ کی روح کو تکلیف ہوگی۔ وہ خبر جسے سب سے چھپایا گیا تھا اسے سب جان جاتے، اس کی مری ہوئی خالہ پر تھو تھو کرتے اور کئی قیافے اور قیاس آرائیاں کرتے۔

''اگر آپ ان کے خاندان کے جائیداد کے لالچ کی بات کرتی ہیں مما تو پھر تو مجھے خالہ کی سب سے قیمتی جائیداد ملی ہے، جو شہر میں ہے اور اس کی مالیت کئی کروڑ ہے، اتنی کہ ان لوگوں کو اتنی رقم گننا بھی نہیں آتی ہوگی......'' جب میں نے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اس کے خاندان والوں نے جائیداد کے لالچ میں اسے خود قتل کر کے خودکشی کا ڈراما بنا دیا ہے تو اس نے کہا۔

''مجھے کچھ بتاؤ تو سہی اس کے راز کے بارے میں فاطی بیٹا!'' میں نے اصرار کیا۔

''کوئی ایسی بات نہیں ہے مما جو آپ کو بتانے والی ہوتی اور میں نے نہیں بتائی...... باقی جو اللہ نے راز میں رکھا مما...... خالہ نے مجھ سے وعدہ لیا تھا، وہ زندہ ہوتیں تو یقین کریں کہ میں ان سے پوچھ کر آپ کو بتا دیتی مگر اب اسے میں آشکار کر کے گناہ گار نہیں ہونا چاہتی، اگر اس ستار العیوب نے ان کے کئی بھید رکھ لیے تو میں کون ہوں جو ان کا ڈنکا بجاتی پھروں۔'' اس کے کہنے پر میں خوف زدہ ہو گئی، شاید...... نہیں یقیناً تانیہ کا کوئی ایسا بھید تھا جس کا تعلق اس کی خودکشی سے تھا۔''ممکن ہے کہ وہ اپنی ناپسندیدہ شادی کو نبھاتے نبھاتے کسی اور کے ساتھ......'' میں اپنی مری ہوئی بہن کے بارے میں ایسا سوچنے پر خود ہی شرمندہ تھی مگر اس سے زیادہ کوئی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی، سو اس کے حق میں صدقِ دل سے دعا کی۔

☆☆☆

احمد کے بتانے کے بعد میں نے دانیال پر خاص نظر رکھنا شروع کر دی تھی اور مجھے احساس ہوا کہ کہیں

جاتے ہوئے ان کی تیاری اور تیور ہی اور ہوتے تھے..... جتنے دن وہ گھر سے باہر رہتے، میں گھر میں کسی انجانی آگ میں جلتی رہتی۔ میں ان کے فون، کمپیوٹر اور کاغذات کو بھی چیک کرنے لگی، میں نے احمر کے کہنے پر داخلہ لے کر خاص طور پر کمپیوٹر کو استعمال کرنا سیکھا تا کہ جس طرح اس نے بتایا تھا میں دانیال کو چیک کر سکتی۔ دانیال کو اس بات کی بھنک بھی نہ مل سکی اور نہ ہی انہیں اندازہ ہوا کہ وہ کس طریقے سے چیک ہو رہے تھے اور ان کی زندگی کی بازی مات کی طرف بڑھ رہی تھی...... اسی دوران مجھے ان کی کمپیوٹر چیٹ میں ایک ایسا چہرہ نظر آیا جسے میں نے کہیں دیکھا تھا......کافی غور وخوض کے بعد مجھے یاد آ گیا۔

''عفت کو کیسے جانتے ہیں آپ دانیال؟'' میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''کون عفت؟'' زمانے بھر کی معصومیت لہجے میں سموئے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

''وہی عفت......جس کے ساتھ آپ نے چند دن مری میں گزارے تھے...... فاطش کی شادی کے بعد!'' میں نے پورے اعتماد سے کہا۔'' جسے آپ واپس آ کر بھی نہیں بھولے...... فاطش کی خلع ہو جانے کے بعد بھی آپ اسے اس کے گھر جا کر ملتے رہے ہیں کیونکہ اس کا شوہر ملک سے باہر ہے اور وہ گھر میں تنہا اور اداس رہتی ہے......وہ جسے آپ کہتے ہیں کہ دنیا کی سب سے باکمال عورت ہے۔''

''میں کسی عفت کو نہیں جانتا۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولے۔

''ہونہہ......'' میں نے طنز سے کہا۔'' آپ کہیں اور میں مان لوں......دانیال؟ وہ عفت دراصل اشعر کی پھوپی کی نند ہے...... آپ کو علم ہونا چاہیے کہ آپ کی بیٹی کی شادی اس گھر میں، اس خاندان میں ہوئی اور پھر اس نے اتنے برے حالات دیکھے......جس وقت میری بیٹی اپنی شادی شدہ زندگی کی بقا کی جنگ ہار کر گھر میں آئی، اس روز آپ اشعر کے خاندان کی ایک عورت کے ساتھ اپنے گھر سے دور رنگ رلیاں منا رہے تھے۔'' میں سسکی۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے جان۔'' انہوں نے ہاتھ بڑھایا جسے میں نے جھٹک دیا۔

''مت چھوئیں مجھے ان غلیظ ہاتھوں سے......''

''تم حد سے بڑھ رہی ہو حنا!'' انہوں نے الٹا مجھ پر غصہ کیا۔

''حد......؟'' میں نے گہری سانس لی۔'' حد تو تم نے کر دی ہے دانیال!'' غصے کی انتہا پر پہنچ کر میرا اس شخص کی عزت کرنے کو بھی دل نہ چاہ رہا تھا۔ اس دن کے بعد سے میرے اور ان کے درمیان سے لفظ ''آپ'' کسی رسوا ہونے والے محبوب کی طرح اٹھ گیا۔

''بہت ہو چکی...... میں نے بہت برداشت کر لیا، تمہیں تو یہ شرم بھی نہیں رہی کہ تمہارے کرتوتوں کی سزا تمہاری بیٹیوں کو مل رہی ہے......ایک کو طلاق ہو گئی ہے، ایک کا بیٹا مستقل مریض ہے اور ہر وقت اس کی جان خطرے میں رہتی ہے......ایک کی شادی ہوئی ہے تو اولاد کا سکھ اس کے نصیب میں نہیں...... کیوں نہیں سمجھ میں آتا کہ یہ قدرت کی طرف سے سزا کے طور پر بھی ہو سکتا ہے۔''

''ہاں ہاں......'' وہ جواب میں چیخے۔'' تم یہ کیوں بھول گئی ہو کہ اس دنیا میں ہونے والی ساری جنگیں، ساری دہشت گردی، قحط، سیلاب اور زلزلے، حادثات اور اموات بھی سب میری وجہ سے آ رہے ہیں۔''

''جس پر جو قیامت ٹوٹتی ہے اسے سب سے بڑی وہی لگتی ہے دانیال...... میرے لیے یہی حادثات ہیں اور یہی زلزلے جنہوں نے ہماری زندگی کو تہہ و بالا کر دیا ہے۔''

''تم ضرورت سے زیادہ تصوراتی دنیا میں رہنے لگی ہو حنا!'' انہوں نے دھیما لہجہ کر کے اپنے لہجے کی تلخی کا اثر کم کرنے کی کوشش کی۔

''ساری عمر تصورات کی حسین دنیا میں رہتے گزر گئی، اب آنکھ کھلی ہے تو اندازہ ہوا کہ میں نے کس دھوکے میں رہ کر عمر بتا دی۔''

"میں نے کوئی دھوکا نہیں دیا تمہیں حنا...... تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، میں اس عمر میں تمہیں کیا دھوکا دوں گا؟" اپنی غلطی کو ماننے پر وہ تیار ہی نہ تھے میں ضبط وکرب کی کتنی ہی منزلوں سے گزر کر ان سے بات بھی کرتی، کوشش کرتی کہ ..... جب بھی موقع ملے سمجھاؤں مگر جونہی میں اس موضوع کی طرف آتی وہ پلٹا کھا کر الٹا مجھ سے الجھ پڑتے جیسے میں جھوٹی اور وہ سچے ہوں میں نے کس سراب کے پیچھے بھاگ بھاگ کر اپنا آپ گنوا دیا تھا، احساسِ زیاں جاتا ہی نہ تھا، اپنا وجود ارزاں لگنے لگا، جی چاہتا کہ وہی کروں جو تانیہ نے کیا تھا۔ اب تو اور بھی واثق یقین ہو چلا تھا کہ تانیہ نے کسی مرد کے ہاتھوں دھوکا ہی کھایا ہوگا...... مگر میرے ہاتھ میں صرف پچھتاوؤں کے مسلے ہوئے نوٹ تھے۔

کاش میں نے کرن کے ساتھ وہ سب نہ کیا ہوتا، اے کاش! مجھے کہیں کرن مل جائے تو میں اس سے معافی کی بھیک مانگوں کیونکہ مجھے یقین تھا کہ کرن کی بددعاؤں نے میری زندگی کو یوں بدنصیبی کا نمونہ بنا دیا تھا۔ اسے بتاتی کہ دانیال کو کھونا اس کی بدنصیبی نہ تھی بلکہ اس کی کوئی نیکی کام آ گئی تھی جو اسے دانیال سے نجات مل گئی تھی...... اگر اس کی بددعائیں طاقت ور تھیں تو کیا میری دعائیں اللہ تعالیٰ رد کر دیتا، میں نے باقاعدگی سے نماز پڑھ کر اس (دانیال) کے لیے ہدایت کی دعا کرنا شروع کر دی۔" یا اسے ہدایت کا راستہ دکھا میرے مولا، یا مجھے اس سے نجات دلا!"

اُس کا میری زندگی میں ہونا میرے لیے اتنا کرب ناک تھا کہ میں اٹھتے بیٹھتے اسے ان لڑکیوں اور عورتوں کے ناموں کے طعنے دینے لگی جن سے اس کا واسطہ رہ چکا تھا یا اس وقت تھا۔

وہ بھی مجھے الجھ کر دیکھتا، میری باتیں سن کر حیرانی سے ٹکر ٹکر مجھے گھورتا مگر اسے کہاں سمجھ تھی کہ میں یہ سب کیوں کر جان لیتی تھی۔ اپنا فون بھی وہ ہر وقت اپنے پاس رکھتا، اپنا کمپیوٹر، لیپ ٹاپ اس نے مستقل دفتر ساتھ لے جانا شروع کر دیا مگر اسے غالباً علم نہ تھا کہ "ہیلنگ" کے لیے مجھے اس کے کمپیوٹر یا لیپ ٹاپ کی ضرورت بھی نہ تھی، اس کی سوچ یہیں تک محدود تھی جو وہ ہر بات کے جواب میں کہتا "جانے کون تمہارے کان بھرتا رہتا ہے...... جانے کسے تم نے میری جاسوسی پر لگا رکھا ہے جو تمہیں اُلا بلا بتاتا رہتا ہے۔" اس سے آگے اس کی سوچ نہ جاتی۔

☆☆☆

صدف کی شادی میرا آخری فرض تھا جسے میں نے نبھانا تھا اور اس کے بعد میں اپنے لیے فیصلہ کرنے کو آزاد ہوتی، مجھے ایسے بدکردار شخص کے ساتھ رہنے کی کوئی مجبوری نہ تھی، مجھے دنیا کی پروا بھی نہ رہی تھی، دنیا کا کیا ہے، لوگوں کے منہ بند رکھنے کو ہم کتنا کچھ کرتے ہیں مگر پھر بھی وہ کسی نہ کسی بات پر کھلے رہتے ہیں۔ صدف کی شادی سے پہلے میں نے احمد سے وعدہ لیا تھا کہ وہ صدف کو کچھ نہیں بتائے گا کیونکہ وہ اپنے باپ کو بہت چاہتی تھی اور میں نہیں چاہتی تھی کہ اس کا دل یہ سب جان کر دکھی ہو، وہ بہت حساس تھی اور باپ کی ذرا سی تکلیف یا بیماری پر تڑپ اٹھتی تھی۔

کبھی میں نے بھی اس شخص کو ۔۔ یونہی چاہا تھا، اس کی خوشی اور ناخوشی کا خیال رکھا تھا، اس کی کسی امانت میں خیانت نہ کی تھی تو پھر وہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟ کیا کمی واقع ہو گئی تھی مجھ میں، میرے پیار میں، میری وفاداری میں؟ عمر بھر تو بیویاں شوہروں کی دلداری میں نہیں رہ سکتیں، ان کے کاندھوں پر وقت کے ساتھ ساتھ کئی مصروفیات پڑ جاتی ہیں جن کا بار وہ تنہا اٹھاتی ہیں اور شوہر بجائے ان کا ساتھ دینے کے، کیا اپنے لیے نئی دلداریاں ڈھونڈ لیں......؟ ان کی محبت کا صلہ انہیں بے وفائی کی صورت میں دیں؟

میں نے سال بھر اسے طعنے دے دے کر اور جتلا جتلا کر بھی دیکھ لیا مگر اس کے اس گھٹیا معمول میں کوئی فرق نہ آیا، میں نے کافی سوچ سمجھ کر اس سے حتمی بات کرنے کا فیصلہ کیا، مجھے اب اس کی زندگی میں نہ رہنا تھا اور اس کے لیے اسے یہ گھر چھوڑنا پڑتا کیونکہ یہ

گھر میرا تھا، وہ نہ صرف گھر سے نکلتا بلکہ میری زندگی سے بھی نکل جاتا اور آزاد ہوتا کہ جہاں چاہے اور جیسے چاہے جھک مارے، جب اسے ہی احساسِ عذاب و سزا نہ رہا تھا تو میرا کیا بگڑتا تھا، اسے نہ دنیا میں بدنامی کا ڈر رہا تھا نہ آخرت میں عذاب کا...... جتنے دھڑلے سے وہ شہر شہر میں عورتوں سے تعلقات رکھے ہوئے تھا اور ان سے ملتا تھا، مجھے سوچ کر حیرت ہوتی کہ وہ اب تک کسی کے ہاتھوں پکڑا کیوں نہ گیا تھا۔

میں نے بہت سوچ سمجھ کر خلع کا فیصلہ کیا تھا، اس عمر میں اور شادی شدہ بیٹیوں کے ساتھ مجھے طلاق ملتی تو میں لوگوں کے منہ نہ روک سکتی، لوگ مجھ پر شک کرتے اس لیے میں نے خلع لینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اپنی ساری بیٹیوں کو بتا دیا کہ میں نے کیا فیصلہ کیا تھا۔ رانیہ کو میں نے پیغام بھیجا، فاطش اور نیلم سے روبرو بات کی اور صدف کو اسکائپ پر...... کئی دن تک میں ان سب کی طرف سے ردِعمل کا انتظار کرتی رہی، فاطش تو گھر میں تھی اس لیے اس نے اگلے ہی روز مجھ سے بات کی اور کہا کہ وہ میرے ہر فیصلے میں میرے ساتھ ہے اور تائید کرے گی۔ صدف کی طرف سے مجھے توقع تھی کہ وہ چیخے گی، چلّائے گی، وضاحتیں مانگے گی مگر اس کی طرف سے ایسا کچھ نہ ہوا، الٹا احمد نے مجھے بتایا کہ وہ شاک میں چلی گئی تھی۔

''آپ نے اسے کیا کہا ممانی جان؟'' احمد نے مجھ سے فون پر پوچھا۔

''وہ ہے کہاں؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔ ''میری اس سے بات کروا دو بیٹا!''

''اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے ممانی جان اور وہ اسپتال میں ہے۔ اسپتال کے اندر فون کی سروس نہیں ہے، گھر پر جائیں گے تو اس سے بات کروادوں گا۔''

''اسے فوراً بھجواؤ پاکستان بیٹا، ورنہ اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو جائے گی۔'' میں نے بے تابی سے کہا۔

''آپ نے اسے کیا بتایا ہے ممانی جان؟'' اس نے سوال دُہرایا۔

''میں نے اسے بھی بتایا ہے اور باقی سب بیٹیوں کو بھی کہ میں نے دانیال سے خلع لینے کا فیصلہ کیا ہے......'' میں نے تھوک نگل کر یہ مشکل فقرہ ادا کیا۔

احمد بھی اس بات پر ساکت رہ گیا، کافی دیر تک کوئی آواز نہ آئی۔ ''ہیلو!'' میں نے تصدیق کی کہ وہ فون کے دوسری طرف موجود تھا۔

''بہت برا ہوگا یہ تو......'' اس نے ہولے سے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ ماموں وعدہ کرنے کے باوجود اپنا وہی معمول جاری رکھے ہوئے ہیں؟''

''ہوں!'' میں نے فقط ہوں پر اکتفا کیا۔

''کیا آپ نے صدف کو بتایا ہے کہ آپ کس وجہ سے خلع لے رہی ہیں ماموں سے؟''

''نہیں...... اس کا موقع ہی نہیں ملا بیٹا!''

''فقط یہ کہہ دینا کہ آپ ماموں سے خلع حاصل کرنا چاہتی ہیں، کافی نہیں ممانی جان، آپ کو وجہ بتانی چاہیے تھی صدف کو تاکہ اسے اندازہ ہوتا کہ آپ کا فیصلہ درست ہے اور وہ شاک میں نہ جاتی۔''

''میں کس طرح اسے یہ سب بتاتی بیٹا......'' میں نے بے بسی سے کہا۔ ''وہ اپنے باپ کی دیوانی ہے، اس کے سامنے اپنے باپ کا بت پاش پاش ہوا تو وہ دنیا کے ہر مرد سے متنفر ہو جائے گی۔''

''میں کوشش کرتا ہوں صدف کو بھیجنے کی، ہو سکا تو خود بھی ساتھ آؤں گا۔'' اس نے جانے کس کیفیت میں فون بند کیا کہ خدا حافظ بھی نہ کہا، میں فون بند کر کے سسک پڑی، مجھے یوں لگا کہ میں کسی بازار میں ننگے سر کھڑی ہوں۔ میرے ذاتی بھید میری اپنی بیٹیوں پر اور پھر دامادوں پر آشکار ہونے والے تھے۔

☆☆☆

ثانیہ کی موت نے مجھے توڑ دیا تھا تو فاطش کی حالت اس سے بھی ابتر تھی، میں نے ان دنوں اسے اتنا پریشان دیکھا تھا کہ شاید اس سے قبل کبھی نہیں۔ وہ گم صم پہروں کمرے میں پڑی رہتی، کالج سے لوٹتی تو اس کے

بعد کمرے سے نہ نکلتی۔ صدف کے ساتھ وہ کچھ بہل گئی اور پھر میں نے نیلم سے بات کی تو اس نے وعدہ کیا کہ وہ کچھ کرے گی تا کہ فاطش کو اس شاک سے نکالا جا سکے...... ''فاطش کی شادی کرنا اہم ہے بیٹا!''

''شادی کے لیے اس سے بات کرنے سے پہلے اہم یہ ہے کہ وہ اس کیفیت سے نکلے مما جو خالہ کی موت سے اس پر طاری ہوگئی ہے، مجھے لگتا ہے کہ وہ ڈیپریشن میں چلی گئی ہے۔''

''ایسا کیوں ہوا بیٹا......؟''

''اسے عدم تحفظ کا احساس ہونے لگا ہے مما، نہ صرف خالہ کی موت بلکہ آپ کے حالیہ فیصلے نے بھی اس پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں، اسے خوف پڑ جائے گا کہ دنیا کے سارے مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔''

''تم کہنا چاہتی ہو بیٹا کہ اس کی اس ذہنی کیفیت کی وجہ میں ہوں؟'' میں نے دکھ سے سوال کیا۔

''میں نے یہ قطعی نہیں کہا مما......'' اس نے فوراً کہا۔ ''لیکن کہنا چاہتی ہوں کہ آپ کا یہ فیصلہ اپنی جگہ درست سہی مگر آپ اپنی بیٹیوں کے ذہنوں اور ان کی زندگیوں پر اس کے اثرات کو وقوع پذیر ہونے سے نہیں روک سکتیں۔'' اس کے کہنے کا مطلب تو یہی تھا کہ مجھے اس بڑے فیصلے پر عمل کرنے سے پہلے اپنی بیٹیوں کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا۔ ان کے گھروں کے حالات کو مدِنظر رکھنا چاہیے تھا، دنیا میں کسی اور کی نہیں مگر اپنی بیٹیوں کی پروا کرنا چاہیے تھی۔ میں خاموش ہوگئی...... ''مما آپ یہ نہ سوچیں کہ میں آپ کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر رہی ہوں، ہم سب اپنے اپنے گھروں میں مطمئن اور خوش ہیں...... مگر...... ایسا ہوا تو......'' وہ رکی۔ ''دیکھیں ناں، جیسے مجھے عمر کو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو بتانا ہوگی اسی طرح صدف اور رانیہ آپی کو بھی اپنے شوہروں کو کچھ نہ کچھ بتانا ہوگا ناں؟'' اس نے نظر چرا کر کہا۔

''ہونہہ......'' میں نے گہری سانس لی تھی، میں اسے بتانا نہیں چاہتی تھی کہ صدف کے شوہر احمد کو نہ

صرف علم ہے بلکہ اسی نے تو مجھے اس سارے خطرے سے آگاہ کیا تھا بہت عرصہ پہلے۔

ایسا نہیں تھا کہ میں نے اس فیصلے تک پہنچنے سے پہلے اس کے تمام پہلوؤں پر غور نہیں کیا تھا مگر نیلم کی بات کے جواب میں خاموشی اس لیے اختیار کی تھی کہ میں اسے واضح الفاظ میں یہ نہ کہہ سکتی تھی کہ اب مجھے کسی کی پروانہ رہی تھی نہ ہی میں اپنی بیٹیوں کو اعتماد میں لیے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کر سکتی تھی......

☆☆☆

نیلم کا پیغام آیا تھا کہ اسے فاطش کو خریداری کے لیے ساتھ لے کر جانا تھا۔ ان دنوں نیلم دن رات گھن چکر بنی ہوئی تھی اس کے شوہر کی پہلی بیوی سے بیٹی بیلی کی شادی طے ہو گئی تھی۔

''مگر تمہیں تو علم ہے نیلم کہ وہ کتنی چور ہے خریداری کی، جان جاتی ہے اس کی بازار کا نام سن کر۔'' میں نے اس سے کہا، جانتی تھی کہ فاطش کو خریداری کا بھی شوق نہ رہا تھا، وہ اس معاملے میں چور تھی، اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کوئی اس کے لیے سب کچھ خرید کر لے آئے، اسے گھر بیٹھے ضرورت کی ہر چیز مل جائے۔

''میں تو پہلے ہی آپ سے اجازت لینے والی تھی مما کہ اسے میرے حوالے کر دیں چند دن کے لیے......'' نیلم نے کہا تھا۔'' اسے کہیں کہ میں اس کی منت کرتی ہوں کہ میرے ساتھ چلے، مما مجھے اپنے لیے خریداری کرنا ہے، کم از کم مجھے مشورہ تو دے دے گی، بہن ہے وہ میری......''

''صدف کو لے جاؤ بیٹا، وہ بھی ذرا بہل جائے گی۔'' میں نے تجویز پیش کی۔

''نہیں مما......'' اس نے فوراً کہا۔'' صدف کا انتخاب بہت مختلف ہوتا ہے اور پھر اس کے ساتھ احمد ہے، اس کی اپنی سسرال کی کوئی نہ کوئی معروفیت بھی ہو گی۔'' اس کے پاس جواب موجود تھا سو میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ میں فاطش کو منا لوں گی۔

''کسی وقت آؤں گی آپ کی طرف، آپ سے ایک اور اہم بات بھی کرنی ہے۔'' اس نے کہا۔

''کون سی اہم بات بیٹا؟'' میں نے فوراً پوچھا تھا۔

''وقت آنے پر بتاؤں گی۔'' اس کے اتنا کہہ کر فون بند کر دینے سے میں قیافوں میں الجھ گئی، ممکن ہے کہ اس نے عمر سے میرے بارے میں بات کی ہو اور اس کا ردِعمل مجھے بتانا چاہتی ہو، ان دنوں میری سوچ اس سے آگے بڑھتی ہی نہ تھی۔ جلد ہی بلی تھیلے سے باہر آ گئی اور اس نے مجھے بتایا کہ اس کی نند ناہید کا دیور سجاد...... فاطش سے شادی کا خواہاں تھا۔ نیلم کی طرف سے آنے والے رشتے نے میرے اندر امید کی ایک نئی رمق جگا دی تھی، میں جی جان سے فاطش کو اس پر منانے میں جُت گئی۔

''پہلے آپ اس سے مل لیں ایک بار مما!''

''میں خود بھی یہی سوچ رہی تھی بیٹا..مگر صرف اس صورت میں اگر تمہارا دل مانتا ہو، خواہ مخواہ.... میں اس سے کیا ملوں گی۔''

''میرے اپنے خدشات ہیں مما مگر میں چاہتی ہوں کہ ایک ماں کی حیثیت سے آپ اسے جانچیں، میں اب کے کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتی، جانے کیسے کیسے سوالات ذہن میں اٹھتے ہیں مگر مجھے علم ہے کہ میں ان سے پوچھ نہ پاؤں گی مگر آپ ان سے بات کریں گی تو کھل کر ساری وضاحتیں بھی کریں اور یقین دہانی بھی کہ میں دوبارہ دھوکا نہیں کھانا چاہتی۔'' وہ آنسوؤں بھری آنکھوں سے کہہ رہی تھی جس سے مجھے یہ اندازہ کرنے میں دشواری نہ ہوئی کہ اسے سجاد سے شادی پر کوئی اعتراض نہ ہوگا اگر میں اس کے کہنے کے مطابق اس سے مل کر کچھ باتوں کی وضاحت کر دوں۔ میں نے نیلم سے کہا کہ جب سہولت ہو تو سجاد سے کہے کہ وہ آ کر مجھ سے مل لے، مجھے اس معاملے میں دانیال سے مشورہ لینے کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوئی تھی اور نہ ہی میرے اور اس کے درمیان تعلق کی وہ نوعیت رہ گئی تھی کہ مجھے اس حوالے سے کوئی پروا ہوتی۔

☆☆☆

''اگرچہ تم عمر میں مجھ سے اتنے چھوٹے نہیں ہو مگر اس کے سوا کوئی اور طرزِ تخاطب سوجھا نہیں بیٹا کہ تم نیلم کے تعلق کے حوالے سے بھی آتے تو میں بیٹا کہہ کر ہی بات کرتی......''

''ذرہ نوازی ہے آنٹی آپ کی۔'' اس نے احترام سے کہا۔

''میں بات کو گھما پھرا کر کروں گی اور نہ ہی طوالت اختیار کروں گی، پوچھنا چاہتی ہوں کہ فاطش کے ساتھ شادی کرنے میں کون سا جذبہ کارفرما ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ میں اسے محبت ہی کہوں گا۔'' اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

''کسی کو جانے بغیر محبت کیسے ہو سکتی ہے، تم تو اس سے ملے بھی نہیں تھے جب تم نے نیلم سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہ میں ایک نوجوان ہوں اور نہ ہی فاطش ایک کم سن لڑکی آنٹی۔ یقین کریں کہ میں نے اسے آپ کے گھر میں پہلی بار دیکھا تو وہ مجھے اچھی لگی تھی، جانتا بھی نہ تھا کہ اس کا نام فاطش ہے، اس کی شادی بھی ہوئی تھی اور اس کا ایک بیٹا بھی ہے......''

''تو یہ سب جان کر بھی تمہارے جذبات وہی کیونکر رہے؟'' میں نے اگلا سوال کیا۔

''آنٹی میں خود بھی اسی طرح کے حالات کا شکار رہا ہوں، میری امی تو اب بھی کنواری لڑکیوں کے رشتے ڈھونڈتی پھرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ بیٹیوں کے والدین اتنے مجبور ہوتے ہیں کہ انہیں جیسا تیسا بھی رشتہ ملے کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں، میں نے ہی مان کر نہیں دیا میں سمجھتا تھا کہ یہ مناسب جوڑ نہ ہوگا، میں کنواری اور کم سن لڑکیوں کے ساتھ خود کو کبھی سیٹ نہ کر پاتا......'' وہ رکا۔ ''فاطش مجھے دیکھنے میں اچھی لگی، پھر اس کے حالات جانے تو مجھے یہ جوڑ بالکل مناسب لگا، ممکن ہے کہ ہماری عمروں میں تفاوت پر آپ کو یا انکل کو اعتراض ہو۔ مگر امید اس لیے بندھ گئی کہ آپ نے اپنی ایک کنواری بیٹی کی شادی اس سے عمر میں کافی

> **باتیں جو مہکائیں**
>
> ☆ سوچ گہری ہو جائے تو کیے جانے والے فیصلے کمزور پڑ جاتے ہیں۔
>
> ☆ برائی کرنے والے سے نہیں بلکہ برائی سے نفرت کرو۔
>
> ☆ رونے سے زندگی نہیں گزرتی بلکہ لگ جاتی ہے۔
>
> ☆ اتنا اونچا نہ اُڑو کہ تمہیں سورج کی کرنیں پگھلا دیں۔
>
> ☆ جس محبت پر آپ فخر نہ کر سکیں وہ صرف موت ہے۔
>
> ☆ دعا میں بڑی طاقت ہے، جب تک سینے میں ایمان ہے دعا پر یقین رہتا ہے۔
>
> مرسلہ: عنبر وسیم، گوجرانوالہ

بڑے شخص کے ساتھ کی، بلکہ اس کے تو پہلی بیوی سے چار بچے بھی تھے۔''

''وہ تو ایک مجبوری بن گئی تھی مگر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ اپنے گھر میں بہت خوش ہے......''

''نیلم بھابی کو دیکھ کر ہی لگتا ہے کہ وہ ایک سمجھ دار ماں کی بیٹی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ فاطش بھی ایسی ہی ہوگی، بدقسمت تھا وہ شخص جو اس کی قدر نہ کر سکا ہو۔'' اس نے پورے خلوص سے کہا تھا۔

''جن لڑکیوں کی دوسری شادی ہوتی ہے...... ان کے شوہر انہیں عموماً پہلی شادی کے حوالے سے کچھ نہ کچھ کہتے ہیں، اگر ایسی کوئی صورتِ حال ہوئی تو؟''

''آج میں نے پہلی اور آخری بار فاطش کی پہلی شادی کا حوالہ دیا ہے آنٹی، میرا وعدہ ہے آپ سے کہ اس کے بعد یہ بھی نہیں کہوں گا کہ بدقسمت تھا وہ شخص!'' اس نے کہا۔ ''میں خود بھی شادی شدہ رہ چکا ہوں اور ایک بیٹی کا باپ ہوں، میں سمجھ سکتا ہوں کہ جب زخموں پر کھرنڈ آ جائے تو انہیں چھیلنا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میری

طرف سے ماضی کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ میں آپ کی بیٹی کو خوش رکھوں گا، میرے پاس اپنا ذاتی گھر ہے، میرا کاروبار بھی اچھا ہے اور میں کوشش کروں گا کہ آپ کی بیٹی کی ہر خواہش پوری کروں، جیسا وہ رہنا چاہے اسے ویسا رکھوں، آپ بے شک امریکا آکر میری ان سب باتوں کی تصدیق کرلیں۔"

"زندگی میں ایک مرد کے ہاتھوں دھوکا کھانے والی عورت...... دودھ کے جلے جیسی ہو جاتی ہے بیٹا، اسے دوسرے مرد پر اعتبار بڑی مشکل سے آتا ہے، میری بیٹی بڑی برداشت والی ہے مگر شادی شدہ زندگیوں میں ایسے اتار چڑھاؤ آتے ہیں کہ اچھے اچھوں کے قدم لرز جاتے ہیں......"

"میں سمجھتا ہوں ان باتوں کو آنٹی، میں نے اپنی بیٹی کی خاطر بہت مصالحت کی کوشش بھی کی تھی مگر میری بیوی...... اسے میرا اور میرے خاندان کا کچھ بھی پسند نہ تھا، مرد کی برداشت کی بھی حد ہوتی ہے، میں اس حد سے بڑھ کر اسے برداشت کرتا رہا مگر وہ کسی بات پر مطمئن نہ ہوتی اور پھر وہ خود ہی گھر چھوڑ کر چلی گئی...... اس نے عدالت میں خلع کا کیس کر دیا تو میں نے اسے طلاق دے دی۔" وہ رکا، گہری سانس لی۔" میں یہ تمام باتیں فاطش کے سامنے قطعی نہیں دہرانا چاہتا، بس چاہتا ہوں کہ میری ہونے والی بیوی یہ سمجھتی ہو کہ شادی دو افراد کے تعلق کا نام نہیں ہے۔ اگرچہ میرے خاندان کی طرف سے نہ کوئی بوجھ ہوگا نہ دباؤ۔ مگر بیوی کی طرف سے یہ مطالبہ کہ اس سے تعلق قائم ہو تو باقی سب سے قطع تعلق کرلیا جائے...... یہ تو ٹھیک نہیں ہے ناں آنٹی!"

"ہوں......" میں نے سوچ کر کہا۔" ظاہر ہے کہ کوئی بھی فرد شادی اس لیے نہیں کرتا کہ وہ باقی خاندان سے کٹ جائے، میری کسی بیٹی میں ایسا وصف نہیں ہے بیٹا!"

"باقی جس طرح آپ مناسب سمجھیں، اگر آپ، انکل اور فاطش مجھے اس قابل سمجھیں تو مجھے خوشی ہوگی، میری ایک بہت بڑی خواہش کی تکمیل ہوگی...... اسود فاطش کا حصہ ہے اور اس حوالے سے مجھے اس کے فاطش کے ساتھ ہونے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا...... میں یہ بھی نہیں کہتا کہ میں اسے اس کے سگے باپ سے بڑھ کر چاہوں گا۔ مگر یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس کا بہترین دوست ثابت ہوں گا۔" اس نے وعدہ کیا، اسے تو علم بھی نہ تھا مگر ساتھ کے کمرے میں بیٹھی فاطش ہم دونوں کے بیچ ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ سن رہی تھی......" آپ کو کسی بات پر ذرا سا بھی شک ہو تو آپ اپنے طور پر جانچ پڑتال کروالیں، میں چاہتا تھا کہ اسی دفعہ کچھ طے ہو جاتا تو میں...... میرا مطلب ہے کہ اگر آپ میرا رشتہ قبول کرلیں تو میں سادگی سے نکاح کر کے فاطش کے ویزے کے لیے اپلائی کر دوں اور جب اس کا ویزا آجائے تو میں اسے لینے آجاؤں اور اگر آپ چاہیں تو اپنی تسلی کرلیں، جب آپ مطمئن ہوں تو میں پھر بھی آسکتا ہوں۔" اس نے اپنا مدعا ڈرے ڈرے انداز میں بیان کیا تو میں خود کو مسکرانے سے نہ روک سکی۔

"میں فاطش کے پاپا سے بات کر کے تمہیں بتاؤں گی بیٹا!"

"آپ پہلے فاطش سے بات کرلیں آنٹی، اس کی رائے اور اس کا فیصلہ سب سے اہم ہے میرے لیے۔"

"فاطش کی رائے بھی کے لیے سب سے اہم ہے بیٹا، اس لیے کہ اب وہ ایک کم عمر اور نادان لڑکی نہیں ہے جو کسی کی باتوں میں آجائے، وقت اور حالات نے اسے بہت کچھ سکھایا ہے اور اب وہ یقیناً اپنے لیے بہتر فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہے۔"

"میں آپ کے جواب کا انتظار کروں گا آنٹی!" اس نے انتہائی احترام سے میرے سامنے سر جھکایا، میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔" بہت شکریہ اس عزت افزائی کا...... آپ نے اپنا دست شفقت میرے سر پر رکھا ہے تو اسے رکھا رہنے دیجیے گا۔" وہ سلام کر کے چلا گیا اور دو منٹ کے بعد میں فاطش کے

پاس تھی۔

''باتوں کا استاد ہے مما!'' اس نے ہنس کر کہا، اس کی ایسی ہنسی میں نے سالوں سے نہ سنی تھی۔

''چلو اچھا ہے، تمہیں بور نہیں ہونے دے گا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''مجھے کیوں؟'' اس نے مصنوعی ناراضی سے پوچھا۔

''کیونکہ اب باقی زندگی تم نے اسی کی باتیں تو سننا ہیں۔'' میں نے اس کی لال ہوتی ہوئی ناک کو چھوا۔

''یہ کس نے کہہ دیا؟'' اس کی آنکھوں میں ہنسی سے آنسو آگئے تھے۔

''تمہاری آنکھوں کی نمی نے...... تمہارے ہونٹوں کی ہنسی نے......''

''آپ کو تو شاعرہ ہونا چاہیے تھا مما!'' وہ اپنے چہرے پر بکھرنے والے رنگ چھپانے کے لیے مجھ سے لپٹ گئی، میں نے اسے اپنی باہوں میں سمیٹ لیا، اس کے ماتھے پر بوسہ دے کر اسے خوش رہنے کی دعا دی، نیلم کو کال کر کے بتانا بھی تھا اور اس سے یہ...... بھی کہنا تھا کہ وہ اور عمر دانیال سے خود ہی بات کر لیں اور انہیں بتا بھی دیں کہ فاطش کو بھی اس پر اعتراض نہ تھا، جب یہ شادی کرنا ہی تھی تو اس میں مزید دیر کا کیا جواز۔

☆☆☆

سب سے بڑھ کر حیرت تو مجھے یہ تھی کہ رانیہ کی طرف سے مجھے کسی قسم کے ردِعمل کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا، یا تو اسے موقع نہ مل رہا تھا یا پھر وہ اپنی زندگی میں مصروف اتنی تھی کہ اس طرف اس کا دھیان نہ تھا۔ مگر یہ کوئی ایسی معمولی اور چھوٹی بات تو نہ تھی۔ میرا دھیان مصطفیٰ کی طرف چلا گیا، اللہ کرے کہ وہ خیریت سے ہو۔ میں نے اس پیغام کے بعد خیر خیریت کا کوئی پیغام بھی کئی دن تک نہ بھیجا تھا اور چند دن کے بعد جب میں نے پیغام بھیجا تو اس کا جواب اتنے نارمل انداز میں دیا تھا اس نے کہ میں حیران رہ گئی۔

جانتی تھی کہ وہ پردیس میں ہے مگر یہ بھی علم تھا کہ وہ میری بہت بہادر بیٹی تھی اور چھوٹی چھوٹی بات پر دل نہ چھوڑ دیتی تھی جیسے کہ صدف...... بیٹے کی طرف سے بھی اسے پریشانی رہتی تھی اور اپنی ملازمت میں مصروف بھی رہتی تھی، سسرال کے بھرے پُرے خاندان کی ذمے داریاں بھی تھیں۔ عابد بیٹا اس کے ساتھ بہت اچھا تھا اور اپنی ماں جیسی عزت مجھے بھی دیتا تھا، مجھے امید تھی کہ وہ میری بات کو آسانی سے سمجھ لے گا، ممکن ہے کہ رانیہ نے اپنے طریقے سے اسے سمجھا بھی دیا ہو۔ میں رانیہ کے بارے میں سوچ سوچ کر متفکر تھی اور وہ اس روز یوں اچانک پہنچ گئی مصطفیٰ کے ہمراہ، عین اس وقت جب ہمارے گھر کی فضا ایک فائر کی آواز سے گونج اٹھی تھی! صدف، فاطش اور رانیہ چیختی ہوئی باپ کی اسٹڈی کی طرف بھاگیں جبکہ میں نے ملازمہ کوثر سے مصطفیٰ کا خیال رکھنے کو کہا جسے اس کی ماں چھوڑ کر بھاگی تھی تو وہ منہ بسور رہا تھا۔ میں بیٹیوں کے تعاقب میں بھاگی تو میرے قدم کئی کئی من کے ہو

رہے تھے، جانے میری آنکھ کیا منظر دیکھنے جا رہی تھی۔

☆☆☆

اسٹڈی روم میں...... ہر طرف لہو کے چھینٹے دیکھ کر میں ہی مر گئی تھی۔ دانیال نے خودکشی کر لی تھی، یہ سوچ کر ہی میرے بدن سے جان نکل گئی، میں نے یہ تو ضرور چاہا تھا کہ اسے اس دنیا میں بھی عبرت ہو اور یہ بھی سوچا تھا کہ اس سے خلع لینے کے بعد اس کا مکروہ چہرہ ساری دنیا کے سامنے لاؤں گی مگر اس وقت اپنے ہی لہو پر گرے ہوئے دانیال کو دیکھ کر میں سکتے میں چلی گئی، کوئی آواز نکلی نہ آنسو...... فاطش چیخ رہی تھی، رانیہ...... جو ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے پہنچی ہی تھی اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ صدف اپنے بال نوچ رہی تھی۔ میری بیٹیوں کے چہرے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے، احمد نظر آیا تھا پھر ایمبولینس کے سائرن کی آواز...... ہر طرف بھگدڑ مچی تھی، سب بھاگ رہے تھے۔

میں وہیں قالین پر ڈھے گئی تھی۔ میری انگلیوں کو قالین نم محسوس ہوا، میں نے ہاتھ اٹھا کر اپنی آنکھوں کے سامنے کیا، لال لال لہو...... کمرے سے باقی لوگ فوراً غائب ہو گئے تھے۔ کمرا خالی ہو گیا تھا۔ میں مرے مرے قدموں سے وہاں سے نکلی، نیچے آئی جہاں اکیلا مصطفیٰ، کوثر کے ہاتھوں سے نکل رہا تھا ساتھ بھاں بھاں کر کے رو رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا کیونکہ اس کے لیے رونا ٹھیک نہ تھا۔ ملازمہ سے کہا کہ اس کے لیے پانی لے کر آئے اور اسود کو بھی دیکھے، میری گود میں آ کر مصطفیٰ چپ ہو گیا تھا۔ میرے آنسو زار و قطار بہنے لگے، وہ لوگ مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ''صاحب کیا کر رہے تھے کمرے میں جب تم انہیں رانیہ کا بتانے کے لیے گئی تھیں؟''

''وہ اپنا پستول الماری سے نکال کر مڑے ہی تھے، میں نے سوچا کہ آپ کو بتاتی ہوں مگر اس سے پہلے ہی......'' کوثر نے ہکلا ہکلا کر بات پوری کی۔

''دانیال ہمیشہ اپنا پستول خود ہی نکال کر باقاعدگی سے صاف کرتے ہیں اور اس میں کبھی گولی بھی نہیں ہوتی۔'' میں بڑبڑا رہی تھی، شاید میں ملازمہ کے ذہن میں آنے والے اندیشوں کو مٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''جانے کس طرح اس میں گولی رہ گئی جو صاف کرتے ہوئے چل گئی؟'' میں نے اس کے چہرے کو دیکھا جہاں بے یقینی کا لیپ تھا...... ''سب لوگ چلے گئے، میرا کسی نے انتظار بھی نہیں کیا؟'' میں دیوانوں کی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔

''وہ جی، خون بہت بہہ رہا تھا اور پھر گاڑی میں چاروں بیٹھ کر ایمبولینس کے پیچھے پیچھے چلے گئے۔'' اس نے بتایا۔ ''آپ ڈرائیور کے ساتھ چلی جائیں، میں بچوں کو سنبھال لیتی ہوں۔'' اس نے سوتے ہوئے مصطفیٰ کو میرے پاس سے اٹھایا اور اسود کے پاس لے گئی، میں نے اپنا کمرا لاک کیا، بیگ اٹھایا اور ڈرائیور کے ساتھ نکلی، فون کر کے احمد سے پوچھ کر ڈرائیور کو بتایا کہ وہ کس اسپتال میں تھے۔ احمد سے پوچھنے کی ہمت ہی نہ ہوئی کہ دانیال......؟

☆☆☆

خودکشی کے لیے فائر تو دانیال نے خود پر کیا مگر اس سے مر گئی حنا...... اس کی بیوی مر گئی، اسپتال کے ٹھنڈے کاریڈورز میں احمد کے ساتھ بات چیت میں، میں نے جانا کہ اس نے خود کو نہیں بلکہ ہم سب کو ایسی موت مارنے کی کوشش کی تھی کہ ہم زندہ نظر آتے مگر زندہ نہ ہوتے...... فائر کرتے وقت اس کا ہاتھ کانپا تھا جس سے اس کی جان تو بچ گئی مگر سر کے بائیں طرف لگنے والی گولی سے اس کا کافی خون ضائع ہو گیا تھا......

''ممانی جان! نہ صرف ڈاکٹروں کو بلکہ سب کو علم ہونا چاہیے کہ وہ اپنا پستول حسبِ معمول صاف کر رہے تھے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں نے تمہارے کہنے سے پہلے ہی ملازمہ سے بھی یہی کہا تھا۔''

''میں نے صدف، فاطش اور رانیہ آپی کو بھی سمجھا دیا ہے...... کوئی بھی پوچھے ممانی جان!'' اس نے

زور دے کر کہا۔ ”کوئی بھی...... اسے بھنک نہیں لگنی چاہیے کہ آپ کے اور ماموں کے بیچ کیا چل رہا تھا، میری امی کو بھی نہیں...... یہ بات آپ کی بیٹیوں کے علاوہ صرف میں جانتا ہوں اور اس کا دائرہ یہیں بند کر دیں ممانی جان!“

”ہوں......“ میں نے گہری سانس لی، میری آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی مگر ایک بھی آنسو نہ بہہ رہا تھا۔

”آپ پریشان نہ ہوں، ان کی حالت اب خطرے سے باہر ہے......“ اس نے میرا کاندھا تھپکا۔ ”میں آپ کا بیٹا ہوں اور آپ کسی بات کی پروا نہ کریں، میں خود ہی آپ کو گھر چھوڑ کر آیا تھا، مجھے ڈر تھا کہ ماموں کو کچھ ہو گیا تو آپ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں گی۔ صدف کی بھی حالت غیر ہے...... میں جانتا ہوں کہ آپ نے ماموں کو پورے خلوص سے چاہا ہے اور ان کی وفادار رہی ہیں، اگر ہم خودکشی کی کوشش کا کہیں گے تو ہر سننے والے کے ذہن میں سوال اٹھے گا، لوگ جانے کیا کیا قیافے لگائیں گے، اس لیے ضروری ہے کہ سب کا بیان ایک ہو۔“ میں نے اس کے ساتھ خود کو اتنا محفوظ محسوس کیا کہ واقعی میرا اپنا بیٹا ہوتا تو ایسا ہی ہوتا۔ ساری بہنیں وہیں انتظارگاہ میں آ گئیں...... نیلم بھی پہنچ گئی تھی، اس کا رنگ پیلا پھٹک ہو رہا تھا...... عمر دانیال کے لیے خون دینے گیا تھا۔

”تم نے کچھ کھایا پیا ہے نیلم؟“ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ”کیسی پیلی ہو رہی ہو؟“

”مما......“ وہ مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔ ”میرے پاپا ٹھیک تو ہیں ناں؟“ اس نے ابھی تک دانیال کو دیکھا نہ تھا اس لیے فکرمند تھی۔ ”آپ ملیں پاپا سے؟“

”احمد بتا رہا ہے کہ وہ ٹھیک ہیں۔“ میں نے اسے پیار کیا۔ ”میں نے بھی انہیں نہیں دیکھا۔“

”مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے......“ وہ اپنا سینہ مسلنے لگی، ساتھ ہی وہ ایک صوفے پر لیٹ گئی، رانیہ نے بھاگ کر اسے پانی لا کر دیا، بہ مشکل اس نے ایک گھونٹ پانی پیا، اسے ابکائی سی ہوئی۔

"کہیں سے کچھ کھانے کو لاؤ بیٹا، غالباً اس نے کچھ کھایا نہیں ہوگا۔" میں نے فاطش کو اپنا بیگ پکڑایا۔

"ڈرائیور باہر ہی ہے، اسے کہو کہ کچھ لے آئے جا کر۔"

"میں یہاں کینٹین سے دیکھتی ہوں مما!" وہ میرے بیگ سے والٹ نکال کر لے گئی۔

"مما......" نیلم نے میرے کان کے پاس سرگوشی کی۔ "عمر کو بلوائیں جلدی سے پلیز!" میں نے صدف سے کہا کہ احمد کو فون کر کے عمر کو بلوائے، جلد ہی عمر آ گیا اور نیلم کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔

"اوہو...... آنٹی، میں نے غلط کیا کہ اسے ساتھ لے آیا۔"

"پاپا کا سن کر وہ کس طرح گھر رک جاتی عمر بھائی!" رانیہ نے ہولے سے کہا۔

"لیکن اس کی اپنی حالت تو دیکھیں......" عمر نے اسے بانہوں میں سمیٹ لیا۔ "اسے تو خود ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت پڑ رہی ہے...... رانیہ آپی پلیز...... کسی ڈاکٹر یا نرس کو بلالیں۔"

"فاطش اس کے لیے کچھ کھانے کو لینے گئی ہے...... غالباً کمزوری ہے، آپ پریشان نہ ہوں۔" میری بہادر بیٹی رانیہ نے کہا۔ "آپ خود ابھی خون دے کر آئے ہیں!"

"آنٹی...... she is pregnant!" عمر کے الفاظ پر میں شاک میں چلی گئی، کس موقع پر میں نے اتنی بڑی خوش خبری سنی تھی کہ میں چیخ کر خوشی کا اظہار بھی نہ کر سکتی تھی...... دو دن قبل ہی تو ایسی خوشخبری مجھے صدف نے سنائی تھی۔ میں اس حادثے کے بعد سے ابھی تک اس کی طرف سے فکر مند تھی...... رانیہ نے فوراً بہن کو اپنی بانہوں میں لیا اور اس کے ہاتھوں کو ملنے لگی۔

صدف نے پاس سے گزرتے ہوئے ایک ڈاکٹر کو پکڑا اور لمحوں میں نیلم کو وہاں سے اسٹریچر پر ڈال کر کسی طرف لے جایا گیا، عمر وہیں بیٹھا تھا۔ احمد دانیال کے پاس تھا۔ صدف اور رانیہ، نیلم کے ساتھ چلی گئیں...... فاطش کچھ جوس چپس اور بسکٹ لے کر لوٹی تو سب کو غائب دیکھ کر پریشان ہو گئی مگر صورتِ حال کے بارے میں جان کر مطمئن ہوئی، عمر سے پوچھ کر اسی طرف روانہ ہوئی جہاں باقی تینوں تھیں۔

"کوئی مسئلہ یا پریشانی تو نہیں تھا انکل کو؟" عمر نے مجھ سے پوچھا۔

"کس قسم کا بیٹا؟" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

"جس زاویے سے فائر ہوا ہے......" وہ رکا۔ "میرا مطلب ہے کچھ ایسا تو نہیں کہ انکل نے خودکشی کی کوشش کی ہو؟" اس نے جھجک کر اپنی بات مکمل کی۔

"ارے ایسا کیوں ہوگا بیٹا!" میں نے چند لمحوں کے لیے سوچا کہ عمر کو بتا دوں کہ کیا صورتِ حال تھی اور اعتراف کر لوں کہ دانیال نے خودکشی کی کوشش ہی کی تھی، آخر جب میں نے خلع لینا تھی تو بھی تو اسے ان باتوں کا علم ہونا تھا...... مگر ہمت نہ کر پائی اس صورتِ حال میں اور احمد کی ہدایت یاد آ گئی کہ ہمیں کسی کے سامنے کوئی ایسی بات نہیں کہنا ہے، کسی کے سامنے بھی نہیں۔

"کاروبار کے حالات کا تو مجھے کوئی علم نہیں ہے لیکن اگر کوئی پریشانی کاروباری بھی ہوتی تو دانیال مجھ سے شیئر تو کرتے۔" میں نے خود ہی اپنا مان رکھا۔ "اپنا پستول دانیال اکثر نکال کر خود صاف کرتے ہیں بلکہ کبھی کبھار باہر نکل کر، کسی کھلی جگہ پر جا کر ہوائی فائر بھی کرتے ہیں، ممکن ہے کہ پچھلی دفعہ فائر کیا ہو اور اس کے بعد گولیاں نکالنا بھول گئے ہوں۔" میں صفائی پیش کر رہی تھی۔

"جو بھی ہو مگر ذرا سی بے پروائی سے کتنا نقصان ہو سکتا تھا......" اس نے ہمدردی سے کہا۔ "میں دیکھتا ہوں ذرا نیلم کو......"

"میں بھی چلتی ہوں بیٹا!"

"آنٹی...... ابھی تک ہم نے نیلم کی حالت کی خبر سب سے پوشیدہ رکھی ہے۔ اصل میں بلی کی شادی ہے ناں تو ایسے میں ایسی خبر کا لیک ہونا، ذرا نیلم خود کو شرمندہ سا محسوس کر رہی تھی، اس لیے آپ اس کی

بہنوں سے کہہ دیں کہ اس راز کو ابھی راز ہی رکھیں......'' میں نے سر ہلا کر اس کی تائید کی۔ کمرے میں داخل ہوئے تو نیلم ڈرپ کے زیر اثر نیند میں تھی، عمر کو وہاں چھوڑ کر ہم سب باہر نکل آئے، اب ہمارا رخ دانیال کے کمرے کی طرف تھا جہاں سے احمد ہمیں بلانے آیا تھا۔

☆☆☆

میں حسب معمول اپنے اس کمرے میں سو رہی تھی جہاں میں پچھلے چند ماہ سے علیحدہ سو رہی تھی، یہ کمرا ہمارے کمرے سے متصل تھا، دونوں کمروں کے بیچ دروازہ بھی تھا جسے میں نے بند کر رکھا تھا۔ یہ کمرا اصل میں دانیال نے پہلے اپنی اسٹڈی کے طور پر بنوایا تھا، بچیوں کی آمد سے اسے ہم۔ ز بچیوں کا کمرا بنایا جب تک دو بچیاں تھیں اور پھر دانیال کی اسٹڈی اوپر منتقل ہو گئی تھی۔ بچیاں جوں جوں بڑی ہوتی گئیں اپنے کمروں میں منتقل ہوتی گئیں مگر یہ ملحقہ کمرا جوں کا توں رہا...... فاطش اسود کی پیدائش کے بعد کچھ عرصے اس کمرے میں رہی۔ مجھے رات کو اٹھ کر اسود کی آیا کو چیک کرنے کی سہولت بھی تھی اور اگر فاطش سے اسود نہ سنبھلتا تو میں اس کی مدد بھی کر دیتی تھی۔

اپنی اسٹڈی کو اوپر منتقل کر کے دانیال بہت سی فکروں سے آزاد ہو گئے تھے اور اسٹڈی میں پڑھنے یا کام کرنے کے بہانے زیادہ سے زیادہ وقت گزارتے اور اپنے تمام ''مشاغل'' کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ میں نے جان لیا تھا کہ میں اب دانیال سے محبت نہ کرتی تھی، نہ ہی مجھے اس کی پروا رہی تھی، نہ اسے عزت دینے کو دل چاہتا تھا......اور تو اور اسے مخاطب کرنا بھی چھوڑ دیا تھا میں نے۔ یہ احساس ہی عورت کے لیے کافی ہوتا ہے کہ اس کا مرد، جس کے لیے وہ مخلص اور وفادار ہے وہ اس کے علاوہ کسی اور عورت کو دیکھے بھی، اپنے مرد کے بدلے ہوئے اطوار ایک گنوار سے گنوار عورت بھی پہچان لیتی ہے...... بیوی کی نظر میں مرد تبھی تک معتبر ہوتا ہے جب تک وہ اپنی محبت سے اسے معتبر رکھتا ہے، ناقدری کرنے والا شوہر عورت کے دل کے سنگھاسن سے گر کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔

اپنے کمرے میں گہری نیند میں اپنے پاؤں پر گیلے پن کے احساس سے میں جاگی......گھبرا کر پاؤں کھینچا، سائیڈ ٹیبل پر رکھا لیمپ جلایا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے سرد لہجے میں سوال کیا۔

'' معاف کر دو مجھے حنا!'' اس نے ہاتھ جوڑے، وہ میرے پیروں پر ماتھا رکھے ہوئے تھا اور اس کی آنکھیں نم تھیں ''گناہ گار ہوں تمہارا......''

'' نہ کوئی ضرورت ہے نہ فائدہ اس طرح کے ڈراموں کا!'' میری کوشش تھی کہ میری آواز بلند نہ ہو کیونکہ ساری بیٹیاں ارد گرد کے کمروں میں تھیں' چند دن میں بلبلی کے بعد، فاطش کا نکاح سجاد سے ہونا طے پایا تھا۔

'' پلیز حنا!'' وہ گڑگڑایا۔ ''forgive me and forget it'' اس نے التجائیہ لہجے میں کہا۔ ''بھول ہو گئی مجھ سے!''

''کیا؟'' میں استہزاء سے ہنسی۔ ''ہونہہ! معاف بھی کر دوں اور بھول بھی جاؤں؟ بھول؟ بھول ایک بار ہوتی ہے دانیال، تم نے تو میری ساری زندگی کو میری ایک بھول کی سزا بنا کر رکھ دیا۔''

'' مجھے معاف کر دو حنا، میں شرمندہ ہوں، تم سے بھی اور بیٹیوں سے بھی، مجھے ان سے بھی معافی لے دو پلیز، ورنہ میرے جینے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' وہ گڑگڑا رہا تھا۔

'' مرنے کی کوشش تو تم نے کر کے دیکھ لی دانیال...... یہ بھی نہ سوچا کہ لوگ کیا، کیا باتیں کرتے......تم تو عمر بھر کی بے حیائیوں کو سمیٹ کر موت کے منہ میں چلے جاتے اور میں جیتے جی مر جاتی...... تمہارے ساتھ ایک' ایک پل ایمانداری اور وفاداری سے گزار کر بھی میں معتوب ٹھہرتی، لوگ مجھے ہی قصور وار گردانتے، جانے کس، کس کے ساتھ منسوب کر کے میرے بارے میں چٹخارے دار خبریں پھیلاتے......تم

نے تو...... اتنا بڑا قدم اٹھاتے ہوئے بھی صرف اپنی نجات کا سوچا، کسی اور کے بارے میں نہیں۔''

''جانتی ہو حنا...... میرا نشانہ اتنا کچا نہیں کہ چُوک جاتا۔مگر میرے ہاتھ سے فائر ہوتے ہی...... لمحے کے ہزارویں حصے میں پستول کا رخ مڑ گیا، اس لیے کہ میں نے سوچا کہ میرے مر جانے پر تمہیں جانے کیسی کیسی وضاحتیں لوگوں کو دینا پڑیں گی...... میں غلط تھا، سزا مجھے ہی ملنا چاہیے تھی اسی لیے اپنا خاتمہ کرنے کا سوچا مگر تم لوگوں کے سامنے کس طرح سر اٹھا کر چلو گی؟ کیا کیا جواب دو گی اور کون تمہاری باتوں کا یقین کرے گا؟ بس یہی سوچ آئی، جو اختیار میں ہوتا تو میں اس گولی کو روک لیتا مگر وہ چل چکی تھی...... جانتا ہوں کہ احمد نے کس کس طرح اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے اس بات کو پھیلنے سے روکا ہے۔مگر میں قصوروار ہوں تو سزا بھی مجھے ہی ملنی چاہیے ناں!''

''سزا کا فیصلہ میں نے اللہ پر چھوڑ دیا ہے دانیال...... میں کون ہوں تمہیں سزا دینے والی یا تمہارے ان عیبوں کو فاش کرنے والی جن کا پردہ اللہ نے بہتوں کے سامنے رکھا۔تمہاری بیٹیاں تمہارے کرتوتوں کو جانتی ہیں...... تم کہتے تھے کہ میں باہر کیوں نہیں نکلتی، اپنا حلقہ احباب کیوں نہیں بڑھاتی، ایک تو تمہیں کھل کھیلنے کی آزادی گھر کے اندر مل گئی تھی جس سے میری بیٹیاں متاثر ہوئیں...... اور کیا بتاؤں تمہیں جو ایک بار میں اپنے دفتر جاتے میں لیٹ ہوئی تو میں نے اندر جانے سے پہلے کیا سنا، مسز ہمدانی کے الفاظ نے مجھے زمین میں ہی گاڑ دیا تھا۔وہ اپنی باقی کولیگز کے ساتھ ہنس رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔'' دانیال جیسی عورتوں کو تو طوائف کہتے ہیں، مردوں کے لیے اس کا متبادل کیا لفظ ہے؟'' بس اس دن میں نے جانا کہ جتنا حلقہ بڑھاؤں گی اتنی ہی بے عزتی اور بدنامی سمیٹوں گی، جس کی فکر سے تم بے پروا اور آزاد ہو گئے تھے۔'' وہ سر جھکائے سن رہا تھا۔'' میں نے اپنے اور اپنی بیٹیوں کے لیے جینا ہے دانیال! اس لیے میں نے تمہاری اور دوسروں کی پروا کرنا چھوڑ دی ہے۔''

''مجھے ایک بار معاف کر کے تو دیکھو، تمہاری توقیر میری نظروں میں اور بڑھ جائے گی حنا!'' اس نے میرے سامنے ہاتھ باندھے۔

''تمہاری نظروں میں میری توقیر؟'' میں اٹھ کھڑی ہوئی۔'' تم ہو کون جو مجھے تمہاری نظروں میں اپنی توقیر کی پروا ہو؟ جب تمہیں اس بات کا خیال نہیں کہ میں نے تمہیں عمر بھر پوجنے کی حد تک چاہا، تمہیں ماتھے پر بٹھا کر رکھا، تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا بھی مجھے تمہاری توہین لگتی تھی۔ میں نے 'آپ' سے 'تم' کا سفر کتنی طویل مسافت کے بعد طے کیا ہے...... میرا تو دل بھی نہیں چاہتا کہ تم اب میرے سامنے بھی آؤ، مجھ سے بات کرو' مجھے چھوؤ...... اور تو اور میرے نام سے جڑا تمہارا نام بھی مجھے برا لگتا ہے۔''

''حنا پلیز...... مجھے چھوڑ کر نہ جانا، مجھ سے خلع نہ لینا، مجھے اپنی بیٹیوں کی خاطر معاف کر دو۔'' میں اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کی بیٹیوں نے ہی تو اسے اس مقام تک پہنچایا تھا، انہوں نے کھل کر اس سے بات کی تھی۔ اسے نہ صرف دنیا بلکہ آخرت کے عذاب سے بھی ڈرایا تھا، اس سے قطع تعلقی کی دھمکی دی تھی...... اپنی اولاد کے سامنے وہ ڈھٹائی نہ دکھا سکا تھا نہ ہی اسے اس عمر میں یہ گوارا تھا کہ میں اس سے خلع لوں۔اس کی رہی سہی ساکھ...... (جسے وہ اپنی ساکھ سمجھ رہا تھا) ختم ہو جاتی، اسی معاشرے میں وہ لوگوں کے منہ بند کر سکتا تھا نہ باہر نکلنے کے قابل رہتا۔

اٹھتے بیٹھتے، دانیال اور اس کی بیٹیوں کی طرف سے معافی کے مطالبے کے سامنے میں ڈٹی نہ رہ سکی۔ بیٹیاں کوئی غلطی کریں تو باپ انہیں عموماً معاف نہیں کرتے مگر میری بیٹیاں باپ کی تمام غلطیوں کو معاف کرنے کو تیار تھیں۔ میں نے ان کے چہروں پر باپ کی خودکشی کی کوشش کے دن قیامت اترتے دیکھی تھی اور اس کے تندرست ہو کر گھر آ جانے پر ان کے چہرے پھولوں کی طرح کھلتے دیکھے تھے۔ باپ کو سلامت دیکھ

گران کی مسکراہٹیں لوٹ آئی تھیں۔ دل سے تو میں نے خلع لینے کا ارادہ پہلے سے ہی ترک کر دیا تھا، میری دو بیٹیاں تخلیق کے مرحلے سے گزرنے والی تھیں، انہیں سکون کی ضرورت تھی۔ فاطش نئی زندگی کا آغاز کرنے والی تھی...... اس کے لیے ان حالات میں خوش رہنا ممکن نہ ہوتا۔

رانیہ کو اس روز یوں اچانک آتا... دیکھ کر مجھے دھچکا لگا تھا۔ اس کے سرپرائز نے تو میری جان ہی لے لی تھی جو اسی وقت فائز نہ ہوتا تو میں اس سے پوچھتی کہ کہیں وہ عابد سے ناراض ہو کر تو نہیں آئی تھی۔ اس کے چہرے پر کھنڈی زردی اور تھکا تھکا وجود کوئی کہانی سنا رہا تھا...... وہ کہانی تو اس نے بعد میں سنائی، اس نے مجھے بتایا کہ کس طرح وہ عابد کی طرف سے بھی... بدگمانی کا شکار ہو گئی تھی اور اس نے اس سے علیحدگی اختیار کرنے تک کا بھی سوچ لیا تھا۔ اس نے تو ایک غلط فہمی کی بنا پر ایسا سوچا تھا جو اللہ نے خود ہی دور کر دی۔ یہ بھی شکر تھا کہ اس کا عابد سے رابطہ نہ ہوا اس وقت جب وہ مایوسی اور بدگمانی کی انتہا پر تھی، ورنہ وہ غصے میں کیا کچھ بول دیتی اور عابد کا دل برا ہوتا، حالات ٹھیک بھی ہو جاتے مگر دلوں میں ایک گرہ پڑ جاتی...... عابد کو یاد رہتا کہ رانیہ نے غصے میں اسے کیا کیا کہا اور اس کے بارے میں کیا کیا بدگمانیاں پال لی تھیں۔ اگر رانیہ ناراض ہو کر آتی یا وہ عابد سے خلع لے لیتی، اگر فاطش نے اشعر سے خلع لی تو کیا مجھے اس کی تکلیف نہیں تھی اسی طرح اگر میں خلع لیتی تو کیا میری بیٹیوں کو تکلیف اور مسائل نہیں ہوں گے؟'' میں نے خود سے سوال کیا، اور پھر حنا مر گئی اور صرف ایک ماں زندہ رہ گئی......

☆☆☆

''ٹھیک ہے...... میں خلع نہیں لوں گی، گھر چھوڑوں گی نہ ہی دانیال سے گھر چھوڑنے کا کہوں گی مگر مجھے اس سے زیادہ پر مجبور نہ کیا جائے......'' میں نے سب بیٹیوں، احمد اور دانیال کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے میز پر اعلان کیا۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ انہوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دانیال کا سر کچھ اور جھک گیا تھا...... رانیہ نے پانی کا گلاس اٹھا کر غٹا غٹ پانی پیا، کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

''اس سے زیادہ کا کیا مطلب مما؟''

''اس سے زیادہ کا مطلب ہے کہ اس سے زیادہ کچھ نہیں، ہم گھر میں اسی طرح رہیں گے جیسے دو اجنبی رہتے ہیں...... صرف دنیا کے دکھاوے کو ہی تو یہ رشتہ رہ گیا ہے۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

''اس طرح تو ٹھیک نہیں ہے مما!'' فاطش نے کہا۔'' اب تو آپ دونوں بالکل تنہا رہ جائیں گے اور ایسے میں آپس میں لاتعلقی تو ٹھیک نہیں۔''

''اس وقت، اس سے زیادہ جبر میں خود پر کر نہیں سکتی بیٹا!'' کہہ کر میں نے اپنی کرسی کھسکائی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔'' نہ ہی میں اسے دل سے معاف کر سکتی ہوں، اتنا بھی میں تم لوگوں کی خاطر کر رہی ہوں۔ میں جھوٹ بھی نہیں بول سکتی، اگر بظاہر کہہ بھی دوں تم لوگوں کو خوش کرنے کو۔ تو وہ جھوٹ ہوگا...... معاف کرنا میرے اختیار میں ہے، وہی نہیں کیا جا رہا اور بھولنا...... یہ تو بالکل ناممکن ہے، باقی اس کی سزا اور جزا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔''

''آپ ایسی ظالم تو کبھی نہیں تھیں مما!'' رانیہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

''میں ایسی بے وقعت بھی کبھی نہ تھی میری جان!'' میری آنکھیں بھر آئیں، صدف نے کچھ کہنا چاہا تو احمد نے اسے روک دیا۔

''ممانی جان کو کسی بات پر مجبور نہ کرو......'' احمد نے کہا۔'' یہ سب اتنا آسان نہیں ہوتا، کہنا آسان ہے مگر جس پر گزرے وہی جانتا ہے۔'' وہ سب جان گئی تھیں کہ احمد دانیال کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا، غالباً اس نے صدف کو بتایا تھا اور صدف نے باقی بہنوں کو۔

''میرے سر میں درد ہے......'' کہہ کر میں نے چلنے سے پہلے دانیال کے چہرے کو دیکھا جس پر شرمندگی سے پیلا پن آ گیا تھا، وہ بھرے بازار میں ننگا ہو گیا تھا جیسے، اس نے اپنی عزت خود کھوئی تھی اپنے پیاروں کی نظروں میں، اب اسے عمر بھر اس کا خمیازہ تو بھگتنا ہو گا۔

''تم لوگ خواہ مخواہ ممانی جان کو مجبور نہ کرو...... وہ دل کی بہت نرم ہیں، وقت گزرنے کے ساتھ ان کے دل میں ماموں کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو جائے گا، میں جانتا ہوں ان کو، وہ معاف تو کر دیں گی ماموں کو مگر اس میں وقت لگے گا۔ وہ سب کچھ بھلانا...... بھی ممکن ہے جب ماموں خود کو بدلیں گے، دوبارہ غلطی نہیں کریں گا اور اپنے رویے سے انہیں ممانی کو ان کی اہمیت کا احساس دلانا ہو گا!'' میں کھانے کے کمرے سے نکلی تو یاد آیا کہ میرا فون وہیں رہ گیا تھا، واپس اندر داخل نہ ہوئی تھی کہ احمد کی آواز نے قدم روک لیے۔

''پاپا اگر ایسا کچھ کیا آپ نے دوبارہ......'' صدف کی آواز بھرا گئی۔

''تو آپ ہم سب بہنوں کا مرا ہوا منہ دیکھیں گے......'' رانیہ نے اس کا فقرہ پورا کیا۔ ''ہم سب خودکشی کر لیں گی۔'' میرا دل کانپ گیا۔ میں اپنا فون لیے بغیر واپس آ گئی۔

☆☆☆

فاطش کی شادی سجاد سے ہو گئی اور اس کے چند ماہ کے بعد وہ اسود کے ساتھ امریکا روانہ ہو گئی...... عابد بھی چند ہفتوں کے لیے آیا تھا اور اس کے ساتھ رانیہ کی واپسی ہوئی۔

''اب تم مصطفیٰ کے بہن بھائی لانے کا پلان کرو رانیہ...... وہ بڑا ہو گیا ہے، اسے گھر میں رونق چاہیے۔'' ایئر پورٹ پر اسے واپس نہ جانے کی ضد کرتے ہوئے دیکھ کر میں نے رانیہ سے کہا۔

نیلم کے ہاں بیٹے اور صدف کے ہاں بیٹی کی ولادت ہوئی۔ ہمارے خاندان میں خوشیوں کی لہر دوڑ گئی۔ خوشی کے ان سب مواقع پر ہم ساتھ ساتھ شامل ہوئے۔ میں اور دانیال...... مگر یہ سب صرف دنیا کو دکھانے کے لیے ہے۔ ہم ایک گھر میں رہتے تو ہیں، دن کو اپنے اپنے جھمیلوں میں مصروف مگر جونہی شام ڈھلتی ہے تو ہم گھر میں اکٹھے ہوتے ہیں، کھانا ہم ملازموں کے سامنے کھاتے ہیں۔ اس کے بعد ٹی وی لاؤنج میں اکٹھے بیٹھ کر ٹی وی پر خبریں سنتے اور سبز قہوہ پیتے ہیں مگر ملازموں کے اپنے کوارٹروں میں جاتے ہی ہم دونوں دو علیحدہ علیحدہ کمروں کا رخ کرتے ہیں۔ اب یہی زندگی کا ڈھب ہے۔ میں نے دانیال کو کبھی زبان سے بھی نہیں کہا کہ...... ''جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا!'' زبان دل و دماغ کے ساتھ ہے، جھوٹ نہیں بول سکتی نہ ہی میں منافقت کر سکتی ہوں۔ معاف کر دوں تو اس کا کیا بھول نہیں سکتی، ہاں جانچ رہی ہوں، کبھی کبھار دل ہمکتا بھی ہے...... شاید کبھی ایسا وقت آ جائے کہ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاؤں، بقول احمد کے، وہ خود کو اس حد تک بدل لیں، اپنی تمام بری حرکتیں چھوڑ کر اللہ سے معافی مانگیں، اپنے کیے کو بھلانے میں میری مدد کریں۔ میری نظروں میں مجھے گرا دینے والے کو ہی علم ہونا چاہیے کہ اسے کیا کرنا ہے...... ایسی زندگی صرف اسی کے لیے سزا نہیں ہے بلکہ میرے لیے بھی ہے۔ ایک ہی بار ملنے والی زندگی کو اس طرح گزارا جائے کہ جسے میں نے خود سے بڑھ کر چاہا وہ نظر کے سامنے ہو، ہاتھ اسے چھونا چاہیں تو چھو بھی سکیں، آنکھ اسے دیکھے، اس سے قدم ملا کر دنیا کے سامنے چلتی بھی ہوں مگر دماغ اسے شجرِ ممنوعہ قرار دے دے، دل کا کیا کروں جو کہتا ہے....

زندگی جس کے مقدر میں ہوں خوشیاں تیری
اس کو آتا ہے نبھانا، سو نبھاتے گزری!
زندگی نام اِدھر ہے کسی سرشاری کا......
اور اُدھر دور سے اک آس لگاتے گزری
زندگی خاک نہ تھی، خاک اڑاتے گزری!
تجھ سے کیا کہتے، تیرے پاس جو آتے گزری

(ختم شد)

کمرے میں ایک دم سے خاموشی چھا گئی تھی۔
کچھ دیر پہلے ثریا بیگم جتنی خوش اور مطمئن نظر آ رہی تھیں اب چہرے پر پتھریلے تاثرات لیے یک ٹک سامنے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جہاں سے پردہ اٹھا کر چائے کی ٹرالی لیے وہ دھیرے، دھیرے قدم اٹھاتی ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سلیقے سے سر سے دوپٹا اوڑھے، چہرے پر ہلکی سی گھبراہٹ لیے۔ وہ بلاشبہ ایک خوب صورت اور جاذبِ نظر لڑکی تھی۔ پاس آ کر اس نے آہستگی سے سلام کیا اور سب کو ایک، ایک کر کے چیزیں سرو کرنے لگی۔

اس کے لہجے کی نرمی اور مٹھاس دل موہ لینے والی تھی۔ اس کے سلام کا جواب بہت گرم جوشی سے صرف روبینہ آنٹی نے دیا تھا۔ ثریا بیگم نے سرد مہری سے نگاہ پھیر لی تھی۔ جسے اس حساس لڑکی اور اس کی سوبرسی ماں عقیلہ نے فوراً محسوس کر لیا تھا۔

چائے سرو کرنے کے بعد وہ خاموشی سے اپنی

معذور

قرۃ العین خرم ہاشمی



پاس کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔ اس کی ہر چیز سے سلیقہ اور تمیز جھلکتی تھی۔ جس کا اندازہ دیکھنے والوں کو بہ خوبی ہو جاتا تھا۔ عقیلہ حقِ میزبانی بخوبی ادا کر رہی تھیں۔

وہ اب کمرے سے جا چکی تھی جبکہ عقیلہ، ثریا بیگم کے تاثرات میں الجھ گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد عقیلہ ان سے اجازت لے کر کسی کام سے ڈرائنگ روم سے باہر آئیں۔ جبھی انہوں نے اپنے پیچھے زہر میں ڈوبی ثریا بیگم کی تلخ آواز سنی۔

''میرے پڑھے لکھے، برسرِ روزگار اور خوب صورت بیٹے کے لیے ایسا رشتہ دیکھا ہے آپ نے؟'' ان کے باہر جاتے ہی ثریا بیگم رشتے کروانے والی روبینہ آنٹی پر برس پڑیں۔

''ثریا بہن میری بات سنیں۔ آپ نے جس طرح کے لوگ اور لڑکی کا کہا تھا ماشاء اللہ یہ ویسے ہی ہیں۔ چھوٹا سا گھرانا، دو بہن بھائی، پڑھے لکھے، صاف ستھرے، شریف لوگ...... آپ نے عقیلہ بہن اور ان کی بیٹی کے طور طریقے تو جانچے ہی ہوں گے۔ شائستگی، تمیز اور خاندانی رکھ رکھاؤ ہے۔ میں ان لوگوں کو کافی عرصے سے جانتی ہوں۔ اس دن جب آپ نے اپنے چھوٹے بیٹے کے لیے اچھے اور شریف لوگوں میں رشتہ دیکھنے کو کہا تو میرے ذہن میں فوراً انہی لوگوں کا خیال آیا تھا۔'' روبینہ آنٹی نے وضاحت سے ثریا بیگم کو بتایا تو وہ تپ گئیں۔

''میں نے اپنے بیٹے کے لیے بلاشبہ اچھے اور شریف لوگوں میں ہی رشتہ کروانے کے لیے کہا تھا مگر یہ نہیں کہا تھا کہ لڑکی اپاہج ہو۔ آپ میرے بیٹے کے لیے اس معذور لڑکی کا رشتہ دیکھنے لائی ہیں۔ جو لڑکی خود ٹھیک سے چل نہیں سکتی۔ اپنا بوجھ نہیں اٹھا سکتی وہ ایک گھر کو کیسے سنبھال سکتی ہے۔ بقول اس کی ماں کے یہ کبھی کبھی اسٹک بھی استعمال کرتی ہے تو ایسی لڑکی جو اپنے چلنے کے لیے اسٹک کی محتاج ہو وہ زندگی کی دوڑ میں کیسے حصہ لے سکتی ہے؟ میرے بیٹے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر کیا چل سکے گی؟ حد کرتی ہیں آپ بھی۔'' ثریا بیگم نے سارا لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔ ادھ کھلے دروازے کے پیچھے موجود اس کی بڑی، بڑی آنکھوں میں نمی سی پھیل گئی اور وہ مزید کچھ سنے وہاں سے چلی گئی۔

''معذور اور اپاہج!'' روبینہ آنٹی نے شاکڈ لہجے میں دہرایا۔ ''بہت افسوس ہے ثریا بیگم مجھے آپ سے ایسے رویئے اور سوچ کی امید نہیں تھی۔ یہ بچی نہ تو معذور ہے اور نہ اپاہج...... ہاں بچپن میں ہونے والے حادثے کی وجہ سے اس بچی کی ایک ٹانگ میں معمولی سا نقص ضرور ہے۔ جس کی وجہ سے یہ تھوڑا سا لنگڑا کر چلتی ہے مگر یہ بہت معمولی سا لنگ ہے۔ یہ بچی پڑھی لکھی، باشعور ہے اور مقامی کالج میں پڑھاتی ہے۔ اپنا اور گھر والوں کا بوجھ بھی اٹھاتی ہے اور دوسری بچیوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ بھی کر رہی ہے۔ شکل، صورت اور اخلاق میں بھی یہ کسی سے کم نہیں ہے۔ مجھے آپ کی کوتاہ بینی پر شدید افسوس ہو رہا ہے بلکہ اس کا یہ نقص تو اتنا واضح بھی نہیں ہے مگر آپ کو صرف یہی نظر آیا۔''

روبینہ آنٹی نے سنجیدگی سے کہا تو ثریا بیگم ناگواری سے منہ بنا کر رہ گئیں جبکہ ساتھ بیٹھی ہوئی ان کی بیٹی جو میٹرک کی طالبہ تھی خاموشی سے ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھی مگر اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ دونوں میں سے کون ٹھیک ہے؟ اسی وقت عقیلہ بیگم کمرے میں دوبارہ داخل ہوئیں تو انہیں دیکھتے ہی ثریا بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں اور جانے کی اجازت چاہی۔

اس سے پہلے عقیلہ بیگم کچھ کہتیں وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ تھامے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ ان کی بداخلاقی پر روبینہ آنٹی آہستہ سے معذرت کرتی دکھی دل کے ساتھ باہر نکل گئیں۔

''ثریا بہن معذرت کے ساتھ مگر میں دوبارہ اس کام میں آپ کی مدد نہیں کر سکوں گی۔ دراصل آپ کو شاید برا لگے مگر میں یہ کام کسی ذاتی غرض یا پیسے کے لیے نہیں کرتی ہوں بلکہ فی سبیل اللہ کرتی ہوں اور میرے بھی کچھ اصول ہیں۔ رشتہ ہونا یا نہ ہونا ایک الگ بات

ہے مگر میں ان لوگوں کو ساتھ لے کر نہیں چلتی جو اخلاقی طور پر دیوالیہ ہوں جن کے لیے کسی انسان کے جذبات و احساسات کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ رشتہ پسند آنا یا نہ آنا آپ کا ذاتی مسئلہ ضرور ہے مگر کسی کو منع کرنے کا بھی کوئی طریقہ ہوتا ہے۔ زیادہ نہیں تو جتنی عزت انہوں نے آپ کو دی تھی اتنی ہی آپ انہیں لوٹا سکتی تھیں۔ اچھے اور خاندانی لوگوں کی پہچان انہی باتوں سے ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر آپ بھی بیٹی والی ہیں۔ کسی کی بیٹی کے لیے اتنے سخت الفاظ استعمال کرنے سے پہلے ایک بار سوچنا ضرور چاہیے۔'' روبینہ آنٹی راستے بھر انہیں ان کے مکروہ رویے کا احساس دلاتی رہیں۔ ان کی باتوں پر جلتی بھنتی ثریا بیگم منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گئیں، روبینہ آنٹی کا گھر آ چکا تھا۔

☆☆☆

یہ سچ تھا کہ روبینہ آنٹی، یہ کام فی سبیل اللہ کرتی تھیں۔ ثریا بیگم سے ان کی ملاقات، اپنی دوست کے گھر میلاد میں ہوئی تھی اور وہاں سے آپس میں اچھی سلام دعا شروع ہوئی۔ جب ثریا بیگم کو پتا چلا کہ روبینہ یہ کام بھی کرتی ہیں تو انہوں نے اپنے تیسرے نمبر والے بیٹے جو ابھی ابھی برسرِ روزگار ہوا تھا کے رشتے کے لیے کہا۔ اپنے دونوں بڑے بیٹوں کے لیے بہویں وہ خاندان سے لائی تھیں۔ اسی لیے اب وہ باہر سے بہو لانا چاہتی تھیں۔ بڑی دونوں شادی کے کچھ عرصے بعد لڑ جھگڑ کر الگ ہو چکی تھیں۔ اپنی بڑی شادی شدہ بیٹی سے مشورہ کر کے اب وہ خاندان سے باہر رشتہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ بڑی بیٹی دوسرے شہر بیاہی ہوئی تھی....

سو اس لیے ماں کے ساتھ اس مہم پر نہیں جا سکتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ اپنی چھوٹی اور لاڈلی بیٹی جو ابھی میٹرک کی طالبہ اور دنیا سے یکسر انجان تھی کو اپنے ساتھ لے جاتی تھیں۔

اس دن کے بعد سے روبینہ آنٹی سے کبھی ان کا رابطہ نہیں ہوا تھا اور دوسری رشتہ کروانے والیوں کے توسط سے انہیں اپنا مطلوبہ گوہرِ نایاب مل چکا تھا اور انہوں نے بہت دھوم دھام سے اپنے بیٹے کی شادی کر دی تھی۔ اب اس بات کو بھی تین سال گزرنے والے تھے۔ ان کی چھوٹی بیٹی اب تھرڈ ائیر میں پڑھ رہی تھی۔

زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں تھی مگر اسی روزمرہ کی بھاگتی دوڑتی زندگی میں وہ لمحہ، وہ وقت ضرور آتا ہے جب وقت کے ہاتھ گروی رکھے الفاظ اور عمل واپس بھی لوٹائے جاتے ہیں۔

☆☆☆

''لگتا ہے آپ نئی ہیں اس کالج میں۔ میں کافی دیر سے آپ کو یہاں اکیلے بیٹھا ہوا دیکھ رہی ہوں۔ میرا نام نورین ہے اور آپ کا؟'' عاصمہ خاموشی سے ایک طرف بیٹھی سب لڑکیوں کو آپس میں ہنستا بولتا دیکھ رہی تھی جب ایک لڑکی نے اس کے پاس آ کر اپنا تعارف کروایا۔

''جی، میں اس کالج میں نئی ہوں اور آج میرا پہلا دن ہے اس کالج میں۔ اس لیے فی الحال کوئی دوست بھی نہیں ہے۔'' عاصمہ نے مسکراتے ہوئے نورین سے ہاتھ ملایا جو اس کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔

''میری بھی بیسٹ فرینڈ ایک ہی تھی۔ جس نے میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا ہے اور میں یہاں اکیلی رہ گئی مگر آپ کو دیکھ کر لگتا ہے کہ میری یہ شکایت بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ سو وی آر فرینڈز؟'' نورین نے کہتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا جسے عاصمہ نے مسکراتے ہوئے تھام لیا۔ یوں کالج کا پہلا دن عاصمہ کی توقع سے بڑھ کر اچھا ثابت ہوا تھا۔ وہ ایف ایس سی میں مطلوبہ نمبرز نہ آنے اور اپنی فرینڈز سے بچھڑنے کی وجہ سے جتنی اداس اور اکیلی خود کو محسوس کر رہی تھی۔ نورین کی زندہ دلی اور اچھی کمپنی میں اس کی اداسی کہیں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ ورنہ اسے نئے کالج اور اجنبی لوگوں میں بی ایس سی کے یہ دو سال گزارنا بہت مشکل لگ رہے تھے۔ پہلا دن لڑکیوں اور ٹیچرز سے تعارف میں ہی گزر گیا تھا۔ سوائے اسٹیٹ کی ٹیچر کے جو کچھ دن کی لیو پر تھیں۔ عاصمہ نے نورین اور باقی کلاس فیلوز سے ان کی بہت تعریف سنی تھی۔ جس نے اس کے اشتیاق کو

کافی بڑھا دیا تھا۔

☆☆☆

''لگتا ہے تمہیں کالج پسند آ گیا ہے۔ اس لیے موڈ اتنا خوشگوار ہے؟'' دوپہر کے کھانے کے بعد جب دونوں ماں بیٹی ستانے کے لیے لیٹیں تو اماں نے عاصمہ سے پوچھا جو پُرجوش ہو کر انہیں اپنے تمام دن کی روداد سنا رہی تھی۔ ایک دم سے رک گئی اور کچھ سوچ کر بولی۔

''اماں کالج تو سچ میں بہت اچھا ہے مگر نورین نہ ملتی تو شاید اتنا اچھا نہیں لگتا۔ سچ میں بہت اچھی اور کوآپریٹو لڑکی ہے وہ۔'' عاصمہ جب سے کالج سے لوٹی تھی نورین نامہ سنا رہی تھی۔ اماں جانتی تھی کہ ان کی یہ بیٹی بہت جذباتی سی ہے۔

''کیوں اماں کو اپنی بیکار سی باتوں سے بور کر رہی ہو۔'' اسی وقت تھکا ہارا فیصل کمرے میں داخل ہوا اور کرسی پر ڈھے سا گیا۔ فیصل کو دیکھ کر عاصمہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''جی نہیں بھائی، اماں تو میری باتوں سے بہت خوش ہوتی ہیں۔'' عاصمہ نے بھائی کو منہ چڑاتے ہوئے کہا تو وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

''اور کیا اگر عاصمہ بھی نہ بولے تو ہم میاں بیوی یا تو ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ جائیں یا پھر دیواروں سے باتیں کریں۔ تمہاری بیوی تو بچوں سمیت آئے روز میکے گئی ہوتی ہے کسی نہ کسی بات پر لڑ جھگڑ کر اور تم ٹھہرے کاٹھ کے الو...... ہر وقت اسے منانے اس کے پیچھے چلے جاتے ہو۔'' اماں نے تیکھے انداز میں بیٹے کو دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اوہو...... اب بس بھی کر دیں اماں، پہلے ہی میں شہلا کے ساتھ دماغ کھپا کر آ رہا ہوں اور اب گھر آتے ہی آپ شروع ہو گئیں۔ مت بھولیں کہ شہلا بھی آپ کی ہی پسند ہے۔ جسے آپ بہت مان اور دعوے کے ساتھ بیاہ کر لائی تھیں۔ میں تو آپ دونوں کے درمیان فٹ بال بن کر رہ گیا ہوں۔ بیوی کی سنوں تو ماں ناراض، ماں کی مانوں تو بیوی ناراض ہو کر میکے جا بیٹھتی ہے۔ ان روز، روز کے جھگڑوں میں میرے دونوں بچے بھی بری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔ کیا کروں؟ اسے لے کر علیحدہ ہو جاؤں بڑے دونوں بھائیوں کی طرح؟'' شدید ذہنی دباؤ کا شکار فیصل بری طرح پھٹ پڑا اور غصے سے اپنی پیشانی کو مسلنے لگا۔

اماں نے عاصمہ کو اشارہ کیا جو فوراً اٹھ کر بھائی کے لیے پانی لینے چلی گئی۔ اب اماں کو بھی اپنی جلد بازی پر افسوس ہونے لگا تھا۔ وہ پہلے ہی شہلا اور بچوں کی وجہ سے اداس اور پریشان سا رہنے لگا تھا اوپر سے اماں کی ایسی باتیں...... اس کا رہا سہا ضبط بھی ختم کر دیتی تھیں۔

''بھائی پانی۔'' عاصمہ نے پانی کا گلاس فیصل کی طرف بڑھایا جسے تھام کر اس نے فوراً منہ سے لگا لیا۔ ٹھنڈا پانی پی کر اس کے جلتے ہوئے اعصاب کچھ پُرسکون ہوئے تو اسے اپنے لہجے کی تلخی اور کڑواہٹ کا احساس ہوا۔

''سوری اماں، میرا مقصد آپ کا دل دکھانا نہیں تھا مگر شہلا کے روز، روز کے بڑھتے مطالبوں اور لڑائی جھگڑوں سے میں سخت تنگ آ گیا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟'' فیصل نے ماں کے پاس بیٹھ کر ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو اماں چادر کے پلو سے اپنی نم آنکھیں پونچھتی ہوئی اثبات میں سر ہلا کر رہ گئیں۔

''بیٹا میں نے تو سارا شہر چھان کر کتنے رشتوں کو رد کر کے اس شہلا کو تمہارے لیے منتخب کیا تھا مگر مجھے کیا خبر تھی کہ یہ آ کے ہمارا جینا حرام کر دے گی۔'' اماں نے دلگیر لہجے میں کہا تو فیصل سر جھٹکتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ پچھتانے سے کیا حاصل...... چار سال ہو گئے ہیں یہ مصیبت جھیلتے ہوئے۔'' فیصل نے افسردگی سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا جبکہ اماں اسی طرح افسردہ سی بیٹھی اسے جاتا ہوا دیکھتی رہیں۔

☆☆☆

''یہ مس نوشین ہیں، اسٹیٹ کی ٹیچر۔'' نورین نے کہنی مار کر دوسری طرف دیکھتی عاصمہ کو متوجہ کیا تو

اس نے گردن موڑ کر سامنے کی طرف دیکھا۔ جہاں ایک گلابی چہرے پر نرم اور ہلکی سی مسکراہٹ لیے، خوب صورت سی لڑکی کھڑی کلاس سے اپنا تعارف کروا رہی تھی اور پھر کلاس کی سب لڑکیاں باری، باری اٹھ کر اپنا تعارف کروانے لگیں۔ عاصمہ، مس نوشین کو دیکھ کر چونک سی گئی تھی۔ اسے یہ چہرہ مانوس سا لگ رہا تھا۔ جب عاصمہ نے اپنی باری آنے پر اپنا تعارف کروایا تو اس نے مس نوشین کو چونکتے اور خود کو غور سے دیکھتے ہوئے پایا مگر جلد ہی وہ باقی کلاس کی طرف متوجہ ہو گئیں اور لیکچر دینے لگیں۔ ساری کلاس ہمہ تن گوش انہیں سن رہی تھی۔ ان کے لہجے کی مٹھاس میں ایک سحر تھا۔ جو سب کے دلوں پر اپنا اثر چھوڑ رہا تھا۔ ان کا پڑھانے کا طریقہ بہت اچھا تھا۔ ساری کلاس بہت دلچسپی اور توجہ سے انہیں سن رہی تھی اور آنے والے دنوں میں مس نوشین سب کے ساتھ، ساتھ عاصمہ کی بھی پسندیدہ ٹیچر بن چکی تھیں۔

☆☆☆

اس دن صبح سے ہی موسم کے تیور کافی خراب تھے۔ کالج میں کافی کم تعداد میں طالبات آئی تھیں۔ کچھ دیر میں ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ جو سارا دن جاری رہی۔ عاصمہ کافی دیر شیڈ کے نیچے کھڑی بارش ہلکی ہونے کی دعا کرتی رہی۔ کالج سے بس اسٹاپ کچھ فاصلے پر تھا۔ کافی لڑکیاں جا چکی تھیں۔ جونہی بارش ہلکی ہوئی عاصمہ اللہ کا نام لے کر خود کو بارش کی کن من سے بچاتی بس اسٹاپ کی طرف چل پڑی۔ اس کے ساتھ کوئی اور لڑکی نہیں تھی۔ سنسان سڑک دیکھ کر وہ جلدی، جلدی قدم اٹھانے لگی جب ایک گاڑی آ کر اس کے پاس رکی۔ عاصمہ ایک دم سے گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ گاڑی میں دو لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔ جو خباثت بھری نظروں سے سر سے لے کر پاؤں تک اسے گھور رہے تھے۔ عاصمہ خوف زدہ سی ہو کر مڑ کر دیکھنے لگی۔ کالج کافی پیچھے رہ گیا تھا۔

"آ جائیں مس، ہم آپ کو ڈراپ کر دیتے ہیں۔" ایک لڑکے نے مہذب بنتے ہوئے کہا مگر اس کی مکروہ ہنسی کسی اور ہی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ عاصمہ نے انہیں جواب دینے کے بجائے تیز، تیز قدموں سے چلنا شروع کر دیا۔ دونوں لڑکوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور اس سے پہلے کہ عاصمہ کچھ سمجھتی ایک لڑکا فوراً گاڑی سے اتر آیا اور عاصمہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگا۔ عاصمہ نے خوفزدہ ہو کر چیخ ماری اور اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ قریب تھا کہ وہ اسے کھینچ کر گاڑی میں بٹھا لیتے۔ ایک گاڑی آ کر ان کے پاس رکی۔ وہ لڑکا اور عاصمہ دونوں چونک گئے۔ گاڑی سے اترنے والی شخصیت کو دیکھ کر عاصمہ بے اختیار چلائی۔

"مس نوشین......!" تب تک مس نوشین گاڑی سے اتر چکی تھیں انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی اسٹک زور سے اس لڑکے کے ہاتھ پر ماری۔ تکلیف کی شدت سے بلبلا کر اس نے عاصمہ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور سامنے کھڑی لڑکی اور اس کے پیچھے آتے ڈرائیور کو دیکھ کر فوراً اپنی کار میں بیٹھ کر رفو چکر ہو گئے۔ عاصمہ روتی ہوئی مس نوشین کے ساتھ لگ گئی۔ اگر مس نوشین بروقت نہ پہنچتیں تو نہ جانے آج اس کے ساتھ کیا ہوتا۔ مس نے اسے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا لیا تھا۔

دیوار

جب دیواروں میں دراڑ پڑتی ہے تو دیوار گر جاتی ہے۔ مگر جب دلوں میں دراڑ پڑتی ہے تو دیوار بن جاتی ہے۔ اپنے دلوں میں دیوار نہیں بلکہ در بناؤ۔

از: نزہت جبین ضیا، کراچی

کیا خوب بتایا

میرے اچھے وقت نے دنیا کو بتایا کہ میں کیسا ہوں اور میرے بُرے وقت نے مجھے بتایا کہ دنیا کیسی ہے۔

از: ممتاز خانم، کراچی

عاصمہ سارا راستہ بہت ڈری اور سہمی ہوئی سی بیٹھی رہی۔ اسے اب بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ بچ گئی تھی۔ ایک خوف اب بھی اسے اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔

گاڑی میں مس نوشین کے ساتھ ایک عمر رسیدہ خاتون بھی بیٹھی تھیں جو عاصمہ کو تسلی دے رہی تھیں اور وہ بالکل خاموش تھی۔ زندگی میں ہونے والے بہت سے حادثے اسی طرح قوتِ گویائی کو سلب کر دیتے ہیں اور ایک مسلسل حیرانی اور سوچ دے جاتے ہیں کہ اگر ایسا ہو جاتا تو......؟

☆☆☆

اماں کا دل آج صبح سے ہی بہت بے چین تھا۔ انہیں بار، بار افسوس ہو رہا تھا کہ ایسے موسم میں عاصمہ کو کالج کیوں بھیج دیا۔ ایسے موسم میں لوکل ٹرانسپورٹ کا ملنا بھی مسئلہ ہوتا ہے۔ وہ بے چینی سے اندر باہر چکر کاٹ رہی تھیں۔ شہلا اپنی ساس کو بے چین و بے قرار دیکھ کر بھی مست تھی۔ وہ اتنی ہی بے حس اور بے پروا سی تھی۔ اسی وقت بھی وہ اپنے دونوں بچوں کو پاس بٹھائے کھانا کھلا رہی تھی اور ایک نظر اپنی ساس پر بھی ڈال رہی تھی۔ جنہوں نے ابھی تک دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا کہ عاصمہ آجائے تو اکٹھے ہی کھائیں گی۔ اسی وقت ڈور بیل ہوئی تو اماں نے فوراً آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور عاصمہ کے ساتھ ایک اجنبی خاتون کو دیکھ کر چونک گئیں۔ عاصمہ روتے ہوئے اماں کے سینے سے لگ گئی تو اماں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

''کیا ہوا میری بچی، سب خیر تو ہے ناں؟ صبح سے میرا دل بہت بے چین اور پریشان سا تھا۔'' اماں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں عاصمہ کو خود سے علیحدہ کرتے ہوئے اس کے زرد پڑتے رنگ کو دیکھ کر پوچھا۔

''آپ حوصلہ رکھیں بہن، بچی ہے اسی لیے گھبرا گئی ہے۔ اللہ نے بڑا کرم کیا ہے سب ٹھیک ہے۔ آپ اندر چلیں میں آپ کو سب تفصیل سے بتاتی ہوں۔'' ان خاتون نے نرمی سے کہا تو اماں کو احساس ہوا اور وہ انہیں فوراً لے کر اندر آگئیں۔ شہلا نے عاصمہ کے ساتھ اجنبی خاتون کو اندر آتے دیکھا تو چونک گئی اور سلام کر کے اٹھ کر کچن میں چلی گئی مگر اس کے کان اندر کی گفتگو پر ہی لگے ہوئے تھے۔

''بس بہن! اللہ نے بہت کرم کیا۔ میری بہو اسی کالج میں لیکچرار ہے۔ مجھے ضروری کام تھا تو ڈرائیور کے ساتھ میں بھی اسے لینے کالج چلی گئی۔ بس ہم واپس آرہے تھے جب راستے میں......'' وہ خاتون دھیرے، دھیرے کر کے سب بتانے لگیں۔

''اماں یہ مس نوشین کی بات کر رہی ہیں جن کے بارے میں اکثر میں باتیں کرتی رہتی ہوں۔ آج اگر وہ نہ ہوتیں تو......'' عاصمہ نے اپنی ماں کے گلے لگتے ہوئے کہا تو اماں کی آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے بھر گئیں۔ عاصمہ کے منہ سے اکثر انہوں نے مس نوشین کا ذکر سنا تھا اور آج وہی اس کے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آئی تھیں۔

''میں آپ کا یہ احسان کبھی بھول نہیں پاؤں گی۔ میں خود آپ کی بہو کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی، کہاں ہے وہ؟ کیا وہ آپ لوگوں کے ساتھ نہیں آئیں؟''

''وہ دراصل باہر کار میں ہی بیٹھی ہوئی ہے، میں بھی اس بچی کی حالت کے پیشِ نظر اندر چلی آئی تھی کہ خود اسے اندر تک چھوڑ آؤں...... اچھا اب میں چلتی ہوں ہمیں کسی کام سے جانا ہے۔'' ان نفیس سی خاتون نے اٹھتے ہوئے کہا تو اماں فوراً بولیں۔

''نہیں...... میں آپ کو ایسے نہیں جانے دوں گی۔ جاؤ عاصمہ بیٹے اپنی مس نوشین کو بھی بلا کر لے آؤ۔ کچھ کھائے پیے بغیر آپ لوگ نہیں جا سکتے۔'' اماں کے بے حد اصرار پر ان خاتون کو بیٹھنا ہی پڑا۔ اماں، بہو کی بے پروائی اور بدتہذیبی کو دل ہی دل میں کوستی کچن کی طرف چل پڑیں۔ اسے پتا بھی تھا کہ مہمان آئے ہیں مگر اس نے کچھ بھی پوچھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ جب تک اماں کولڈ ڈرنک گلاسوں میں ڈال کر لائیں۔ عاصمہ، مس نوشین کو لیے اندر لاؤنج میں داخل ہو رہی

تھی۔ میز پر گلاسوں کی ٹرے رکھتی اماں کی نظر جوں ہی اسٹک کے سہارے دھیرے، دھیرے قدم اٹھاتی اس لڑکی کے بلیح چہرے پر پڑی وہ اپنے ذہن پر زور دیتی ایک دم سے بری طرح چونک گئیں۔ حیرت اور شاکڈ کی کیفیت میں وہ اسے دیکھے جا رہی تھیں۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے ایک معمولی سے نقص کی وجہ سے انہوں نے بری طرح رد کیا تھا۔ اس کا مذاق اڑایا تھا اور آج وہی لڑکی پورے اعتماد اور شان کے ساتھ ان کے سامنے موجود تھی۔ انہوں نے حیرت سے اس نفیس اور سوبر سی عورت کی طرف دیکھا۔ جن کے لباس اور رکھ رکھاؤ سے ان کی خاندانی امارت اور سلیقے طریقے کا پتا چل رہا تھا اور اس عورت نے اپنے اکلوتے اور خوب صورت بیٹے کے لیے اس لڑکی کا انتخاب کیا تھا اور اب بھی کتنے فخر اور خوشی سے اپنی بہو کی تعریف کر رہی تھی۔

کیا سچ میں ایسا بھی ہوتا ہے؟

ہاں اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔ زندگی کا امرت، مٹی کے کچے برتن میں بھی مل سکتا ہے۔ اس کے لیے ضروری نہیں ہوتا کہ برتن سونے کا ہو یا چاندی کا بس یقین اور نیت خالص ہونی چاہیے۔ یہ امرت کسی کا بھی نصیب بن سکتا ہے۔

کچھ دیر بیٹھنے کے بعد ان خاتون نے اجازت چاہی اور خدا حافظ کہتی ہوئی گھر سے باہر نکل گئیں۔ ان کے پیچھے، پیچھے نوشین بھی نکلنے لگی۔ جب اماں نے دھیرے سے نوشین سے اپنے چار سال پہلے والے بدصورت رویے اور الفاظ پر معافی مانگی تو باہر کی طرف قدم بڑھاتی وہ رک گئی اور پلٹ کر انہیں دیکھنے لگی۔ کچھ دیر تک اسی خاموشی کے ساتھ وہ ان کے شرمندہ چہرے کو دیکھتی رہی پھر بولی تو اس کا لہجہ بہت سپاٹ تھا۔

''دکھ اس بات کا نہیں تھا کہ آپ نے رشتے سے انکار کیا۔ دکھ اس بات کا تھا جو جواز اور الفاظ آپ نے مجھے مسترد کرتے ہوئے استعمال کیے کہ جو لڑکی اسٹک کی محتاج ہو وہ ایک گھر کو کیسے چلا سکتی ہے؟ اور آج وقت نے کیسی کروٹ لی کہ اسی اسٹک کی مدد سے میں نے آپ کے گھر کی عزت بچائی ہے۔ میں آج ایک عزت دار گھرانے کی بہو بھی ہوں اور ایک محبت کرنے والے شوہر کی بیوی اور ہاں دو بچوں کی ماں بھی ہوں اور یقین کریں ان سب کے ساتھ ساتھ میں اس معاشرے کی تعمیر و ترقی میں بھی اپنا کردار ادا کر رہی ہوں اور یہ سب کچھ میرے آس پاس رہنے اور بسنے والے ان لوگوں کی مضبوط سوچ اور یقین کی وجہ سے ہوا ہے جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جسمانی معذوری سے زیادہ تکلیف دہ اور اذیت ناک ذہنی و اخلاقی معذوری ہے۔ جسمانی معذوری پھر بھی قابلِ قبول اور قابلِ علاج ہوتی ہے مگر اخلاقی معذوری اور تہذیبی بدحالی نسلوں کی نسلیں تباہ کر دیتی ہے۔'' وہ کچھ پل رک کر پھر بولی تھی۔

''میرا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا نہیں تھا آنٹی' اسی لیے عاصمہ کو پہلے دن پہچان لینے کے باعث میں آج آپ کے سامنے .... آنا نہیں چاہ رہی تھی۔ اس لیے کہ جب اللہ نے مجھے بہترین سے نوازا ہے تو مجھے کسی سے کوئی گلہ یا شکایت نہیں رکھنی چاہیے۔ اگر میری کوئی بات بری لگی ہو تو بہت معذرت چاہتی ہوں۔'' نوشین نے بہت سلیقے اور تہذیب سے کہا اور ایک نظر حیران سی کھڑی عاصمہ اور شرمندہ سی کھڑی ثریا بیگم پر ڈالی اور گھر سے باہر نکل گئی۔

آج عاصمہ کو سمجھ آیا تھا کہ اسے مس نوشین کا چہرہ مانوس سا کیوں لگا تھا۔ آج اسے کئی سال پہلے کا وہ سین یاد آ گیا تھا جب وہ اماں کے ساتھ اپنے بھائی فیصل کے رشتے کے لیے نوشین کو دیکھنے گئی تھی۔

ثریا بیگم کو بھی آج صحیح معنوں میں ذہنی اور اخلاقی معذوری اور جسمانی معذوری میں فرق سمجھ میں آیا تھا۔ آج وہ تاسف سے ہاتھ مل رہی تھیں کہ اس اخلاقی معذوری سے بہتر تو وہ جسمانی معذوری ہی ہے جو کم از کم انسانی وجود کو کائی تو نہیں لگاتی ...... کائی لگے وجود نہ اپنے لیے کارآمد ہوتے ہیں اور نہ معاشرے کے لیے۔

ناولٹ

کھوئے کھوئے لمحے

تابندہ نعیم

پاکستان کی انتہائی معتبر، انتہائی خوب صورت اور انتہائی گہرے جملے لکھنے والی مصنفہ رفعت ناہید سجاد کے انداز تحریر سے متاثر ہو کر شروع کی جانے والی یہ کہانی گزشتہ کئی سالوں سے ٹکڑوں کی شکل میں لکھی جاتی رہی۔ اس عرصے میں پاکستانی معاشرہ تبدیل ہوچکا ہے۔ اب پاکستان کے پبلک پارکس میں شاید ہی کوئی غیر ملکی خاتون پاکستانی طالبات کو شام کی تفریح کرانے نکلتی ہو... مگر ہمارے آپ کے اسی پاکستان میں کبھی ایسا ہوا کرتا تھا۔ کہانی فرضی ہے۔ اس کے واقعات سن انیس سو ستاسی سے انیس سو پچانوے تک کے حالات اور کرداروں پر مبنی ہیں، تاہم ان کی کسی حقیقی کردار یا واقعے سے مماثلت محض اتفاقیہ ہو سکتی ہے۔

لاہور

10 اگست 1991ء

وہ ٹھٹک کر رکا تھا اور چونک کر مڑا تھا۔

وہ تینوں غیر ملکی خواتین، مارکیٹ کے اس بڑے سپر اسٹور میں دکاندار سے قیمت کم کرانے کی پاکستانی اسٹائل کی زنانہ بحث میں الجھی پیچھے انتظار میں کھڑے دیگر خریداروں کی تنگی وقت سے قطعاً بے خبر معلوم ہوتی تھیں۔ وہ ان تینوں میں بالکل بائیں طرف والا انتہائی





چھوٹے ہیئر اسٹائل والا سر تھا، جس نے اسے اس قدر غور سے دکاندار سے الجھی خواتین کا ایسا بھرپور جائزہ لینے پر مجبور کیا تھا۔

وہ ان کی ادائیگی مکمل ہونے کے انتظار کے پورے دس منٹ انتہائی صبر سے اس بات کا منتظر رہا کہ وہ لڑکی ذرا سا اپنا رخ اِدھر کو موڑے تو وہ اس کا چہرہ دیکھ سکے...... لیکن وہ سر تو جیسے فریم میں جڑا تھا...... اس نے نہ جنبش کی نہ دکاندار سے بحث میں الجھی نہ اپنی ساتھی خواتین کو مشورہ دینے کے لیے ہی اپنا رخ موڑا۔ وہ اسے یونہی اندازے سے مخاطب کر کے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا تھا۔

گاہکوں کی قطار لمبی ہوتی دیکھ کر، ایک دوسرا خوش شکل سیلز مین مدد کو آگے بڑھا تھا۔

''سر آپ کی کیا خدمت......؟'' اس نے گردن گھما کر سیلز مین کو دیکھا جو بظاہر اپنے مہذب نظر آنے والے گاہک کو سوتی شلوار دوپٹے میں ملبوس، غیر ملکی خواتین کا جائزہ لیتے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ فہد نے دوسرے کاؤنٹر کی طرف بڑھنے کے بجائے اسٹور سے باہر جانے والے راستے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اسے یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔ اسے یہاں سے جو بھی خریدنا تھا، اس کے لیے پھر بھی آیا جا سکتا تھا۔ اس کی گاڑی قریب ہی کھڑی تھی لیکن ابھی اگنیشن میں چابی گھمائی نہیں تھی کہ اس نے دیکھا، وہی تینوں غیر ملکی لڑکیاں اسی اسٹور سے چند شاپنگ بیگز اٹھائے باہر نکل رہی تھیں۔

بلاشبہ یہ یادداشت کے آنے یا جانے کی کوئی فلمی کہانی نہیں تھی...... وہ وہی تھی، سو فیصد وہی...... اسے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی تھی۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلتا اور اپنا تعارف پیش کرتا، ایک چمکدار ہونڈا اکارڈ کے تیز رفتار ڈرائیور نے اس کی گاڑی کے عین ساتھ، اپنی گاڑی ایسے لگائی کہ وہ دروازہ کھولنے کا ارادہ ہی کرتا رہ گیا۔ اس نے گاڑی ریورس کر کے باہر نکالنے میں تیزی دکھائی مگر اس عرصے میں، وہ تینوں لڑکیاں اس کی نظر سے اوجھل ہو چکی تھیں۔

اس نے گول چکر (چورنگی) کے گرد، انتہائی آہستہ رفتار سے، دوسرا چکر لگاتے غور کیا کہ آج اس کے ساتھ یہ ہوا کیا تھا۔

اس کی زندگی میں پشیمانیاں پالنے کی فرصت کم تھی۔ ایسے میں وہ ایک لمحہ، جو لبرٹی کے راؤنڈ اباؤٹ کے پاس اس کے ہاتھ سے پھسلا تھا، اس پر غور کرنے کی مہلت اسے دوبارہ اگلے کئی دنوں بعد ہی مل پائی۔

''وقت کتنی تیزی سے گزر رہا ہے۔'' اس نے آج کے آخری مریض کو تسلی آمیز باتوں کا انجیکشن لگا کر رخصت کرنے کے درمیان سوچا۔ وہ ان دنوں سخت مصروف تھا مگر جانتا تھا کہ میڈیکل کے شعبے کی کوئی ریسرچ، مریضوں سے رابطے سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔

''اس لیے بیکار پچھتاوؤں میں وقت ضائع کرنا بالکل مناسب نہیں ڈاکٹر صاحب......'' اس کے اندر سے ایک دوستانہ مشورہ برآمد ہوا تھا۔

☆☆☆

لاہور

12 اگست 1991ء

لیکن اتفاقات حقیقت بھی بنتے ہیں...... عظیم نقصانات پورے بھی ہو جاتے ہیں...... اور خسارے کی تحریریں کبھی کبھار دُھل جایا کرتی ہیں۔ وہ ابھی انکشاف کی حیرت سے سنبھل ہی رہا تھا کہ افسوس، اس کے بعد کا لمحہ پھر کہیں راستے میں گر گیا تھا۔

وہ بہت تیزی سے گاڑی چلاتا ہوا آیا تھا۔ اس لیے کرکٹ ہاؤس سے نکلتی ان دو لڑکیوں کو دیکھ کر فوری بریک لگاتے میں کچھ لمحے کی تاخیر ہوگئی۔ جب اس کی کار کے پہیے رکے تو وہ جیل روڈ کی نہر والی کراسنگ پر، سرخ سگنل اور لاتعداد گاڑیوں کے درمیان یوٹرن لینے کا راستہ ڈھونڈتا ہی رہ گیا۔ اس کی گاڑی کے سائڈ مرر میں پیچھے رہ جانے والی، پیدل چلتی لڑکیاں کسی نامعلوم راستے پر جا کر نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔

بس ایک لمحے کی بات تھی...... دوسرا لمحہ وہ تھا جب اس نے یوٹرن لیا، گاڑی دائیں طرف کا رخ موڑ کر واپس گھمائی اور یہ جانتے ہوئے بھی وہ ایک بار پھر اس کی نظروں کے سامنے سے غائب ہوچکی ہے، اسے ڈھونڈنے کی پوری کوشش کی تھی۔

☆☆☆

لاہور

10 ستمبر 1991ء

تیسری بار پھر...وہ اسے اسی سڑک پر دکھائی دی۔ آج بھی وہ اکیلی نہیں تھی۔ نئی بات یہ تھی کہ آج وہ بھی اکیلا نہیں تھا۔

آج اسے ریما کو کالج سے گھر چھوڑنا تھا۔ اس کی بہن، کالج کے سبز گرل والے گیٹ سے اس کی گاڑی دیکھتے ہی اپنے ہاتھ میں مسالے والا مکئی کا بھٹا سنبھالے اپنی دوستوں کو خدا حافظ کہتی باہر آئی۔ وہ ابھی دروازہ کھول کر ٹھیک سے بیٹھی بھی نہیں تھی کہ اس کا بھائی گاڑی آگے بڑھا چکا تھا۔

وہ سخت عجلت میں تھا۔ اسے ریما کے ”کتنی گرمی ہے اور چھلّی کھائیں گے نہ“ والے والہانہ جملوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ریما کو لگا، اسے کہیں پہنچنے کی جلدی ہے۔ وہ سامنے دیکھ کر گاڑی چلانے کے بجائے اپنے دائیں طرف کی کھڑکی کے پار، کسی کو کھوجتا لگ رہا تھا۔

ریما نے بھائی کی نظروں کے تعاقب میں، دائیں طرف کے اس پار والے منظر پر نظر ڈالنی چاہی۔ اور بس وہی لمحہ تھا جب ایک بے حد بوسیدہ سی وین، عمرا سپتال کے سامنے رکی بھی اور چل بھی پڑی۔

وہ اب وہاں نہیں تھی۔ وہ کھٹارا سی وین، آج پھر اسے اپنے پروں میں چھپائے فہد کے اگلے راستے گم کیے دے رہی تھی۔

”یہ کتنا عجیب اتفاق ہے۔“ وہ بری طرح مایوس ہوا۔ اور یہ کتنی عجیب بات تھی کہ اس کے ساتھ یہ اتفاق بار، بار ہورہا تھا آخر کیوں......؟

”آپ چلتے کیوں نہیں؟“ ریما کی ناراض سی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ اور اسے احساس ہوا کہ سڑک کے پار کا منظر بدلتے دیکھ کر اس نے بے اختیار بریک لگائی تھی اور پاؤں اٹھانا بھول گیا تھا۔

”سوچنے کی بات یہ بھی تھی کہ آخر وہ کیوں اس سے ہر قیمت پر ملنا چاہتا ہے۔“ اس نے بریک سے پاؤں اٹھاتے، ایک دفعہ پھر سوچا۔

لیکن یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ وہ اس سڑک سے ایک بار نہیں، بار، بار گزرا...... یہ اس کا روز کا راستہ نہیں تھا۔ ریما متجسس تھی کہ اس کا بھائی جو کبھی لنچ کرنے گھر نہیں آتا، ان دنوں اپنے انتہائی مصروف اوقاتِ کار سے فرصت نکال کر اسے کالج سے گھر ڈراپ کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

15 ستمبر 1991ء

اسے کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔

پچھلے چند دنوں میں وہ اس جیل روڈ پر سے جانے کتنی بار گزرا ہوگا۔

”اور یہ لاہور شہر آخر کتنا بڑا ہے؟“

اس نے آج کی تاریخ کے ڈوبتے سورج کو بادشاہی مسجد کے میناروں سے پرے دیکھ کر سوچا...... شاہی قلعے کی برجیاں ماند پڑ جانے والی کرنوں کی روشنی سے اور بھی سرخ ہورہی تھی۔ اسے اپنی تلاش کے لاحاصل اور حماقت انگیز ہونے کا احساس بھی تھا۔

”اگر وہ اس شہر میں موجود تھی تو کیا اتنی ہی فرصت سے ہوگی کہ آج، ابھی، اس شہر کے تاریخی مقام دریافت کرنے ضرور یہاں آئے گی۔ ہاں...... ٹھیک ہے، وہ ایک عجیب سے جنون کا شکار ہورہا ہے پھر بھی کچھ عقل سے کام لینا چاہیے۔“ اس نے خود کو خود ہی سمجھایا۔

وہ کوئی بیروزگار نہیں تھا...... اس کے کام کا حرج ہورہا تھا۔ زندگی میں ایسی بے وقوفیوں کی گنجائش رکھی ہی نہیں جا سکتی۔

☆☆☆

20 ستمبر 1991ء ... اور پھر کمال ہوگیا۔

وہ کسی کام سے سروسز اسپتال آیا تھا اور اب اس نے واپسی کے ارادے سے اپنی گاڑی اسپتال کے مین گیٹ سے نکالی ہی تھی۔ ریس کورس پارک کے سگنل سے بائیں طرف مڑتے ذرا سی دیر میں اس نے دیکھا کہ اپنی صحت سے محبت کرنے والے لاہوریوں کی ایک بڑی تعداد شام کی سیر کرنے پارک میں جا رہی تھی۔ اور لڑکیوں کا وہ گروپ جو اس کے سامنے ابھی ابھی پارک میں داخل ہوا تھا، اس میں ایک وہ بھی تھی۔ اس بار اس نے وقت ضائع نہیں کیا۔

اس نے گاڑی پارک کی ذیلی سروس روڈ پر لگائی...... اور انتہائی عجلت میں تیز تیز چلتا ہوا، مین گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ انہیں ڈھونڈنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا۔

وہ اکیلی نہیں تھی...... وہ ایک گھونگریالے، بھورے بالوں والی انتہائی دراز قد، غیر ملکی لڑکی کے ساتھ تھی۔

وہ جانتا تھا اگر آج کا یہ لمحہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا تو وہ اسے دوبارہ ڈھونڈنے میں شاید کبھی کامیاب نہ ہو سکے۔

وہ لپک کر قریب گیا تھا اور اس نے وقت ضائع کیے بغیر پکارا تھا۔

''ہیلو، سبرینہ......''

وہ جو اپنی طرف سے پارک کے قدرے کم رونق والے حصے میں جو نیئر ہاسٹل کی لڑکیوں کو تفریح کرانے لائی تھی، خوف سے سن ہو گئی۔ وہ اس بڑے شہر کے ہنگامے میں، صرف اور صرف شناسا چہروں سے ہی بچتی پھر رہی تھی۔ اس کی شکل پر کچھ ایسا تھا.... جیسے کسی نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔ اس نے اس کے رنگ اڑتے چہرے کو بھی دیکھا تھا اور اس کی آنکھوں کی ہراساں سی بیگانگی کو بھی۔

مگر وہ زیادہ دیر انتظار نہ کر سکا اور انگریزی میں بولا تھا۔

''تم نے مجھے پہچانا نہیں......؟ میں فہد ہوں، فہد مرتضیٰ......'' اس کے چہرے کے رنگ اڑتے تاثر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

''تم ایڈنبرا میں تھیں ناں...... ہم وہاں مل چکے ہیں۔'' وہ آخر کہاں کہاں سے بھاگے گی...... زندگی میں انسان کو فرار کے کتنے موقع ملتے ہیں بھلا......؟ وہ کسی حقیر سے خوفزدہ چوہے کی طرح گھر کر مارے جانا نہیں چاہتی تھی۔

''تم یقین نہیں کرو گی کہ میں تمہیں کتنے دنوں سے ڈھونڈ رہا ہوں۔'' وہ اپنی شُستہ انگریزی میں جو کہہ رہا تھا، یقیناً اس کا لغوی مطلب بھی وہی تھا۔

''تو کیا وہ سوچ لے کہ اس کی اڑان بس یہیں تک تھی؟'' اتنی تھکا دینے والی طویل پرواز کے بعد کسی نے اس کی ڈوری کھینچی اور پھر پھڑ پھڑاتی ہوئی وہ زمین پر آ رہی۔ اس نے دیکھا، اس کے سامنے کھڑے شخص کی آنکھوں میں، ایک انوکھی سی چمک تھی۔ اس نے فرار کی بے فائدہ کوشش کے لیے کچھ دور بیڈمنٹن کھیلتی چڑیوں کی طرح چہچہاتی لڑکیوں کے گروپ کی طرف نظر دوڑائی مگر وہ اس کے ارادے بھانپ چکا تھا۔

''سبرینہ گیبرئیل......!'' اس نے ذرا جھک کر کہا۔

''آپ کی مہربانی ہوگی اگر آپ مجھے بتا دیں اگلی بار میں آپ سے ملنا چاہوں تو مجھے آپ کو کہاں تلاش کرنا چاہیے۔ معاف کیجیے...... اگر آپ دوبارہ گم ہو گئیں تو میں آپ کو کہاں ڈھونڈتا پھروں گا؟'' اس کے اٹھتے قدم رکے۔

شرارت آمیز دوستانہ انداز، جس میں حکم نہیں شکوہ سا تھا۔ وہ ایسے لہجوں کی بالکل عادی نہیں رہی تھی۔ اس نے ایک لمحے کا توقف کیا لیکن رکنے کا ارادہ بالکل ترک کر کے دوبارہ لڑکیوں کی طرف قدم بڑھا دیے۔

''دیکھو......'' وہ اس کے ساتھ آیا۔ ''تم میری بات کا جواب تو دے سکتی ہو؟''

لڑکیوں کا گروپ، اس گھونسلے جیسے بالوں والی لمبی لڑکی کے ساتھ بے پروا ہنسی بکھیرتا ان کے قریب آ رہا تھا۔

''کیا تم نے مجھے واقعی نہیں پہچانا؟''
اس نے بغیر سوچے سمجھے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے دیکھا۔ مہربان لہجے والا شخص توجہ سے، اس کی ایک ہاں یا نہ کا منتظر کھڑا تھا۔ وہ ڈگمگا گئی۔
فہد مرتضیٰ اگر دماغ پر ذرا سا زور دیتا تو سوچ سکتا تھا کہ اس کے سامنے کھڑی لڑکی کے انداز میں خود مختاروں والی تو کوئی بات نہیں تھی۔ وہ جیسے کسی فیصلے تک پہنچنے کی کوشش میں اپنے آپ سے الجھتی لگ رہی تھی۔ پھر کسی اکتا دینے والی گھڑی میں وہ اس کھیل سے بھی تنگ آ گئی۔
''میرے پہچاننے یا نہ پہچاننے سے کیا فرق پڑتا ہے؟''
فہد کی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔
''شکریہ...... ورنہ مجھ سے بڑا بے وقوف اس شہر میں کوئی نہ کہلاتا۔'' اسے کچھ کچھ یاد آیا، وہ شخص تو شاید ایسا ہی تھا۔ حالات اور وقت صرف اسی کے لیے تبدیل ہوئے تھے۔
اور ممکن ہے، یہ سب ویسے نہ ہو جیسے وہ سمجھ رہی ہے۔ دوست اور دشمن لہجوں میں اتنا فرق بھی نہیں ہوتا۔
کسی گہری مشکل سے نکل کر اس نے ہلکے سے مسکرانے کی کوشش کی۔
''اور...... سب کیسے ہیں؟''
''اور سب کون......؟'' فہد کے منہ سے نکلا پھر جیسے اس نے اپنے جملے پر نظر ثانی کر لی۔
''واپس آنے کے بعد پچھلے کچھ سال، میں اتنا مصروف رہا کہ کسی سے زیادہ ملنے کا موقع نہیں ملا۔ تمہاری کسی سے ملاقات ہوئی؟''
اس کے سامنے کھڑے شخص کی آنکھوں میں یہ پڑھنا مشکل نہیں تھا کہ اس کے خدشے بے بنیاد ہیں پھر بھی یقین اور بے یقینی کا درمیانی فاصلہ پل صراط بنا ہوا تھا۔
''نہیں......'' اب وہ آنے والے حالات کا سامنا کرنے کے لیے بالکل تیار تھی۔
''میں تو کسی سے ملی نہیں۔'' کیا فائدہ ایسی سچائیوں کا جو آپ کی غلطیوں کا اشتہار بنا کر بل بورڈ پر لگا دیں۔
''یونہی تمہیں دیکھ کر مجھے خیال آیا......''
کم عمر لڑکیوں کی بے پروا ہنسی نے رابطہ بڑھاتی گفتگو کا یہ مشکل قائم ہوا تسلسل توڑ دیا تھا۔ بھورے رنگ کے بالوں والی لڑکی اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف اشارہ کرتی اس سے واپسی کا ارادہ معلوم کر رہی تھی۔
''تم بتاؤ گی نہیں کہ تم کہاں ٹھہری ہوئی ہو؟'' فہد کو لگا کہ وہ اس پر ایک نظر اور ڈالنے کی تکلیف گوارا کیے بغیر دوبارہ کھو جانا پسند کرے گی۔ چند منٹوں میں اس نے اس کے چہرے کو بہت بے حساب کتاب کرتے دیکھا تھا۔ فہد نے اپنے پرس سے ایک کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے اپنا پین اسے پیش کرتے اس کے چہرے پر لکھے زبردست گریز کو صاف محسوس کیا تھا۔ اب وہ کارڈ اپنی ہتھیلی پر الٹ کر کچھ نہ کچھ لکھ رہی تھی۔
کارڈ پر نظر ڈال کر وہ خوش ہو گیا۔
''پڑھتی ہو وہاں؟''
''پڑھاتی ہوں۔'' وہ اس سے اس کا وزیٹنگ کارڈ لیے بغیر جا چکی تھی۔ پھر بھی فہد کو لگا مغرب میں گرتے سورج کی کرنیں آج کچھ روشن روشن سی تھیں۔

☆☆☆

''بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی۔ پتا نہیں وہ سچ بول رہا تھا یا جھوٹ...... اور کیا پتا جو......'' ایک اونچے قہقہے نے اس کی توجہ کھینچی...... سونیا کا چہرہ جوش سے سرخ تھا۔ وہ اینڈریا کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر، آج کے کسی غیر اہم واقعے کو، ناقابلِ فراموش ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ اسپتال کی لڑکیوں سے زیادہ فاصلہ رکھنے کی قائل نہیں تھی۔ وہ جتنا سونیا کو جان چکی تھی وہ جونیئر اور سینئر ہاسٹل کی تمام وارڈنز اور لڑکیوں میں سب سے بڑی ڈراما کوئین تھی۔
''کس قدر بے تکا ہنستی ہے یہ سونیا......''
اس نے خفیف سی ناگواری سے اپنی نظر ہٹالی۔
ہاسٹل کا کامن روم جو شام کو ٹی وی روم بن جاتا تھا۔ محبت کی کسی لازوال کہانی پر مبنی ڈرامے کے نشر ہونے کا منتظر تھا۔ کمرا بے فکر لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ سبرینہ نے اپنی توجہ واپس اسی نکتے پر مرکوز کی، جس نے کم از کم آج کی رات تو اس کی نیند اڑا ہی ڈالی تھی۔

"اور اگر اس کے سارے شک ٹھیک نکلے تو......؟" اس نے زندگی میں بہت سی غلطیاں کی تھیں، بہت سے غلط فیصلے کیے تھے۔ اسے یقین تھا یہ خوف سے بھری زندگی اور اندیشوں کے عفریت اس کی سزائیں ہی ہیں...... لیکن ہاں، اگر آج اس سے غلطی ہوئی تھی تو اب تک کی تمام غلطیوں میں یہ سب سے بڑی ہے۔ اور اب یہ کون، کون سے عذاب نہیں لائے گی...... یہ سوچ کر اسے جھرجھری آگئی۔

اور بھلا کیا ہو جاتا، اگر وہ اسے پہچاننے سے انکار کر دیتی تو...... مگر اس سے اتنی بڑی حماقت ہوئی کیوں آخر...؟ کیا اس لیے کہ وہ دشمنوں میں سے نہیں لگ رہا تھا۔ یا اس لیے کہ وہ بہت دنوں بعد باہر نکلی تھی اور زندگی کے تمام بڑے سوال بھلا کر، کچھ دیر تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتی تھی۔ یا وہ شخص بہت جانا پہچانا سا تھا یا شاید جانا پہچانا اتنا نہیں تھا جتنی اس کی آنکھوں میں دوستی تھی۔ خوش خلقی سے مسکراتی، مانوس سی، دوست آنکھیں...... یا شاید عرصے سے دشمن دنیا کے راستوں پر خوف کے ٹوکرے لادے، وہ اتنی خود ترسی کا شکار ہوگئی تھی کہ جو پہلا شناسا چہرہ اسے دکھائی دیا بس اس نے اسی کو اپنا نجات دہندہ مان لیا۔

وہ ہاسٹل کے ڈائننگ ہال میں کتنی دیر سے کھانے کی میز پر بیٹھی پچھتاوؤں سے برسرِ پیکار تھی۔ سب کھانے والے کھانا کھا کر اٹھ چکے تھے۔

سونیا بھی اپنی پسندیدہ اسٹوڈنٹس کے ساتھ، کب کی ہاسٹل واپس جا چکی تھی۔ روزانہ سبرینہ اور اینڈریا بھی ان کے ساتھ ہی نکلا کرتی تھیں۔ رات کے کھانے کے بعد کچھ دیر کالج کے ڈائننگ ہال سے جونیئر اور سینئر ہاسٹل کے درمیان لمبی اندھیری روشوں پر رات کے پھولوں کی خوشبو سونگھتے کچھ دیر چہل قدمی کرنا، اسے تازہ دم کر دیا کرتا تھا۔

لیکن آج سبرینہ چپ چاپ تھی۔ اینڈریا نے اسے کبھی اتنی گہری سوچ میں ڈوبے نہیں دیکھا تھا......

اور ہاسٹل میں رہنے والی ایک خاتون لیکچرر سے طویل بحث میں ابھی، اسی کے اٹھنے کے انتظار میں تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی۔ وہ جب سے پارک سے واپس آئی ہے، کسی اہم مسئلے میں گرفتار ہے۔ آخر جب ڈائننگ ہال کا اسٹاف، کھڑکیاں دروازے بند کرنے اور میزیں رات سے پہلے آخری بار چمکانے لگا تو اس سے رہا نہیں گیا۔ خاتون لیکچرر کو رخصت کر کے وہ اس کی طرف آگئی۔

"آج واپسی کا ارادہ نہیں؟" اس نے نرمی سے پوچھا تھا۔ سبرینہ بغیر ایک لفظ کہے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔"

اس نے اینڈریا ایلیسن کے ساتھ اندھیرے درختوں کے نیچے دور تک خاموشی سے لیٹی طویل روش پر سے گزرتے اپنے آپ کو مخاطب کیا۔

اور کوئی، کوئی وقت اتنا ظالم ہوتا ہے جب انسان وقت کو نہیں، وقت انسان کو گزارتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک بار پھر ایسا ہی ہوا تھا۔

"کس قدر اندھیرا ہے۔" اس نے اینڈریا کو...... بڑبڑاتے ہوئے سنا۔

"پتا نہیں کیوں یہاں روشنی کا بندوبست نہیں کرتے، صبح ضرور بات کروں گی آفس میں۔"

اینڈریا نہیں جانتی تھی کہ اس کے لیے اندھیرے کتنی بڑی نعمت ہیں۔ وہ ایسی پناہ گاہوں کی تلاش میں کتنی بار زخمی ہوئی...... اور کس کس طرح......

"وہ تمہارا دوست تھا کوئی؟" اینڈریا اس سے پارک میں ملنے والے اس اجنبی کے بارے میں سوال نہ کرتی اگر جو اسے شام سے اتنا پریشان نہ دیکھ رہی ہوتی۔

"نہیں۔" بہت دیر بعد اس کی آواز آئی۔

"دوست تو نہیں تھا۔" اس نے اینڈریا سے زیادہ خود اپنے آپ کو یقین دلایا۔

اینڈریا نے اپنے کمرے کا رخ کیا تو وہ ہاسٹل کی دوسری منزل پر اپنے کمرے کو جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

دوسری منزل کے لمبے برآمدے میں کھلنے والے ترتیب وار کمروں سے، کسی امریکی گلوکارہ کا گیت اس

کے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔

وہ اپنے کمرے کے باہر کاریڈور کے نیم روشن کونے میں پڑی کرسی پر ڈھیر ہوگئی۔

''کیا تھا جو آج کا دن کسی بڑے حادثے کے بغیر گزر جاتا۔'' وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کندھے سے کندھا ملائے، سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتی لڑکیوں کو، ایک بے دھیان سی مسکراہٹ کے ساتھ، نظروں کے سامنے سے گزرتا دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

لڑکیاں ڈراما دیکھ کر واپس آرہی تھیں۔ اونچی آواز میں ہیرو پر، ایک ساتھ جان دینے والی اور زندگی سے اپنا حصہ وصول کرتی لڑکیاں، جنہیں یقین تھا کہ ان کے حسین خواب، حقیقت ضرور بنیں گے، انہیں درد میں ڈوبی گلوکارہ وٹنی ہیوسٹن میں کوئی دلچسپی نہیں تھی جو کہہ رہی تھی۔

(''میں نے تم سے زیادتی کی لیکن میرے پیارے، کیا تم دیکھ نہیں سکتے، کیا تم میرے اندر جھانک نہیں سکتے۔'')

اور اس کی آواز سبرینہ کے دل میں، بہت دور تک بہت زور سے کسی ٹھیس کی طرح لگ رہی تھی۔

(''اگر میرے الفاظ بے معنی ہیں تو میرے گیت کی دُھن پر دھیان دو کیونکہ میری محبت وہیں کہیں چھپی ہوئی ہے۔'')

کاش اسے کوئی ٹائم مشین مل سکتی...... وہ وقت کو اتنا پیچھے لے جاسکتی کہ زندگی کی کتاب میں لکھی... بدصورت تحریریں مٹا کر دوبارہ لکھی جاسکتیں۔ وہ کسی اداس، ندیدے بچے کی طرح دونوں ہاتھوں میں چہرہ ٹکائے، اپنے آپ کو بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

لیکن افسوس کہ ایسا ہوتا نہیں...... زندگی ایک منہ بند غار ہے، جس میں صرف ایک ہی راستے پر آگے بڑھا جاسکتا ہے۔ پیچھے پلٹ کر جانے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

وہ ایک، ایک کمرے میں جھانکتی، لڑکیوں کی گنتی پوری کرکے حاضری لگاتی، ٹھیک رات دس بجے جونیئر ہاسٹل کے تمام کمروں کی بتیاں بجھوا کر لڑکیوں کو سو جانے کی ہدایت کرتی...... اپنے روزگار کے تمام فرائض ایمانداری سے انجام دے کر اپنے بستر پر آگئی۔

شام سے اب تک ملامت، پچھتاوے اور افسوس کے کتنے ہی دور، اس پر سے گزرتے رہے تھے لیکن تکیے پر سر رکھتے ہی ایک زبردست خوف اس پر حملہ آور ہوا۔

یہ ستمبر کی ابتدائی راتیں تھیں۔ گرمی بہت زیادہ نہیں تھی۔ یا شاید اسے ہی اچھے برے موسم گزارنے کی عادت ہوگئی تھی...... لیکن اینڈریا بہت تکلیف میں تھی۔ وہ امریکا کی سرد ترین ریاست مینیسوٹا سے آئی تھی۔ اسے اس قیامت کی گرمی میں اپنے کمرے کے پوری رفتار سے چلتے پنکھے میں بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ اپنی طرف کے کمروں کی چھت پر مچھر دانی لگا کر سونے کا آئیڈیا بھی اینڈریا کا ہی تھا...... اسی نے سبرینہ کو بتایا تھا کہ اس ملک میں، گرمی کے موسم میں چھت پر سونا ایک عام سی بات ہے۔ سبرینہ نے اینڈریا کو یہ بتا کر مایوس نہیں کیا کہ اس ملک پاکستان سے وہ اس سے کچھ زیادہ ہی اچھی طرح واقف ہے۔ سخت گرمیاں شروع ہونے کے بعد سے وہ اور اینڈریا چھت پر سو رہی تھیں۔

ستاروں بھرے آسمان سے اس کی دوستی بھی خوب ہوگئی تھی۔

آسمان جو ایک مہربان سامع تھا۔ ساری شکایتیں، سارے سوال خاموشی سے سنتا تھا۔ مگر آج ایک غیر معمولی رات تھی۔

اسے آسمان کی تاریکی سے، ایک کوبرا سانپ اپنی طرف لپکتا نظر آیا۔

''اگر فاروق کو سچ مچ پتا چل گیا تو......؟'' اسے لگا، رات بہت کالی ہے، چندا بھی نہیں نکلا تھا...... لیکن ستارے چمکتے چمکتے تھک کر سو بھی گئے تھے۔ جگمگانے اور چمکنے کا یہ کھیل جیسے ان کے لیے کوئی ناپسندیدہ سا فعل بن کر رہ گیا ہو۔

''تم اس بھول میں مت رہنا کہ تم کہیں بھاگ کر جا بھی سکتی ہو۔''

کسی کی خون جما دینے والی سفاکانہ سرگوشی اس

کے کان میں گونجی تھی۔
''میں زیادہ نہیں کہنا چاہتا...... مگر مجھے آزمانے کی غلطی مت کرنا...... اب تک تمہیں شاید ٹھیک سے اندازہ نہیں ہوا۔''

اسے ٹھیک سے اندازہ ہو چکا تھا۔ اس نے محسوس کیا، اس کی کنپٹی سے ہو کر کان اور بالوں میں جذب ہوتے ٹھنڈے پسینے کے قطرے، گرمی سے نہیں، خوف کی زیادتی سے بہہ نکلے تھے۔

اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اتنے مضبوط اعصاب کی مالک نہیں۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

اس خوفناک اکیلی رات میں، اس کے ساتھ کوئی بھی بڑا حادثہ پیش آسکتا ہے۔ شاید وہ کل کا سورج دیکھنے کے لیے نہ بچ سکے۔ اور اگر اگلی تمام عمر اس کے نام، ایک بے رحم قاتل کے خنجر تیز کرنے کی مشقت لکھ دی گئی...... تو وہ اس خون آلود سرخ جہنم میں کیسے جل سکے گی۔ کتنی دیر تک خوف کی شدید لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی کو سنسناتی گزرتی رہی۔ کتنی دفعہ اس نے سوچا کہ وہ آواز دے کر ساتھ کی چارپائی پر سوئی اینڈریا کو جگا لے۔ لیکن اسے لگا اگر اس نے ذرا سی آواز اونچی نکالی تو چھت کے کسی اندھیرے کونے سے، برآمدے کے کسی ستون کے پیچھے سے نکل کر کوئی ڈراؤنا ہیولہ اسے دبوچ لے گا۔

پتا نہیں کتنی رات گزر چکی تھی اور کتنی ابھی گزرنا باقی تھی۔

شاید اسے تھوڑی سی نیند آگئی تھی کہ سناٹے میں ایک ارتعاش پیدا ہوا۔ جیسے کوئی وزنی چیز دھم سے گری ہو۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی...... اس کا دل اچھل کر حلق میں دھڑک رہا تھا۔

ایسی آوازیں صرف وہم سے نہیں آیا کرتیں مگر کاش یہ اس کا وہم ہی ہو۔ کتنی دیر سانس روکے پڑے رہنے کے بعد اسے لگا وہ خوفناک سا اسرار، وہ بھیانک سرسراہٹ، اس کے اردگرد کی فضا سے معدوم ہوگئی ہے۔

اس کے دل کی دھڑکن ابھی معمول پر نہیں آئی تھی پھر بھی وہ اٹھ بیٹھی۔ چاروں طرف غضب کا سکون اور اطمینان تھا۔ رات اپنے دامن میں بے شمار لوگوں کے خواب سمیٹے دھیرے دھیرے گزر رہی تھی۔ دور بہت دور ہاسٹل کی باؤنڈری وال کے اُدھر لمبی اور ویران سڑک خاموشی سے لیٹی رات کے مسافروں کو راستہ دکھا رہی تھی۔ سڑک پر سے گزرنے والی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس ذرا دیر کو ہاسٹل کی پچھلی دیوار پر لہراتیں پھر دور ہوتے ہوتے بالکل معدوم ہو جاتیں۔

گاڑیوں کے وقتاً فوقتاً بجتے ہارن، کسی بے قابو کار کے چرچراتے ٹائر، چند لمحوں کو فضا کے جامد سناٹے کو منتشر کرتے...... پھر گزر جاتے۔

یہ دوسری ہزاروں راتوں جیسی ایک عام سی رات تھی۔ جس میں کوئی غیر معمولی پن نہیں تھا۔ کائنات کی ہر حرکت پُرسکون تھی۔ سوائے ہاسٹل کی چھت پر سانس روکے بیٹھی اس لڑکی کے جسے ایک معصوم بلی نے انجانے میں کود کر بے سکون کر دیا تھا۔ وہ پوری چھت پر ٹہل کر، یہاں وہاں سے نیچے جھانک کر اچھی طرح اطمینان کر کے بستر پر واپس آئی تو بھی اسے یقین نہیں تھا کہ اس کا خوف بے بنیاد ہے۔

صبح ہونے میں چند گھنٹے باقی تھے۔ وہ مؤذن کی آواز کو مہربان ماں کی لوری کی طرح سنتی، کب سوئی، اسے پتا نہیں چلا۔ ایسی ہی ایک اور لمبی رات کو، اس نے اپنے خدا کے بالکل نزدیک جا کر ایک دعا پہلے بھی مانگی تھی۔ وہ بند آنکھوں سے اپنے آپ کو اسی رات کی اذیت میں مبتلا دیکھ رہی تھی۔

اسے لگا، اسے سوئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ کسی نے اسے بری طرح جھنجوڑ دیا۔

اس نے بہ مشکل تمام کھلتی، بند ہوتی آنکھوں سے دیکھا، اینڈریا اس سے کچھ کہہ رہی تھی پر کیا......؟ وہ سمجھ نہیں سکی...... وہ ایک خواب میں مسلسل جاگ رہی تھی...... کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اس کے قریب پہنچ چکی تھیں...... اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ اس کے پاؤں زخمی تھے مگر وہ رک نہیں سکتی تھی...... وہ بھاگے چلی

جارہی تھی۔ اسے ڈیڈی کے پاس جانا تھا...... اسے ایما کے پاس جانا تھا مگر کتے اس کے تعاقب میں تھے...... اس کی بوٹیاں نوچنے کو بے قرار...... سرخ لپکتی زبانوں والے...... اس کی آنکھ کھلی تو تیز چمکیلی دھوپ اس کے اوپر تک آرہی تھی۔

وہ بستر سمیٹ کر نیچے آئی تو ہاسٹل کی خاموشی بتارہی تھی کہ پڑھنے والے پڑھائی کرنے جاچکے تھے۔ اس نے منہ ہاتھ دھونے کے دوران واش بیسن کے آئینے میں نظر ڈالی۔ کیا رات بھر کی کہانی اس کے چہرے پر صاف پڑھی جاسکتی تھی؟ وہ اپنا پہلا پیریڈ مس کرچکی تھی۔ کالج کی پرنسپل اچھی خاتون تھیں لیکن انہیں شکایت کا موقع دینا اچھی بات نہیں تھی۔ وہ ان کی احسان مند تھی کہ انہوں نے اسے بغیر کسی حوالے اور دستاویزی لوازمات کے، اس اجنبی ملک میں روزگار اور چھت کا آسرا دیا تھا۔ اس نے پرنسپل کے کمرے میں اپنی طبیعت کی خرابی کو تاخیر کا سبب بنا کر پیش کرنا چاہا...... اسے پتا چلا اینڈریا ایلیسن اس کی دوست یہ کام پہلے ہی کرچکی تھی۔

''ہم بلاوجہ ہی دنیا سے بدگمان رہتے ہیں...... کتنے اچھے لوگ اسی دنیا میں روزانہ ہمیں ملتے ہیں اور ہمیں احساس تک نہیں ہونے دیتے۔''

اس نے بہت شکرگزاری سے اینڈریا کے بارے میں سوچا۔ یہ کل سے اب تک ہونے والا سب سے اچھا واقعہ تھا۔

اینڈریا اسے پرنسپل کے کمرے سے نکلتے ہی ملی۔ وہ سونیا بروس کی کوئی بات توجہ سے سنتی اسی طرف آرہی تھی۔ اسے دیکھ کر دور ہی سے بولی۔

''میں نے پرنسپل کو بتادیا تھا کہ آج تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں، تم کوئی کلاس نہیں لوگی۔'' اسے خیال آیا...... رات جب وہ خوفزدہ بلی بنی...... چھت پر یہاں وہاں گھوم رہی تھی تو اینڈریا نے ایک بار بھی آنکھ کھول کر نہیں دیکھا تھا۔

''کیا وہ دوسروں کی بے چینی، سوتے میں بھی بھانپ لینے پر قادر ہے؟'' سبرینہ کو یہ بات زیادہ مناسب معلوم نہیں ہوئی۔

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔''

اینڈریا کو لگا، وہ کسی بات کا برا مان گئی ہے...... وہ سونیا کے ہاتھ میں دبی، اپنی کہنی ہٹا کر اس کے نزدیک آئی۔

''مجھے لگا، تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔'' سبرینہ کو اچھا نہیں لگا، جیسے وہ اس کے چہرے پر کسی سوال کا جواب تلاش کررہی تھی۔

''تم رات بھر بے چین رہیں، میری آنکھ کھلی تو تم چھت پر ٹہل رہی تھیں۔ تم کچھ پریشان ہو سبرینہ......؟ تم مجھ سے ہر بات کرسکتی ہو۔'' وہ اس کے بالکل نزدیک کھڑی، اتنی فکرمندی سے پوچھ رہی تھی کہ سبرینہ نے گرمجوشی کی ایک زبردست لہر اپنے دل میں اٹھتی محسوس کی۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں......'' وہ اپنی تھرڈ ائیر کی کلاس لینے جاچکی تھی۔

اینڈریا کو لگا...... وہ کوئی فاصلہ کم کرنے کو تیار نہیں، وہ کسی پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں ہے، وہ خود اپنے مسکرانے سے خوفزدہ ہے...... حتیٰ کہ اب وہ کسی سے بات کرنے سے بھی خوفزدہ ہے حالانکہ سب کی رائے سبرینہ گیبرئیل کے بارے میں یہ نہیں تھی۔ یہیں اسی کالج میں، کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ حسین، مغرور اور لیے دیے رہنے والی نئی لیکچرر، کسی کو اپنے برابر کا نہیں سمجھتی...... لیکن اینڈریا ایلیسن جانتی تھی کہ ایسا نہیں ہے۔

ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اس نے اینڈریا کو ہونے والے زبردست ملیریا بخار میں، دن رات ایک کرکے اس کی دیکھ بھال کی تھی۔ کسی معمولی اکتاہٹ کے اظہار کے بغیر اسے تازہ سوپ اور پلین دلیا کھلاتی، اس کا دھیان رکھتی وہ لڑکی، اینڈریا کو لوگوں کے ہر اندازے کو غلط ثابت کرتی بہت اچھی لگی تھی۔

☆☆☆

اپنی عمر کی چوتھی دہائی پھلانگ چکنے والی سونیا کا تعلق آسٹریلیا سے تھا۔ وہ ہاسٹل کی حالیہ چند سالہ تاریخ

کی سب سے پرانی غیر ملکی وارڈن تھی۔ اسے خود کو کم عمر اور پُراعتماد ظاہر کرنے کا شوق تھا۔ اسے لوگوں پر ہنسنا اور بے لاگ تبصرے کرنا بھی پسند تھا۔ اس سے انسان زیادہ پُراعتماد دکھائی دیتا ہے اور نہ جانے کیوں، اسے سبرینہ سے ایک عجیب چڑ تھی اور وہ ہاسٹل کی دیگر وارڈنز کو، اپنے خیالات سے آگاہ کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں سمجھتی تھی۔

اسے یقین تھا کہ سبرینہ کو اپنے حسن پر سخت غرور ہے، تبھی وہ کسی سے گھلتی ملتی نہیں..... کوئی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

''وہ اتنی کم عمر نہیں، جتنی لگتی ہے۔'' اور......

''پتا نہیں، اس نے بیچلرز بھی کیا ہے یا نہیں..... یہ تو مسز احمد ہی اتنی سادہ ہیں کہ اسے یہاں جاب مل گئی۔''

اینڈریا کو سونیا بروس سے سخت اختلاف تھا..... لیکن وہ دیکھتی تھی کہ سبرینہ کے لیے، سونیا جیسی عورت جیسے کوئی وجود ہی نہیں رکھتی تھی اور صرف سونیا ہی نہیں، اسے اپنے اردگرد کی دنیا میں کسی سے کوئی زیادہ مطلب نہیں تھا۔ سبرینہ کے لیے اتنا کافی تھا کہ کالج کی نیک دل پرنسپل نے، اس کی استعداد کو، ایک ہی ملاقات میں جانچ کر اسے زندگی نئے سرے سے شروع کرنے کا موقع دیا تھا۔

چونکہ وہ پچھلے کئی مہینوں سے ہاسٹل میں ہی رہ رہی تھی، اسے جونیئر ہاسٹل کی وارڈن کی جزوی ذمے داری دینا، ان کے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ انہیں انسانوں کی پرکھ کا دعویٰ تھا اب تک جو غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔

وہ پڑھاتی کیسا تھی، اس کا اندازہ انہیں تھرڈ ائیر اکنامکس کی طالبات کے امتحانی نتائج دیکھ کر ہو چکا تھا۔ وہ جس بھی وجہ سے یہاں تھی کسی کو نقصان پہنچانے نہیں آئی تھی۔ پرنسپل یہ اندازہ بھی لگا سکتی تھیں کہ وہ زیادہ دیر شاید یہاں نہ رکے مگر جب تک یہاں ہے تب تک کالج کو اس کی قابلیت سے فائدہ اٹھالینا چاہیے۔

اس کے دو ہی شوق تھے..... کتابیں پڑھنا......

اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھتے رہنا...... اور کالج کی ایک سینئر پروفیسر مس تزئین اظہر سے ملنے ہاسٹل ہی میں موجود ان کی رہائش گاہ ''اسٹاف ہاؤس'' جانا۔ اسے بحث کرنے میں دلچسپی نہیں تھی...... لیکن مس اظہر کی باتیں اسے اچھی لگتی تھیں۔

تزئین اظہر تاریخ پڑھاتی تھیں۔ جنوبی ایشیا اور اسلامی دنیا کی تاریخ...... جو اُن کے بقول، کبھی ترقی معکوس کا باب معلوم ہوتی ہے...... کبھی درباریوں کی خوشامد اور کبھی مستقبل میں جھانک سکنے والا جادوگرنی کا کرسٹل بال...... انہیں یقین تھا کہ تاریخ کو درست طریقے سے لکھا گیا ہوتا تو دنیا اس سے حقیقتاً کچھ سبق سیکھ سکتی تھی۔ جو تاریخ کتابوں میں درج ہے، اس میں سچ اور جھوٹ کی تمیز کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا ریت سے سونا الگ کرنا۔

تاریخ سبرینہ کا مضمون نہیں تھا مگر اس ملک کی تاریخ کا اُس ملک سے بہت گہرا تعلق تھا، جہاں سے وہ آئی تھی۔

کالج کے ساتھ تزئین اظہر کا بہت دیرینہ تعلق تھا...... دہرہ دون میں بچپن گزارنے والی تزئین اظہر تقسیم ہندوستان سے پہلے بننے والے اس تاریخی کالج کے ابتدائی سالوں کی فارغ التحصیل طالبات میں سے تھیں۔

''پاکستان بنانے والوں نے کیا سوچ کر ایک الگ ملک مانگا تھا؟''

''بعد میں آنے والوں نے اسے کیا بنا دیا؟''

سن سینتالیس میں، پاکستان بننے کے بعد، مسلمان گھرانوں کی جو گنی چنی لڑکیاں کالج کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور جو تزئین اظہر کے بقول، ساڑی پہن کر سائیکل چلالیا کرتی تھیں، بہت بہادر اور ترقی پسند لڑکیاں تھیں..... وہ ایسی لڑکیاں، اس نئے ملک کی تعمیر کے لیے، کس قدر قیمتی رہی ہوں گی۔'' وہ پاکستان کی تاریخ کے تمام اندرونی ابواب سے واقف نہ ہو کر بھی بخوبی اندازہ لگا سکتی تھی۔

اس ملک اور اس میں رہنے والوں کو بہت عجیب انداز سے بہت قریب سے دیکھ لینے کے باوجود وہ ان تمام اچھی باتوں پر بھروسا کرنا چاہتی تھی۔ مسز تزئین اظہر جو اپنے گھنگریالے، سرمئی بالوں میں ہاتھوں سے کنگھی کرتیں...... وہ اس ملک میں اب تک اسے ملنے والی سب سے متاثر کن شخصیت تھیں۔ وہ اسے کالج کی عظمتِ رفتہ کے قصے سناتیں۔ مسز منجلا کماری اور مسز رحیم الدین کے زمانے کی سنہری یادیں تازہ کرتیں...... تعلیم حاصل کرنے کے لیے، اپنے زمانے کی طالبات کی زبردست لگن اور مشکلات کا ذکر کرتیں...... لیکن جو بات انہیں اپنی عمر کے دیگر لوگوں سے ممتاز کرتی تھی، وہ مستقبل سے مایوس نہیں تھیں۔ سبرینہ ان کی مثبت سوچ اور امید بھرے الفاظ کو سنتی حیران ہوتی رہتی...... ان کی باتوں میں، ان کے خیالات میں کہیں بھی وہ پیرانہ سالی، وہ عمر رسیدگی نہیں تھی جو اُن کی دوہری ہوتی کمر اور چہرے اور ہاتھوں کی جھریوں میں نمایاں طور پر جھلکتی تھی۔

سبرینہ سمجھ سکتی تھی...... وہ لڑکیاں کتنی خوش قسمت رہی ہوں گی جنہیں ان سے پڑھنے کا موقع ملتا رہا تھا۔ ہاں لیکن...... آج کے دن اس کے لیے دنیا کی ہر دلچسپی اپنی کشش کھو بیٹھی تھی۔

اس نے اس بھیانک کالی رات کی کسی گھڑی میں، خدا کے بالکل نزدیک جا کر دعا مانگی تھی اور وہ قبول بھی ہوگئی تھی لیکن وہ جانتی نہیں تھی کہ رات سے صبح کرے گی تو دن سے رات کرنا عذاب ہو جائے گا۔

یہ ایک گھنٹا گزرا ہے اب دوسرا گھنٹا گزر رہا ہے، ابھی تین گھنٹے بھی نہیں ہوئے۔ وقت جیسے کسی اڑیل ضدی گھوڑے کی طرح راستے کے بیچ رک گیا تھا اور چابک برسانے پر اور زیادہ اکڑفوں دکھانے لگتا...... وہ تمام دن گھڑی کی سوئیوں پر نظریں جمائے نامعلوم جلاد آہٹوں کی منتظر رہی تھی۔

اور اب پھر...... ایک سیاہ رات اس کے کمرے کے دروازے کے باہر سوال بن کر کھڑی تھی...... کاش اس نے لمحوں کے بجائے عمر بھر کے لیے خدا سے اپنے

قائدِ اعظم کی عظمت

قیامِ پاکستان کے بعد ایک غیر ملکی صحافی نے قائداعظم سے کہا۔ ''آپ کتنے خوش نصیب ہیں آپ نے اپنی قوم کے لیے ایک الگ ملک حاصل کرلیا آپ بانیِ پاکستان ہیں۔'' قائداعظم نے جواب دیا۔ ''میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ پاکستان میری زندگی میں بن گیا لیکن میں بانیِ پاکستان نہیں ہوں۔'' صحافی نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اگر آپ اس مملکت کے بانی نہیں تو پھر کون ہے؟'' قائداعظم نے جواب دیا۔ ''ہر ایک مسلمان۔'' یہ سن کر صحافی بہت حیران اور مرعوب ہوا۔

مرسلہ: رفعت مبین رفی، یو ایس اے

تحفظ کی ضمانت مانگی ہوتی۔

اس رات وہ ضد کر کے اپنے کمرے میں سوئی، کھڑکیاں دروازے اچھی طرح بند کیے حالانکہ وہ جانتی تھی جس خوفناک گھڑی کے آنے کا اسے ڈر ہے اس نے اگر سچ آنے کا ارادہ کرلیا تو یہ تالے، یہ چٹخنیاں کسی کام نہیں آئیں گی۔ وہ سائڈ ٹیبل کا لیمپ جلا کر بستر پر آگئی اور چھت کے گھومتے پنکھے کو گھورتے ہوئے پچھلے اٹھائیس گھنٹوں کے اٹھائیس کروڑ لمحوں میں اٹھائیس ارب دفعہ گزرنے والے اسی بھیانک خوف کو اپنے اوپر سرسراتا محسوس کرنے لگی، جس نے کل سے اس کا خون خشک کیے رکھا تھا اور یہ جان کر اسے مایوسی ہوئی کہ وہ بالکل بھی بہادر نہیں ہے۔

وہ اور ہوتے ہیں جو سکون سے خود اپنے ڈوبتے، ڈوبتے رہنے کا نظارہ کرتے ہیں، آہستہ...... آہستہ...... آہستہ اور آہستہ...... بہت بہادر اور بہت ہی عالی حوصلہ...... وہ مگر اتنا۔ اتنا سارا حوصلہ کہاں سے لائے لیکن وہ رات کوئی انہونی کیے بغیر گزر گئی تھی اور اس سے اگلی رات اور اس سے اگلی والی بھی...... اصولاً

تو اسے سکون کی سانس لینی چاہیے تھی مگر وہ اور بھی بے سکون ہوگئی۔ تمام دن وہ جلے پیر کی بلی کی طرح صبح سے دو پہر تک کلاسیں بدلتی پھرتی اور اسے لگتا، وہ منحوس گھڑی نہایت سفا کی سے دور بیٹھی اس کا تماشا دیکھ رہی ہے۔ خوش فہمیاں پالنے کی اسے عادت نہیں رہی تھی۔ پھر اسے غصہ آنے لگتا...... جس برے وقت کو آنا ہے آخر وہ آ کیوں نہیں جاتا۔ اسے کس چیز کا انتظار ہے؟ کبھی وہ سوچتی...... کیوں نہیں وہ یہ ساری بزدلی چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوتی؟ اس اتنی بڑی دنیا میں کیا اسے چھپنے کے لیے ایک ننھا سا کونا بھی دستیاب نہیں ہوگا؟

اور سوچنے کی بات یہ بھی تھی یہ خیال پہلے کبھی اتنی شدت سے کیوں نہیں آیا؟ پھر وسوسے اس کا راستہ گم کرنے لگتے، اسے فرار کی ہر کوشش بے فائدہ لگنے لگتی۔ اسے شک تھا...... فاروق شاید کسی زیرک شکاری کی طرح اونچی مچان پر بیٹھ کر شکار کے دام میں آنے سے پہلے کی بوکھلاہٹ کا مزہ لے رہا ہے اور اسے یقین ہو کہ شکار چاہے کتنا ہی تیز دوڑے...... کتنا ہی آگے نکل جائے...... وہ رسی کا حقیر پھندا پھینک کر اسے پل میں قابو کر لے گا۔

☆☆☆

"May I come in Ma,m?"

کسی نے جالی کے دروازے سے ناک چپکا کر اسے پکارا تھا۔ وہ ابھی اپنے دھلے ہوئے کپڑے برآمدے میں تنی رسی پر پھیلا کر کمرے میں آئی ہی تھی۔ اس نے گھوم کر دیکھا اور گردن کی ہلکی سی جنبش سے لڑکی کو اندر آنے کا راستہ دیا۔

وہ اس دفعہ کے بیچ کی ہاسٹل آنے والی ان دو نئی طالبات میں سے ایک تھی۔ جن کی انگریزی بولنے سے جان جاتی تھی۔ وہ جب بھی آتی، اپنا کوئی نہ کوئی مترجم ساتھ لاتی تھی۔ وہ لاہور کے کسی نواحی علاقے سے آئی تھی اور آمد و رفت کا کوئی ذریعہ نہ ہونے یا شاید کسی اور مسئلے کی وجہ سے ہاسٹل میں رہنے پر مجبور ہوئی تھی۔ مگر جس دن سے آئی تھی ہاسٹل اس کے لیے عذاب بنا ہوا تھا۔

شاید وہ اپنے گھر والوں سے اتنی قریب تھی کہ ہاسٹل کی زندگی سے سمجھوتا نہیں کر پا رہی تھی۔ سبرینہ جب بھی اسے دیکھتی، اس کی آنکھیں روئی روئی اور چہرہ سرخ ہو رہا ہوتا۔ وہ جتنا چاہتی تھی کہ اس کا وارڈن سے واسطہ نہ پڑے، اتنا ہی اس کے کام سبرینہ کے پاس اٹکے رہتے تھے۔ وہ ہر بار کسی ساتھی طالبہ کو ساتھ لے کر آتی تھی۔ اس کے کان میں وہ اپنا مسئلہ بتاتی اور ساتھی طالبہ مستعدی سے انگریزی ترجمہ اگلنے لگتی۔

"میم یہ کہہ رہی ہے، اس کے ہاسٹل کے بلیو کارڈ پر اس کے بھائی کے دستخط ہوتے رہ گئے ہیں...... اب یہ ویک اینڈ پر گھر کیسے جائے گی؟ اسے ہاسٹل سے گھر لے جانے کے لیے صرف اس کا بھائی ہی آ سکتا ہے۔" وہ تھوڑی دیر رک کر پھر بولی۔

"میم...... اسے اپنے فزیکل ایجوکیشن کے یونیفارم کے لیے اپنے گھر فون کرنا ہے، کیا آپ اسے ساتھ لے جا کر کالج کے باہر کہیں سے فون کروا دیں گی؟ آج اسے یونیفارم نہ ہونے کی وجہ سے جرمانہ ہوا ہے۔ دراصل کالج سے فون نہیں ہوسکتا، مسٹر چوہدری کے پاس فون کے ٹوکن ختم ہوگئے ہیں۔" وہ دونوں لڑکیوں کے پیغامات سنتی، مسئلے حل کرتی رہتی...... اس نے کبھی یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ اسے لڑکی کی کوئی بات سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی۔

اس نے دیکھا آج وہ اکیلی آئی تھی۔

لڑکی اس کے اشارے پر کرسی سنبھالتے محتاط انگریزی میں بولی۔

سبرینہ نے اپنی کرسی سنبھال لی پھر میز پر رکھے کاغذات کی ترتیب درست کرتے ہوئے بڑے غور سے اسے دیکھا۔ وہ گھبرائی ہوئی نہیں لگ رہی تھی جیسے آج اپنے سارے مسئلے خود ہی حل کرنے کا تہیہ کر کے آئی ہو۔ ہمیشہ کی روئی روئی آنکھیں بھی آج کچھ روشن روشن سی تھیں۔

اس نے کارڈز کے ڈھیر کے نیچے سے اپنا مطلوبہ کاغذ تلاش کر کے سیدھا کیا۔

"میں نے یہ پوچھنے کے لیے تمہیں بلایا ہے کہ

مجھے سمجھ نہیں آئی، یہ کیا ہے؟'' اس نے ایک کاغذ اس کے سامنے لہرایا۔

لڑکی ذرا سا ہچکچائی...... جیسے کچھ غلط کہنے سے ڈرتی ہو۔ پھر بولی۔

''دراصل میم...... میں اپنے گھر واپس جانا چاہتی ہوں۔''

''کیا تم جانتی ہو......؟ سبرینہ نے اسے سمجھانا چاہا۔'' ایک بار تم نے ہاسٹل چھوڑ دیا تو تمہیں دوبارہ یہاں جگہ نہیں مل سکے گی۔ کیا مسئلہ ہے تمہیں یہاں...... مجھے بتاؤ؟''

لڑکی نے اپنے ہاتھ مسلے اور سبرینہ کو محنت سے یہ سمجھانے کی کوشش کرنے لگی کہ وہ ہاسٹل کی زندگی سے مر کر بھی خود کو ہم آہنگ نہیں کر پائے گی۔

''وہی تو میں جاننے کی کوشش کر رہی ہوں کہ کیوں......؟'' اسے لگا وہ خواہ مخواہ ہی بحث کر رہی ہے۔

''تم اپنا مسئلہ سمجھاؤ گی نہیں تو ہم اسے کیسے حل کریں گے۔'' لڑکی کچھ دیر سر جھکائے رہی پھر بالکل صاف انگریزی میں بولی تھی۔

''میں آپ کو سمجھا نہیں سکتی میم، یہ بہت عجیب سی بات ہے، دراصل میں اپنے گھر سے دور نہیں رہ سکتی۔''

''اور یہ تو میں سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ کیوں؟''

سبرینہ کی آواز بلند نہیں ہوئی تھی مگر لڑکی سمجھ گئی تھی کہ میم اب غصے میں آ رہی ہیں۔ اس کے بالوں کی چھوٹی چھوٹی لٹیں چھت کے گھومتے پنکھے کی آزمائش سے بے قابو ہو رہی تھیں۔ پھر اس نے لڑکی کو پہلے سے قدرے کمزور انداز میں وضاحت کرتے سنا۔

''دیکھیں...... میم! میں رات دس بجے کے بعد اپنی پڑھائی شروع کرتی ہوں اور یہاں رات دس بجے ساری لائٹس آف کر دی جاتی ہیں...... اور مجھے کسی کے ساتھ ایک کمرے میں رہنے کی عادت نہیں ہے۔'' وہ بتاتی جا رہی تھی۔

''ہاسٹل کا ماحول میرے گھر سے مختلف ہے... اور...... میں اپنے گھر کے بغیر جی ہی نہیں سکتی۔''

وہ رک رک کر یہاں نہ رہنے کے سبب بتاتی چلی گئی۔

سبرینہ نے اپنے سامنے میز پر رکھا رجسٹر بے سبب ہی کھولا تھا۔ پتا نہیں کیوں...... اسے شبہ ہوا وہ لڑکی اسے چڑانے کی کوشش کر رہی ہے۔

''میں اپنے گھر کے بغیر نہیں رہ سکتی، گھر....... ہونہہ۔''

لیکن لڑکی حیران رہ گئی تھی۔ میم سبرینہ نے اگلا فقرہ زبردست اردو میں ادا کر کے دھماکا کر دیا تھا۔

''ہاں لیکن اپنے مستقبل کے لیے اپنی پڑھائی کے لیے ایسی چھوٹی چھوٹی قربانیاں تو دینی پڑتی ہیں۔''

لڑکی منہ کھول کر حیرت کا بہ آواز اظہار کرنے کے بجائے اچانک ہی خوش ہو گئی تھی۔

سبرینہ نے خود کو اس کے چہرے پر پھیلنے والی روشنی سے اور بھی چڑتے ہوئے محسوس کیا۔ اب وہ اسے ہاسٹل قوانین کے جن دکھا، دکھا کر ڈرا رہی تھی۔

''تم نے تین دن پہلے سے اطلاع نہیں دی تھی کہ تم ہفتے کے درمیان میں ہاسٹل سے گھر جانا چاہتی ہو۔ ہاسٹل کے قوانین میں نے نہیں بنائے۔ جس نے بنائے ہیں ان کے پاس جا کر اعتراض کرو۔'' وہ چڑ کر بولی تھی۔

''اگر ہاسٹل کی رُولز بک تم نے نہیں پڑھی تو میرا کیا قصور......؟'' وہ ٹپ ٹپ آنسو بہاتی لڑکی، وضاحتیں کرتی ہلکان ہو رہی تھی۔ وہ فوری طور پر اپنے گھر اس لیے جانا چاہتی تھی کہ صرف چند دن کے لیے خود گھر سے روز کالج آ کر دیکھ سکے، آیا وہ تنہا پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کر سکتی ہے یا نہیں، اس کے بعد وہ ہاسٹل سرے سے ہی چھوڑ دے گی۔

مگر سبرینہ کسی بدمزاج ہیڈ مسٹریس کی طرح ''نہ'' ''نہ'' کرتی کچھ بھی سننے پر آمادہ نہیں تھی۔

آخر لڑکی تھک کر چپ ہو گئی۔ اب وہ ہاتھ کی پوروں سے اپنے آنسو صاف کر رہی تھی۔ سبرینہ کا دل افسوس سے بھر گیا...... اتنی معصوم سی لڑکی کو رُلا کر وہ دراصل کس چیز کا بدلہ، کس سے لینا چاہتی ہے۔ پھر وہ چھوٹی سی لڑکی یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ جتنی ضدی سی

بن کر میم سبرینہ اتنی دیر سے مسلسل انکار کیے جارہی تھیں...... اتنے ہی آرام سے وہ مان بھی گئیں۔ انہوں نے اسے گھر جانے کی اجازت دینے کے ساتھ، ساتھ اچھی سی مزیدار سی کافی بھی بنا کر پلائی تھی۔

☆☆☆

وہ بدمزاج بوڑھیوں کی طرح ہر ایک سے الجھنے لگی تھی۔ صبح سے دوپہر تک پیریڈ کی گھنٹیوں کے تعاقب میں، ایک سے دوسرے کلاس روم میں جانا، اسے مشکل ہو رہا تھا۔ وہ ان دنوں اپنی اسٹوڈنٹس کو کیا پڑھا رہی تھی اگر اتنی الجھی ہوئی نہ ہوتی تو اپنا محاسبہ ضرور کرتی۔

اور وہ ایسا ہی اکتاہٹ بھرا دن تھا جس میں سونیا بروں سے اس کی جھڑپ ہوتے ہوتے بچی...... اینڈریا اس کے عجیب وغریب موڈ سے تنگ آکر لڑ پڑی تھی اور اس اداس سی روئی روئی آنکھوں والی لڑکی کو چڑیا کی طرح چہچہاتے، اپنی ماں کے ساتھ ہاسٹل سے رخصت کرتے، اس کی آنکھیں خواہ مخواہ گرم پانیوں سے بھر رہی تھیں۔ اس نے شدید رشک سے اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ اپنے محبوب گھر کو روانہ ہونے والی شادمان و فرحاں لڑکی کو دیکھا۔ جس نے زمانے کی مشکلات پر لعنت بھیج کر، اپنے گھر اور اس میں رہنے والوں کو اپنے لیے چن لیا تھا۔

لیکن اسے پتا نہیں، اتنی تکلیف کس بات پر ہو رہی تھی۔ وہ ساری شام قیمتی گاڑیوں میں آنے والے والدین اور ہاسٹل میں رہنے والی بیٹیوں کی ملاقات کے مناظر دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہی...... اور سب سے زیادہ تکلیف اسے تب ہوئی، جب وہ لمبا سفر کر کے آنے والوں کے گلے میں جھولتی، خوشی سے چلاتی، کالج کے قصے سناتی، ہاسٹل کی کم عمر طالبات کو دیکھ کر حسد محسوس کر رہی تھی۔ محبت اور فکر کا اظہار کرتے، حال چال پوچھتے، کالج کی سرگرمیوں کی روداد سنتے والدین...... ہنستے کھلکھلاتے بہن بھائی...... کچھ ماڈرن کچھ دیہاتی، درمیانی عمر کی مائیں...... سوٹ بوٹ والے، شلوار قمیص والے باپ...... سب کے معاشی درجے، اس ملک کی اس کلاس کے نمائندگی کرتے تھے، جن کا بڑا حصہ تزئین اظہر کے بقول قومی خزانے میں چند فیصد ہی ٹیکس جمع کروا پاتا ہے۔

وہی کلاس جسے ٹھوکر مارنے میں اسے کچھ تاخیر ہوگئی تھی۔ لیکن معاشی درجہ بندی سے پرے وہ سب ایک دوسرے سے جڑے...... محبت بھرے رشتے تھے اور یہ صاف ظاہر تھا۔

اسے شدید احساسِ کمتری ہوا۔ کتنے عرصے سے وہ اپنے آپ کو مضبوط کر رہی تھی۔ کتنے عرصے پہلے اسے لگا تھا اس نے خود کو سمجھا لیا ہے...... مگر یہ سچ بھی، کبھی بالکل برداشت نہیں ہوتا...... کہ کسی کو یہاں اس جگہ اس سے ملنے نہیں آنا تھا۔

اپنے باپ کو تو وہ اپنی سرکشی کی قبر میں دفن کر آئی تھی اور......

''ایما...... ایما کیا کر رہی ہوگی اس وقت......؟''

اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ وہ دھاکوں میں گھرے، چکنا چور کھڑکیوں والے، کسی پھٹے پرانے اسپتال کی آپریشن ٹیبل پر تکلیف سے کراہتے، درد سے چلاتے انسانوں کے زخم سی رہی ہوگی۔

کسی عظیم جدوجہد کے زخموں سے چور چور سپوت کی تکلیف اپنے ہاتھوں سے چنتے اسے ایک لمحے کو بھی یہ سوچنے کی فرصت نہیں ملی ہوگی کہ اس کی بہن دنیا کے کس نامعلوم کونے میں زندگی کے کن عذابوں میں گھری، اسے یاد کر رہی ہے...... آنسو پینے کی زبردست کوشش میں، اس کا گلا بری طرح دکھ رہا تھا۔

اور یہاں آنا ہی کسے تھا...... سوائے اس بے رحم گھڑی کے...... جو قیامت کے کئی دن گزار کر بھی آ نہیں رہی تھی۔

ملاقات کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ آنے والے مہمان اپنی منزلوں کو روانہ ہونے والے تھے...... وہ ہاسٹل واپسی کے ارادے سے کالج کے مین آفس کے باہر پڑے میز کرسی سے اپنا سامان اٹھا کر پلٹ رہی تھی کہ اسے لگا...... اس کا وہم سچا ہو گیا ہے۔

(باقی آئندہ)



اے عمرِ رواں آہستہ چل

عاشفہ مسعود

چالیس کا سنگِ میل عبور کیے چند ہی دن ہوئے تھے۔ ایک روز صبح جلدی آنکھ کھل گئی۔ باتھ روم میں آئینہ دیکھا۔ شکل کچھ عجیب سی محسوس ہوئی۔ شاید بہت عرصے بعد فرصت سے آئینے کے روبرو ہوئے تھے۔ ٹوتھ برش وہیں چھوڑا اور بار بار غور کیا۔ چُندھی آنکھیں کھول کھول کر دیکھا۔ کچھ سمجھ نہ آیا شکل شریف کیوں اتنی باسی سی لگ رہی ہے۔ جیسے فریج میں سبزیوں کے نیچے کسی کونے کھدرے میں رہ جانے والی مولی گاجر......دل کو تسلی دی شاید باتھ روم میں روشنی کم ہے۔ اصل میں جیسے جیسے بجلی کے نرخوں میں اضافہ ہو رہا ہے انرجی سیور کی وولٹیج کم ہو رہی ہے۔

چھوٹا آئینہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکالا۔ کھڑکی کھول کر

ٹیرس پہ آگئے۔ بند گھروں میں رہنے کی وجہ سے دن کی روشنی میں شاید برسوں بعد اپنی شکل دیکھی۔ ایک تو سورج کی روشنی دوسرے آئینہ بھی وہ کم بخت جو شکل کو بڑا کر کے دکھائے۔ چہرہ غور سے ملاحظہ کیا تو حواس گم ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔

''یا الٰہی یہ ہم ہیں یا کوئی دکھیاری ادھیڑ عمر عورت......'' آنکھوں کے کونوں پر دو لائنیں...... بھیتری آنکھیں پٹپٹائیں لائنیں جوں کی توں...... دور کی نظر بھی کم زور ہے اور عینک کے بغیر آئینہ بھی شاید عرصے بعد دیکھا تھا۔ آنکھوں کے نیچے باریک باریک لکیریں غور سے دیکھنے کے لیے آئینہ منہ کے قریب کیا تو جلد کے کھلے مسام کھلے مین ہول لگے۔ ہونٹوں کے اطراف کی لکیریں گہری بلکہ مستقل سی ہوگئی تھیں۔ دوھری ٹھوڑی...... یا اللہ گزشتہ پندرہ بیس سال سے وزن سو پونڈ سے کم ہی رکھنے کے لیے کیا کیا جتن نہ کیے کیسے کیسے کھانے چھوڑ کر تقریبات اور شادیوں میں صرف سلاد اور ایک آدھ بوٹی پر گزارہ کیا اور مشروبات سے یوں پرہیز کیا جیسے سچ مچ ام الخبائث ہو۔ شادیوں میں جہاں کولڈ ڈرنک کی نہریں بہہ رہی ہوتی ہیں کیونکہ مائیں بچوں سے پکڑ پکڑ کر کرسیوں کے نیچے رکھتی جاتی ہیں اور پھر خود ہی اپنے ہلنے جلنے سے گرا دیتی ہیں۔ ایسے میں بہت جی للچاتا تو بچے سے ایک آدھ گھونٹ لے لیا۔

''لاؤ دیکھوں تو زیادہ ٹھنڈا تو نہیں۔'' دل کو شدید دھکا لگا۔ غم کے اثرات جب چہرے پر پہنچے تو ماتھے پر باریک، باریک لکیروں کا جال بچھ گیا۔ دل ڈوبنے لگا۔ درو دیوار گھومتے نظر آئے۔ دل چاہا دنیا بھر کے تمام آئینے نہ سہی پر گھر بھر کے تو ضرور توڑ دیں۔ اور چیخ چیخ کر روئیں۔ رونا اگر مسئلے کا حل ہوتا تو شدتِ غم سے دیواروں پر ٹکریں مار مار کر روتے...... مگر اے تیسری دنیا کی مجبور عورت تجھے ابھی ہمت کر کے اٹھنا ہے۔ ''ان'' اور بچوں کو رخصت کرنا ہے۔ تیرے پاس اپنی ذات کا غم منانے کی فرصت کہاں۔ تجھے تو شاید جب فرشتہ اجل بھی لینے آئے تو کہنا پڑے۔ ''بھائی ایک منٹ ٹھہرو بچہ ذرا باتھ روم میں ہے اسے دھولیں۔'' ''ان'' کو کہیں ہم دنیا سے جارہے ہیں تو فرمائیں گے ایک کپ چائے دیتی جانا اور دروازہ بند کر دینا میرا ابھی اٹھنے کا موڈ نہیں۔ تھوڑی دیر بعد اٹھوں گا تمہارے مرنے کی دو چار چھٹیاں تو کرنی پڑیں گی۔'' بہر حال حواس مجتمع کیے اندر آ کر ان کو غور سے دیکھا کہتے تو ہم بھی ان کو موصوف ہی ہیں لیکن اگر موصوف کے تخاطب سے لکھتے تو کچھ قارئین جو ہماری طرح مصنفہ کا نام پڑھے بغیر پڑھنے کی عادی ہیں کسی مزاح نگار کا سمجھ کر سوچتیں اس مرتبہ انہوں نے کچھ ماٹھا سا لکھا ہے۔ اپنے ''ان'' کا ظالم نظروں سے ایکسرے کیا تو معلوم ہوا بدلے بدلے میرے سرکار نظر آتے ہیں۔ حالت تو اُدھر بھی کچھ پتلی سی ہے۔ وہ زلفیں جو کنگھا کرنے کے بعد ماتھے پر جھولتی تھیں پیچھے ہٹی ہوئی تھیں۔ چندیا کچھ خالی، خالی سی نظر آرہی تھی اور شکل پر بھی بڑھاپے کے آثار وجیہہ جوان کے بجائے انکل انکل سے لگے تو دل کو کمینی سی تسلی ہوئی۔ اس دشت میں ہم تنہا داخل نہیں ہوئے۔

اصل میں ان کی اور ہماری عمر میں تین سال اور بارہ دن کا فرق ہے۔ بڑا کون ہے آپ خود اندازہ لگائیں شاید اس طرح ہمیں کچھ مارجن مل جائے۔ ہم دونوں ہی سنگل پسلی اور عمر چور بلکہ ڈاکو دونوں کو ہی چھوٹا بننے کا مراق...... یہ مراق کیسے پیدا ہوا اس کی ایک الگ داستان ہے۔ جب ہماری شادی ہوئی تو ساتھ ہی ہمارے جیٹھ کی بھی شادی ہوئی۔ وہ دونوں ماشاء اللہ کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں...... شاید ہم دونوں کا وزن ملا کر بھی ان میں سے ہر ایک سے کم ہو اس لیے ہم سب کو چھوٹے، چھوٹے لگے بیوٹی پارلر پر ایک خاتون گویا ہوئیں۔

''آج کل ماؤں کو آخر آگئی ہوئی ہے ان کا بس نہیں چلتا ورنہ پیدا ہوتی کو ہی بیاہ دیں۔'' شادی کے بعد ہمسائیوں سے میل ملاپ ہوا یا ٹیرس پر سے کسی سے ہائے ہیلو سوال ہوا۔

''بیٹا کون سی کلاس میں پڑھتی ہو، ہائے سچ مچ شادی شدہ ہو یقین نہیں آتا۔''یہ فقرے دس بارہ سال تو اتر سے سنتے رہے۔ اب چند سال سے ان کی گونج کچھ کم ہوتی جارہی تھی۔ لیکن اب بھی کوئی نہ کوئی معصوم پوچھ ہی لیتا۔''کیا آپ کی شادی ہوگئی؟''تو دل چاہتا ہے جھٹ اس کی بلائیں لے لیں۔ دل کئی دن تک سرشار سار رہتا۔ جب پہلی پریگننسی میں ڈاکٹر کے پاس گئے تو سوال ہوا ''شادی شدہ ہو؟''جھٹ بولے اگر شادی نہ بھی ہوئی ہوتی تو آپ کے سامنے خود کو شادی شدہ ہی ظاہر کرتے۔ کافی شرمندہ ہوئیں۔ جب بھی بچوں کی نئی کلاس ٹیچر سے ملے یا رزلٹ لینے گئے یہی سوال ہوا۔ چوتھے بچے تک لوگ پوچھتے رہے۔''کیا پہلا بچہ ہے؟''ایک دو مرتبہ تو ہم نے کہا بھئی پلیز ایک بار پھر کہیں ہم نے موبائل میں فیڈ کر کے میاں کو سنانا ہے۔ کچھ یہی حال ان کا بھی رہا۔ ہم کہیں گئے یا کوئی مہمان پہلی مرتبہ ہمارے ہاں آیا۔ ہم ہمیشہ ان کے جانے کے بعد خوش ہوتے رہے۔ جب کبھی اپنے کلاس فیلوز کو ملتے آپس میں ایک دوسرے کو دکھا کر دونوں ہی خوش ہوتے۔ وہ جو موٹی سی آنٹی ہیں اورنج سوٹ میں یہ ہمارے ساتھ کالج میں ہوتی تھیں۔ یا وہ جو موٹا سا گنجا سا ہے میرا ہاسٹل فیلو تھا۔ باہر بھی ان کا یہی حال تھا۔ ہر نئی جگہ نیا اسٹاف پوچھتا''سر آپ کی شادی ہوگئی ہے۔''جب بتاتے میرا بڑا بیٹا او لیول میں ہے تو لوگ حیرت کا اظہار کرتے۔ خیر اپنی اپنی جگہ پر ہم دونوں کا یہی خیال تھا ہم ہمیشہ یونہی جوان رہیں گے۔ مگر اب سارا دن عجیب پریشانی میں کٹتا۔ صبح صبح منکشف ہونے والی افتاد کے بارے میں سوچتے رہے۔ کبھی اپنے آپ کو کوستے کاش کوئی نائٹ کریم ہی استعمال کرتے رہتے آخر ساری دنیا کرتی ہے، کوئی نہ کوئی تو فائدہ ہوتا ہی ہوگا۔ ایسی بھی کیا سستی اور بے پروائی۔ کبھی پارلر ہی چلے جاتے آخر رسالوں میں کوئی ایسے تو نہیں لکھا ہوتا ہے کہ تیس سال کے بعد فیشل باقاعدگی سے کروانا چاہیے۔ ہم نے تو شادی کے وقت میک اپ کے علاوہ کبھی پارلر کی شکل ہی

نہیں دیکھی تھی۔ کبھی دل کو تسلی دیتے۔ زمانہ کافی ترقی کر گیا ہے کوئی نہ کوئی طریقہ تو ہوگا۔ شوبز والے بھی آخر کچھ نہ کچھ تو کرتے ہی ہیں۔ پھر خیال آیا ایک چکر پارلر کا بھی لگا لیں۔ بھویں بنوائیں جو عینک لگانے کی وجہ سے نہیں بنواتے۔ فیشل کروا کر بال چھوٹے کروالیں۔ شاید شکل پر کچھ فرق پڑ ہی جائے۔ معلوم کرنے پر پتا چلا اچھے پارلر سے یہ سب کروانے پر کافی خرچہ آتا ہے۔ انہوں نے جو خرچا پچھلے پندرہ سالوں سے نہیں کیا ایک دم کرنے پر کیسے آمادہ ہوں گے۔ کنجوس ابنِ کنجوس ہیں...... خیر اللہ کا نام لے کر فون کر کے پوچھا۔ بولے "مہینے کا آخر ہے کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ اکٹھے پانچ ہزار......" گویا پانچ لاکھ مانگ لیے ہوں۔ پھر سوال کیا ......"کیا یکم کے بعد مل جائیں گے؟"

"نہیں اس مرتبہ بچوں کی فیس دینی ہے۔ ویسے تمہیں بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی۔ کیا کسی ایڈ میں کام مل گیا ہے۔ جیسی ہو ویسے ہی گزارہ کرو۔"

اور کھٹ سے فون بند...... دل میں وہموں کی یلغار ہوگئی۔ یقیناً کوئی نہ کوئی چکر ہوگا جو یہ چاہتے ہیں کہ ہم بوڑھے لگیں۔ کوئی نئی اسٹاف یا کوئی ڈاکٹر کوئی؟ خیر رات کو بہانہ بنا کر پوچھیں گے۔ ہمارے ساتھ گائنی کا کوئی مسئلہ ہے، کوئی اچھی ڈاکٹر نظر میں ہو تو بات کروائیں۔ ظاہر ہے جو آج کل اچھی لگ رہی ہوگی اسی کا خیال آئے گا اور ان کی سلام دعا سے ہم کچھ نہ کچھ اندازہ لگانے کی کوشش کریں گے۔ ویسے تو ہمارے سامنے آنے والے فون کو یا تو کاٹ دیتے ہیں یا کہتے ہیں کہ پھر بات کروں گا۔ اس وقت ذرا مصروف ہوں۔ فون پر کوڈ لگا ہوا ہے۔ بچوں کا بہانہ کر کے کہ ہر چیز انہیں دکھانے والی نہیں ہوتی۔ ویسے فون کا اس طرح خیال رکھتے ہیں جیسے ماں، اپنے تو زائدہ کا...... رات کو بھی سوئے، جان کر ہاتھ لگانے کی کوشش کرو تو فوراً تڑپ کر اٹھیں گے کیا ہوا؟ ایسے میں فون اپنے ہاتھ میں لینے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا۔ میرے فون میں بیلنس نہیں ایک ضروری کال کرنی ہے۔ بادلِ نخواستہ دے تو دیں گے مگر ساتھ ہی پھیرے لینے شروع کر دیں گے۔ "جلدی فارغ کرو مجھے ذرا باہر جانا ہے۔" ایسے میں دکھاوے کے لیے ملائی ہوئی کال پر بھی ٹھیک طرح سے بات نہیں ہوتی۔ فون پر کیا خاک چیک ہوگا۔

جلد ہی اس کا توڑ بھی تلاش کر لیا گیا۔ ایک عام سادہ سا فون جس میں ہمیشہ بیلنس ہوتا...... اس پر ایک لطیفہ یاد آیا۔

میاں تڑپتے ہوئے "جلدی سے ڈاکٹر کو فون کرو۔ مجھے لگتا ہے ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔" بیوی فون ہاتھ میں لیتے ہوئے "میرے پاس تو بیلنس نہیں جلدی سے اپنا کوڈ بتاؤ۔"

میاں "ٹھہرو، ٹھہرو، مجھے لگ رہا ہے میں ٹھیک ہو رہا ہوں۔"

ایک دن کسی دوست کی فوتگی سے واپس آئے تو عجیب سی کیفیت میں بولے۔

"ایک وعدہ کرو اگر میں خدانخواستہ تم سے پہلے فوت ہو گیا تو اللہ نہ کرے تو میرا فون ایسے ہی نہر میں پھینک دینا۔" ہم نے آواز میں رقت بھرتے ہوئے کہا اپنی طرف سے پوری کوشش کریں گے وعدہ نہیں کرتے ایک دم سے اتنے خرچ ہوں گے مجبوری میں بیچنا بھی پڑ سکتا ہے۔ سن کر چپ ہو گئے چند دن بعد پچاس ہزار ہاتھ میں دیتے ہوئے فرمایا یہ پیسے بہت سنبھال کر رکھو کبھی ایمرجنسی ہو سکتی ہے۔ تب سے ہم ہر نئے فون کی آمد پر یاد دلاتے ہیں کہ یہ فون تو مہنگا ہے۔ تو مزید پیسے مل جاتے ہیں۔ اللہ کرے جلدی سے ایک اور اچھا سا فون لیں تو ہماری سونے کی چوڑیاں آجائیں گی جو کب سے پسند ہیں۔

خیر رات گئے تک ہماری گرما گرم بحث ہوتی رہی اور انہوں نے ہمارے کپڑے، جوتے اور ہم نے ان کے موبائلز کے بل اور ہوٹل کے خرچے گنوائے۔ آخر کار تھوڑے سے پیسے حاصل کرنے میں کامیابی ہو ہی گئی۔ صبح ہی جا کر بال چھوٹے کروائے۔ مختلف رسالوں میں پڑھی تراکیب ذہن میں لائے۔ انڈے،

دہی، شہد، جو کا آٹا سب کے باری باری ماسک لگائے تاکہ تھوڑے فریش لگیں۔ پھر نہا کر بہن سے مانگ کر لایا چھوٹی آستینوں اور چھوٹی شرٹ ٹراؤزر والا نئے فیشن کا سوٹ پہنا۔ اکلوتی میک اپ کی چیز لپ اسٹک لگا کر دل کو تھوڑی تسلی ہوئی ابھی ڈولے (گرے) بیروں کا کچھ نہیں بگڑا۔ شام کو انہوں نے بھی کل کی لڑائی کی تلافی یا پھر اپنے پیسے پورے کرنے کے لیے ترچھی سی نظر ڈالتے ہوئے اپنا فرض پورا کیا۔ ”بال کٹوا کر چھوٹی لگ رہی ہو۔“ دل کو کافی ڈھارس ہوئی۔ جو چند روزہ ثابت ہوئی۔ ایک صبح جب اپنے چھوٹے بیٹے کو اسکول بیگ پہنا رہے تھے ایک ڈیل ڈیل سائیکل والا بولا۔ خالہ جی ذرا بچنا۔ پھر وقفے وقفے سے آنے والے فقرے اتوار بازار کے فضول دکاندار......

”خالہ جی یہ لیں...... آنٹی جی بات سنیں۔“ پھر تو گھر والے بھی ہمارے زخموں پر نمک پاشی کرنے لگے۔ چھوٹا بیٹا ساتھ لیٹا ہوا ہمارے بالوں سے کھیل رہا تھا۔ دو چار سفید بال نظر آئے تو بولا۔ ”اماں آپ تو بڈھی ہوگئی ہیں۔“ ایک دن بڑے والے نے پوچھا ”کیا آپ کے بچپن میں آئس کریم ہوتی تھی۔“ یا اللہ کیا ہم پتھر کے زمانے کے لوگ ہیں۔

میری امی بچوں کو نماز کے لیے ڈانٹ رہی تھیں۔ ساتھ ہی ہمیں لپیٹتے ہوئے بولیں۔

”اب تم اور کس زمانے میں فجر کی نماز پڑھو گی۔ اب عمر ڈھل رہی ہے کچھ تو خدا کا خوف کرو۔“ یا اللہ کیا...... ہم اتنے بوڑھے ہوگئے ہیں۔ ایک دن یہ میرے لیے سوٹ لائے ساس بولیں۔ ”ہیں یہ تم اس کے لیے سرخ سوٹ لائے ہو۔“ جیسے یہ خود ان کے لیے سرخ سوٹ لے آئے ہوں۔ حالانکہ ان کو سرخ اور گلابی رنگ کے علاوہ کسی اور رنگ کا پتا ہی نہیں۔ ایک دن تو حد ہی ہوگئی۔ ہماری چھوٹی بہن کے رشتے کے سلسلے میں کچھ لوگ آئے ہوئے تھے۔ ہم حسب معمول گندے مندے پھر رہے تھے۔ فوراً بڑی سی چادر اوڑھ کر اندر چلے گئے۔ پوچھا گیا ”کیا آپ لڑکی کی ماں ہیں؟“ دل چاہا کولڈ ڈرنک میں زہر ملا دیں۔ یا اللہ تمام دنیا کی آنکھوں کو کیا ہوگیا ہے۔ سب نے آخر ہمارا دل جلانے کا ٹھیکا کیوں لے رکھا ہے۔

غور کیا تو پتا چلا ہمارے ”ان“ کا بھی حال ہم سے زیادہ فرق نہیں۔ ایک دن تیل کی بوتل اٹھا کر بولے ”ذرا تیل تو لگا دو۔ بال گر رہے ہیں۔“ جب مالش کروا کے دل کو تسلی ہوئی تو بولے۔

”آج ایک مریضہ جس نے پرچی پر اپنی عمر پینتیس سال لکھوائی بولی انکل۔ میرا دل تو غصے سے کھول اٹھا۔ لگ رہا تھا بی پی شوٹ کر جائے گا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ زہر کا ٹیکا لکھ دوں اگر ایمان ملک اور ہما وسیم کی وجہ سے ڈاکٹروں کی شامت نہ آئی ہوتی تو قسم سے یہی کرتا تھا۔“ چند دن ہوئے اپنی کپڑوں کی الماری شاید زندگی میں پہلی مرتبہ کھول کر کھڑے تھے۔

”ہم نے پوچھا کیا چاہیے؟“ بولے۔

”ایک بھی ڈھنگ کی شرٹ نہیں...... کس قسم کے عجیب مرے مرے سے رنگ ہیں۔“ ہم اس حال سے گزر چکے تھے فوراً اندازہ ہوا دل پر چوٹ لگی ہے۔ ٹھنڈا پانی پلانے کے بعد ہم نے پھر پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“ کہنے لگے۔

”آج تو حد ہی ہوگئی۔ کلینک کے ساتھ والے دکاندار سے سلام دعا ہے۔ آج بولا سر میرے سسر کو کوئی نوکری دلوا دیں۔ پوچھا کتنی عمر ہوگی تمہارے سسر کی؟ فوراً بولا سر کچھ زیادہ نہیں تقریباً آپ کی جتنی ہوگی چند سال پہلے فوج سے ریٹائرڈ ہوا ہے۔“ اسی شام ہماری ایک رشتے کی بھانجی اسلام آباد سے آئی ہوئی تھیں۔ اپنی گڑیا کو ”ان“ کی گود میں ڈال کر بولی ”جاؤ بیٹا نانا پاس......“ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ قاعدے میں بنی ض سے ضعیف کی شکل آنکھوں کے سامنے آگئی۔

خیر اس کے بعد کچھ دن تک ہم دونوں الجھے الجھے رہے۔ جی بھر کر اوٹ پٹانگ حرکتیں کیں۔ یہ بھی میرون کالی گہرے گہرے رنگوں کی شرٹس لا لا کر الماری

میں رکھتے رہے۔ نکال کر پہن کر خود کو آئینے میں دیکھتے اور اتار کر کوئی ہلکے رنگ کی شرٹ پہن لیتے۔ بالوں کا اسٹائل چینج کیا۔

ہم بھی جس کو فریش دیکھتے فوراً اس کی لپ اسٹک کا نمبر اور برانڈ پوچھتے۔ کوئی بہن یا بھائی جن کپڑوں میں کھلی کھلی لگیں۔ سوٹ ادھار مانگ لیتے کچھ بالوں کی لٹ کاٹی...... تو کبھی بال کھول کر ٹوپی سر پر رکھی۔ اپنی عادت کے برعکس گہرے رنگوں کے جدید ڈیزائن کے کپڑے سلوائے تاکہ لڑکی لڑکی لگیں۔ یہ بھی کرشمہ سے ہوتے ہوئے کترینا تک آئے۔ ہمیں بھی رنبیر کپور بھانے لگے۔ اب بھی ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا کبھی کبھار چھو ہی لیتا ہے۔ ہیا پنی کولیگ کے ساتھ کسی نئے اسپتال گئے۔ وہ محترمہ ابھی تک غیر شادی شدہ ہیں۔ لیکن خاصی یکم شہیم...... وہاں کسی نے ان سے پوچھا آپ اپنے بیٹے کے ساتھ آئی ہیں۔ ''ان'' کو مارے خوشی کے دو دن تک نیند نہیں آئی۔ ہم ''ان'' کے کسی واقف کی شادی پر گئے۔ ''ان'' کی اسٹاف کہنے لگیں سر کی عمر تو اچھی خاصی ہے ان کی بیوی تو چھوٹی سی لڑکی ہیں، سن کر خون میں سیروں اضافہ ہوا۔ جو اگلے دن ایک ہی وار میں خشک ہوگیا۔ جب اسپتال کی ایڈمن کہنے لگی۔

''میں نے امی کو آپ کے بارے میں بتایا کہ آنٹی آئی ہوئی ہیں۔ وہ آپ سے ملنے آئیں گی۔'' یعنی کبھی سوکھے تو کبھی ڈوبے۔

گزشتہ ہفتے رات کو بارش کے بعد موسم بہت خوب صورت تھا۔ اور اتفاق سے یہ بھی فارغ تھے۔ ہم سب موسم انجوائے کرنے لانگ ڈرائیو پر نکلے۔ پھرتے پھراتے ان کے ہاسٹل کے پاس سے گزرے۔ گاڑی روک کر بچوں کو بتانے لگے۔ پھر بولے آؤ بچو تمہیں اپنا کمرا دکھاؤں...... ہمیں تو گاڑی میں بیٹھنا تھا کیونکہ بوائز ہاسٹل میں رات میں خواتین کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ہمارا خیال تھا اب کم از کم آدھ گھنٹا تو ضرور بور ہوں گے۔ یہ ٹھیک پانچ منٹ بعد کھوٹے سکے کی طرح تشریف لائے بولے آج کل کے لڑکے عجیب فضول ہیں۔ کہنے لگے۔ ''آئیں انکل بیٹھیں۔''

آخر ایک دن قرآن پاک پڑھتے ہوئے ہم اس آیت پر پہنچے ''جب انسان چالیس سال کا ہوا اور اپنی بھرپور جوانی کو جا پہنچا۔'' بار بار یہ آیت پڑھی۔ قرآن بند کر کے مزید سوچا تو پتا چلا کہ بہت سے پیغمبروں کو نبوت چالیس سال کی عمر میں ملی۔ یعنی اللہ کے نزدیک چالیس سال میچور ہونے کی عمر ہے۔ ایک دم ہلکے پھلکے ہوگئے۔ ممتاز مفتی نے سچ ہی کہا ہے۔

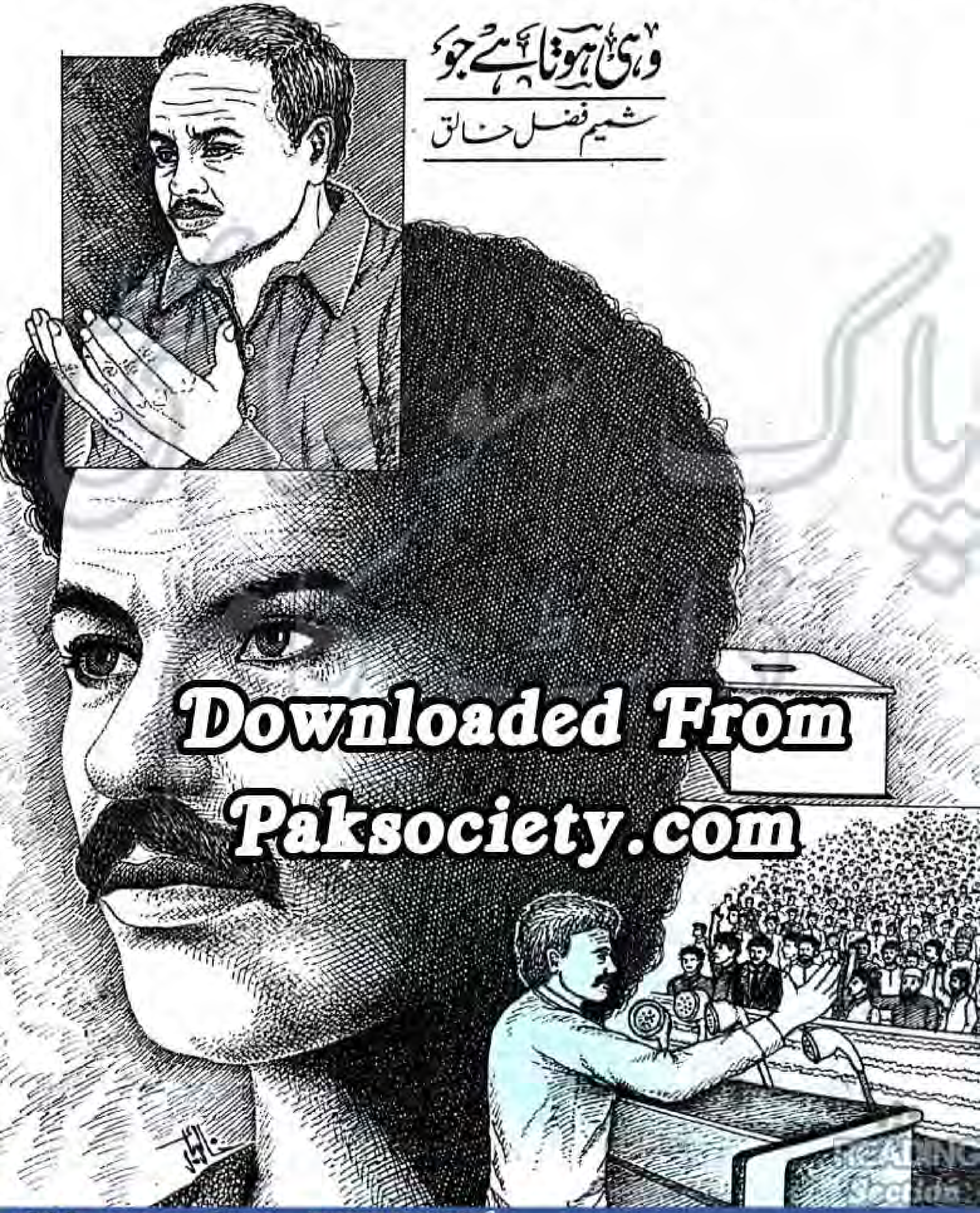
''عورت نے نئی روش کے تحت لڑکی بن کر جینے کو اپنا لیا ہے۔ وہ عورت بن کر جینے سے الرجک ہوگئی ہے۔ پرانے زمانے میں حسن کا معیار صحت مند مٹیار ہوا کرتی تھی۔ اب پچکے گالوں والی زرد انیمک لڑکی۔'' یوں ہم نے لڑکی پن کو خدا حافظ کہا اور عورت بن کر جینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ویسے بھی تیس سے چالیس سال کا عرصہ جوانی کا بڑھاپا اور چالیس سے پچاس سال کا عرصہ بڑھاپے کی جوانی ہے۔ اس لیے ہم بڑھاپے کی جوانی گزار رہے ہیں۔ اور خوش ہیں، جوانی تو ہے بڑھاپے کی ہی سہی۔ البتہ تیس کے قریب والوں سے اتنی گزارش کرنے کی جسارت ضرور کرتے ہیں۔ آنٹی خالہ یا انکل بناتے ہوئے اپنے بارے میں ضرور سوچیں آپ کو بھی جلد ادھر ہی آنا ہے۔ آپ پر بھی یہ ستم ٹوٹیں گے۔ ساتھ ساتھ تھوڑا سا خیال ہم فورٹی ناٹی کا ضرور کریں۔ ہم بھی دل رکھتے ہیں اور اس میں کچھ ارمان ابھی باقی ہیں۔

ہماری جتنی عمر ہے ہمیں اس کا اچھی طرح احساس ہے۔ آپ بھی اپنی عمر کا خیال کریں اگر ہم بھی تیار شیار ہو کر خوش ہو رہے ہوتے ہیں تو پلیز ہماری خوشیوں کو خاک میں مت ملایا کریں۔ چند سال پہلے تک صرف عورتیں ہی آپا یا باجی بنانے کی شوقین تھیں۔ اب مرد بھی اس میدان میں کافی ترقی کر رہے ہیں۔ کیوں کیا خیال ہے آپ کا ہمیں خوش ہونے کا اتنا ساحق تو ہونا چاہیے ناں......!

ملک قاسم اپنے وسیع و عریض ٹیرس پر ٹہل رہا تھا...... بظاہر تو وہ چہل قدمی کر رہا تھا لیکن دراصل وہ سخت ٹینشن میں تھا...... دل کی دھڑکنیں قابو میں نہیں آرہی تھیں...... اسمبلی کے الیکشن کے لیے نامزدگی کے کاغذات داخل کرانے کی آخری تاریخیں تھیں اور ملک قاسم نے وہاں دفتر میں اپنا ایک خاص بندہ کھڑا کیا ہوا تھا تاکہ وہ ملک قاسم کو ہر اُس امیدوار کے بارے میں اطلاع دے جو اس دن نامزدگی کے کاغذات

وہی ہوتا ہے جو

شمیم فضل خالق



داخل کرانے کے لیے آئے۔اس کی جھنجلاہٹ میں اضافہ ہورہا تھا......اس نے دانت کچکچا کر سوچا۔

''یہ نالائق کرموفون کیوں نہیں کررہا......میں نے اسے کہا بھی تھا کہ مجھے پل پل کی خبر دیتے رہنا۔''

اچھے بھلے محمد کریم کو ملک قاسم نے کرمو بنا دیا تھا...... لیکن کرمو، ملک قاسم کا دایاں ہاتھ تھا...... ملک قاسم کو خود پر اتنا اعتماد نہیں تھا جتنا کرمو پر تھا۔وہ ملک قاسم پر اپنی جان فدا کرسکتا تھا اس کا ملک قاسم کو اچھی طرح یقین تھا لیکن اس کے باوجود وہ غصے میں آتا تو اس ...... بیچارے کے جسم پر ایک چیتھڑا نہ چھوڑتا۔

''بدذات...... کم بخت کہیں کا......اب مجھے ہی اسے فون کرنا پڑے گا۔'' بے قراری حد سے سوا ہوئی تو ملک قاسم نے اپنا قیمتی سیل فون پاکٹ سے نکالا اور کرمو کو فون کرنے لگا......رِنگ جارہی تھی لیکن کرمو فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ملک قاسم نے دانت کچکچا کر اسے چند موٹی موٹی گالیاں دیں اور سیل فون پاکٹ میں رکھنے لگا اسی وقت اس کا فون گنگنا اٹھا...... ملک قاسم نے اسکرین دیکھی......کرمو کا فون تھا۔

''کہاں مرگیا تھا بدذات......'' وہ دہاڑا۔''فون ریسیو نہیں کررہے تھے تم، نہ ہی خود فون کررہے تھے؟''

''وہ جی......'' وہ ذرا گھگیا کر بولا۔''معلومات اکٹھی کررہا تھا۔''

''کیسی معلومات......؟'' ملک قاسم کے کان کھڑے ہوئے۔اب تک جتنے بھی آزاد امیدواروں نے نامزدگی کے کاغذات داخل کرائے تھے اس حلقے سے......وہ کوئی قابلِ ذکر لوگ نہیں تھے۔نہ ہی وہ ملک قاسم سے الیکشن جیت سکتے تھے......ملک قاسم کی ساری زندگی سیاست کے داؤ پیچ کھیلتے گزری تھی...... اسے سیاست کے سارے گُر آتے تھے۔

''اب تک بھی......'' وہ گرج کر بولا۔

''سائڈ پر ہورہا تھا مالک......'' وہ آواز دھیمی کرتے ہوئے بولا۔

''آپ عبدل کو تو نہیں بھولے ہوں گے...... وہی جو اپنے حجرے میں نوکر تھا۔''

''کون عبدل؟'' ملک قاسم سوچ میں پڑ گیا۔

''کہیں تُو کالو کی بات تو نہیں کررہا؟'' قدرے وقفے سے وہ بولا۔

''جی...... جی......وہی۔'' کرمو جلدی سے بولا۔

''اس کا کیا ذکر ہے یہاں...... چولھے میں ڈالو اسے اور کام کی بات کرو۔'' ملک قاسم بگڑ کر بولا۔

''وہی تو بتارہا ہوں مالک...... عبدل نے اپنے کاغذاتِ نامزدگی داخل کرائے ہیں۔''

''کیا بکواس کررہا ہے تو؟'' ملک قاسم اتنی زور سے دہاڑا کہ اس کی آواز کی گونج دور، دور تک سنی گئی......دوسری طرف کرمو بھی سہم گیا...... ملک قاسم کو خود کو قابو کرنے میں چند لمحے لگے...... پھر وہ بولا۔''پوری بات بتا!''

''مالک ......عبدل ہمارے حجرے سے نکل کر غریبوں کی جس بستی میں رہتا ہے وہاں ان کی کمیٹی کا صدر بن گیا وہ اپنے لوگوں کے چھوٹے موٹے مسائل حل کرنے کے لیے کوشاں رہتا تھا...... ان لوگوں کے اصرار پر وہ الیکشن میں کھڑا ہونے کے لیے رضامند ہوگیا......آپ دیکھیے مالک...... پوری کی پوری غریب بستی اس کے ساتھ آئی تھی......لوگ اتنے جوش وخروش میں تھے کہ مانو وہ آج ہی الیکشن جیت گیا ہو......سب لوگ بڑے پُراعتماد تھے کہ عبدل الیکشن ضرور جیتے گا۔''

''خاموش......'' ملک قاسم زور سے چنگھاڑا...... اور مارے غصے کے فون کاٹ کر قریب رکھی میز پر اس طرح اچھالا کہ فون سیٹ گرتے، گرتے بچا...... مارے طیش کے ملک قاسم کے نتھنے زور زور سے پھڑک رہے تھے...... دل تھا کہ بیٹھا جارہا تھا۔وہ امیروں سے مقابلہ کرسکتا تھا لیکن غریبوں سے مقابلہ اس کے بس کا روگ نہیں تھا......وہ عبدل کے بارے میں سوچنے لگا۔

عبدل چند سال پہلے اس کے حجرے میں نوکر تھا۔دو سال تک اس نے وہاں کام کیا تھا......ایک دن وہ ملک قاسم کے لیے ناشتا ڈائننگ ٹیبل پر رکھ رہا تھا کہ

ٹرے اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی...... جہاں سارے برتن ٹوٹ گئے وہاں چائے کی چھینٹیں ملک قاسم کے سفید براق کپڑوں پر بھی جا پڑیں...... ملک قاسم اس وقت ڈائننگ چیئر پر بیٹھا اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا......اسے اتنا غصہ آیا کہ اس نے وہیں عبدل کو دُھنک کر رکھ دیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر نوکروں کی پٹائی کرنا تو اس کا وتیرہ تھا......نوکر بیچارے رو پیٹ کر دوبارہ اپنے کاموں میں لگ جاتے لیکن عبدل اس مار کے بعد نہیں رکا...... اور اپنا حساب کتاب کر کے وہاں سے چلتا بنا......

''تھوڑا سا برداشت سے کام لیتا تو عبدل آج بھی میرا نوکر ہوتا تو اس طرح میرے مقابلے پر نہیں آتا......'' ملک قاسم نے سوچا۔ اسے کسی طور چین نہیں آرہا تھا......دل سینے میں پھڑک رہا تھا......'' کیا وہ عبدل جیسے بندے سے ہار جائے گا؟'' یہ سوچ اس کے دل کو نوچ رہی تھی، بے چینی حد سے سوا ہوئی تو اس نے پھر کرمو کو فون ملایا۔

''بتا کرمو...... کیا نئی تازہ خبر ہے...... اس کالو سے ملاقات ہوئی؟''

''جی مالک...... بڑی اچھی طرح ملا...... آپ کی خیریت بھی پوچھی اس نے اور اس نے بتایا کہ وہ اپنے جیسے غریب لوگوں کی قسمت بدلنے کے لیے آیا ہے...... وہ اسمبلی میں جا کر اپنے لوگوں کی تقدیر بدلے گا......اسی طرح کی باتیں وہ کر رہا تھا۔''

''اچھا اب تقریر چھوڑ۔'' ملک قاسم کے حلق میں کڑوا تھوک آ گیا اس نے منہ ایک طرف کر کے آخ تھو کیا اور رازداری سے بولا۔ ''تو نے اسے خریدنے کی بات کی......؟'' ملک قاسم جانتا تھا کہ کرمو بہت سارے ضروری کام اس سے اجازت لیے بنا ہی کر دیتا اور بدلے میں اس کی شاباش سمیٹتا......نہ صرف شاباش بلکہ انعام واکرام بھی......

''ڈھکے چھپے لفظوں میں کی تو لیکن وہ تو کانوں کو ہاتھ لگانے لگا مالک...... وہ کہنے لگا کہ وہ تو غریب بستی کی امید ہے ان کی آس ہے...... وہ مر جائے گا لیکن کبھی نہیں بکے گا۔''

''ہاں تو ٹھیک ہے...... مار دو اسے۔'' ملک قاسم سفاکی سے بولا۔ ''پرویز اور امان سے بات کر لو۔'' پرویز اور امان، ملک قاسم کے خاص بندے تھے جو اس کے لیے ایسے ہی خطرناک کام کرتے تھے وہ اپنے کام میں اتنی مہارت رکھتے تھے کہ کبھی کسی کو ان پر شک نہیں ہوا تھا۔

''وہ تو ٹھیک ہے مالک......لیکن اس طرح اس حلقے سے الیکشن نہیں ہو سکے گا۔ آپ کو یاد ہوگا پچھلی بار ایک امیدوار قتل ہوا تھا تو وہاں الیکشن روک دیا گیا تھا۔'' کرمو اس سے زیادہ باخبر تھا۔

''اوہ......'' ملک قاسم جیسے ڈھے سا گیا اس بار اسے اپنی جیت کا پورا یقین تھا۔ اس کی پارٹی جو ''ہماری پارٹی'' کے نام سے تھی اب ایک بڑی پارٹی کے طور پر ابھرنے لگی تھی۔ اس بار تو انہوں نے بجلی کے بحران سے فائدہ اٹھایا تھا اور ''روشنی ہم دیں گے'' کے نعرے کے ساتھ اپنی الیکشن مہم کا آغاز کیا تھا......لوڈ شیڈنگ کے ستائے لوگ ان کے نعروں پر یقین کرنے لگے تھے لیکن اب یہ عبدل؟ کبھی کبھی چیونٹی بھی ہاتھی کو کاٹ لیا کرتی ہے اور پھر غریب لوگوں کا ایکا بھی تو بے مثال ہوتا ہے۔ وہ سوچ، سوچ کر پریشان ہونے لگا۔ اگر الیکشن نہ ہونے کا ڈر نہ ہوتا تو وہ عبدل کو قتل کرانے میں مزید ایک لمحہ نہ سوچتا......لیکن اب کیا کیا جائے......وہ ذہنی طور پر تھک سا گیا...... اس مسئلے کا کیا حل سوچا جائے...... اسے کافی کی طلب ہونے لگی تو فون اٹھا کر اس نے خانساماں کو کافی لانے کے لیے کہا۔

یہ مردانہ حصہ جو حجرہ کہلاتا تھا زنانہ حصے سے الگ تھا۔ ملک قاسم زیادہ تر اسی مردانے حصے میں رہتا تھا......اس کی بیوی مہر و ایک سادہ سی عورت تھی۔ جس نے کبھی شوہر کی ان دلچسپیوں میں مخل ہونے کی کوشش نہیں کی...... حجرے میں بھی ملک قاسم کا ایک شاندار بیڈ روم تھا اور وہ اکثر وہیں رات گزار لیا کرتا تھا......

یہاں اس کے دوست احباب بھی آیا کرتے تھے، رات گئے تک سیاسی بحثیں چلتی رہتیں...... قہوے کے، کافی کے دور چلتے رہتے...... ملک قاسم کے دو بیٹے تھے جنہیں اس نے پڑھنے کے لیے بیرونِ ملک بھیجا ہوا تھا۔

کافی آگئی تو وہ کونے میں رکھی ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا...... زیادہ سوچنے سے اس کے سر میں درد شروع ہو گیا تھا...... وہ انگلیوں سے ماتھے کو دباتا ہوا گھونٹ، گھونٹ کافی پی رہا تھا کہ کرمو آ گیا...... سلام کر کے وہ ہاتھ باندھے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

''کرمو...... میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس مسئلے کا کیا حل ہوگا؟''

''کس مسئلے کا...... مالک؟'' وہ ادب سے پوچھنے لگا تو مالک قاسم نے تیز نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کڑوے لہجے میں کہا۔

''ارے...... تیرے باپ، عبدل کی بات کر رہا ہوں۔ اس خبیث کالو کی اور بھلا مجھے کیا مسئلہ ہوگا۔''

''ہاں مالک......'' وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ''مسئلہ تو بڑا سنگین ہے، جو لوگ اس کے ساتھ تھے ان کا جوش و خروش دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ سب عبدل کو کندھوں پر اٹھا کر لائے تھے...... غریب بستی میں ایک عبدل ہی پڑھا لکھا ہے باقی تو سب ان پڑھ ہیں۔''

''تو جانتا ہے...... غریبوں کی تعداد امیروں سے زیادہ ہے۔'' ملک قاسم پُرسوچ انداز میں بولا۔

''جی مالک...... یہ تو ہے......''

''تو سن...... ہم کیوں ناں اس غریب بستی کے ووٹرز کو خرید لیں۔'' اسے جیسے ایک حل سوجھ گیا تھا۔

''میرا نہیں خیال مالک...... کہ اس میں ہم کامیاب ہو جائیں گے۔ وہ نہیں بکیں گے...... اس بار وہ اپنی حالت سدھارنے کے لیے میدان میں کودے ہیں...... آپ ان کا جوش و خروش دیکھتے تو حیران رہ جاتے۔''

''ایک تو، تُو بہت منحوس ہے...... مجال ہے کہ کوئی بات میرے مزاج سے بھی کر لے۔'' ملک قاسم نے غصے سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''جی مالک......!'' وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ''میں کوشش کر لیتا ہوں۔''

''سن...... تو عبدل سے بھی مل لے...... تگڑی آفر دینا اسے...... اور ووٹرز کے لیے تو اپنے ساتھ نوٹوں کی گڈیاں لے کر جانا۔''

''جی مالک......'' وہ سعادت مندی سے سلام کر کے چلا گیا اور ملک قاسم بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا...... دو گھنٹے بعد جب یہ بے چینی حد سے سوا ہوئی تو وہ کرمو کو فون کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ آ گیا۔

''کیا...... کیا بنا؟'' ملک قاسم کو لگ رہا تھا جیسے اس کے سیاسی مستقبل کا انحصار اب صرف کرمو کی ہاں یا نہ میں ہے...... لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے پتا چل رہا تھا کہ وہ بری طرح ناکام لوٹا ہے...... ملک قاسم نے غور سے اس کے تاثرات دیکھے۔

''بولو...... کیا ہوا......؟'' وہ شدید بے چینی کے عالم میں پوچھنے لگا۔

''ہونا کیا تھا مالک......'' وہ مایوسی سے منہ لٹکا کر بولا۔ ''بڑی مشکل سے جان چھڑا کر آیا ہوں...... میری آفر پر تو وہ لوگ مجھے پولیس کے حوالے کر رہے تھے اور وہ عبدل...... وہ بھی ان کے ساتھ مل گیا تھا۔''

''کمینے...... شیطان کی اولاد...... اس خبیث سے تنہائی میں بات کرنی تھی ناں......'' ملک قاسم غصے سے چلّا کر بولا۔

''تنہائی میں ہی کی...... اس سے بڑی راز داری سے بات کی تھی اور ووٹروں سے بھی الگ سے بات کی...... لیکن نہ جی...... وہ تو سب دوسری ہوا میں ہیں...... کہہ رہے تھے کہ وہ زمانے لد گئے جب تم دولت کی چھب دکھا کر ہم سے اپنی مرضی کے بندے کو ووٹ ڈلوایا کرتے تھے۔ اب ہم اپنے لیے خود جدوجہد کریں گے...... اور دیکھ لینا اسمبلی میں جا کر دکھائیں گے۔''

''یہ تو بہت برا ہوا...... بیٹھے بٹھائے یہ کیا مصیبت گلے پڑ گئی۔''

ملک قاسم اپنے ماتھے کو دونوں ہاتھوں سے رگڑتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں بولا۔

''دعا کریں مالک...... کہ عبدل راتوں رات مرجائے...... اسے ہارٹ اٹیک ہوجائے...... پھر غریبوں کی بستی میں کوئی دوسرا بندہ نہیں ہے جو عبدل کی سیٹ سنبھال سکے۔'' کرمو کو کچھ نہ سوجھا تو یہی کہنے لگا۔

''تمہارے منہ میں گھی شکر کرمو...... پہلی بار کوئی ڈھنگ کی بات کی ہے۔'' ملک قاسم نے پہلی بار کرمو سے بغیر گالی دیے بات کی تھی...... کچھ دیر دونوں اسی موضوع پر بات کرتے رہے لیکن جب کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکے تو فیصلہ یہ طے پایا کہ کل پارٹی کے خاص، خاص بندوں کو بلا کر میٹنگ کی جائے اور اسی کے مطابق اقدامات کیے جائیں...... ملک قاسم بہت تھک گیا تھا...... آج سارا دن شدید قسم کے جذباتی ہیجان میں گزرا تھا...... اس نے ڈنر بھی برائے نام کیا...... اور صرف کافی کا ایک کپ پی کر اسی حجرے میں اپنے بیڈ روم میں چلا گیا...... کرمو کی بات اس کے دل کو لگی تھی۔

وہ بار، بار دعا مانگ رہا تھا کہ خدا کرے آج کی رات عبدل کی آخری رات ہو...... اس طرح ہلدی لگے نہ پھٹکری...... اور رنگ بھی چوکھا آئے گا......

اگر ایسا ہوگیا یعنی عبدل آج چل بسا تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے الیکشن جیتنے سے نہیں روک سکتی۔

بستر پر جانے سے پہلے اور نیند کی گولی لیتے ہوئے بھی اس کے ہونٹوں پر یہی دعا تھی۔

اگلے دن صبح نو بج گئے...... پھر دس بج گئے۔

خانساماں دوبار بیڈ ٹی لے کر ملک قاسم کے بیڈ روم میں گیا...... ہلکی سی دستک دی...... لیکن ہمیشہ کی طرح ملک قاسم کی آواز نہ آئی...... کہ ''اندر آجاؤ......'' خود سے وہ ڈر کے مارے اندر جانہیں سکتا تھا۔ وہ کرمو کے پاس گیا اور اسے ساری بات بتائی تو کرمو بے پروائی سے کہنے لگا۔

''رات کو مالک خاصے پریشان تھے...... نیند دیر سے آئی ہوگی...... کچھ دیر اور سونے دو انہیں......''

خانساماں کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا...... سب کرمو کی حیثیت جانتے تھے...... سو اس کی بات ماننا سب کے فرائض میں شامل تھا...... جب گیارہ بج گئے تو خانساماں پھر کرمو کے پاس آیا۔

''ارے......!'' کرمو اس کی بات سن کر چونک اٹھا۔ ''ابھی تک نہیں اٹھے؟''

''جی میں تیسری بار چائے لے کر گیا تھا...... اور اس بار دروازے پر دستک بھی زور سے دی...... لیکن اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔'' خانساماں نے بتایا تو کرمو کے چہرے پر تشویش کے سائے لہرانے لگے...... وہ جیسے بھاگتا ہوا ملک قاسم کے بیڈ روم میں گھسا اور ایک ساتھ ساری لائٹیں جلا دیں......

ملک قاسم اپنے بیڈ پر عجیب غیر فطری انداز میں لیٹا ہوا تھا...... کرمو کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ دیوانہ وار ملک قاسم کی طرف بڑھا...... کبھی اس کے دل کی دھڑکنیں سننے کی کوشش کرتا...... تو کبھی نبضیں ٹٹولنے لگتا...... پل بھر میں سارے نوکر بیڈ روم میں جمع ہوگئے۔ ڈاکٹر بھی آگیا تھا۔ ملک قاسم کو دیکھتے ہی ڈاکٹر کہنے لگا۔

''ان کو تو مرے کافی دیر ہوچکی ہے...... بڑا سیریس ہارٹ اٹیک ہوا...... جو ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ اگر وقت پر طبی امداد مل جاتی تو شاید......'' وہ اتنا ہی کہہ کر رہ گیا۔

ملک قاسم کا بہت بڑا جنازہ تھا...... ملک کے ہر شہر سے لوگ آئے تھے...... کرمو نے دیکھا جنازے میں عبدل بھی شریک تھا۔

''مالک...... آپ نہیں جانتے تھے کہ آج عبدل کی نہیں آپ کی آخری رات تھی دنیا میں۔'' وہ خود سے کہنے لگا۔

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

اے عشق ترے ہیں کھیل عجب

ڈرِ ثمن بلال

وہ کمالِ ہنر یوں بھی کرتا گیا
زخم دیتا گیا زخم بھرتا گیا
دور اُس کی نگاہوں سے منزل ہوئی
جادۂ عشق میں جو بھی ڈرتا گیا
رات پھولوں پہ شبنم برستی رہی
رنگ پھولوں کے رخ کا نکھرتا گیا

عشق، محبت، چاہت، پیار ایک جذبے کے کتنے اظہار ... یہ جذبہ ہر کسی کے دل میں پنپ سکتا ہے بشرطیکہ دل کا ظرف وسیع اور خلوص کے موتیوں سے مرصّع ہو، زیرِ نظر کہانی اسی جذبے کے اتار چڑھاؤ کو بے حد متاثر کُن انداز میں قاری کو ایک نئی سوچ سے روشناس کراتے ہوئے بڑھتی ہے۔

عشق کے آفاقی جذبے کو ایک نئے انداز میں بیان کرتی دلکش تحریر

قسط 4





سارہ نے صبح کالج جاتے ہوئے کاجل اور لپ اسٹک اپنے بیگ میں رکھ لی تھی اور خوب صورت سی وہ قیمتی بالیاں جو اس نے پچھلی عید پر تین سو کی خریدی تھیں وہ بھی بیگ میں رکھ لی تھیں۔

آج وہ ذہنی طور پر اسجد کے ساتھ باہر جانے کے لیے بالکل تیار تھی۔ ذویا اسکول کے لیے گھر سے نکل چکی تھی۔

''اچھا اماں میں کالج جا رہی ہوں۔'' سارہ نے چادر سر پر لیتے ہوئے سیما بیگم کو اطلاع دی۔

''سارہ میری آج طبیعت ٹھیک نہیں ہے، لگتا ہے بلڈ پریشر ہائی ہے میرا...... تو ایسا کر مجھے ایک کپ چائے بنا دے۔'' سیما بیگم گلو کے لاپتا ہونے کے باعث پریشانی سے بیمار پڑ گئی تھیں۔

''اماں، چائے بناتے، بناتے مجھے کالج جانے میں دیر ہو جائے گی۔ آج تو صبح سے سوئی گیس بھی بہت کم آ رہی ہے......'' سارہ نے بیگ اور اپنی فائل اٹھاتے ہوئے انہیں اطلاع دی۔

''ایک تو ان کم بختوں نے جان عذاب میں ڈال رکھی ہے پہلے بجلی کی لوڈ شیڈنگ ہوا کرتی تھی اب بجلی کے ساتھ، ساتھ گیس بھی بند کر دیتے ہیں نامراد کہیں کے۔'' سیما بیگم غصے میں بولیں۔

''سن آج تجھے بھی بڑی جلدی ہے کالج جانے کی...... ابھی تو آٹھ بجے ہیں۔''

''اماں کالج جاتے ہوئے مجھے پندرہ بیس منٹ لگتے ہیں۔ اور ویسے بھی آج جس ٹیچر کا پہلا پیریڈ ہے وہ بہت سخت ٹیچر ہیں۔ پانچ منٹ بھی دیر ہو جائے تو پوری کلاس کے سامنے بے عزتی کر دیتی ہیں......'' آج سارہ بڑی روانی سے جھوٹ پہ جھوٹ بول رہی تھی۔ صرف اسجد کے لیے۔

''اچھا چل جا پھر...... تیرے ابا اپنے والدین کی قبر پر تلاوت کرنے گئے ہیں وہ آتے ہیں تو انہیں کہہ دوں گی۔ مجھے ایک کپ چائے بنا دیں گے۔''

''اماں آپ سے ایک بات کہنی تھی۔'' وہ التجائیہ انداز میں کہتی ہوئی ان کے پاس پلنگ پہ بیٹھ گئی۔

''کون سی بات؟''

''اماں وہ میری سہیلی ہے ناں حنا...... وہ کچھ دنوں سے بیمار ہے اور کالج نہیں آ رہی...... کلاس کی دو تین لڑکیاں کالج سے چھٹی کے بعد اس کے گھر اس کا پتا کرنے جا رہی ہیں۔ میں بھی ان لڑکیوں کے ساتھ حنا کو دیکھ آؤں؟''

''ہاں چلی جانا مگر زیادہ دیر نہ لگانا...... ورنہ تیرے ابا سوال پہ سوال کر کر کے میری جان کو آ جائیں گے کہ سارہ کہاں گئی ہے؟ کالج سے ابھی تک آئی کیوں نہیں؟ کس سہیلی کے گھر گئی ہے؟ وغیرہ، وغیرہ......'' سیما بیگم نے اسے تنبیہ کی۔

''جی اماں مجھے پتا ہے، میں چھٹی کے بعد بس گھنٹے ڈیڑھ تک آ جاؤں گی۔'' سارہ پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اچھا ٹھیک ہے، باہر کا دروازہ اچھی طرح سے بند کر جانا۔''

''اچھا اماں اللہ حافظ!''

سارہ ان سے اجازت لے کر گھر سے نکل گئی تھی۔ آج وہ تیز، تیز قدم اٹھاتی کالج کی طرف روانہ تھی۔

سیما بیگم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ آج سے پہلے وہ کبھی اتنے شوق سے اور اتنی جلدی میں کالج جانے کے لیے تیار نہیں ہوئی تھی۔ ایک بے چینی تھی، ایک انتظار کی کیفیت تھی جس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

کالج میں بھی اس نے غائب دماغی سے تمام کلاسز اٹینڈ کی تھیں۔ آخری پیریڈ بنک کرنے کے بعد وہ کالج کے وسیع لان میں ایک درخت کے نیچے آ بیٹھی۔ سارہ نے اپنے بیگ میں سے چھوٹا سا مرر نکالا پھر کاجل نکال کر اپنی

بڑی، بڑی خوب صورت آنکھوں میں کاجل لگانے لگی۔ ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک لگانے کے بعد بیگ سے بالیاں نکال کر پہننے لگی۔

اسی اثنا میں چھٹی کی گھنٹی سنائی دی۔

سارہ نے جلدی سے بیگ اور فائل اٹھائی۔ چادر کو سر پہ لیا اور گیٹ کے قریب آ گئی۔

لڑکیاں ٹولیوں کی صورت میں گیٹ سے باہر نکلنے لگیں۔ سارہ نے گیٹ سے باہر جھانکا مگر اسے اسجد کہیں دکھائی نہ دیا۔

وہ اندر آ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے گیٹ سے دوبارہ باہر جھانکا۔ اس بار بھی اسے مایوسی ہوئی۔ اسجد کہیں نظر نہ آیا......

''بھئی کہاں غائب تھیں سارہ! آج آخری پیریڈ ہی نہیں لیا تم نے؟'' اس کے عقب میں کھڑی حنا اس سے پوچھ رہی تھی۔

سارہ نے چونک کر بے اختیار حنا کی طرف رخ موڑا۔

''واہ بھئی...... بڑے میک اَپ شیک اَپ...... کہاں کی تیاری ہے؟'' حنا نے راز داری سے پوچھتے ہوئے اسے آنکھ ماری۔

''کک کہیں نہیں...... آج بس دل چاہا تو کاجل لگا لیا۔'' سارہ ہڑبڑائی۔ اس نے کبھی حنا سے جھوٹ نہیں بولا تھا...... اور وہ ہمیشہ سادہ سی کاجل یا لپ اسٹک کے بغیر ہی کالج آیا کرتی تھی۔

''دل ایویں ہی تو نہیں چاہتا میری جان...... یہاں جب لڑکیاں اس طرح تیار ہو کر گیٹ کے پاس کھڑی ہوتی ہیں تو تم اچھی طرح سے جانتی ہو وجہ کیا ہوتی ہے؟ اور تمہیں تو میں تین سال سے جانتی ہوں...... سچ، سچ بتاؤ...... کسی لڑکے کے چکر میں ہو؟'' حنا نے مسکراتے ہوئے راز داری سے اس سے پوچھا۔

''پتا نہیں...... چلو اب گھر چلتے ہیں۔'' سارہ نروس ہو چکی تھی۔

''پتا تو خیر مجھے چل ہی جائے گا...... یہ بتاؤ جو لڑکا روز ہمارے پیچھے آتا ہے کہیں اسی سے افیئر تو نہیں چل رہا تمہارا؟''

''ہاں وہی ہے، محبت کا دعویٰ کرتا ہے مجھ سے......'' وہ دھیرے سے اعتراف کرنے لگی کیونکہ حنا سے اب مزید کچھ چھپانا بالکل فضول تھا۔

وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی کالج گیٹ سے باہر نکل آئیں۔ سارہ نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ اسجد کہیں ہوتا تو دکھائی دیتا۔

''اچھا...... تو ہمارے گروپ کی انوشے تو خواہ مخواہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ وہ لڑکا اس کے پیچھے آتا ہے۔'' حنا مسکرائی۔

اب کے سارہ خاموش رہی...... باقی کا راستہ ایسی ہی چھوٹی موٹی باتوں میں طے ہو گیا تھا۔ سارہ کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا...... آج پہلی بار اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھے...... مگر اس نے ایسا کیا نہیں تھا...... آہستہ، آہستہ سب لڑکیاں اپنے، اپنے گھروں کو روانہ ہو گئی تھیں۔ حنا کا گھر سارہ کے گھر سے پہلے دو گلیوں کے فاصلے پر تھا......

اب سارہ اکیلی رہ گئی تھی...... اس نے اپنی رفتار آہستہ کر دی...... اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس بار بھی مایوسی نے

اس کے دل کو اور پریشان کر دیا تھا۔ نہ جانے وہ اسے کیوں ستا رہا تھا...... کیوں اس کو خفگی دکھا رہا تھا؟ اب سارہ راستے میں ہی ایک درخت کے نیچے کھڑی ہو گئی تھی۔ آٹھ دس منٹ اس درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اس کا انتظار کرنے کے باوجود وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ وہ ایک بار پھر مرے مرے قدموں سے چلنے لگی۔ اس کا دل ہر اٹھتے قدم کے ساتھ ڈوب رہا تھا۔ اس نے اپنی چادر کے پلو سے لپ اسٹک صاف کر لی اور بالیاں اتار کر بیگ میں رکھ لیں۔ اس کا گھر اب ایک گلی کے فاصلے پر تھا...... اسے اب یقین ہو گیا تھا کہ امجد اس سے ناراض ہو گیا۔ سارہ کے دل پر ایک بوجھ سا آن پڑا...... وہ مرے قدموں سے اپنی گلی میں داخل ہو چکی تھی اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے...... اس نے گھر کا دروازہ بجایا۔ جہاں داخل ہوتے ہی اسے ہمیشہ کی طرح نئی پریشانیوں کا سامنا کرنا تھا۔

☆☆☆

ایشال کمرے میں داخل ہوئی تو پنو...... عنایہ کے ہاتھ پیروں پہ لوشن لگا رہی تھی...... ''کیسی ہو تم......؟'' ایشال نے منہ پھلائے بیڈ پر لیٹتے ہوئے بے دلی سے پوچھا۔

''ہم تو ٹھیک ہیں مگر لگ رہا ہے کہ تم ٹھیک نہیں ہو؟'' عنایہ نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے ایشال کو دیکھا۔

''ہاں میں بالکل بھی ٹھیک نہیں ہوں...... اور آج کا دن بھی بہت برا گزرا ہے میرا...... اور عمر بھائی کے سامنے آج مجھے بہت embarrasment فیل ہوئی۔'' ایشال نے اپنے ٹیڈی بیئر کو خود سے لپٹاتے ہوئے بتایا۔

''کیوں بھئی ایسا کیا ہو گیا آج؟'' عنایہ ہنوز مسکراہٹ چھپائے پوچھ رہی تھی۔

''عنایہ، جو آج میرے ساتھ ہوا ہے ناں...... اللہ کرے وہ کبھی کسی دشمن کے ساتھ بھی نہ ہو۔'' ایشال کی آواز میں افسردگی تھی۔

''یا اللہ خیر...... ایشو بی بی اب ایسا وی کیا ہو یا ہے جی...... چھیتی دسو میرا تو دل ڈوبا جا رہا ہے۔'' اب کے پنو بھی پریشان ہوئی۔

پھر کیا تھا...... ایشال نے ڈاکٹر عمر کے حوالے سے اپنے ساتھ ہونے والا قصہ ان دونوں کے گوش گزار کر دیا جسے سنتے ہوئے عنایہ اور پنو کی ہنسی نہیں رک رہی تھی۔

''مجھے اتنی بیستی (بے عزتی) محسوس ہو رہی ہے اور تم ہنس رہی ہو؟'' ایشال نے اپنے قریب رکھا کشن اٹھا کر عنایہ کو مارا۔

''تو تم نے لاؤڈ اسپیکر اپنے گلے میں فٹ کر کے علینہ سے عمر بھائی کے حوالے سے اس طرح کی گوسپ نہیں کرنی تھی ناں......'' ہنس ہنس کر عنایہ کی آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔

''تو مجھے کیا معلوم تھا کہ عمر بھائی کے کان اتنے باریک ہوں گے...... یا وہ دوسرے کمرے میں بیٹھے میری باتیں اتنی آسانی سے سن لیں گے۔'' ایشال جھنجلائی۔

''اینی ویز جو بھی ہوا بہت برا ہو۔'' عنایہ نے کہا۔

''تو اور کیا...... ٹینشن سے میرا تو سر پھٹ رہا ہے۔'' ایشال اپنے ٹیڈی بیئر کو اٹھائے بیڈ سے اٹھ کر انٹر کام کی طرف آئی۔

''اسلم میرے لیے اچھی سی کافی بنا کر روم میں بھیجو۔'' ایشال نے انٹر کام پر بٹلر کو ہدایت کی...... اور واپس بیڈ پر آ گئی۔

''پنو، دادو جاگ رہی ہیں؟''

''نہیں ایشو بی بی، وڈی اماں تو ظہر کی نماز پڑھ کر سوگئی تھیں جی۔'' ایشال نے اثبات میں سر ہلایا۔

''پینو اب بس کرو۔'' عنایہ نے پاؤں سمیٹ لیے...... پینو جو عنایہ کے پیروں پر لوشن لگا رہی تھی اٹھ کر واش روم میں ہاتھ دھونے چلی گئی۔ عنایہ سائڈ ٹیبل پر سے موبائل اٹھا کر دیکھنے لگی۔

''ایشو ویسے آج تمہارے ساتھ ہوا بہت برا ہے۔''

''عمر بھائی کی موجودگی میں ہمیشہ میرے ساتھ ایسے ہی کیوں ہوتا ہے اور یہ بات مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی۔''

''عمر بھائی دل کے بہت اچھے ہیں، بس وہ خاصے پنکچوئل آدمی ہیں۔ اصول پسند، سنجیدہ مزاج سے اور اگر وہ تمہیں کسی بات پر ڈانٹ بھی دیتے ہیں تو وہ تمہاری بھلائی کے لیے ہی کہتے ہیں...... تاکہ تم اپنے فیوچر کے بارے میں سنجیدہ ہو جاؤ۔'' عنایہ نے بڑی بہن ہونے کے ناتے ایشال کے دل سے ڈاکٹر عمر کے لیے بھری بدگمانی نکالنی چاہی۔

ایشال خاموش رہی۔

اس دوران پینو بھی گیلے ہاتھ اپنے دوپٹے کے پلو سے خشک کرتے ہوئے آگئی تھی۔

''ایشو بی بی میں آپ کے سر کا مساج کر دیتی ہوں۔ فوراً آپ کے سر کی پیڑ (درد) دور ہو جائے گی۔'' وہ ایشال کے سر کا مساج کرنے بڑھی۔

''پینو تم سچ میں بہت اچھی ہو۔'' اس کے مساج کرنے سے ایشال کو سکون ملنے لگا اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

''بس ایشو بی بی چنگی (اچھی) تو صرف اللہ کی ذات ہے۔ جس نے آپ کے دلاں دے وچ مجھ حقیری بندی کے لئے انس ڈال رکھی ہے۔ جو چھاں جو تحفظ اور جو پیار مجھے یہاں اس کار (گھر) میں ملا ہے اگر نہ ملتا تو پینو پتا نہیں کتھے دھکے کھا رہی ہوتی۔'' پینو کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''پینو تم پچھلے آٹھ سال سے ہمارے ساتھ ہو۔ ڈونٹ وری تم ہمیشہ ہمارے ساتھ رہو گی۔'' عنایہ نے موبائل ایک سائڈ پر رکھتے ہوئے اس کو تسلی دی۔

''اللہ آپ دونوں بہنوں کو ہمیشہ خوش رکھے جی۔''

''اوکے میں چلتی ہوں میرے جم کا ٹائم ہو گیا ہے۔'' عنایہ بیڈ سے اٹھی۔ اسی اثناء میں اسلم دروازہ ناک کر کے ایشال کی کافی لے آیا تھا۔

''تھینکس پینو...... اب بس کرو...... میں کافی پی لوں۔'' پینو اور اسلم کمرے سے باہر نکل گئے۔

''ایشو اگر تمہیں آج ٹائم ملے تو سیلون چلی جانا...... تمہارے بال بہت عجیب اور روکھے ہو رہے ہیں...... اور تمہارا فیس بھی رف ہو رہا ہے۔'' تھوڑی دیر بعد عنایہ ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس، سائڈ ٹیبل سے گاڑی کی چابی، موبائل اور گلاسز اٹھاتے ہوئے ایشال سے مخاطب تھی۔

''ہاں میں ابھی کال کر کے اپائنٹمنٹ لے لیتی ہوں۔'' عنایہ اثبات میں سر ہلا کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

''چھوٹو یار اب اٹھ جاؤ۔'' اقصم بہت گہری نیند سو رہا تھا اور وہ اس کے سرہانے کھڑی مسلسل اسے جگا رہی تھی۔

تو اس نے آنکھیں کھول کر اپنے سامنے کھڑی مناب کو دیکھا...... بے اختیار اس کا دل چاہا کہ وہ اس لڑکی کا

ہاتھ تھام کر اسے اپنے پاس بٹھالے۔ اسے اپنے قریب کرلے اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس سے پوچھے کہ یہ کب، کیسے اور کتنا عجیب کھیل کھیلا ہے تم نے میرے دل کے ساتھ...... کہ یہ دل اب تمہارے علاوہ کسی کے ذکر پہ یوں دھڑکتا ہی نہیں۔ یہ تمہارے علاوہ اب کسی کی سنتا ہی نہیں، کیوں کیا تم نے میرے ساتھ ایسا؟ چپکے چپکے تمہاری اس محبت نے کیسا کھیل کھیلا ہے مجھ سے؟ سنہرے سپنے دکھا کر ایک تاریک راستے پر گامزن کردیا مجھے...... وہ سفر جس کی کوئی منزل ہی نہیں...... بس چلتا چلا جارہا ہوں میں...... واپسی کا راستہ مل رہا ہے نہ آگے منزل دکھائی دے رہی ہے۔" تب اس کے اندر کوئی کرب سے بولا تھا۔

"محبت کی تاریک گھاٹیوں سے نکلنے کا منتر آج تک کوئی نہیں جان سکا...... جو اس سفر پر ایک بار گامزن ہوجائے، اسے کبھی یوٹرن نہیں ملتا۔"

"چھوٹو کہاں کھو جاتے ہو تم؟ میں کتنی دیر سے تمہیں جگا رہی ہوں۔" مناب جھنجلائی۔ "ہمیں بروقت یہاں سے نکلنا ہے۔" اقصم نے جمائی لیتے ہوئے اپنے اوپر سے کمبل ہٹایا۔

"اٹھ رہا ہوں...... آپ بے فکر رہیں...... تھوڑی دیر میں آپ کو کالج پہنچادوں گا۔ آپ کی کلاس مس نہیں ہونے دوں گا میں۔" اقصم نے بستر سے اٹھتے ہوئے اسے تسلی دی۔ اس کی آنکھیں اب بھی نیند سے بند ہورہی تھیں۔

"اوکے میں ناشتا بناتی ہوں تب تک تم شاور لے کر فریش ہوجاؤ۔" مناب دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"ویسے آپ بڑے ظالمانہ طریقے سے جگاتی ہیں۔" اقصم کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔

"تم اگر اب بھی نہیں اٹھتے تو میں تم پر پانی پھینکنے والی تھی۔" مناب ہنسی۔

"میں اتنا اچھا خواب دیکھ رہا تھا۔ آپ کے جگانے سے ٹوٹ گیا۔" وہ واش روم کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

"خواب ہوتے ہی ٹوٹ جانے کے لیے ہیں...... اس لیے ان پر افسوس کرنا فضول ہے۔" مناب کی بات پر وہ دھیرے سے سر ہلا کر واش روم میں گھس گیا تھا۔ پندرہ منٹ کے بعد وہ کچن میں ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے۔ ناشتا کررہے تھے۔

"آپ سب کچھ اتنا مزے کا بناتی ہیں کہ میں تعریفیں کرکر کے تھک گیا ہوں۔" اقصم چھری اور کانٹے کی مدد سے اپنی پلیٹ میں رکھا اسپینش چیز آملیٹ بہت شوق سے کھا رہا تھا۔

"تو کس نے کہا ہے تم تعریف کرو...... میں جانتی ہوں میرے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔" مناب کافی پیتے ہوئے مسکرائی۔

"ارے آپ تو کچھ کھا نہیں رہیں؟"

"میرا ناشتا ایسا ہی ہوتا ہے...... ایک کافی کا مگ اور براؤن بریڈ (چوکر والی ڈبل روٹی) کا ایک سلائس......"

"اسی لیے آپ اتنی دبلی پتلی اور عمر چور دکھائی دیتی ہیں۔" اقصم مسکرایا۔

"عمر چور......؟ کیا مطلب ہے بھئی تمہارا؟"

"مطلب یہ کہ آپ اپنی عمر سے بہت کم نظر آتی ہیں...... ستائیس کے بجائے بائیس، تئیس سال کی لگتی ہیں آپ۔" مناب اس کی رائے پر ہنس پڑی۔

"کم آن چھوٹو لگنے سے کیا ہوتا ہے...... میں ستائیس سال کی ہوں اور مجھے بائیس سال کی نظر آنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

"آپ بھی کمال کرتی ہیں...... لڑکیاں تو اپنی عمر کے حوالے سے بڑی کانشس ہوتی ہیں...... کہ ان کی اصل عمر

کے بارے میں کسی کو پتا نہ چل جائے مگر آپ کی سوچ اس معاملے میں بڑی عجیب ہے۔''
''عجیب نہیں ہے چھوٹو...... میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کچھ حقیقتوں کو کسی بھی صورت جھٹلایا نہیں جا سکتا۔''
اب کے مناب کی بات پر اس نے خاموشی اختیار کرنی ہی بہتر سمجھی تھی۔ وہ ایک رائٹر تھی اور اس کے پاس ہر بات کا جواب موجود ہوتا تھا پر وہ شاید یہ بات بھول گیا تھا۔
تھوڑی دیر کے بعد اقصم اپارٹمنٹ کو لاک لگا رہا تھا اور مناب اس کے پاس کھڑی تھی۔ مناب نے اپنا لیپ ٹاپ والا بیگ ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ اقصم نے لاک لگانے کے بعد اس کا ہینڈ کیری پکڑا۔
''لائیں یہ بھی مجھے پکڑا دیں۔''
''اٹس اوکے یہ اتنا وزنی نہیں ہے۔''
''اوکے۔'' وہ دونوں ساتھ، ساتھ چلتے ہوئے پارکنگ کی طرف آئے۔
اقصم نے اس کا سامان گاڑی میں رکھا...... تب تک مناب بھی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ چکی تھی...... اقصم گاڑی پارکنگ سے نکال کر مین روڈ پر لے آیا۔ وہ بالکل خاموش بیٹھی تھی۔
''خاموش کیوں ہیں؟ کہیں ولی بھائی تو نہیں یاد آرہے؟'' اقصم نے ایک لمحے کے لیے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔
''بھلا مجھے ولی کو یاد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو ہر وقت میرے دل میں رہتا ہے۔'' مناب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔
''دل...... یہ کم بخت دل......'' دل میں سوچتے ہوئے اس نے اسٹیرنگ پہ مکا مارا۔
''کیا ہوا؟'' مناب حیران ہوئی۔
اقصم کا جی چاہا کہ گاڑی یہیں بیچ راستے میں روک کر اسے چیخ چیخ کر بتائے کہ تم ایک قاتل ہو...... !تم نے میرے اندر کا ایک ہنستا ہوا انسان مار ڈالا ہے۔
''چھوٹو کیا ہوا؟'' مناب نے اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا۔
''کچھ نہیں...... ایک ضروری چیز گھر بھول آیا ہوں۔'' اس نے دھیرے سے وضاحت کی...... اور پھر باقی کا راستہ وہ خاموش ہی رہا۔
مناب گاڑی میں چھائی خاموشی توڑنے کے لیے کوئی بات کرتی تو وہ جواب دے دیتا۔ مناب بہت عرصے کے بعد اس سے یوں ملی تھی۔ اور وہ اس کے لیے بہت فکر مند ہوگئی تھی۔ وہ بچپن سے جس اقصم کو جانتی تھی...... وہ یہ اقصم نہیں تھا۔ وہ اقصم ہمیشہ خوش رہنے والا، نٹ کھٹ سا...... دوسروں کو خوش رکھنے والا ایک شور مچاتے جھرنے جیسا لڑکا تھا۔ اور یہ والا اقصم ایک جھیل کی طرح تھا...... خاموش...... اس خاموشی کے اندر کتنے طوفان چھپے ہوئے تھے یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ مناب نے اس اقصم کا مزاج تیزی سے بدلتے ہوئے دیکھا تھا۔ کبھی وہ خوش ہوتا اور پھر اگلے ہی لمحے وہ اداس ہو جاتا۔ وہ کچھ کہتا اور پھر کہتے، کہتے رک جاتا۔ وہ بات کرتا اور پھر بات کرتے، کرتے کہیں کھو جاتا۔ وہ مناب کو ایک پہیلی کی طرح لگ رہا تھا...... جسے بوجھنے کی کوشش میں خود مناب بھی الجھ گئی تھی۔
انہی سوچوں میں ڈوبے کب وہ لندن پہنچ گئے۔ احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ اقصم نے جب اسے اس کے فلیٹ کی بلڈنگ کے باہر اتارا تو مناب نے اسے اوپر آنے پر بہت زور دیا تھا۔
''چھوٹو چلو ناں...... میرے ساتھ اندر تو آؤ...... لنچ تم میرے اور فاریہ کے ساتھ کرو...... پھر واپس چلے جانا......'' مناب نے اصرار کیا۔
''نو تھینکس...... آپ پلیز جائیں...... مجھے واپس بھی جانا ہے۔''

''اوکے ایزیوویش...... تم اپنا بہت خیال رکھنا۔ مجھے تمہاری بہت فکر رہے گی۔''
مناب کی بات پر اقصم تلخی سے مسکرایا تھا۔
مناب اس کا شکریہ ادا کر کے اندر بڑھ گئی تھی۔ اور وہ کتنی ہی دیر وہاں بے مقصد کھڑا رہا تھا...... یہ دو دن جو مناب نے اس کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ میں گزارے تھے وہ اس کی زندگی کے یادگار دن تھے۔ آج جب وہ اسے چھوڑ کر واپس آرہا تھا تو اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بھری دنیا میں بالکل اکیلا رہ گیا ہو۔

☆☆☆

شام کے چھ بج رہے تھے جب ایشال سیلون سے واپسی پر ساجدہ پھپو کی طرف آگئی تھی۔ گیراج میں ڈاکٹر عمر کی گاڑی دیکھ کر ایک لمحے کے لیے اس کا دل گھبرایا تھا مگر اگلے ہی لمحے...... ساجدہ پھپو کا خیال آتے ہی اس کا اعتماد بحال ہو گیا تھا کیونکہ وہ ان کی بھی بے پناہ لاڈلی تھی۔
''السلام علیکم......!'' وہ گھر کے اندر داخل ہوئی تو ساجدہ پھپو اسے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھتے ہوئے نظر آئیں۔
''وعلیکم السلام...... میری ایشو آئی ہے۔'' ساجدہ بیگم نے محبت سے اسے خود سے لپٹا کر اس کا ماتھا چوما۔
''پھپو آپ تو ہم سے ملنے آئی نہیں...... میں نے سوچا کہ میں ہی اپنی پھپو سے مل آؤں۔'' اب ایشال ان کے پاس صوفے پر بیٹھ چکی تھی۔
''بس میری جان پچھلے دنوں کچھ طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی اس لیے گھر سے نکلنے کو دل بھی نہیں چاہا۔ مگر آج میں تمہیں اور عنایہ کو بہت یاد کر رہی تھی۔''
''جھوٹ بالکل جھوٹ...... آپ کو ہماری یاد آئے تو آپ ہر روز ہماری طرف آئیں۔'' ایشال نے انہیں خفگی دکھائی...... وہ ایسے ہی ساجدہ بیگم کو نخرے دکھایا کرتی تھی۔
ساجدہ بیگم مسکرائیں...... ''پگلی جن سے پیار ہوتا ہے ضروری نہیں کہ ان سے روز ملا جائے...... اپنے پیاروں کی محبت تو دل میں ہمیشہ بسی ہی رہتی ہے۔ چاہے ان سے روز نہ بھی ملا جائے۔ ان کے لیے دل میں موجود محبت بھی کم نہیں ہوتی۔''
ساجدہ بیگم نے اسے بڑے پیار سے لپٹایا۔
''میری جان، تم اور عینی تو میرے پیارے مرحوم بھائی کی اولاد ہو...... تم دونوں مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز ہو......'' ساجدہ بیگم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ایشال کی آنکھوں میں بھی آنسو جگمگا گئے۔
''پھپو...... مما اور بابا کے بعد جس طرح سے آپ نے اور بڑے پاپا نے ہمیں پیار دیا ہے اور جس شفقت سے پالا ہے...... اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔'' ایشال کو سنجیدہ دیکھ کر ساجدہ بیگم مسکرائیں۔
''تم دونوں بہنوں میں ہی ہم سب کی جان اٹکی رہتی ہے۔''
''اور آپ کا ہٹلر بیٹا ہمیشہ میری جان نکالنے کے چکروں میں رہتا ہے۔'' ایشال نے دل میں سوچا۔
''پھپو آپ نے بس ایویں خود کو ہر وقت گھر کے کاموں میں بزی کر رکھا ہوتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ روز نور منزل آیا کریں......'' ایشال نے خوش دلی سے ان کے گلے میں بازو ڈالے۔
''ہاں تو یہ اچھی بات ہے ناں اگر میں خود کو بزی نہ رکھوں تو بیمار پڑ جاؤں گی... بستر سے لگ جاؤں گی۔''
ساجدہ بیگم نے پیار سے اس کے سر پر چپت لگائی۔
''اللہ نہ کرے پھپو آپ کو کبھی کچھ ہو۔'' ایشال نے پیار اور لاڈ سے اپنا سر ان کے کندھے سے ٹکا لیا......

''دوپہر میں عمر آیا تو میں اس سے تمہارے بارے میں پوچھ رہی تھی۔''
''یقیناً میری شکایتیں ہی لگا رہے ہوں گے۔'' ایشال نے منہ پھلایا۔
''میرے پاس اتنا فالتو ٹائم نہیں ہے تمہاری شکایتیں لگانے کے لیے......'' ڈاکٹر عمر ہاتھ میں شرٹ پکڑے نہ جانے کہاں سے اچانک نازل ہوئے تھے کہ انہوں نے ایشال کی بات سن کر اسے یوں جواب دیا تھا۔
''السلام علیکم......!'' وہ جز بز سی ہو کر سیدھی بیٹھ گئی۔ جانے آج کل ایشال کے ستارے کیوں گردش میں تھے۔
''وعلیکم السلام......'' سلام کا جواب دینے کے بعد وہ ساجدہ بیگم سے مخاطب ہوئے۔
''مما میرے کپڑے پریس ہو کر نہیں آئے کیا؟''
''نہیں بیٹا......فیضو (ملازم) کہہ تو رہا تھا کہ آج دھوبی دے جائے گا مگر ابھی تک وہ نہیں دے کر گیا۔''
''اور یہ فیضو کہاں ہے؟''
''بیٹا وہ تو مارکیٹ تک گیا ہے کچن کی ایک دو چیزیں لانی تھیں۔''
''اوکے مما پھر آپ ثریا سے کہیں یہ شرٹ پریس کر دے۔'' ڈاکٹر عمر نے شرٹ ان کی طرف بڑھائی۔
''عمر بیٹا میں تمہاری شرٹ خود پریس کر دیتی ہوں۔ ثریا (ملازمہ) کا بچہ بیمار ہے آج وہ جلدی کوارٹر چلی گئی تھی۔''
''اب کیسا ہے ثریا کا بیٹا؟''
''صبح تم نے جو اسے میڈیسن دی تھیں اس سے کافی بہتر ہے۔''
''اوکے......مما مجھے دیر ہو رہی ہے ہسپتال سے...... میں اپنے روم میں ہوں...... آپ پلیز میری شرٹ پریس کر کے وہیں لے آیئے گا۔'' اپنی بات مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر عمر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے......اور وہ ساجدہ بیگم کے ساتھ اسٹور روم میں چلی آئی۔
ساجدہ بیگم نے آئرن اسٹینڈ پر رکھی استری کا سوئچ آن کیا۔
''لائیں پھپھو میں پریس کر دیتی ہوں شرٹ......'' ایشال نے بلاوجہ آفر کی...... حالانکہ اسے مردانے کپڑے تو پریس کرنا بالکل نہیں آتے تھے۔
''ارے نہیں میری جان میں کر لیتی ہوں اور ویسے بھی تمہیں کہاں یہ کپڑے پریس کرنے آتے ہیں؟''
''آتے تو نہیں پھپھو......مگر میں کر سکتی ہوں۔'' ایشال نے ان کے ہاتھ سے استری لیتے ہوئے انہیں تسلی دی۔
''رہنے دو ایشو کہیں تم کپڑے پریس کرتی خود کو کوئی نقصان نہ پہنچا بیٹھو......'' ساجدہ بیگم کے لہجے میں تشویش تھی۔
''ارے کچھ نہیں ہوتا پھپھو...... آپ سب نے تو مجھے بس ایویں ہی سمجھ رکھا ہے۔'' ایشال بلاوجہ الٹی شیخی دکھاتے ہوئے شرٹ پریس کرنے لگی شاید وہ ان کی شرٹ پریس کر کے .... اپنی اس خفت کو، اپنی اس شرمندگی کو مٹانا چاہتی تھی جو آج دوپہر سے لے کر اب تک اسے اٹھانی پڑ رہی تھی۔
''لو بھئی تم پھر اسے پریس کرو...... آج صبح میں نے شامی کباب بنائے تھے میں ذرا تمہارے لیے وہ فرائی کر لوں۔''
''ڈونٹ وری پھپھو...... میں ابھی آپ کے پاس آتی ہوں۔'' ساجدہ بیگم کے اسٹور روم سے نکلنے کے بعد وہ شرٹ پریس کرنے کی کوشش کرنے لگی۔
اسی دوران اس کا سیل فون بج اٹھا...... عنایہ اسے کال کر رہی تھی۔
''ہیلو!'' ایشال نے کال ریسیو کی۔

"کہاں ہو ایشو......؟ میں جم سے واپس بھی آ گئی ہوں اور تم نے سیلون میں اتنی دیر لگا دی؟ مجھے تمہارے ساتھ شاپنگ مال جانا تھا۔"

"عینی میں فارغ ہو کر پھپو کی طرف آ گئی تھی۔"

"پھپو کیسی ہیں؟"

"ٹھیک ہیں، تمہیں بہت یاد کر رہی ہیں۔"

"او کے تم پھپو کو میرا اسلام کہنا۔ میں تھوڑی دیر تک تمہیں وہاں سے پک کرلوں گی۔ تم ڈرائیور کو واپس بھیج دو۔"

"او کے......" ایشال کال سن کر پلٹی تو اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔ کال سننے کے دوران اسے شرٹ کے اوپر سے استری اٹھا کر سائڈ پر رکھنا یاد ہی نہیں رہا تھا۔

ڈاکٹر عمر کی شرٹ استری سے بری طرح جل چکی تھی۔

"او گاڈ......! میری نیکیاں ہمیشہ میرے گلے کیوں پڑ جاتی ہیں؟"

"مما بھئی کہاں ہیں آپ، ابھی تک میری شرٹ پریس نہیں ہوئی کیا؟" ڈاکٹر عمر ماں کو ڈھونڈتے ہوئے اسٹور میں داخل ہوئے تو اپنے سامنے ایشال کو اور پھر اس کے ہاتھوں میں اپنی جلی ہوئی شرٹ دیکھ کر بھونچکا رہ گئے۔

"تم......؟ اور...... یہ شرٹ تمہارے ہاتھ میں؟" وہ غصے میں آگے بڑھے۔

ایشال نے چہرہ جلی ہوئی شرٹ کے پیچھے چھپا لیا۔

"مم...... مجھ...... سے...... جل...... گئی...... آپ کی شش...... شرٹ......" وہ بری طرح سے ہکلائی۔

ڈاکٹر عمر نے غصے میں ہاتھ بڑھا کر شرٹ کھینچ کر اس کے چہرے سے ہٹائی تو ایشال نے آنکھیں میچ لیں۔

"انتہا درجے کی اسٹوپڈ ہو تم...... جو کام انسان کو سرے سے ہی نہ آتا ہو تو اسے دوسروں کے سامنے کبھی شیخی دکھانے کے لیے بھی نہیں کرنا چاہیے۔" اسے ڈاکٹر عمر کی سخت نظریں اپنے چہرے پر گڑتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

"بس...... سوری...... عمر بھائی...... مم...... میں تو پھپو کی ہیلپ کرنے کی کوشش کر رہی تھی...... پتا نہیں یہ کیسے...... جل گئی۔"

"مما کو پتا بھی ہے کہ تم ایک نان سیریس قسم کی لڑکی ہو...... تمہاری ہیلپ ہمیشہ دوسروں کے لیے مہنگی ہی پڑتی ہے پھر بھی...... میری فیورٹ شرٹ تمہیں پریس کرنے کے لیے دے دی۔"

ڈاکٹر عمر نے شرٹ آئرن اسٹینڈ پر پھینکی اور اسٹور روم سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

داؤد چوہدری اور سمیرا بیگم...... بڑی اماں کے کمرے میں موجود تھے...... پینو چائے کی ٹرالی وہیں لے آئی تھی...... اور انہیں چائے سرو کر رہی تھی۔

"داؤد میرے بچے، اپنے ملک کو چھوڑ کر کیا ضرورت تھی ملائشیا میں نئی فیکٹری لگانے کی؟"

نور بیگم اپنی راکنگ چیئر پر براجمان تھیں...... پینو کے ہاتھ سے چائے کی پیالی پکڑتے ہوئے وہ ان سے مخاطب ہوئیں۔

"اماں جی ہمارے ملک کے آج کل جو حالات چل رہے ہیں اس صورتِ حال میں یہاں مزید پیسہ انویسٹ کرنا سراسر بے وقوفی ہے۔ یہاں لوگوں کے چلتے کاروبار تباہ ہو گئے ہیں...... لوڈ شیڈنگ سے لوگوں کی فیکٹریاں اور ملیں بند ہو رہی ہیں...... لوگ اپنے ملک کو چھوڑ کر...... بنگلا دیش، ملائشیا اور دوسرے ملکوں میں نئی فیکٹریاں لگا رہے ہیں۔ اماں جی اسی لیے میں نے بھی زارون ٹیکسٹائل کے نام سے ملائشیا میں نئی فیکٹری لگانے کا فیصلہ کیا ہے......

اپنے ملک میں ٹیکس دینے کے باوجود ہمارے لیے مسائل کے انبار لگ رہے ہیں۔"

داؤد چوہدری چائے کے سپ لیتے ہوئے بولے۔

"ہاں بیٹا کہتے تو تم بالکل ٹھیک ہی ہو...... یہاں کے حالات دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے مگر یہ ملک ہمارا ہے،ہمیں ہی اسے ٹھیک بھی کرنا ہے۔" نور بیگم بھی دکھی ہوئیں۔

"چھوڑیں داؤد اس ٹاپک کو...... خوامخواہ بی پی ہائی ہوجائے گا آپ کا بھی اور اماں کا بھی۔" سمیرا بیگم چائے پیتے ہوئے مسکرائیں۔

"بس بہو...... یہ ملک ہماری شناخت ہے...... بہت اچھا وقت گزرا ہے یہاں ہمارا...... جس درخت کی چھاؤں تلے انسان ستانے بیٹھتا ہو اس درخت کی شاخیں کاٹ کر اس کی چھاؤں ختم کردی جائے تو...... ستانے والوں کا چھاؤں کی فکر کرنا عجیب بات نہیں...... اور پھر اس ملک کو تو ہم نے بہت قربانیوں کے بعد حاصل کیا تھا... بہرحال...... وہی وقت اچھا تھا کم از کم زندگیوں میں سکون تو تھا۔"

داؤد چوہدری نے چائے کی خالی پیالی ٹرالی میں رکھی۔

نور بیگم نے ایک طویل سانس لی......

"میں نے صبح اقصم سے بات کی تھی...... ماشاءاللہ آواز سے تو بالکل ٹھیک لگ رہا تھا۔" انہیں اچانک اقصم کا خیال آیا۔

"جی اماں شکر ہے اب تو اقصم بالکل ٹھیک ہے بتا رہا تھا کہ مناب دو دن اس کے پاس ہی رہی اور اس نے اقصم کا بہت خیال رکھا۔" سمیرا بیگم نے انہیں تفصیل سے بتایا۔

"ساجدہ آپا نے اصغر بھائی (بہنوئی) کی وفات کے بعد جس طرح سے عمر اور مناب کی تربیت کی انہیں اعلیٰ تعلیم یافتہ بنایا وہ نہایت قابلِ تعریف ہے۔ مناب کو دیکھ کر ہمیشہ میں سوچتا ہوں کہ اگر اللہ نے مجھے ایک اور بیٹا دیا ہوتا تو یقیناً میں اس کے لیے مناب کا انتخاب کرتا۔"

داؤد چوہدری کے انداز اور لہجے میں خوشی تھی...... تفاخر تھا۔

"ہاں یہ تو ہے...... بہرحال ولی بھی بہت اچھا لڑکا ہے...... اللہ اسے ولی کے ساتھ خوش رکھے۔" سمیرا بیگم نے بھی تائید کی۔

"اماں میں ایک بات سوچ رہا تھا۔ زارون کی شادی کے بعد اقصم اور ایشال کی باقاعدہ منگنی نہ کردی جائے؟" انہوں نے ماں سے رائے لی۔

"ہاں بیٹا تم ٹھیک کہہ رہے ہو...... یہ جو دونوں ہر وقت چونچیں لڑاتے رہتے ہیں، ہر وقت ایک دوسرے سے بحث وتکرار اور لڑائی جھگڑوں میں وقت برباد کرتے ہیں...... کم از کم اس سے تو ہماری جان چھوٹے گی۔" نور بیگم کے انداز پہ داؤد اور سمیرا دونوں ہی مسکرا دیے۔

"اقصم کے آنے میں چند مہینے ہی تو رہ گئے ہیں، زارون کی شادی پہ آئے گا تو میں اس سے ایشال کے حوالے سے بات کروں گی۔" سمیرا بیگم نے ارادہ ظاہر کیا۔

"ایشال سے یاد آیا۔ بھئی کہاں ہیں میری دونوں بیٹیاں...... نظر نہیں آرہیں؟" داؤد چوہدری نے فکرمندی سے پوچھا۔

"دونوں کہیں باہر نکلی ہیں۔"

"اچھا اسی لیے گھر میں رونق نہیں ہے...... خاص طور پر ایشو گھر میں ہو تو کچھ نہ کچھ الٹا سیدھا ہوتا رہتا ہے گھر

میں۔'' داؤد مسکرائے۔

''تو اور کیا...... پچھلے دنوں تو ایشو نے میرا بی پی تک غلط چیک کیا۔ وہ تو بھلا ہو عمر کا...... وہ آیا اس نے دوبارہ مجھے چیک کیا تو پتا چلا کہ ایشو کا تو بی پی آپریٹس ہی خراب تھا۔'' نور بیگم نے مسکراتے ہوئے بیٹے کو تفصیل بتائی تو داؤد کے ساتھ سمیرا بھی ہنسنے لگیں۔

''پھر تو ایشو کو ڈانٹ پڑی ہوگی عمر سے۔'' داؤد چوہدری صوفے سے اٹھتے ہوئے بولے۔

''ہاں عمر تو کہہ رہا تھا اس غیر سنجیدہ لڑکی کو ڈاکٹر بنا کر ہم نے اچھا نہیں کیا۔''

نور بیگم کی بات پر مسکراتی ہوئی سمیرا بیگم بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''اماں اسی لیے تو عمر کے ساتھ ایشو کو ایڈجسٹ کروایا ہے۔ اس کے سنجیدہ مزاج سے، رعب دار شخصیت سے ڈرتی ہے ایشو اور عمر جیسے ذمے دار بندے کے ساتھ کام کرے گی تو اس کے مزاج میں بھی سنجیدگی آجائے گی۔''

''اللہ کرے میرے بچے، ایسا ہی ہو...... ورنہ یہ بیل تو منڈھے چڑھتی دکھائی نہیں دیتی۔'' وہ دونوں ہنسنے لگے۔

''اماں اب ہمیں اجازت دیجیے...... ہمیں ایک ڈنر پر جانا ہے۔'' داؤد چوہدری نے مسکراتے ہوئے اجازت طلب کی۔

''اچھا میرے بچوں اللہ تم سب کو اپنی امان میں رکھے۔'' دونوں ماں سے اجازت لے کر کمرے سے نکل گئے تھے۔ پینو جب چائے کی ٹرالی کچن میں چھوڑ کر دوبارہ نور بیگم کے کمرے میں آئی تو وہ چھڑی کے سہارے چلتی ہوئی بیڈ پر بیٹھ چکی تھیں۔ پینو...... ان کے پاس بیٹھ کر ان کی ٹانگیں دبانے لگی۔

''پینو تم ذرا وہ ڈراما تو لگا دو...... جو مجھے بہت پسند ہے۔'' نور بیگم نے فرمائش کی۔

''وڈی اماں، کمال ہے، آپ کے ساتھ چووی (چوبیس) گھنٹے صائمہ چوہدری والا ڈراما دیکھ دیکھ کے میرا دماغ پُٹھا (الٹا) ہو گیا پر آپ کو ابھی اس ڈرامے کا ناں وی یاد نہیں ہویا۔''

پینو نے ڈراما سیریل ڈولی کی آئے گی بارات کی سی ڈی لگاتے ہوئے نور بیگم سے بے تکلفانہ لہجے میں کہا۔

''مجھے ڈرامے کے نام سے کیا لینا دینا...... مجھے تو بس صائمہ چوہدری پسند ہے میں تو اسی کے لیے دیکھتی ہوں یہ ڈراما......'' نور بیگم نے اس ڈرامے کی پوری سیریز دیکھ رکھی تھی...... اور ان کے پاس تمام کی سی ڈیز موجود تھیں۔ وہ ذرا سا بھی بور ہوتیں تو پینو سے یہی سی ڈی لگوالیا کرتیں...... ان کے ساتھ، ساتھ پینو کو بھی یہ ڈراما ہر روز دیکھنا پڑتا تھا۔

☆☆☆

سارہ جب مجھے دل کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تو سیما بیگم اسے دیکھ کر حیران ہوئیں...... اور اس سے زیادہ حیران اس کی آنکھوں میں سجا کاجل دیکھ کر ہوئیں۔

''تم نے تو کہا تھا کہ تم دیر سے گھر آؤ گی؟ اور یہ کاجل کہاں سے آنکھوں میں لگا لیا تم نے؟''

سارہ کمرے میں داخل ہوئی تو وہ اس کے پیچھے چلی آئیں۔

''ہاں دیر سے ہی گھر آنا تھا اماں...... مگر حنا آج خود کالج آگئی تھی...... اب وہ کافی بہتر ہے اور اسی نے میری آنکھوں میں کاجل لگایا ہے۔ آج کل وہ پارلر کا کام سیکھ رہی ہے۔''

سارہ نے بہانہ بنایا...... چادر اتاری اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔

''زویا آپی نہیں آئیں؟''

''زویا باتھ روم میں ہے...... چل تو پھر کپڑے بدل لے اور روٹی بنالے۔''

''اماں آج میرے سر میں بہت درد ہے آج زویا آپی سے کہو وہ روٹی بنادیں گی۔'' سارہ پلنگ پر لیٹ گئی تھی۔

''ٹھیک ہے میں زویا سے کہہ دیتی ہوں...... میں نے پیاز انڈے بنا دیے تھے۔'' سیما بیگم باہر جانے کے لیے اٹھیں۔

''اماں گلو کا کچھ پتا چلا؟'' سارہ نے فکرمندی سے پوچھا۔گلو دو دن سے گھر نہیں آیا تھا اور اس کا فون بھی بند تھا۔

''نہیں...... نہ جانے کہاں دفع ہو گیا ہے یہ لڑکا...... تیرے ابا اسی کا پتا کرنے گئے ہیں۔'' انہوں نے ایک سرد آہ بھری۔

''پتا نہیں یہ دو دن اس نے کہاں اور کس کے پاس گزارے ہوں گے؟ زندگی میں پہلے پریشانیاں کیا کم تھیں جو یہ لڑکا اور پریشانیاں دینے پر تل گیا ہے۔'' سیما بیگم بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔

اور سارہ پلنگ پر لیٹی ...... اسجد کے بارے میں سوچنے لگی وہ اس کے بارے میں جتنا سوچتی خود کو اتنا ہی ملامت کرتی...... اسے اسجد کا اظہارِ محبت یاد آتا...... شدید گرمی اور دھوپ میں اس کا انتظار کرنا یاد آتا۔انہی سوچوں میں لیٹے، لیٹے جانے کتنا وقت گزر گیا تھا کہ زویا ہاتھ میں ٹرے پکڑے کمرے میں داخل ہوئی۔

''سارہ اٹھو کھانا کھالو......'' اس نے پلنگ پر ایک طرف ٹرے رکھی۔

''آپی مجھے بھوک نہیں آپ کھالیں۔''

''ارے کیوں......؟ بھوک کیوں نہیں ہے تمہیں؟''

''حنا نے کینٹین سے سموسے کھلا دیے تھے...... میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ میں تھوڑی دیر سونا چاہتی ہوں۔'' سارہ کے انداز میں بیزاریت تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے میں تمہیں سر درد کی گولی لا دیتی ہوں تم کھا کر تھوڑی دیر سو جاؤ۔'' زویا نے دراز سے سر درد کی گولی نکال کر اسے دی۔پانی کا گلاس اٹھا کر اسے پکڑایا۔وہ دوا کھا کر دوبارہ لیٹ گئی۔

زویا، ٹرے اٹھا کر کچن میں آگئی...... اور وہیں چوکی پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگی۔

''زویا میں ذرا تیری پھپو نگہت کی طرف جا رہی ہوں...... صبح سے دو بار پیغام بھیج چکی ہے۔آج سمعیہ کی سسرال والے شادی کی تاریخ لینے آ رہے ہیں...... تمہارے ابا گھر آئیں تو کہنا کہ ساتھ والے رشید کا موٹر سائیکل لے کر وہیں آجائیں۔ میں انہی کے ساتھ واپس آجاؤں گی۔'' سیما بیگم چادر اوڑھتے ہوئے زویا کو ہدایت دینے لگیں۔

''جی اماں...... میں کہہ دوں گی ابا سے۔'' زویا نے پانی کا گلاس لبوں سے لگایا۔

''میں چلتی ہوں تم کنڈی لگا لینا......'' وہ بے فکر ہو کر باہر نکل گئیں۔

زویا نے کھانا ختم کیا...... دھونے والے برتن سنک میں رکھے اور خود دروازہ بند کرنے کے لیے صحن میں آگئی۔ ابھی وہ دروازہ بند کرنے ہی والی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور خضر اپنی پھٹیچر سی موٹر سائیکل لے کر اندر داخل ہو گیا۔

''میرے استقبال کے لیے تم یوں راستے میں کھڑی نظر آؤ گی؟ یقین نہیں آ رہا مجھے۔'' خضر نے مسکراتے ہوئے موٹر سائیکل درخت کے نیچے کھڑی کی اور زویا سے مخاطب ہوا۔

''جی نہیں میں تمہارے استقبال کے لیے نہیں بلکہ دروازہ بند کرنے کے لیے آئی تھی۔'' وہ مسکرائی۔

''ہر وقت میرے دل میں رہتی ہو مگر مجال ہے جو تم نے کبھی میرا دل رکھنے کی کوشش کی ہو۔'' وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھ آیا۔

زویا درخت کے نیچے چار پائی بچھا چکی تھی۔
''اماں اور ابا گھر پر نہیں ہیں۔'' اس نے اطلاع دی۔
''یہ تو اور بھی اچھا ہے۔'' خضر نے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھا۔
''اماں تمہاری طرف ہی گئی ہیں۔'' زویا نے سر جھکا لیا۔
''مجھے پتا ہے اسی لیے تو آیا ہوں۔''
''مگر کیوں؟''
''تمہیں دیکھنے کو دل چاہ رہا تھا۔ اور کیوں......''
''دیکھ لیا ہے...... اب جاؤ...... ابا آگئے تو کیا سوچیں گے۔'' زویا کو فکر ہوئی۔
''تو دیکھ لیں میں کون سا غیر ہوں...... تمہارا منگیتر ہوں...... اور ماموں کا بھانجا ہوں۔''
''چائے بناؤں تمہارے لیے......؟'' وہ پوچھنے لگی۔
''نہیں...... بس تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھ جاؤ......'' خضر اسے کلائی سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھانے لگا۔
''کیا کر رہے ہو خضر......؟'' زویا نے نرمی سے اس کے ہاتھ سے اپنی کلائی چھڑانی چاہی۔
''کچھ نہیں کر رہا میں...... بیٹھو میرے پاس۔'' خضر نے اس کی کلائی پکڑے پکڑے اسے اپنے ساتھ چار پائی پر بٹھا لیا۔
''کیا کر رہے ہو......؟ اندر سارہ سو رہی ہے وہ اٹھ گئی تو......؟'' زویا گھبرائی۔
''تو دیکھ لے یار، تم میری ہونے والی بیوی ہو۔'' خضر نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے جیب سے دو ہزار نکالے اور زویا کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔
''یہ کیا ہے؟'' وہ حیران ہوئی۔
''دو دن بعد تمہاری سالگرہ ہے۔ اس بار امی کو تنخواہ دیتے ہوئے یہ دو ہزار میں نے سائڈ پر رکھ لیے تھے...... میری طرف سے ان روپوں کی کوئی چیز خرید لینا۔''
''ارے نہیں خضر...... یہ بہت زیادہ ہیں، یہ میں نہیں لے سکتی۔'' زویا نے ہاتھ پیچھے کیا۔
''یہ زیادہ نہیں بلکہ بہت کم ہیں، آج کل دو ہزار کی بھلا اوقات ہی کیا ہے۔''
''مگر میرے لیے یہ بہت زیادہ ہیں خضر......''
''زویا پلیز مجھے شرمندہ مت کرو...... اور یہ رکھ لو...... مجھ پر اگر چار جوان بہنوں کی ذمے داریوں کا بوجھ نہ ہوتا تو یقیناً تمہارے ارمان، تمہارے چاؤ اپنی حیثیت سے بڑھ کر پورے کرتا......'' وہ بیچارگی سے کہہ رہا تھا۔ ''سمیعہ کی شادی کے بعد مزید تین بہنوں کی ذمے داریوں سے ابھی سبکدوش ہونا باقی ہے...... نہ جانے ابھی ہمیں اور کتنے سال لگیں گے ایک ہونے میں۔'' خضر نے افسردگی سے زویا کے ہاتھ تھام لیے۔
''تم پریشان مت ہوا کرو خضر...... انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہاں ہم سب بھی انہی حالات سے نبرد آزما ہیں...... گلو کی حرکتیں روز بروز ناقابلِ برداشت ہو رہی ہیں...... اس گھر کو چلانا روز بروز مشکل ہو رہا ہے۔ اوپر سے خالد بھائی...... وہ زارا بجو کو چوتھے بچے کی ولادت کے لیے یہاں بھیج رہے ہیں...... کچھ سمجھ میں نہیں آتا اس گھر کے حالات کب اور کیسے بدلیں گے؟''
زویا کی پریشانی دیکھ کر خضر اپنی پریشانیاں بھول گیا۔
''اس ملک میں امیر روز بروز امیر ہو رہا ہے اور غریب یہاں روز بروز مزید غریب ہو رہا ہے نہ جانے

ہمارے طبقے کو سکھ کی سانس کب نصیب ہوگی؟'' خضر حد درجہ مایوس ہوا۔
''میں نے تم سے کہا تھا کہ اپنے آفس میں میرے لیے کوئی جاب ڈھونڈنا۔'' زویا کو یاد آیا۔
''مجھے یاد ہے زویا اور یہ کوئی بھولنے والی بات تھوڑی ہے، میں نے اپنے آفس میں بات کر رکھی ہے جونہی کوئی سیٹ خالی ہوئی، میں تمہیں وہاں جاب دلوانے کی پوری کوشش کروں گا۔''
زویا نے اس کی یقین دہانی پر اثبات میں سر ہلایا۔

☆☆☆

زارون کو ملائشیا گئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا..... عنایہ زارون کے بغیر خود کو بہلانے کے لیے خود کو مصروف رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی..... اس وقت بھی وہ اسے بیڈ پر بیٹھی گود میں لیپ ٹاپ رکھے..... ٹیکسٹائل کے حوالے سے پرنٹ ڈیزائنگ میں مصروف تھی۔ جب اس کے موبائل پر میسج ٹون بجی..... عنایہ نے موبائل اٹھا کر دیکھا اور مسکرا دی۔

اس نے لیپ ٹاپ پر کھلے پروگرام کو Minimise کیا..... اور اسکائپ پہ آن لائن ہو کر اسے وڈیو کال کی۔ اگلے ہی لمحے وڈیو کال تھرو ہوگئی اور زارون چوہدری کا مسکراتا ہوا چہرہ اسے اندر تک سرشار کر گیا۔
''کیسی ہو سویٹ ہارٹ.....؟'' اس نے بڑے پیار سے عنایہ کو مخاطب کیا۔
''میں ٹھیک ہوں..... تم کیسے ہو؟ کیسا ٹائم گزر رہا ہے؟'' عنایہ نے پُرجوش ہو کر پوچھا
جواب دینے سے پہلے زارون نے اِک سرد آہ بھری۔ ''یار تمہیں بہت مس کر رہا ہوں کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ ویسے پاپا کو چاہیے تھا کہ وہ شادی کے بعد مجھے یہاں بھیجتے..... کم از کم تم تو میرے ساتھ ہوتیں۔'' وہ اداس لہجے میں بولا۔
''انشاء اللہ چند مہینوں کے بعد ہم ہمیشہ ایک ساتھ ہوں گے۔'' عنایہ مسکرائی۔
''ہاں بالکل..... تم ہی تو میری آنکھوں کی روشنی اور میرے لبوں کی مسکراہٹ ہو، تمہارے بغیر میری لائف اِن کمپلیٹ ہے۔''
فخر اور خوشی سے عنایہ کی آنکھیں اور ہونٹ مسکرانے لگے۔
''اگر میں اتنی ہی اہم ہوں تو مجھے چھوڑ کر گئے ہی کیوں؟'' زارون نے ایک طویل سانس لی۔
''مجبوری نہ ہوتی تو کبھی نہیں جاتا۔ یہ بتاؤ گھر میں سب ٹھیک ہیں؟''
''ہاں سب تو ٹھیک ہیں پر میں نہیں۔''
''کیوں کیا ہوا؟'' وہ فکرمند ہوا۔
''تمہیں بہت مس جو کرتی ہوں.....'' زارون اس کی بات پر مسکرایا۔
''کہتے ہیں دور جانے سے محبت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔'' زارون کا انداز چھیڑنے والا تھا۔
''میں جانتی ہوں..... ہم صرف ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں..... اور ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اس یقین اور اطمینان کے لیے ہمیں ایک دوسرے سے دور جانے کی ضرورت نہیں ہے زارون..... ہم ایک بے تاب آرزو کی طرح ایک دوسرے کے دل میں دھڑکتے ہیں۔''
''ہاں ٹھیک کہتی ہو تم..... جو دل کے آئینے میں بسے ہوں ہر وقت' ہر لمحہ اور ہر جگہ وہی دکھائی دیتے ہیں ہمیں.....'' وہ جذباتی ہوا۔ اور عنایہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔
''جیسے یہاں ہر جگہ مجھے تم ہی تم دکھائی دیتی ہو۔'' زارون کے اظہار پر ایک کھنکتی ہوئی ہنسی اس کے لبوں پر بکھر

گئی تھی۔

وہ ایسا ہی تھا دل کھول کر عنایہ سے محبت کا اظہار کرنے والا...... اس کی بے پناہ تعریفیں کرنے والا اسے سراہنے والا...... اور وہ بھی زارون کی حد درجہ چاہتوں، بے پناہ محبتوں پہ کھل اٹھتی تھی...... کبھی کبھی وہ خود بھی اپنی قسمت پر رشک کیا کرتی کہ ایک کامیاب ترین ہر لحاظ سے مکمل پرسنالٹی کا حامل شخص اسے ٹوٹ کر چاہتا ہے وہ اس کے دل پر راج کرنے والی پہلی اور آخری لڑکی ہے۔ ان کے سوشل سرکل کی تمام لڑکیاں عنایہ کی قسمت پر رشک کیا کرتی تھیں۔ ان دونوں کا شمار اپنی سوسائٹی کے چند پرفیکٹ اور خوب صورت ترین کپلز میں ہوتا تھا۔ ایک مکمل زندگی نے ان کے گرد اپنی محبت کے پر پھیلا کر انہیں اپنی آغوش میں لے رکھا تھا مگر وہ دونوں یہ نہیں جانتے تھے کہ زندگی اگر اپنی خوب صورتی دکھاتی ہے تو بدصورتی بھی دکھاتے دیر نہیں لگاتی۔ اگر محبت اپنے پر پھیلا کر اپنی آغوش میں لیتی ہے تو محبت تپتی دھوپ میں پھینک کر امتحان لینا بھی جانتی ہے۔ آنے والا وقت ان کے لیے خوشیوں کے پیغام لانے والا تھا یا ان کو کڑے امتحان میں ڈالنے والا تھا؟ وہ دونوں بے خبر تھے۔ وہ دونوں انجان ایک دوسرے کی محبت میں بس گم تھے۔

☆☆☆

ایک ایمرجنسی آگئی تھی۔ جس کی وجہ سے آج ڈاکٹر عمر وقت سے پہلے اسپتال آگئے تھے۔ بچے کو پے در پے موشن اور الٹیاں آنے سے فٹس پڑ رہے تھے...... بروقت طبی امداد ڈرپ وغیرہ لگانے سے بچے کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ ڈاکٹر عمر ایمرجنسی وارڈ سے باہر نکلے تو انہوں نے ایشال کے نمبر پر میسج ٹائپ کیا...... اور اسے بتایا کہ وہ اسپتال آچکے ہیں...... تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے روم کے ساتھ ملحق سٹنگ روم میں آکر اپنے لیے کافی بنانے لگے۔ آج ڈاکٹر عمر ناشتا کیے بغیر ہی اسپتال آگئے تھے۔

اسپتال میں ٹی بوائے بھی موجود تھے جو دیگر ڈاکٹرز کو چائے وغیرہ بنا دیا کرتے تھے مگر ڈاکٹر عمر ایسے چھوٹے موٹے کام مثلاً چائے یا کافی وغیرہ خود ہی بنالیا کرتے تھے۔ کافی کے ساتھ کوکیز لینے کے بعد وہ اپنے آفس میں اپنی مخصوص ریوالونگ چیئر پر آکر بیٹھ گئے۔ جہاں وہ اپنے پیشنٹ کو چیک کیا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ صبح ڈیوٹی کرنے والی نرس بھی وہاں موجود تھی۔

''ڈاکٹر ایشال ابھی نہیں آئیں؟'' انہوں نے نرس سے دریافت کیا۔

''نہیں سر، وہ ابھی نہیں آئیں۔''

''اوکے آپ سرمد سے پوچھیں...... باہر کتنے مریض ہیں؟ مجھے آج دو بجے کہیں جانا ہے...... اگر مریض ہیں تو انہیں اندر بھیجنا شروع کریں۔'' ڈاکٹر عمر کی ہدایت پر نرس اثبات میں سر ہلا کر روم سے باہر نکل گئی۔ اسی اثناء میں ان کے روم کا دروازہ کھلا تھا اور ایشال...... پرنٹڈ بلیک اور یلو کلر کے نیرو ٹائٹ پر پلین یلو کلر کا ٹاپ پہنے ماتھے پر گلاسز اور ہاتھ میں شوز کے ساتھ میچ کیا بلیک پرس پکڑے داخل ہوئی۔

ڈاکٹر عمر نے اسے سرتاپاؤں دیکھا اور بھونچکا رہ گئے...... ٹائٹ میں پھنسی اس کی ٹانگیں...... گھٹنوں سے اوپر ہاف سلیوز ٹاپ...... ڈاکٹر عمر کے ماتھے پر ابھرنے والی شکنیں دیکھ کر ایشال کو خطرے کی گھنٹیاں صاف سنائی دینے لگیں۔

''السلام علیکم......'' ایشال نے جلدی سے انہیں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' مختصر جواب......

''یہ کس حلیے میں تم اسپتال آئی ہو؟''

’’کک کیا مطلب......؟‘‘ ایشال نے حیرت سے اپنے لباس کو دیکھا۔ وہ اور عنایہ تو عام طور پر ایسا ہی لباس پہن کر شاپنگ مالز اور مارکیٹس بھی چلی جایا کرتی تھیں۔ گھر میں تو وہ اکثر سلیولیس پہنا کرتی تھیں......اور یہ لباس تو ایشال کو اچھا خاصا معقول لگ رہا تھا۔

’’تمہیں ہر بات کے مطلب سمجھانا میرے فرائض میں شامل نہیں ہے......کبھی اپنے فضول برین کا استعمال بھی کر لیا کرو...... جاؤ جا کر خود کو آئینے میں غور سے دیکھو......تمہارے گاڑی سے نکل کر یہاں تک آنے میں نہ جانے کتنے مردوں کی گندی نظریں تم پر اٹھی ہوں گی ......اندازہ ہے تمہیں؟ گھر اور پبلک پلیس میں کیا فرق ہوتا ہے......تم کیا دودھ پیتی بچی ہو کہ ہر بات تمہیں سمجھانی پڑ جائے؟‘‘ ڈاکٹر عمر غصے میں بولتے ہوئے اپنی چیئر سے اٹھ کر اس کے سر پر کھڑے اسے بری طرح سے ڈانٹ رہے تھے۔

’’ایسا لگ رہا ہے جیسے تم اسپتال کے بجائے کسی فیشن شو میں آئی ہو۔‘‘ آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ وہ گھر بھر کی لاڈلی تھی وہ منہ سے جو بات نکالتی اسے پورا کیا جاتا تھا۔ ایک ڈاکٹر عمر ہی تھے جو دھڑلے سے اسے دومنٹ میں جھاڑ دیا کرتے تھے۔ گو کہ ڈاکٹر عمر غلط نہیں کہہ رہے تھے مگر ان کا سخت لہجہ ایشال کو اندر تک چھلنی کر گیا تھا۔

’’اگر میرے اسپتال میں میرے ساتھ تم نے کام کرنا ہے تو آئندہ ایسا گھٹیا ڈریس پہن کر مت آنا...... now go back and get change your dress‘‘ ڈاکٹر عمر نے غصے میں اپنا آخری جملہ ادا کیا اور واپس اپنی چیئر پر آ بیٹھے......ایشال سر جھکائے ان کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ تمام راستے وہ روتی رہی تھی۔

گھر آ کر اس نے خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا تھا پھر وہ دوبارہ اسپتال نہیں گئی تھی۔

☆☆☆

کہتے ہیں محبت ایک پرندے کی طرح ہوتی ہے اسے سختی سے رکھو گے تو یہ مر جائے گی اور اسے نرمی سے رکھو گے تو یہ اڑ جائے گی۔

شاید سارہ کے ساتھ بھی ان دونوں باتوں میں سے کوئی ایک ہوئی تھی۔ اسجد دوبارہ اسے کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ روز لاشعوری طور پر کالج سے چھٹی کے وقت اس کا انتظار کرتی...... کئی بار رک کر پلٹ کر دیکھتی اور مایوس ہو کر چلنے لگتی۔ اس کے دل کی حالت بھی عجیب ہوگئی تھی۔ نہ اسے بھوک لگتی نہ وہ ہنستی بولتی...... چھوٹی سے چھوٹی بات پر آج کل وہ جھنجلا جاتی۔ اپنے پاس ٹیوشن پڑھنے والے بچوں کو وہ بات بات پر جھاڑ دیتی...... وہ کوئی کام کرتی تو اس کے کانوں میں اسجد کی محبت بھری باتیں گونجتیں، وہ صبح شام خود کو ملامت کرتی کہ ناحق اس نے اسجد کی محبت کو ٹھکرا دیا...... سمعیہ کی شادی میں بھی اس نے کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ زارا بجو اپنی تینوں بچیوں سمیت ان کے گھر میں آ چکی تھی...... وہ پھر بھی خاموش رہی۔ اس دن بھی وہ بے دلی سے صبح کالج جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ جب زویا نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

''سارہ کیا بات ہے......؟ میں کئی دن سے محسوس کر رہی ہوں...... تم بہت چپ چپ رہنے لگی ہو؟''

''کچھ نہیں آپی...... بس ایگزامز ہونے والے ہیں...... پھر گھر کے حالات دیکھ کر ٹینشن سے ہنسنے بولنے کو دل ہی نہیں کرتا۔''

سارہ کی بات پہ زویا نے پیار سے اس کے کندھے پر چپت لگائی۔

''پگلی! میرے ہوتے ہوئے تمہیں پریشان ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں۔'' سارہ...... اس کی تسلی پر صرف اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

''چلو شاباش...... باہر آؤ...... مل کر ناشتا کرتے ہیں۔''

زویا اسے صحن میں لے آئی...... شاکر حسین صحن میں رکھی چیئر پر بیٹھے تھے...... ان کے سامنے ایک چھوٹی سی ٹیبل رکھی تھی جس پر چائے کا ایک کپ اور چنگیر میں رکھی روٹی سے وہ ناشتا کر رہے تھے...... سیما بیگم کچن میں روٹیاں بنا رہی تھیں...... زارا بھی ان کے پاس موڑھے پر بیٹھی تھی ......اور چائے میں روٹی ڈبو کر اپنی تینوں بچیوں کے منہ میں باری باری نوالے ڈال رہی تھی۔

اب ایک، ایک روٹی زویا اور سارہ کی ہے......'' سیما بیگم نے توے سے روٹی اتار کر الگ چنگیری میں رکھی۔

''نانی...... بھوک لگی ہے، ہمیں اور روٹی دو ناں......'' زارا کی سب سے چھوٹی تین سالہ بیٹی نے نانی سے کہا۔

''غضب خدا کا...... تم تینوں ایک، ایک روٹی کھا چکی ہو ابھی بھوک نہیں مٹی کیا......؟ یاجوج ماجوج کی اولاد کہیں کی...... اپنے باپ پر گئی ہیں تیری بیٹیاں......'' سیما بیگم نے غصے میں اپنے پاس بیٹھی زارا کو گھورا۔

''اماں یہی تو عمر ہے ان بیچاریوں کے کھانے پینے کی...... اگر تھوڑی سی اور روٹی مانگ لی بچی نے تو کون سا قیامت آ گئی ہے۔'' زارا شرمندہ ہوئی۔

''تیری آمد ہمارے لیے قیامت بن کر ہی آتی ہے...... تجھ پر جو دو مہینے ہم خرچا کرتے ہیں وہ قرض کی صورت میں ایک سال میں اترتا ہے ہمارے سر سے...... تو ان کے باپ سے کیوں نہیں کہتی کہ اپنے بچوں کی ذمے داری خود اٹھائے ہم نے انہیں پالنے کا ٹھیکا نہیں لے رکھا...... یہاں تیرے باپ کی فیکٹریاں نہیں چل رہیں...... اور بھائی تیرا یہ گھر چھوڑ کر کہیں دفع ہو گیا ہے...... ہم نہ جانے کس طرح گزارہ کر رہے ہیں...... کبھی تو ہمارے حال پر رحم کر لیا کر۔ خالد جب کہتا ہے، تو بچے لے کر دوڑی چلی آتی ہے...... سمجھاتی کیوں نہیں اسے؟'' سیما بیگم کا پارہ ہائی ہو چکا تھا لہٰذا وہ بیٹی کو نان اسٹاپ کھری کھری سنا رہی تھیں۔

زارا یہ باتیں سن کر رونے لگی۔ اور اپنی تینوں بچیوں کو تھپڑ مارتی ہوئی کمرے میں لے گئی۔ زویا اور سارہ کی آنکھیں بھر آئیں...... اس گھر میں ہمیشہ لڑائی غربت کی وجہ سے ہی ہوا کرتی تھی۔

''خدا کے لیے بس کر دو سیما بیگم...... اس میں بھلا میری زارا کا کیا قصور......؟ وہ ہمارے پاس نہیں آئے گی تو اور کہاں جائے گی؟ یہ گھر اس کا میکا ہے ہم نہ رہے تو کس کے پاس آئے گی وہ یہاں؟'' شاکر حسین کو از حد افسوس ہوا۔

''ہاں میں ہی بری ہوں...... سارے قصور میرے ہی ہیں جو ایک معمولی کلرک کے ساتھ ساری زندگی نبھا کرتی رہی اور اپنی جان پر عذاب جھیلتی رہی۔ اتنی ہی پروا ہے ان بیٹیوں کی...... تو ان کے لیے کوئی ڈاکا ڈال لیا ہوتا کہیں فراڈ کر لیا ہوتا...... دنیا دفتروں میں اتنی ہیر پھیر کرتی ہے، رشوت لیتی ہے مگر آپ پر تو ساری زندگی ایمانداری کا بھوت سوار رہا۔ نہ خود ڈھنگ سے جی سکے نہ ہمیں ڈھنگ سے جینے دیا۔'' سیما بیگم غصے سے اٹھیں، ہاتھ میں پکڑا چمٹا چنگیری میں پٹخ کر کچن سے باہر نکل گئیں۔

''سیما بیگم تم تو خواہشات کی غلام عورت ہو، جس نے زندگی کی کالی راتوں میں کبھی سویرا نہیں ہونے دیا...... خواہشات کے بھنور میں پھنسی ہوئی وہ عورت ہو تم، جسے اپنا مقصدِ حیات ہی بھول گیا۔ کیونکہ تم نے ہمیشہ اپنی زندگی کو ضرورت کے بجائے خواہشات کی نذر کیا...... اری پاگل عورت، ضرورت فقیروں کی بھی پوری ہوتی ہے اور خواہشات بادشاہوں کی بھی باقی رہ جاتی ہیں...... نہ تم نے خود قناعت پسندی کی عادت اپنائی اور نہ تم نے اپنے بیٹے کو اس کا درس دیا...... تم کیا جانو عزت کمانا، دولت کمانے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے...... بے شک میں نے حرام کی کمائی سے دولت کے انبار نہیں لگائے مگر میرا دل مطمئن ہے، میرے دل میں سکون ہے کہ میں نے جو کمایا اپنی محنت سے حق حلال کمایا...... کسی کو دھوکا نہیں دیا...... کسی سے فراڈ نہیں کیا...... جُوا نہیں کھیلا...... جن چیزوں کو میرے اللہ نے حرام قرار دیا...... میں نے ان چیزوں سے پرہیز کیا۔''

''بس کریں شاکر صاحب ساری زندگی یہ کتابی باتیں کر کر کے آپ وقت گزارتے رہے ہیں...... اب ہم سے یہ عذاب نہیں سہا جاتا، نہ خیالی اور کتابی باتوں سے گزارہ ہو جاتا ہے۔'' وہ سنک پر سے ہاتھ دھو کر صحن میں بچھی چارپائی پہ آ بیٹھیں۔

''تمہاری ہر وقت کی ناشکری کی عادت، ہر وقت لعنت ملامت کرنے پر...... ہمارے گھر میں رزق سے اللہ نے اسی لیے برکت اٹھالی ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کو اور شکر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ تم اسی وجہ سے ہر وقت بے سکون رہتی ہو۔'' شاکر صاحب کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''مجھے بے سکون ہی رہنے دیں...... شکر ہے آپ تو سکون میں ہیں...... دو وقت کی روکھی سوکھی روٹی کھائی اور باہر نکل گئے۔ ایک میں جو ہوں یہاں سڑنے اور کڑھنے کے لیے۔'' سیما بیگم نے منہ پُھلایا اور چارپائی پر لیٹ گئیں۔

شاکر حسین خاصے دل گرفتہ ہو کر گھر سے باہر نکل گئے تھے۔

''اماں خدا کے لیے آئندہ ایسی باتیں مت کرنا...... اگر زارا بجو اپنے بچوں کے ساتھ ہماری طرف آ گئی ہیں تو اللہ ان کے نصیب کا رزق بھی دے گا ہمیں...... آپ میرے حصے کی روٹی بچیوں کو دے دیں...... مجھے ناشتا نہیں کرنا...... مگر آئندہ ان بیچاریوں کو یوں طعنے تشنے مت دیجیے گا۔'' سارہ نے از حد دکھ سے کہا اور چادر اوڑھ کر کالج کے لیے بھوکی ہی نکل گئی۔

زویا کا دل بھی خون کے آنسو رونے لگا۔ وہ چپکے سے کمرے میں آ گئی تھی اور اپنی دراز سے خضر کے دیے

دو ہزار روپے نکال لائی۔

''اماں یہ دو ہزار رکھ لیں۔ اس کا تھوڑا بہت جو بھی راشن آئے وہ لے آئیں...... میں نے اسکول کے سالانہ فنکشن پہ ایک سوٹ بنوانے کے لیے یہ جمع کر رکھے تھے مگر اب آپ اسے رکھ لیں۔''

زویا نے پیسے سیما بیگم کو دیتے ہوئے دل میں یہ اعتراف ضرور کیا کہ زندگی استاد سے زیادہ سخت ہوتی ہے استاد سبق دے کر امتحان لیتا ہے مگر زندگی امتحان لے کر سبق دیتی ہے۔

کمرے میں بیٹھی زارا...... اب اپنی تینوں بچیوں کو خود سے لپٹائے رو رہی تھی۔

☆☆☆

رات کے دس بجے کا وقت تھا...... وہ ایک درمیانے درجے کا کوئی رہائشی علاقہ تھا۔ دو نوجوان لڑکے پچھلے ایک گھنٹے سے اس علاقے کے بینک کے سامنے بنے پلازے کی سیڑھیوں پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ان کے قریب ہی ان کی موٹر سائیکل بھی کھڑی تھی۔ اسی اثناء میں ایک شخص موٹر سائیکل پر سوار بینک کے سامنے رکا اور بینک سے ملحق اے ٹی ایم کے کیبن کی طرف گیا۔

سامنے بیٹھے دونوں لڑکوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ اس کے بعد ایک لڑکے نے اٹھ کر اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی...... اتنے میں دوسرا لڑکا بھی ہاتھ میں پکڑا موبائل اپنی جیب میں ڈال کر اس لڑکے کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا...... اس دوران اے ٹی ایم کے کیبن کا دروازہ کھلا تھا اور وہ شخص عجلت میں موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے ان کے قریب سے گزرا......

یہ دونوں لڑکے جو پہلے سے تیار کھڑے تھے، اس شخص کے پیچھے تیزی سے موٹر سائیکل بھگانے لگے۔

''اوئے سالے تیز چلا کہیں شکار ہاتھ سے نہ نکل جائے......'' پچھلی سیٹ پر بیٹھے لڑکے نے موٹر سائیکل چلانے والے لڑکے کو تنبیہہ کی تو چلانے والے نے اسپیڈ بڑھا دی۔

آگے جا کے وہ شخص یوٹرن لینے والا تھا کہ اس کے تعاقب میں یہ دونوں لڑکے موٹر سائیکل پر سوار اس کے سر پر پہنچ چکے تھے۔ آس پاس کوئی نہیں تھا جبھی پیچھے بیٹھا لڑکا برق رفتاری سے موٹر سائیکل سے اترا اور اس شخص پر پستول تان کر دہاڑا......

''جیب میں جتنا کیش ہے جلدی نکال ورنہ اس پستول میں جتنی گولیاں ہیں تیرے بھیجے میں اتار دوں گا۔''

وہ شخص حیران پریشان، مارے خوف کے کانپنے لگا۔

''جلدی نکال جلدی......'' پستول تانے شخص نے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔ مقابل شخص کپکپاتے ہاتھوں سے جیب میں سے کیش نکالنے لگا۔

''جلدی سے نکال الو کے......'' پستول تانے شخص نے اس کے ہاتھ سے پیسے جھپٹ کر اپنی جیب میں ڈالے۔ ''اب جیب سے فون بھی نکال جلدی کر۔'' اس ڈرے ہوئے شخص نے موبائل بھی نکال لیا۔

''اب اتر اس موٹر سائیکل سے۔'' پستول تانے شخص نے ایک اور مطالبہ کیا۔

''کک کیوں بھائی...... یہ تو...... مم...... مت چھینو۔''

''ابے اترتا ہے یا اتاروں تیرے بھیجے میں گولیاں......'' پستول تانے شخص نے اسے گریبان سے پکڑ کر موٹر سائیکل سے نیچے اتارا اور خود موٹر سائیکل پر بیٹھ کر وہ دونوں نوجوان آگے پیچھے موٹر سائیکلیں بھگاتے ہوئے اس شخص کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

(جاری ہے)

ہم روحِ سفر ہیں

شہناز وسیم



اس نے ایک بار پھر لاؤنج پر نظر دوڑائی، وسیع و عریض خوب صورت و خوش رنگ کارپٹ پر گاؤ تکیے اور کشن بکھرے پڑے تھے۔ بچوں کے فیڈر سے رِسنے والے بچے کھچے دودھ نے قالین پر گول گول اور گیلے دھبے ڈال دیے تھے۔ منجھلے خالو صوفے پر گول مٹول ہو کر ٹانگیں سیکڑے پڑے تھے اور کچھ نہ کچھ بڑبڑا رہے تھے۔

"پچیس سال ہوگئے میری شادی کو، میں جب

بھی یہاں آتا، آپا جان نئے دولھاؤں کی طرح میرا سواگت کرتی تھیں۔ میں لاکھ کہتا آپ اتنا تکلف نہ کیا کریں مگر وہ کہاں ماننے والی تھیں، ہمیشہ صاف ستھرا بستر اور تکیہ فراہم کرتیں، ایک ان کے نہ ہونے سے کتنا فرق پڑا ہے نہ بستر ہے نہ تکیہ، صوفے پر پڑا ہوا ہوں۔''

''میں جب بھی رہنے آتی مجھ سمیت سب بچوں اور میاں کے کپڑے بناتیں، میں منع بھی کرتی مگر مان کر نہ دیتیں، مگر پچھلی مرتبہ نہ جانے کیا ہوا کپڑے بنانا ہی بھول گئیں۔ خیر اس عمر میں یادداشت ویسے بھی کمزور ہوجاتی ہے۔'' بڑی پھپھو کی آواز سناٹے میں لہرائی۔

''ارے اس کے ہاتھ کی کڑھی کا تو جواب ہی نہیں تھا، پورے بارہ مسالوں کا تڑکا لگاتی تھی، فون کر کے مجھے دعوت دیتی تھی کہ آج کڑھی بنا رہی ہوں کھانا ہمارے ساتھ ہی کھائیے گا...... ہائے ہائے...... آہ اب ایسی کڑھی کہاں کھانے کو ملے گی۔'' چھوٹے ماموں نے آہ بھری۔

''ارے بھئی یہ اس وقت کا کھانا کس کے گھر سے آیا تھا، اتنا بدمزہ تھا، چکنائی سے بھرپور چھیچھڑے زدہ بوٹیاں! اب تک حلق چکنا ہو رہا ہے، متلی کی سی کیفیت الگ ہو رہی ہے اس چہار دیواری کے اندر آج پہلی مرتبہ اتنا بدمزہ کھانا کھانے کو ملا۔'' پھوپا جی کسی کونے سے پکارے اور پھر ایک کونے کی طرف منہ کر کے فرش پر تھوک دیا۔

''مرحومہ بہت سے وعدے ادھورے چھوڑ کر چلی گئیں۔ میں نے کتنے مان سے کہا تھا کہ نوید کی شادی پر سوتے کے کنگن لوں گی، انہوں نے وعدہ بھی کیا تھا مگر جب بھی وعدہ یاد دلایا تو یہی کہا کہ ابھی ہاتھ تنگ ہے حالانکہ صرف میں نے کیا، خاندان بھر بلکہ سارے زمانے نے دیکھا کہ نوید کی شادی پر بھائی جی نے خزانوں کے منہ کھول دیے تھے۔ ارے جب آدمی کا دل ہی تنگ ہوجائے تو ہاتھ تو تنگ ہوگا ہی ناں...... وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہوجائے۔'' زرینہ آنٹی نے سسکیاں بھریں۔

''ارے چھوڑو زرینہ! کیا ذکر لے کر بیٹھ گئیں مرنے کے بعد ویسے بھی آدمی کی اچھائیاں یاد کرنی چاہئیں۔ اب مجھے ہی دیکھو میں یہ بات بالکل بھلا دوں گا، ایک مرتبہ میں نے کچھ قرض مانگا تھا مگر انہوں نے منع کر دیا، مجھے بہت صدمہ بھی ہوا تھا۔ خیر اب میں ہر بات بھلا دینا چاہتا ہوں کیونکہ وہ بہت اچھے گھر اور اچھی جگہ پہنچ گئیں، اللہ ان کے درجات بلند کرے۔'' بڑے خالو اپنی جھونک میں بولے جا رہے تھے۔

''ہائے اللہ! بھابی کے بعد اب ان کے گھر کی دیکھ ریکھ کون کرے گا...... دیورانی، جیٹھانی ہونے کے باوجود میرا ان کا بڑا بہنا پا تھا، ہمیشہ کہتیں''ارے کیوں کرائے کے گھر میں پڑی ہو ہمارا دل اور گھر دونوں بڑے ہیں، دروازے کھلے ہیں تمہارے لیے اس گھر کے بھی اور دل کے بھی......'' ہائے میری بہنو جیسی جیٹھانی! کہاں سے لاؤں گی اب انہیں......'' چھوٹی چچی بلک بلک کر رونے لگیں۔

''ارے کیوں رنج کرتی ہو، وہ نہیں ہیں تو کیا ہوا ان کی نشانیاں تو ہیں، ان کے بچے، ان کا گھر، ان کی چیزیں...... اب تم ہی کو یہ سب دیکھنا ہے ان سے محبت کا حق تو اسی طرح ادا ہوسکتا ہے ناں کہ ان کی تمام ذمے داریاں تم سنبھال لو اور یہ سب کرنے کے لیے تمہیں یہاں تو رہنا ہی پڑے گا۔'' چھوٹے چچا نے غمگین اور بلغمی آواز میں کہا۔

کونے میں غم سے نڈھال ایک صوفے پر پڑے نوید نے تڑپ کر ایک طنز بھری نگاہ سب رشتے داروں پر ڈالی، وہ موازنہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کون زیادہ غم سے نڈھال ہے۔ اسے ڈر تھا کہ غم کی شدت سے ان میں سے کوئی ایک آدھ اپنی جان سے ہاتھ ہی نہ دھو بیٹھے۔ وہ پرسوں رات کی فلائٹ سے اپنی ماں کی بیماری کی اطلاع سن کر اپنی بیوی عمیمہ اور دو بچوں کے ساتھ شارجہ سے یہاں پہنچا تھا۔ اس کے آتے ہی ان کی طبیعت خاصی سنبھل گئی تھی مگر رات کو اچانک ان کی حالت دوبارہ بگڑ گئی اور ڈاکٹر انہیں نہ بچا سکے۔ غم کی ایک طویل رات تھی جو ختم ہونے میں ہی نہیں آرہی تھی،

نوید کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ رات اس کی پوری زندگی پر محیط ہوگئی ہے۔

''آہ امی! کہاں سے لاؤں آپ کو...... اتنی بڑی دنیا میں ایک بھی چہرہ آپ جیسا نہیں...... آپ نے یہ کیوں سمجھا کہ اب مجھے آپ کی ضرورت نہیں رہی۔ آپ تو ہر کام میں دوسروں سے مشورہ کرتی تھیں پھر اس دنیا سے جانے کا فیصلہ بغیر کسی کو بتائے....؟ بغیر صلاح مشورہ کے.....؟ میں بہت اکیلا رہ گیا ہوں امی......'' نوید بہت جذباتی ہو کر سوچ رہا تھا اس نے بے آواز روتے ہوئے پھر ایک نگاہ رشتے داروں پر ڈالی۔ کریمن بوا سوجی آنکھوں اور غمگین چہرے کے ساتھ بالکل خاموش سی فلاسک سے گرم گرم چائے نکال کر سب کو تقسیم کر رہی تھیں۔ انہوں نے اس کے گھر نمک کا کھایا تھا' وہ اپنی ذمے داریاں نبھانے کھڑی ہوگئی تھیں۔

ثروت جو بہت دیر سے سیڑھیوں پر بیٹھی یہ منظر دیکھ اور سن رہی تھی نے سیڑھیوں کی ریلنگ پر اپنی پیشانی ٹیک دی۔ آنسو ابل ابل کر اس کا چہرہ تر کر رہے تھے۔ وہ سوا مہینہ نہا کر امی کے بلانے پر میکے رہنے آئی تھی۔ امی نے اس کے بچے کے لیے بہت پیارے پیارے کپڑے اور اونی سیٹ تیار کیے تھے۔ وہ ایک ہفتے سے امی کے ہاں تھی، امی کس قدر خوش تھیں اس کے آنے پر! اپنے ماں، باپ کو وہ ایک آئیڈیل کپل مانتی تھی۔ اس نے کبھی نہیں دیکھا کہ اس کے پاپا نے کبھی کوئی عامیانہ سا اظہارِ محبت کیا ہو یا امی نے روایتی انداز میں عورتوں والے گلے شکوے اپنے شوہر سے کیے ہوں۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے کتنے خوش اور مطمئن نظر آتے تھے۔ وہ پاپا، نوید اور اس کے شوہر کے لیے باریک ململ کے کرتوں پر نفیس کڑھائی کرتیں، سردی آنے سے پہلے نوید اور پاپا کے لیے سوئیٹر اور مفلر تیار کرتیں، گاجر اور گھیکوار کا حلوا اور گوند تیار کر کے پاپا کو اپنی نگرانی میں کھلاتیں۔ پاپا، امی کا زبان سے نہیں نگاہوں سے شکریہ ادا کرتے اور امی کا چہرہ اندرونی

غزل

حسرت بھری نگاہوں کو آرام تک نہیں
وہ یوں بدل گئے کہ اب سلام تک نہیں
جس کی طلب میں زندگی اپنی گزار دی
اس بے وفا کے لب پہ میرا نام تک نہیں
جو کہہ گئے تھے شام کو بیٹھیں گے آج پھر
کچھ سال ہوگئے کوئی پیغام تک نہیں
دفن ہوں تیرے ہجر کی اِک ایسی قبر میں
کتبے پہ جس کے آج کوئی نام تک نہیں
بے اختیار اٹھتے ہیں میرے قدم اُدھر
حالانکہ اس گلی میں مجھے کام تک نہیں

مرسلہ: نگینہ ضیا بنگش، کراچی

غزل

کسی سے کوئی شکایت نہ کچھ گلہ رکھیے
دراز صرف محبت کا سلسلہ رکھیے
خیال و خواب میں ہی اس سے رابطہ رکھیے
خرد سے کچھ تو جنوں کا معاملہ رکھیے
دلوں کی بات دلوں تک رہے تو بہتر ہے
زبان کھول کے کیوں اپنا مدعا رکھیے
تمہاری راہ پہ آجائے گا کبھی نہ کبھی
ابھی تو باتوں میں کچھ دن اسے لگا رکھیے
جدائی اس کی دل و جاں پہ لاکھ بار سہی
وہ مل ہی جائے گا اِک روز، حوصلہ رکھیے
عطائے دوست ہے جانے نہ دیجیے اس کو
متاعِ غم کو کسی طور سے بچا رکھیے
جو بات ہے، وہ دلوں تک پہنچ ہی جائے گی
چھپا کے شعر میں کچھ حرف آشنا رکھیے
خود اپنے ضبط کا دامن نہ چھوٹ جائے کہیں
قریب جا کے بھی کچھ، اس سے فاصلہ رکھیے

شاعرہ: فریدہ لاکھانی فرح، سڈنی

خوشی اور اطمینان سے پُرسکون نظر آنے لگتا۔

"اُف! میرے خدا! پاپا کہاں ہیں؟ سوری امی! ابھی تو آپ کو گئے چند گھنٹے بھی نہیں گزرے اور ہم پاپا کا خیال نہ رکھ پائے......نوید......" وہ چلائی۔

"نوید! پاپا کہاں ہیں؟ انہیں تو دیکھو......" وہ ریلنگ پکڑ کر کھڑی ہوگئی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"نوید اِدھر آؤ...... یہاں میرے پاس!" وہ پکاری۔

نوید ایک جھٹکے سے اٹھا اور دوڑتے ہوئے سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر آیا۔ ثروت نے نوید کے سینے میں منہ چھپالیا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ نوید نے اسے رونے دیا۔ منع کرنے کا کوئی فائدہ بھی تو نہیں تھا اور پھر خود بھی تو وہ دل کھول کر رونا چاہتا تھا۔ وہ اس کے بالوں پر پیار سے بوسے دے رہا تھا، اس کی آنسوؤں سے بھری گیلی آنکھوں کو چوم رہا تھا۔ ثروت اس کی ایک ہی تو بہن تھی، دونوں میں بے حد پیار اور دوستی تھی۔

"نوید! ہم اپنا بہت کچھ کھو چکے، امی کو اب کہاں سے لائیں گے۔ گھر کا حال تو تم نے دیکھ لیا...... امی کے جانے کے بعد کس طرح بکھرا پڑا ہے۔" وہ سرگوشیوں میں نوید کو بتا رہی تھی تب ہی اوپر والے بیڈ روم کا دروازہ کھلا اور عمیمہ باہر آئی، اس نے ایک رنجیدہ سی نظر دونوں پر ڈالی، ہاتھ میں پکڑی بچے کی فیڈر ریک پر رکھی اور دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی ان دونوں کے پاس آگئی۔ ثروت اس کی نند ضرور تھی مگر اس سے بہت دوستی تھی، شوہر اور اپنی نند کا درد وہ اپنے دل میں محسوس کر رہی تھی۔ اسے بھی اپنی ساس سے بے حد محبت تھی ان کے درمیان کبھی ساس، بہو والا جلاپا نہیں رہا۔ جس طرح وہ اس سے محبت کرتی تھیں وہ بھی اپنی ساس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ عمیمہ کو دیکھ کر ثروت کے آنسو ایک بار پھر چہرے کو تر کرنے لگے۔

"عمی...... تم نے دیکھا، ہم سب کے ساتھ یہ کیا سانحہ ہوگیا۔" عمیمہ نے ثروت کے کندھے پر محبت سے ہاتھ کا دباؤ ڈالا اور اس کو اپنے قریب کرلیا۔ اس کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں چوم لیں۔

"میں آپ دونوں سے ہرگز یہ نہیں کہوں گی کہ صبر سے کام لیں، مگر یہ ضرور کہوں گی کہ اس گھر میں ایک ہستی اور بھی ایسی ہے، جس کا غم ہم سب سے سوا اور جدا ہے انہیں بھی کسی کندھے اور سینے کی خواہش ہوگی...... ہاں ہم سب کے پاپا! چلیے نوید، پاپا کے پاس چلتے ہیں۔"

نوید نے ایک نظر نیچے لاؤنج پر ڈالی، وہاں لائٹ آف ہوچکی تھی اور زیادہ تر لوگ سوچکے تھے۔ واقعی ثروت ٹھیک کہہ رہی تھی اس کی ماں کا سجا ہوا اور سمٹا ہوا گھر بے طرح بکھرا پڑا تھا اس کے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی۔

"ایک گھر پر ہی کیا موقوف ہم لوگ بھی تو بری طرح بکھر گئے ہیں۔ نہ جانے کتنا عرصہ لگ جائے گا خود کو سمیٹنے اور سنبھالنے میں، چلو ثروت پاپا کے پاس چلیں۔" نوید نے ثروت کو پکڑ کر اٹھایا تبھی سب کو احساس ہوا کہ پیچھے کوئی ہے، انہوں نے مڑ کر دیکھا، پاپا کے بیڈ روم کا دروازہ کھلا تھا اور وہ نہ جانے کب ان کے پیچھے آکر کھڑے ہوگئے تھے۔ نوید نے ایک نظر ان کے چہرے پر ڈالی۔ ان کی آنکھوں میں بچھڑنے والے ساتھی کے دکھ کے ساتھ، ساتھ بچوں کے لیے محبت بھی تھی۔

"سوری میرے بچو......! تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں! مجھے تو خود اس وقت اپنے بچوں کے پاس آجانا چاہیے تھا، بیٹا تم کہاں تھے اتنی دیر...... ثروت، عمیمہ! ہم سب کا ہی غم بڑا ہے، بہت بڑا، اس کائنات سے بھی بڑا......" پاپا نے کرب سے ڈوبی ہوئی آواز میں سب کو مخاطب کیا۔

"بچو! میں آپ سے شرمندہ ہوں، آؤ میرے پاس، اچھا میرے کمرے میں چلو...... آؤ میرے ساتھ۔" احتشام صاحب نے تینوں کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور دھیرے دھیرے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

پاپا کا بیڈروم گھر کے ہر کمرے سے مختلف تھا۔ بے حد کشادہ ہوادار اور روشن...... ایک دیوار کے ساتھ کتابوں کے شیلف رکھے تھے اور رائٹنگ ٹیبل تھی' ایک کونے میں رنگ، برش، ایزل اور فریم رکھے تھے۔ تیسری جانب ایک بڑی سی کھڑکی تھی۔ نیچے لان میں لگی ہوئی ایک پھولوں سے لدی بیل دیوار کے سہارے اس کھڑکی تک آ گئی تھی۔ اس بیل کے گچھے اس کھڑکی کے راستے کبھی کبھی اندر بھی جھانکا کرتے اور دیوار گیر بڑے سے آئینے میں اپنا منہ دیکھتے تھے۔ کھڑکی کے پاس ہی رکھی ہوئی ایک ٹیبل پر الیکٹرک کیتل، کافی کے مگ، کافی میٹ اور چمچ رکھے ہوئے تھے، اس سے ذرا فاصلے پر ہینگر پر پاپا کا کیمرا، ڈریسنگ گاؤن اور کپڑے ٹنگے تھے۔ کمرے میں کوئی بیڈ نہیں تھا، صرف کارپٹ اور کشن رکھے تھے پاپا ہمیشہ زمین پر سوتے تھے ان کے کمرے میں ثروت اور نوید بہت کم آتے تھے۔ کیونکہ وہ لکھنے پڑھنے سے فارغ ہو کر پینٹنگ کرتے تھے۔ پاپا محکمۂ تعلیم کے ایک اعلیٰ افسر ہونے کے ساتھ ملک کے ایک نامور مصور بھی تھے۔ ان کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی ایگزی بیشن کئی ممالک میں ہو چکی تھی۔ ان کی بنائی ایک، ایک تصویر لاکھوں میں فروخت ہوتی تھی۔ امی ہمیشہ بچوں کو پاپا کے کمرے میں جانے سے منع کرتی تھیں، وہ کہتیں تخلیقی کام کے لیے ذہنی یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے اور آج پاپا خود ان سب کو اپنے کمرے میں لائے تھے۔

''بیٹھو بیٹا! بیٹھ جاؤ......'' انہوں نے بہت پیار سے بچوں کو مخاطب کیا تھا۔

''آج ہماری فیملی کتنی نامکمل لگ رہی ہے ایک تمہاری امی کے نہ ہونے سے۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولے۔

''ثرو، ثروت! میری جان اِدھر آؤ میرے پاس۔'' انہوں نے ثروت کا ہاتھ پکڑ کر فلور کشن پر بٹھا دیا۔

''بچو! نیچے سارے مہمان غالباً سو گئے ہیں لیکن ہم سب آج کی رات جاگیں گے کیونکہ ہم لوگوں کا غم ان سب سے جدا ہے، ہے ناں......! نوید بیٹا تم وہاں کیوں کھڑے ہو، یہاں آؤ ناں میرے پاس، میرے قریب...... ممی کو بھی بٹھاؤ یہاں میرے پاس......'' انہوں نے فلور کشن کی طرف اشارہ کیا۔

''آج کی رات جو غم و اندوہ کی رات ہے اس میں کچھ بھی یاد نہیں کریں گے سوائے تمہاری امی... کی باتوں کے۔'' پاپا کی آواز غم سے بوجھل تھی۔

''آج کی رات میں صرف اور صرف شمیم کو یاد کرنا چاہتا ہوں۔ یاد تو خیر وہ ہم کو ہمیشہ رہیں گی کیونکہ وہ ایسی ہی سحر انگیز شخصیت کی مالک تھیں جن کو بھولنا ممکن ہی نہیں مگر آج کی رات اس لحاظ سے فیصلہ کن ہونی چاہیے کہ ہماری آنے والی ''کل'' کو کیسا ہونا چاہیے۔ میں جانتا ہوں بچوں کہ اپنے پاپا کا یہ انداز اور یہ روپ تم تینوں کو بہت عجیب اور عامیانہ لگ رہا ہوگا...... ممی بیٹا یہ نہ سوچنا کہ پاپا بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں، دراصل میں آج تم سب کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ تمہاری امی میری زندگی کا کتنا خوب صورت رنگ تھیں...... کتنا حسین احساس تھیں...... میں بہت کوشش بھی کروں گا تب بھی مجھے وہ الفاظ نہیں مل سکیں گے جن سے میں تمہاری ماں کی صحیح تصویر کھینچ سکوں جبکہ میں ایک مصور ہوں' رنگوں اور برش سے کھیلتا ہوں، تصویریں بناتا ہوں مگر الفاظ میں؟ کاش! میں الفاظ کے سلسلے میں اتنا تہی دست نہ ہوتا۔ میں شاید دنیا کا ایک عجیب و غریب باپ ہوں حالانکہ ایسے معاملات میں انسان صرف اپنے قریبی دوستوں کے سامنے ہی کھلتا ہے مگر آج میرا جی چاہتا ہے کہ میں......'' پاپا کچھ دیر توقف کے بعد پھر گویا ہوئے۔

''بیٹا! آج تم کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میری زندگی کا سب سے خوب صورت، دلآویز اور انمٹ رنگ تمہاری ماں کا ہے اور تم جانتے ہو یہ رنگ میری زندگی میں کیسے شامل ہوا؟'' وہ گویا کسی کہانی کا آغاز کر رہے تھے۔

''میں انگلستان سے جب اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے لوٹا تو ایک بے فکر نوجوان تھا، آزاد فضاؤں، خوب صورت مناظر، بہتے جھرنوں گنگناتی ندیوں اور سرسبز وادیوں کے درمیان اپنے کیمرے کے ساتھ رہنا چاہتا تھا مگر تمہاری دادی اماں نے بھی ہر ماں کی طرح اپنی آنکھوں میں میری شادی کے خواب سجا رکھے تھے۔ وہ میرے سر پر سہرا اور گھر میں بہو دیکھنا چاہتی تھیں...... پوتا کھلانے کی آرزو تھی انہیں! صبح شام بس ایک ہی وظیفہ تھا ان کی زبان پر......

''بیٹا! اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے تو بتا دو، ورنہ جو لڑکی مجھے پسند آئے گی لے آؤں گی اپنی بہو بنا کر......''

میں اس زمانے میں اتنی جلدی شادی کرنے کے حق اور موڈ میں نہیں تھا، میں آزاد رہنا چاہتا تھا اپنے کیمرے کے ساتھ، رنگوں اور برش کے ساتھ...... کتابوں کے ساتھ...... مگر تمہاری دادی ماں کہتیں......

''میرے چاند! لڑکوں کی شادی اگر جلدی اور وقت سے ہو جائے تو اس سے بہت فائدے ہوتے ہیں۔ ایک تو لڑکے کسی برائی میں نہیں پڑتے، بچے جلدی جوان ہو کر باپ کی طاقت بنتے ہیں اور شادی انہیں ذمے دار بھی بناتی ہے۔'' یہ کہتے کہتے میری ماں کی آنکھوں میں پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگتیں...... میں سوچنے لگتا میری پیدائش کے ساتھ ہی شاید میری ماں نے اس خواہش کو پروان چڑھایا ہے اور انتظار کیا ہے اب چونکہ میں تعلیم سے فارغ ہو کر برسرِ روزگار ہوں، کیوں نہ میں اپنی ماں کی یہ خوشی اس کی زندگی میں ہی پوری کر دوں...... سو میں نے اپنی ماں سے کہہ دیا۔

''ٹھیک ہے اماں......! آپ کی بہو آپ کی پسند سے ہی آئے گی مجھے کوئی لڑکی پسند نہیں، آپ جس لڑکی کو بھی پسند کریں گی بس مجھے وہی پسند آ جائے گی، وہی یقیناً بہت اچھی ہوگی۔'' پھر ایک محفلِ میلاد النبی ﷺ میں سفید کلف لگا، چُنا ہوا دوپٹا اوڑھے سر اور آنکھوں کو جھکا کر نعتِ رسول ﷺ پڑھتی ہوئی شمیم ان کے دل میں اترتی چلی گئی۔ ایک لمحے میں انہوں نے میری تقدیر کا فیصلہ کر لیا اور مجھ سے کہا کہ میں تمہیں اس کی تصویر لا کر دکھا دوں گی جسے میں اپنے بیٹے کی دلہن بنانا چاہتی ہوں۔ اس پر میں بولا۔

''ارے نہیں اماں...... آپ تصویر وغیرہ کے چکر میں نہ پڑیں۔ بس میں نے چھوڑ دیا ہے آپ پر سب کچھ۔'' اس طرح شمیم میری زندگی کا سب سے خوب صورت اور حسین رنگ بن کر میرے شب و روز کی ہم سفر بن گئی۔ بیٹی عمیمہ اور ثروت تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ میں نے شادی سے پہلے شمیم کی ایک جھلک تک نہیں دیکھی تھی۔ حتیٰ کہ جب اماں اسے رخصت کرا کر گھر لائیں تو انہوں نے مجھے آواز دی۔ ''احتشام بیٹے ادھر آؤ، دیکھو یہ ہے میری اگلی نسل کی امین تمہاری دلہن شمیم! دیکھو اور بتاؤ کیسی ہے میری نگاہِ انتخاب......''

اور وہ وقت تھا کہ جب میں اپنی شریکِ سفر کو پہلی بار دیکھا۔'' پاپا نہ جانے کون سی خوابناک کہانی سنا رہے تھے۔ وہ تینوں خاموشی سے متوجہ تھے۔

''ماں کے کہنے پر میں پُرشوق ہو کر آگے بڑھا، وہ ایک خوب صورت اور آراستہ مسہری پر گھٹنوں پر دونوں ہاتھ اور ہاتھوں پر ٹھوڑی ٹکائے گاؤ تکیے سے ٹکی بیٹھی تھی۔ اس کی بھوؤں کے اوپر افشاں سے گول گول ٹیکوں کی قطاریں سی بنی ہوئی تھیں۔ سرخ صبیح گالوں پر سونے کے تار کی بنی ہوئی بڑی سی نتھ میں سچے موتی دمک رہے تھے، بالوں کی لٹیں شرم اور پسینے سے ماتھے پر چپک گئی تھیں۔ کپکپاتے ہونٹوں پر سرخ رنگ کھلا پڑ رہا تھا۔ کانوں میں ہلکورے لیتے آویزے اور اس کے لبوں کی مسکان قابلِ دید تھی۔ ماتھے کا ٹیکا اور جھومر عجیب بہار دکھا رہا تھا، خوب صورت مہندی لگے پیروں میں پازیب اور انگلیوں میں بچھوے پہنے وہ میرے سامنے تھی۔''

پاپا شاعری سنا رہے تھے۔

''اوہ میرے خدا......! وہ سماں اور وہ منظر میں کبھی نہیں بھول سکتا...... میں پُرشوق ہو کر آگے بڑھا اور اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ میرے دل میں یہ خواہش شدت اختیار کر گئی کہ یہ آنکھیں کھولے اور مجھے دیکھے......

میں بھی تو دیکھوں اس کی آنکھیں کیسی ہیں مگر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ میں نے انگلینڈ میں دورانِ تعلیم عورت کو ایک بے باک اور مختلف روپ میں دیکھا تھا، عورت کا یہ روپ میرے لیے حیران کُن تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ عورت کا اس قدر حسین انداز اور روپ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے انگلیوں کی پوروں سے اس کی ٹھوڑی کو اوپر اٹھایا اور کہا۔

''میں تمہارے اس خوب صورت پاؤں کی ایڑھی دیکھ کر قسم کھاتا ہوں کہ آئندہ ساری زندگی کسی دوسری عورت کا چہرہ مجھے پسند نہیں آئے گا، تم نے تو آتے ہی میرے دل پر لکھ دیا کہ یہ شارع عام نہیں ہے۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے'' وہ یہ سن کر چھوئی موئی کی طرح سمٹی اور جھکتی ہی چلی گئی۔'' ثروت، عمیمہ اور نوید کی آنکھوں میں حیرت تھی پاپا ٹرانس میں بات کررہے تھے۔

''میرے بچو! میرے شکر پارو! یہ کہانی یا افسانے کا کوئی منظر نہیں ہے بلکہ میری زندگی کی ایک نہ بھولنے والی یاد ہے۔ میرے راج دُلاروں تمہارے چہروں پر نظر آنے والی حیرت فطری ہے۔ اپنے پاپا کا یہ انوکھا روپ تمہیں صرف حیران ہی کرسکتا ہے۔ مجھے اندازہ ہے بلکہ میں خوب جانتا ہوں کہ شمیم نے ایک ماں ہونے کے ناتے بچوں کی دوست ہونے کا کردار بھی بہ خوبی نبھایا۔ تم دونوں بہن، بھائی اور عمیمہ اپنے ہر مسئلے اور الجھن کو ان سے بہ خوبی ڈسکس کرلیتے تھے۔ بے جھجک ہوکر...... تو آج کی یہ باتیں اس لیے بھی ہیں کہ میں وہ فاصلے کم کرنا چاہتا ہوں بلکہ ختم کرنا چاہتا ہوں۔ شمیم کی طرح میں بھی اپنے بچوں سے بے پناہ محبت کرتا تھا بلکہ کرتا ہوں مگر کھل کر اظہار آج کیا ہے۔'' انہوں نے ثروت اور عمیمہ کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور نوید کو اپنے قریب کرلیا۔

''تمہاری ماں نے زندگی بھر مجھے اتنے سکھ دیے کہ شمار نہیں کرسکتا اور اب یہ دکھ......'' پاپا کی آواز کرب سے بھاری ہوگئی۔ نوید نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

''نو...... نو مائی سن......'' پاپا نے نوید کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھنسا دیں۔

''be brave my lovely child ابھی تو رات باقی ہے، تمہاری ماں جو ہم سب کے بغیر رہ نہیں سکتی تھی نہ جانے کیسے رہے گی...... اسے تو ہر دم اپنا گھر، اپنا شوہر اور اپنے بچے یاد رہتے تھے اس نے کبھی مجھ سے یہ نہیں کہا کہ مجھے سیر کرانے لے چلو، مجھے کپڑے دلاؤ، زیور خرید کردو، میں اکثر شمیم سے کہتا تم مجھ سے کوئی فرمائش کیوں نہیں کرتیں، بیویوں کی طرح لڑتی بھی نہیں ہو۔''

''ارے سب کچھ تو ہے میرے پاس اور لڑنا تو بہت ہی بری بات ہے۔'' وہ ہنس کر کہتی۔

''اس نے مجھے تمام خاندانی بکھیڑوں سے آزاد کیا ہوا تھا، بہت سے ایسے کام جو صرف میری ذمے داری تھے اسے بھی اس نے بحسن وخوبی نبھایا۔ کتنا

خوش نصیب تھا میں...... اور اب کتنا بد نصیب ہو گیا ہوں میں، وہ بھرے میلے اور بھری بہار میں مجھ سے بچھڑ گئی۔ وہ شادی کے بعد جب رخصت ہو کر اس گھر میں آئی تھی تو اس کی آنکھیں بند تھیں، میرے شدید اصرار پر بھی اس نے آنکھیں کھول کر مجھے نہیں دیکھا تھا اور آج بھی جب وہ اس گھر سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہی تھی تب بھی اس کی آنکھیں بند تھیں، کیسا عجیب اتفاق ہے یہ......" پاپا کے آنسو اندر کہیں جلتے ہوئے دل پر چھن، چھن گر رہے تھے اور نوید اس آواز کو محسوس کر رہا تھا۔ اس نے پاپا کے کندھوں پر نرم اور محبت بھرے دباؤ سے ہاتھ رکھا پھر بے قرار ہو کر ان کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

"پاپا، آپ اپنے سارے دکھ اور کرب، تکلیفیں میری جھولی میں ڈال دیں...... پلیز پاپا......" ثروت کی سسکیاں سناٹے کو توڑتی رہیں۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پاپا کی آواز پھر سنائی دی۔

"جب ہم اسے اس کی آخری آرام گاہ میں اتار رہے تھے تو میں سوچ رہا تھا کہ وہ آنکھیں کھول کر ایک الوداعی نظر مجھ پر ضرور ڈالے گی مگر...... ایسا نہیں ہوا۔ اس نے آنکھیں کھول کر مجھے نہیں دیکھا...... آج بھی شمیم کا چہرہ اتنا ہی دلکش لگ رہا تھا، دنیا کی ہر عورت سے ممتاز اور جدا......" پاپا رک، رک کر دھیمی آواز میں بول رہے تھے۔

"وہ اپنی اس خوش قسمتی پر ناز کرتی ہوئی چلی گئی کہ اس کے شوہر نے اسے کندھا دیا، آخری دم تک ساتھ دیا اور وفا نبھائی۔"

"بس کیجیے پاپا! بس کیجیے میرا کلیجا پھٹ جائے گا آپ کی باتیں سن کر......" ثروت نے تڑپ کر پاپا کے گھٹنوں پر سر ٹیک دیا۔

"میری بچی! تمہاری ماں نے ساری زندگی تو مجھے خوش رکھا ہی تھا مگر جاتے، جاتے وہ ایک اور انوکھی خوشی کے لمس سے مجھے سیراب کر گئی۔ نوید بیٹا! پرسوں رات جب تم انجکشن لینے نیچے گئے تھے تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے قریب بلایا، اگرچہ وہ اس وقت بہت تکلیف میں تھی مگر رک، رک کر اس نے وہ بات مجھ سے کہی جسے اس کے منہ سے سننے کا میں ہمیشہ متمنی رہا۔"

"پاپا...... امی نے آپ سے کیا کہا؟" ثروت اور عمیمہ نے دم بخود ہو کر پوچھا۔

"بیٹا......" پاپا کی آواز کرب سے دھیمی اور بھاری ہو گئی۔ "شمیم نے مجھ سے کہا....

"میں گھر داری اور بچوں اور آپ کے کاموں میں اتنی مصروف رہی کہ کئی بار جی چاہا کہ آپ کو یہ بتاؤں کہ آپ مجھے اچھے لگتے تھے بہت زیادہ، میں یہ بھی کہہ نہ پائی اور وقت گزرتا ہی چلا گیا۔" پاپا نے اپنی گردن جھکا لی اور کئی لمحے خاموش بنا آہٹ کے گزر گئے۔

"شاید اس نے یہ بات اسی دن کے لیے سنبھال کر رکھی تھی کہ اس کے بعد اور اس کے بغیر جو زندگی میں گزاروں گا...... یہ بات میرے لیے زندگی کی حرارت کا سبب بنے گی اور میں اس جملے کی توانائیوں کے ساتھ زندہ رہوں گا۔" پاپا اٹھ کر دھیمے دھیمے چلتے ہوئے کھڑکی کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے انہوں نے کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہر انسان کو زندہ رہنے کے لیے کچھ جواز چاہیے ہوتے ہیں۔ کچھ اسباب ہوتے ہیں جو اسے زندہ رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اکساتے ہیں، کچھ ذمے داریاں ہوتی ہیں جو اسے نبھانی ہوتی ہیں اور کچھ لوگ ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ زندہ رہنا چاہتا ہے بلکہ قدرت ہر انسان کو کسی نہ کسی چھوٹے بڑے مشن پہ بھیجتی ہی اسی لیے ہے کہ وہ محدود اور مخصوص وقت میں اس مشن کو پورا کرے اور واپس آجائے...... شاید تمہاری امی نے اپنے حصے کے کام پورے کر لیے تھے...... اور میرے حصے کے کچھ کام ابھی باقی ہیں اسی لیے میں ان کے ساتھ یا ان سے پہلے نہیں جا سکا۔" انہوں نے گردن جھکا کر کھڑکی سے باہر جھانکا اور مڑ کر بچوں سے مخاطب ہوئے۔

"گو ابھی رات باقی ہے مگر میرے شکر پارو!

رات کتنی ہی کٹھن، طویل اور صبر آزما کیوں نہ ہو، نہ صرف ختم ہو جاتی ہے بلکہ جاتے جاتے ایک مسکراتی ہوئی اجلی، روشن اور پاکیزہ صبح اور چمکتا ہوا دن ہمیں تحفے میں دے جاتی ہے۔'' نوید کی آنکھوں میں حیرت تھی اور ثروت کی آنکھوں میں آنسو......

''پاپا! آج آپ میرے ہاتھ کی بنی ہوئی کافی پئیں گے، میں کافی بہت اچھی بناتی ہوں۔'' عمیمہ اپنی جگہ سے اٹھی۔

''ضرور اچھی کافی بناتی ہوگی۔ کیونکہ تم خود بھی تو بہت اچھی ہو مگر آج میرے بچے میرے کمرے میں آئے ہیں، میرے مہمان ہیں تو آج مجھے اپنے ہاتھ سے ان کو کافی بنا کر پلانا چاہیے اور میں بھی کافی بہت اچھی بناتا ہوں۔'' پاپا نے شفقت اور محبت سے عمیمہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''نہیں پاپا......! آپ یہاں بیٹھیں۔'' اس نے پاپا کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''آج یہ کام میں کروں گی اور فیصلہ نوید اور ثروت کریں گے کہ کون اچھی کافی بناتا ہے۔'' نوید نے تشکر بھری نظروں سے عمیمہ کو دیکھ کر اشارے سے منع کیا۔

''نہیں عمیمہ......! آج ہم سب مل کر اپنے پاپا کے ہاتھ کی بنی ہوئی کافی پئیں گے، پاپا آپ کافی بنائیے۔''

''شیور! میں اس وقت یہ کام بہت خوش ہو کر کروں گا کیونکہ میرے پیارے بلکہ بہت ہی پیارے مہمان میرے کمرے میں آئے ہیں اور کافی کی فرمائش کر رہے ہیں۔'' انہوں نے گردن موڑ کر بہت پیار سے ثروت کو دیکھا، وہ دوڑ کر باپ کے سینے سے لگ گئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔

''پاپا! آپ ہمارے لیے کتنا پیار رکھتے ہیں اپنے دل میں...... پر ہم امی کو نہیں بھول سکتے، ہم کیسے رہیں گے ان کے بغیر...... کیسے؟''

''نہیں میرے شکر پاروں، میرے دل کے چین و سکون! ہمیں رہنا ہوگا ان کے بغیر...... بہادری کے ساتھ جینا ہوگا ان لوگوں کے لیے جو اب ہمارے ارد گرد ہیں۔ تم جیو گی ان کے لیے جو تم سے وابستہ ہیں، تم سے جڑے ہیں جن کو تمہاری ضرورت ہے مثلاً تمہارے بچے، تمہارا شوہر، نوید اور ہم سب......'' پاپا نے کہا۔

''بیٹی زندگی صرف روپ بدل لیتی ہے ختم نہیں ہوتی، زمین کا سینہ چیر کر باہر آنے والی کونپل تیز ہوا کی زد پر بھی خود کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ پیغام دیتی ہے کہ میں موجود ہوں، میں زندہ ہوں۔'' پاپا نے عمیمہ کے ہاتھ میں کافی کا مگ دیتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولے۔

''اور وہ کونپل عمیمہ ہے، شمیم زندہ ہے مگر وہ اب عمیمہ ہے۔ وہ ثروت کے روپ میں بھی زندہ ہے جو اسی کی تربیت کو لے کر اگلے گھر گئی ہے......اور ہاں یہ بتاؤ کہ کافی کیسی ہے؟'' انہوں نے تینوں کے چہروں کی طرف دیکھا۔

''بالکل زندگی کی طرح ہے، تلخ بھی اور شیریں بھی، کل تک میں زندہ رہنا نہیں چاہتا تھا۔ پاپا مجھے لگتا تھا کوئی میرے دل کی باریک رگوں کو جیسے شیشے کے ٹکڑے سے کاٹ رہا ہے...... مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ آپ مجھے پھر سے زندگی سے محبت کرنے پر مجبور کر دیں گے۔'' انہوں نے نوید کے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں لے کر اس کے ماتھے کو چوما۔

''میں ہوں ناں تم سب کے پاس...... میں شمیم کی چھوڑی ہوئی اثاث کا وارث ہوں، میرے بعد تم ہو گے تمہارے بعد تمہارا بیٹا اور پھر......!'' پاپا نیچی آواز میں بولتے ہوئے اٹھے۔

''آؤ میرے بچوں میرے ساتھ......'' وہ تینوں کو اٹھاتے ہوئے بولے۔

''رات ختم ہو چکی ہے کھڑکی سے باہر دیکھو...... کس قدر خوب صورت اور روشن صبح طلوع ہو چکی ہے اور دیکھو یہی تو زندگی ہے۔''

تینوں اب پاپا کے ساتھ لگے کھڑے ممی کے ہاتھ سے سجائے گئے لان کو گیلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

دوسرا اور آخری حصہ

جرسِ الفت کے اسیر

فرحین اظفر



روبیشہ کے لیے اس کی پسندیدگی کی عمر اتنی طویل نہیں تھی۔ جتنی ہانیہ کو ناپسند کرنے کی۔ وہ جدید دور کی پڑھی لکھی فیشن ایبل لڑکی تھی۔ اسی حساب سے اس کا پہناوا تھا اور اسی انداز کا گفتگو کا طریقہ۔

بلال کو اس میں کوئی بات ایسی نہ لگتی کہ وہ اس کی جانب مائل ہو جاتا۔ سوائے اس کے چہرے اور آنکھوں سے جھلکتی پسندیدگی جو صرف اور صرف خاص الخاص بلال کے لیے تھی اور جسے محسوس کر کے وہ اور زیادہ کوفت میں مبتلا ہو جاتا...... اور اس چیز کو جب وہ شاہ نور کے ساتھ مل کر انجوائے کرتی تو غصے کے مارے اس کا دل



چاہتا کہ اس کے ساتھ ساتھ اپنی بہن کا بھی گلا دبا دے جو ہانیہ کے بڑے بھائی دانیال سے منسوب تھی۔

اس نے بارہا روبیشہ کو خاندان کی تقریبات میں بجے سنورے دیکھا تھا۔ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود رشتے داری ایسی قریبی نہ تھی اور نہ ہی اس نوعیت کی تھی کہ بحالتِ مجبوری خاندان ہی کی تقریبات کے علاوہ ایک دوسرے کے گھر بھی آنا جانا ہوتا دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی عرصہ دراز تک یہی سمجھتا رہا کہ روبیشہ، زین ہی کی شریکِ سفر بنے گی۔ اس کے باوجود اس نے کبھی دونوں کو بلا وجہ ایک دوسرے سے چپکے ہوئے نہیں دیکھا۔ جیسا کہ ہانیہ سارے جہان میں بانگِ دہل بلال کو اپنا فیانسی کہتی پھرتی تھی۔ اسے اس بات کی کبھی پروا نہیں ہوتی تھی کہ بلال کو یہ بات کیسی لگتی ہے۔ اس کے برعکس روبیشہ کا تمیز دار لباس، دھیما انداز اور خصوصاً زین العابدین کے ساتھ بے حد معتدل رویّہ، ہمیشہ اس کی نگاہوں میں پسندیدہ رہا۔

زین العابدین کی کسی اور سے شادی اس کے لیے بھی اتنی ہی غیر متوقع تھی، جتنی دوسروں کے لیے۔ لیکن اس نے چند ہی روز بعد دل میں خواہش کی ایک نئی نازک کونپل کو پھوٹتے دیکھا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ کونپل، ست رنگے پھولوں سے لدی بیل میں بدل گئی...... جس نے اس کے دل کی چار دیواری کو اپنے سبزے سے ڈھانپ لیا تھا۔

اسے یوں لگنے لگا جیسے روبیشہ سے کتنے برسوں پرانی شناسائی ہے۔ مہینوں سے اس کی شکل تک نہ دیکھنے کے باوجود وہ اسے چوبیس گھنٹے اپنے ساتھ محسوس ہونے لگی۔ وہ اس کا تصور کرتے، کرتے، اتنی دور پہنچ جاتا کہ یہ حقیقت خود بخود اپنا وجود کھو دیتی کہ روبیشہ کو اس کے ارادوں کی بھنک تک نہ تھی۔ اور وہ سب کچھ جاننے کے بعد کیا سوچتی، کیا کہتی، کیا سمجھتی اسے اس بات کی بھی پروا نہیں تھی...... شاید اس کو خود پر ضرورت سے زیادہ بھروسا تھا۔

☆☆☆

گھر کی فضا میں ایک محسوس کیا جانے والا تناؤ تھا۔ تائی امی جہاں بیٹے کی حرکتوں سے عاجز تھیں وہیں بہو سے شرمسار۔ وہ سمجھتی تھیں زین کی زندگی میں کسی اور کے آجانے سے رُبا خود بخود نکل جائے گی۔ شریکِ حیات کی اپنی ایک الگ مستحکم حیثیت ہوتی ہے۔ مگر ان کی سب تدبیریں ایک کے بعد ایک ناکام ہوتی چلی گئیں۔ جب زین نے جاب شروع کی تو انہوں نے اپنے شوہر کا مکان بیچ کر دیورانی کے گھر سے دور دراز علاقے میں بہتر جگہ پر نیا گھر لے لیا۔ تاکہ زین کی آمدورفت کم ہو سکے۔

اپنی بہو کی تلاش میں انہوں نے کنوؤں میں بانس ڈلوا دیے۔ جو حور پری وہ زین کے لیے چن کر لائی تھیں اس کے حسن کی چمک سے ان کی اپنی آنکھیں چندھیائی جاتی تھیں۔ زین تو پھر مرد تھا۔ انہیں پتا تھا کہ تھوڑے ہی دن اس کے خوب صورت ساتھ کے آگے روبیشہ اور زین کی (اپنے تئیں) نام نہاد محبت کہیں منہ چھپا کر بھاگ جائے گی۔ سارا خاندان بشمول ان کی دیورانی اور خود رُبا کے، منہل کے حسن کے قصیدے پڑھتا نظر آیا۔ شادی والے دن ان کی گردن فخر سے تن گئی تھی۔ جب ولیمے میں انہوں نے زین کے دائیں بائیں منہل اور روبیشہ کو بیٹھا دیکھ کر ان کا موازنہ کیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے تو وہ ربا کو اس بلکہ کسی بھی قسم کے تقابل کے قابل ہی نہیں گردانتی تھیں۔ نہ وہ صورت میں اس کے برابر تھی... نہ تعلیم نہ خاندانی اسٹیٹس اور سب سے اہم چیز ذہنی ہم آہنگی اور سیرت تو ان کے نزدیک قابلِ غور چیزیں تھیں ہی نہیں۔

کئی مہینے گزر جانے کے باوجود وہ دونوں اوائل دنوں کے مانند دور دور، خاموش اور لاتعلق نظر آتے تھے۔ شادی شدہ جوڑے تو اوائل ایام میں بے حد قریب، پُرجوش اور خوش دِکھتے ہیں۔ وہاں ایسا کچھ نہ تھا۔ نہ زین کی نظریں معنی خیز تھیں کچھ کہتی، کچھ سنتی، بولتی۔ نہ منہل کے عارض گلگلوں ہوتے۔ نہ اٹھتی گرتی پلکیں، نہ حیا آمیز مسکراہٹ۔

''یہ سب رو بیشہ کا ہی کیا دھرا ہے۔'' بالآخر وہ فیصلہ کن انداز میں سوچتی ہوئی اٹھیں۔ منجھلی لاؤنج میں پتھر کا بت بنی ٹی وی کے آگے بیٹھی تھی۔ اسے بتا کر باہر نکل آئیں۔ ان کا رخ ٹیکسی اسٹینڈ کی جانب تھا۔ دیورانی کے گھر کا راستہ قدرے لمبا سہی مگر اتنا بھی طویل نہ تھا کہ وہ زین کے علم میں لائے بنا وہاں جا نہ سکیں۔

☆☆☆

ریحان سعدی گہری نظروں اور انتہائی سنجیدگی سے اپنے اکلوتے فرمانبردار بیٹے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ شرمسار تو تھا لیکن اپنی بات سے پیچھے ہٹنے کے لیے ذرہ برابر تیار نہ تھا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو۔ تمہاری دونوں باتیں بڑوں کی ناراضی کا سبب بن رہی ہیں۔ ہانیہ سے شادی سے انکار بھی اور اس لڑکی کی ضد بھی۔'' اپنی بیگم کی بہ نسبت انہیں روبیشہ اور اس کے گھر والوں سے کوئی ذاتی پُرخاش نہ تھی۔ بلکہ منصفانہ طریقے سے سوچتے تو وہ ہی انہیں ہمدردی کی مستحق بھی نظر آتیں۔

''لیکن دونوں باتیں جائز بھی ہیں اور میرا حق بھی۔ میں ہانیہ سے شادی سے انکار بھی کر سکتا ہوں اور رُبا کا انتخاب بھی کر سکتا ہوں۔''

آمنہ کی برداشت کی حد بس یہیں تک تھی۔

''تمہیں اندازہ نہیں ہے، یہ صرف اتنی سی بات نہیں ہے بلال۔ اگر ہانیہ تمہیں پسند نہیں تو کہیں اور کرلو شادی مگر وہاں...... وہاں نہیں۔''

''کیوں نہیں؟'' وہ اب بھی پُرسکون تھا۔

''ایک تو وہ میری بہن کی سوکن کی لڑکی ہے دوسرے تم...... تم کچھ نہیں جانتے۔ بھئی اسے سمجھائیں ناں'' وہ آخر میں زچ ہو کر پھر شوہر کی طرف مڑ گئیں۔

''بیٹا، اس فیملی میں صرف ایک اس لڑکی کو چھوڑ کر باقی سب میں کوئی نہ کوئی فزیکل یا مینٹل ڈسٹربنس ہے۔ اس کی بڑی بہن کی شادی کو کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ وہ اب تک بے اولاد ہے۔ خود ان کی اپنی والدہ کوئی صحت مند خاتون نہیں تھیں۔ جبھی تو صداقت کو دوسری شادی کرنا پڑی۔'' انہیں جوان بیٹے سے نظریں چرانا پڑیں۔ آمنہ کا سر بھی جھک گیا۔

''اس کی اپنی جڑواں بہن قلی مینٹلی ابنارمل ہے۔ بڑی بہن بے اولاد ہے اور بچپن میں دو بھائی پیدا ہوتے ہی انتقال کر چکے۔ ایسی لڑکی سے شادی کی خواہش؟ اور کون ضمانت دے گا کہ مستقبل میں وہ اس قسم کی مشکلات سے دوچار نہیں ہوگی۔ یا اسے ایسا کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہوگا۔''

انہوں نے رک رک کر اپنی بات مکمل کی۔

''اس بات کی ضمانت تو کوئی بھی نہیں دے سکتا بابا اور بھلا مستقبل کی کسی بھی بات کی ضمانت دے ہی کون سکتا ہے۔ اللہ کے سوا......؟''

''تم اپنا منہ بند ہی کرلو تو بہتر ہے۔ ارے سالوں سے وہاں دیکھ رہی تھیں امینہ بیگم مگر ہوا کیا۔ اس نے بھی دکھادی ناں ہری جھنڈی۔ ظاہر ہے آنکھوں دیکھی مکھی کون نگلتا ہے۔ بس اب تم بھی اس بات کو یہیں ختم کردو۔''

اپنی طرف سے انہوں نے جھٹ پٹ معاملہ نمٹایا تھا۔ مگر بلال ایک دم بھڑک اٹھا۔

''ہرگز نہیں۔ اگر آپ یہ سمجھ رہی ہیں کہ اس طرح کی فضول فکریں پکڑا کر میرا ارادہ بدل دیں گی تو یہ آپ کی بھول ہے۔ میں اگر شادی کروں گا تو صرف روبیشہ سے بس۔'' وہ بولتے ہوئے باہر نکل گیا۔ آمنہ حق دق رہ گئیں۔ باپ کے سامنے اس قدر بدتمیزی اور بلال۔ وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں لیکن ریحان سعدی سمجھدار تھے۔ وہ نہ تو حیران تھے اپنی بیگم کی طرح...... نہ ضدی تھے اپنے بیٹے کی طرح۔ وہ پُرسوچ انداز میں دروازے کی سمت دیکھ رہے تھے جہاں سے بلال باہر نکلا تھا۔

''میرے خیال میں ہمیں بلال کی بات مان لینی چاہیے۔'' کافی دیر بعد ان کے منہ سے نکلا۔ آمنہ نے جھکا ہوا سر اٹھا کر بے یقینی سے انہیں دیکھا تھا۔

☆☆☆

''ارے واہ کتنی آسانی سے کتنی بڑی بات کہہ دی آپا!'' فون پر صالحہ تھیں۔ ان کا ردِعمل توقع سے بہت قریب تھا۔

''آسانی سے نہیں کی ہے صالحہ! تم اچھی طرح جانتی ہو۔ اگر ایک طرف تمہاری بیٹی ہے تو دوسری طرف میری اپنی اولاد اسی فیصلے کی زد میں آکر نقصان اٹھائے گی۔''

''تو پھر یہ بیوقوفی کیوں؟ مزے آگئے بلال کے تو۔ بیٹھے بٹھائے من کی مراد مل جائے گی اور میری بیٹی اس کا کیا کروں میں؟ وہ بیمار پڑگئی ہے۔ جب سے گھر میں یہ بات نکلی ہے۔'' ان کی آواز بھرا سی گئی۔

''تو پھر تم ہی بتاؤ صالحہ میں کیا کروں۔ ایک طرف ہماری بیٹیاں ہیں تو دوسری طرف......'' انہوں نے دانت بھینچ کر اپنا غصہ نکالا۔ خدا جانے بلال پر یا روبیشہ پر۔

''اور اب تو ریحان بھی اس کی حمایت کررہے ہیں۔''

آمنہ کا بس نہیں چلتا تھا کہ بلال کو روئی کی طرح دُھنک کر رکھ دیں۔ جس نے انہیں اپنی بہن کے سامنے شرمندہ کروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اور اس روبیشہ کو تو کچا ہی چبا ڈالیں۔

''تم ذرا ایک دو دن صبر کرو آپا، میں صداقت سے کہتی ہوں۔'' صالحہ کی پُرسوچ آواز نے ان کے مُردہ جسم میں جیسے نئی روح پھونک دی۔

''ہیں؟ تم بات کروگی ان سے وہ مان جائیں گے؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتی۔ کبھی ان بیوی، بیٹیوں کا نام تو زبان پر نہیں لاتے۔ مگر خرچہ بھیجنے میں ایک دن کی بھی تاخیر نہیں کرتے۔''

ان کے صاف گو انداز پر وہ ڈھیلی سی پڑ گئیں۔

''اچھا دیکھو! خدا کرے کوئی صورت نکل آئے۔''

دل ہی دل میں دعا کرتے ہوئے انہوں نے مُردہ دلی سے ریسیور رکھ دیا۔

☆☆☆

مغرب کا دھندلا سماں اپنے پر پھیلائے سرد اداسی میں اونگھ رہا تھا۔ جبھی ایسا لگا جیسے گھر میں بھونچال آگیا ہو۔ وہ گھبرا کر کمرے سے باہر نکلی۔ کب سے جائے نماز پر بیٹھی اپنے مجازی خدا کے مزاج مل جانے کی دعا مانگتی گڑگڑا رہی تھی۔

''ہاں گئی تھی میں، ان ماں بیٹیوں کے پچھن سدھارنے...... ارے شرم نہیں آتی......لوگوں کے گھر اجاڑنے کا سامان کرتی پھر رہی ہے دن دہاڑے۔ ایسی بے شرم لڑکی تو دیکھی نہ سنی۔''

''کیا ہوگیا ہے امی آپ کو؟ آپ کی اپنی بھتیجی ہے وہ، آپ کا اپنا خون۔ اس پر اس طرح کا الزام لگاتے ہوئے آپ کو شرم آنی چاہیے۔ آپ خود بھی بیٹیوں والی ہیں۔''

''اے ہاں ہم بھی بیٹیوں والے ہیں مگر خدا گواہ ہے۔ ہماری بیٹیوں نے کسی پر نگاہ نہیں رکھی۔ جہاں باندھ دیا چپ چاپ سر جھکا کر بندھ گئیں نہ چوں نہ چرا ایک یہ ہیں۔ جوانی پھٹی جارہی ہے......'' تائی امی کے زبان کے جوہر پہلی بار منہل پر کھلے تھے۔ اس کا منہ کھل گیا۔

''بس کریں امی!'' زین اس قدر زور سے دہاڑا کہ اسے لگا اس کا دل باہر آجائے گا۔ اس نے بے اختیار اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

''اب ایک لفظ نہیں بولیے گا آپ۔ بہت کہہ چکیں اور بہت سن لیا میں نے۔'' اس کا چہرہ انگارے کے مانند دہک اٹھا۔ تائی امی اور منہل دونوں ہی اپنی جگہ سہم سی گئیں۔

''روبیشہ کے بارے میں کسی نے مجھ سے ایک لفظ بھی آئندہ کہا تو نتائج کا ذمے دار وہ خود ہوگا۔'' اس کی آواز کسی دہاڑ سے مشابہ تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے میں گیا۔ اور پوری قوت سے دروازہ دے مارا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز پورے گھر میں گونج گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی تائی امی اور منہل کسی خواب سے جاگی تھیں۔

☆☆☆

اسے اپنے وجود سے آگ کی لپٹیں سی نکلتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایک وحشت کے عالم میں اس نے ٹائی گھسیٹ کر دور پھینکی۔ اس کی نگاہوں میں روبیشہ کا سرخ چہرہ گھوم رہا تھا۔

''کیوں آتے ہیں بار بار یہاں۔ جانتے نہیں ہیں سب کو برا لگتا ہے۔'' اس نے جبڑے بھینچ کر شرٹ کے بٹن کھولے اور بیڈ پر اچھال دی۔

''ایک بار مجھے ٹھکرا کر چین نہیں ملا کیا آپ کو۔ جو بار بار بے عزت کرنے......''

''او خدایا!'' اس نے فل اسپیڈ میں پنکھا چلا دیا۔

''وہ روئی تھی۔'' اس نے پورے جسم پر پسینے کی نمی محسوس کی۔

''وہ مجھ سے بدگمان تھی۔''

''اسے مجھ سے شکایت ہوئی...... ربا کو...... مجھ سے۔'' وہ اب اپنے جسم پر موجود بنیان گھسیٹ رہا تھا۔ پنکھے کی سرد ہوا خنک موسم میں جسم میں گھسنے لگی تھی مگر اس کا وجود کسی طور ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا۔

''مت آیا کریں یہاں۔ جائیں یہاں سے۔'' کسی نے اس کے پردۂ سماعت پر انگارہ گرایا۔

''مت آیا کریں۔''

''چلے جائیں مت آیا کریں۔''

اسے چین نہیں مل رہا تھا۔ وہ واش روم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں صرف روبیشہ کا چہرہ تھا۔ سرخ متورم۔ اس کے کانوں میں صرف روبیشہ کی آواز تھی...... رندھی ہوئی...... بیٹھی ہوئی...... چلاتی ہوئی۔

''مت آیا کریں یہاں۔'' وہ اب ٹھنڈے پانی کا شاور کھول کر اس کے نیچے کھڑا تھا۔ یخ پانی کی دھاریں اس کے وجود کو سرد کرتی جا رہی تھیں اور وہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

☆☆☆

ریحان صاحب بہت دیر سے اپنی بیگم کا کھویا کھویا سا انداز ملاحظہ کر رہے تھے۔ کتنی بار انہوں نے بات کرنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر چپ کر گئیں۔ بس صرف ایک گہری سانس بھرنے پر اکتفا کیا۔

''کیا سوچ رہی ہیں آپ؟'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑی کتاب سینے پر الٹ کر رکھ لی۔

''یہی کہ بلال کا رشتہ لے جانے کے لیے کون سا دن مناسب رہے گا؟'' بات تھی یا آہ۔ جو جانے کب سے دل میں دبی تھی۔

''تو آپ بالآخر اس بات پر راضی ہو ہی گئیں۔''

''کیا کرتی ہونا ہی پڑا۔'' ان کے لہجے میں کچھ تھا کہ وہ چونک سے گئے۔

''کیوں؟ کل تک تو آپ پروں پر پانی نہیں پڑنے دے رہی تھیں۔''

''ہاں......بس'' انہوں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

''صالحہ نے کہا تھا صداقت بھائی سے کہلوانے کے لیے کہ وہ لوگ اس رشتے سے انکار کر دیں۔''

''کیا...... بات کر رہی ہیں آپ آمنہ؟ کیا ضرورت تھی یہ فضول بات کرنے کی۔'' ریحان ایک دم بگڑ سے گئے۔ آمنہ گڑبڑا گئیں۔

''میں نے کہاں......؟ بس صالحہ خود ہی کہہ رہی تھی تو میں نے بھی کچھ نہیں کہا۔'' وہ صرف اتنا ہی کہہ سکیں۔

''حد کرتی ہیں آپ بھی۔ ایک باپ پہلے ہی بیٹیوں کو عید کے علاوہ شکل نہیں دکھاتا۔ اوپر سے آپ کہتی ہیں کہ ایک بیٹی کا رشتہ بچانے کے لیے دوسری بیٹی کے رشتے سے انکار کر دیں وہ؟'' ان کی بات غلط نہ تھی۔ آمنہ کے پاس سوائے ایک اور ٹھنڈی سانس بھرنے کے کوئی چارہ نہ تھا۔

''انہوں نے بھی یہی کہا کہ میرے لیے تو دونوں ہی برابر ہیں۔''

''ہاں تو کیا غلط کہا انہوں نے۔ رویے بھلے غیر متوازن ہوں مگر اولاد تو اولاد ہوتی ہے۔'' وہ تکیہ سیدھا کر کے لیٹتے ہوئے بولے۔

''میرے خیال میں یہ ویک اینڈ مناسب رہے گا۔''

☆☆☆

منگنی کی انگوٹھی بہت قیمتی اور خوبصورت تھی۔
بلاشبہ پہنانے والوں کے ذوق کا منہ بولتا ثبوت تھی اور اس کی انگلی میں آکر سج سی گئی تھی۔ اسے یہ انگوٹھی پہنے چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ مگر جذبات اس حوالے سے بالکل سپاٹ سے تھے۔ اسے امی کا تمتماتا ہوا چہرہ اور نم آنکھیں یاد تھیں۔ ایسی ہی نمی اس نے شاید زین کی آنکھوں میں بھی دیکھی تھی۔ جو بالکل اچانک بلال اور اس کے گھر والوں کی آمد کے بعد وہاں آیا تھا۔
مگر......
وہ وہاں آیا ہی کیوں تھا... کیسے......؟ کس لیے......؟ ایک بار رومیشہ سے سن لینے کے بعد اسے یقیناً دوبارہ پلٹ کر وہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہ ایسا وعدہ خلاف تو نہ تھا پھر......؟
''میں نے بلایا تھا اسے، تاکہ اپنی آنکھوں سے تمہاری نسبت ہوتی دیکھ لے اور پھر آئندہ تمہارا نام نہ لے۔'' اس کی سوچیں یمنیٰ نے پڑھ لی تھیں۔
اور وہ ایک دم ہی ہنس دی پھر دیر تک ہنستی رہی۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں بھی ویسی ہی نمی آن ٹھہری۔ جو اس نے زین کی بے یقین نگاہوں میں چمکتی دیکھی تھی۔
''تم کتنی نادان ہو یمنیٰ! کتنی نادان...... تم سمجھتی ہو زین کو یہاں بلا کر انہیں میری منگنی کی رسم دکھا کر تم نے ان کے دل میں موجود میرے لیے جو جذبات ہیں ان کا سدِباب کر دیا ہے؟'' اس نے جیسے یمنیٰ کے بچپنے پر سر جھٹکا۔
''بالکل پاگل ہو تم۔'' آنسوؤں کا گولہ اس کے حلق میں پھنسنے لگا تھا اور وہ نگلنے پر مجبور تھی۔
''معلوم نہیں کیوں...... کیوں سب لوگ ہمارے اتنے دشمن ہو گئے۔ وہ لوگ جو ہمارے اپنے تھے۔ کیا ملا انہیں ہمیں یوں دور دور دیکھ کر۔ ہم نے تو کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑا تھا۔'' وہ ایک عالم بے خودی میں بڑبڑاتی، بیڈ پر دم سادھے بیٹھ گئی۔ یمنیٰ تھوڑی دیر اسے دیکھتی رہی۔ پھر دھیرے سے آواز دی۔ مگر وہ اپنے آپ میں تھی کہاں۔
''کچھ بھی تو نہیں مانگا تھا کسی سے ہم نے...... ہم نے تو...... ایک دوجے سے ایک دوسرے کا ساتھ تک نہیں مانگا۔ پھر کیوں...... کیوں سب ہمارے ایسے دشمن ہو گئے؟ ہمیں قریب دیکھ کر خفا ہمیں دور دیکھ کر خوش، راضی......''
''ربا!...... ربا......'' یمنیٰ نے گھبرا کر اس کا کندھا جھنجوڑا۔ مگر وہ سامنے جانے کون سے غیر مرئی نکتے کو گھور رہی تھی۔
''ہم کون سا مر رہے تھے ایک ہونے کے لیے۔ ہم نے تو صبر ہی کر لیا تھا ناں۔ پھر کیوں تماشا بنانے لگے سب؟ کیا ملا سب کو یہ کر کے؟ جدا تو ہو گئے تھے ہم۔ مان تو لی تھی بات۔ مار تو لیا تھا دل پھر پھر...... پہلے تائی امی، پھر تم......''
''ربا ہوش کرو کچھ، کیا ہو گیا ہے؟'' اب کی بار یمنیٰ کی آواز بلند تھی۔ اس نے بنا چونکے یمنیٰ کی طرف چہرہ موڑا تو آنکھوں میں ٹھہرا پانی چھلک گیا۔
''کیا کیا انہوں نے؟ کیا کیا تائی امی نے؟'' وہ یمنیٰ کے سوال پر چونک کر جیسے حواسوں میں لوٹی۔
''انہوں نے وہی کیا جو تم نے آج کیا۔ مگر وہ جیت گئیں۔ وہ بازی لے گئیں۔ تم جیت گئیں۔ سب لوگ جیت گئے ایک سوائے میرے۔ صرف میں ہار گئی۔ زین ہار گئے۔ بس...... بس ہم۔'' وہ بے دردی سے اپنے ہاتھوں میں پہنے گجرے کھسوٹ رہی تھی۔

☆☆☆

رات کے سیاہ کشکول سے، تاریکی اور سناٹے کے سکے ایک ایک کر کے گرتے جا رہے تھے۔ اس کی بے نیند سرخ آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں۔ اور ان میں صرف ایک مانوس چہرہ آن سمایا تھا۔ کتنی حیرت اور بے یقینی تھی اس چہرے پر۔ کتنے سوال تھے اس کے خاموش لہجے میں۔ اور کتنا دکھ تھا اس معمولی سی نمی کی تہ میں...... اور وہ واپس چلا گیا۔ چچی کو مبارک باد دے کر۔ اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ کوئی جواب نہیں

مانگا۔ کوئی بات نہیں کی۔ اس کے پاس آ کر بیٹھا تک نہیں۔ اور روبیشہ کا سر جو جھکا تو اس کے بعد دوبارہ اٹھ ہی نہ سکا۔

اس کا دل تو تب سے ہی پگھل رہا تھا۔ دھیرے دھیرے، قطرہ قطرہ، لمحہ لمحہ، نہ کل رات اور نہ آج، اسے نیند نہیں آئی تھی۔ اسے یاد بھی نہیں تھا کہ کل وہ واپس کب گیا۔ وہ اس کے بعد سب کچھ بھول گئی تھی۔

یمنیٰ کی چہکتی آواز...... بلال کے چہرے کے انگنت رنگ...... متوقع ساس اور سسر کا روکھا رویہ اور اکلوتی نند کی غیر موجودگی وہ بھی اتنے اہم موقع پر۔ کسی بھی دھیان کی راہ پکڑنے سے پہلے دو نم، حیران آنکھیں اس کے راستے میں کھڑی ہوئیں اور وہ خود سے نظریں چرانے لگی۔ موبائل کی اسکرین لمحہ بھر کو چمک کر بجھ گئی۔ اور زندگی میں پہلی بار اس نے مسکرا کر نہیں بلکہ بے تابی سے جھپٹ کر سیل اٹھایا تھا۔

''راستے تو جدا ہو ہی گئے لیکن منزل پر پہنچنے سے پہلے ایک بار بھی مڑ کر نہ دیکھا۔ اپنی خوشی میں شامل کرنے کے لیے ہی سہی۔ ایک بار یاد تو کیا ہوتا۔ تم جان لیتیں...... دوستی کسے کہتے ہیں۔''

اس کی پلکوں پر ٹکے آنسو رواں ہو گئے۔

''یاد تو اسے کیا جاتا ہے جو بھول جائے۔''

یہ سیل بھی زین کا تحفہ تھا اور یہ سنگل بیڈ بھی۔ جس پر وہ لیٹی ہوئی تھی۔ سرہانے دیوار میں نصب ہوئی جدید طرز کی رائٹنگ ٹیبل، لیمپ اور کتابوں کے ڈھیر میں حصہ بنی بیشتر کتابیں اسی کی یادگار تھیں۔ اس کے دستخط اور دعائیہ الفاظ سے جن کے سرورق جگمگاتے تھے۔

وہ سیل آف کر کے سینے پر رکھ کر بے اختیار سسک پڑی۔ جس سینے میں دھڑکتا دل اسی کے نام کی مالا جپتا تھا۔

''مجھے معاف کر دیں زین جو بھی تکلیف آپ نے یمنیٰ کی وجہ سے اٹھائی اس کے لیے۔'' ٹوٹتے الفاظ، لبوں کو چومتے جا رہے تھے۔ بالکل اسی طرح، جس طرح کچھ دن پہلے زین کے لبوں سے نکلتے

فضاؤں میں تحلیل ہو گئے تھے۔
''مجھے معاف کر دو رو بیشہ، جو بھی تکلیف تمہیں امی نے پہنچائی اس کے لیے۔''

☆☆☆

آج پتا نہیں کون سا دن تھا... زین العابدین اور منہل کی بات چیت بند ہوئے۔ وہ اس کے معمولات اور ضروریات کا پہلے ہی کی طرح خیال رکھ رہی تھی لیکن زین ایک ''ہوں'' سے آگے بڑھنے کو تیار نہ تھا۔ کئی بار اس نے سوچا، اس سے اس موضوع پر بات کرے یا کم سے کم اتنا ہی پوچھ لے کہ جو کچھ بھی ہوا اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ بہر حال وہ اس کا شوہر تھا اور ایک مشرقی بیوی کی طرح اس کی بے اعتنائی اسے جلاتی اور تڑپاتی تھی۔ خاص طور پر اس صورت میں جبکہ اسے اچھی طرح پتا چل چکا تھا کہ اپنے شوہر کی سوچوں اور دل و دماغ پر وہ اکیلی ہی قابض نہیں۔ کوئی اور بھی پورے طمطراق سے وہاں براجمان ہے۔ یا پھر شاید وہ خود تو کہیں تھی ہی نہیں۔ ہر جگہ وہ ہی وہ تھی...... ''رو بیشہ......'' اس نے ایک حسرت سے اس کا نام لے کر دوسری طرف کروٹ لے کر سوتے ہوئے زین کو دیکھا۔ پھر کچھ دیر یونہی دیکھتی رہی۔ پھر جانے کیا سوچ کر دھیرے سے اس کا بازو ہلایا۔

''زین!......زین!''

وہ گہری نیند سے جاگا تو مندی مندی آنکھوں میں حیرانی سموئے اسے دیکھنے لگا۔ اور وہ اسے جگا تو چکی تھی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات کرے۔ اسے یوں نیند سے جگانے کی کیا وجہ بیان کرے۔ کوئی ایسی بات جو اس کا دل خوش کر دے۔ یا کچھ ایسا کہ وہ مسکرا دے۔ الفت کی نظر یا کرم کی کوئی ایک ساعت اس کے نصیب میں لکھ دے۔

''میں...... مجھے نیند نہیں آ رہی۔'' وہ اٹکنے لگی۔

''تو......؟'' اس کا سوال اتنا ہی لاتعلق تھا جتنا کہ وہ خود۔

''میں نے سوچا آپ تھوڑی دیر...... میں...... میرے ساتھ جاگ لیں تو ہم باتیں کر لیتے۔''

آخری الفاظ پر اس کی آواز بالکل دم توڑ گئی۔

''نیند تمہیں نہیں آ رہی اور جاگوں میں؟'' منہل کو لگا جیسے لمحے بھر کے لیے اس نے منہل کی ہنسی اڑائی۔ گویا پسِ عبارت کہیں ''تمہاری اوقات کیا ہے؟'' چھپا بیٹھا تھا۔

وہ سر جھکا کے لب کچلنے لگی۔ کسی ناکردہ جرم کے مانند اس نے زین کو جگانے کی غلطی کر ڈالی تھی۔

''کوئی سلیپنگ پلز لے لو۔ مجھے صبح آفس جانا ہے۔'' قیمتی مشورہ حاضر تھا۔

وہ کمبل منہ تک تان کر لیٹ چکا تھا۔

شادی کی پہلی رات کے علاوہ اس نے کبھی منہل کو اپنی اس ''خاص توجہ'' سے نہیں نوازا تھا جس کا ارمان اور جس کا تصور ہر نوبیاہتا کے چہرے پر گلال بکھیر دیتا ہے۔ جو سہاگن کے وجود کو گلاب کی طرح مہکا دیتا ہے۔

منہل کب تک اس پتھر کے وجود کو تکتی اپنی قسمت سے شکوہ کرتی۔ جلد یا بدیر اسے نیند آ ہی جانی تھی۔ پلز کے بغیر بھی لیکن جب تک نیند نہ آئی۔ آنسو اس پر مہربان تھے۔ جانے کیوں بہتے آنسوؤں کی تپش تلے دل کے کسی پوشیدہ کونے میں کہیں کچھ بہت غلط ہو جانے کا احساس سر یہوڑائے سلگ رہا تھا۔

☆☆☆

بلال کو اس کا نمبر پہنچایا جا چکا تھا۔ یقیناً یہ یمنی کی مہربانی تھی۔ جس کی خود اسے خواہش تھی نہ ضرورت۔ ہاں ایک مجبوری ضرور تھی۔ جو اسے نبھانی تھی۔ اس بات سے بے خبر یا جان بوجھ کر نگاہیں چرائے کہ یہ خیر خیریت، صبح و شب بخیر کے مختصر پیغامات چند لمحوں یا چند دنوں یا چند ہفتوں کی بات نہیں اور مجبوری تاحیات کون نبھا سکتا ہے بھلا...... ایک نہ ایک دن، کسی نہ کسی کو تو ختم ہونا ہی پڑتا ہے...... یا تو مجبوری...... یا اسے نبھانے والے کو خود......

ایک سرخ، سرد، اداس شام میں یمنی آئی تو

مسکراہٹ اس کے لبوں پر دمک رہی تھی اور نگاہوں کی چمک خیرہ کن تھی۔

امی نے چٹا چٹ چوم کر اس کی نظر اتار ڈالی وہ ہونق بنی اس کا منہ تک رہی تھی جب انہوں نے اس کی کمر پر ایک دھپ رسید کی۔

''دیکھ کیا رہی ہو خیر سے خالہ بننے والی ہو۔ خدا خیریت سے وہ دن دکھائے میری تو آنکھیں ترس گئی تھیں اس بچی خوشی کو دیکھنے کے لیے۔''

انہوں نے کپکپاتے لبوں سے اس کی پیشانی چوم کر ڈھیروں دعائیں دیں اور خود چائے بنانے اٹھ گئیں۔

دوسرے دن شام تک اس خوشی کو بانٹنے کچھ مہربان چلے آئے۔ تائی امی اور منہل کی آمد نے اسے اس حد تک حیران کیا کہ وہ سلام کرنا ہی بھول گئی۔ دل تو چاہا کہ وہیں سے پلٹ کر کمرے میں چلی جائے اور دروازہ بند کر کے اس وقت تک باہر نہ نکلے جب تک وہ واپس نہ چلی جائیں مگر دل پر کس کا زور...... لوگ کس طرح دوسروں کو اپنی نظروں سے گرا کر رشتے استوار کرنے چلے آتے ہیں۔

''اور ان کو یہ خبر دی کس نے؟'' یہ معما بھی ان ہی کی زبانی حل ہوا۔ دوپہر کو آمنہ کے فون کرنے پر امی نے خوشی خوشی انہیں اپنی خوشی میں شریک کیا اور شام تک نمک پاشی کے اسباب سمیت احباب موجود تھے۔

''ارے دوسری سب باتیں بھلا کر خوشی منانے چلے آئے ہم تو۔'' انہیں اپنے گزشتہ رویّے پر کوئی ندامت نہ تھی۔

''بس اللہ نظرِ بد سے بچائے۔'' امی حسبِ عادت مسکرائے گئیں۔

سالوں گزرے انہوں نے جیٹھانی سے کبھی تکرار نہیں کی تھی۔ جب باقاعدہ ارادے کے ساتھ وہ رویشہ کے کردار پر کیچڑ اچھالنے آئی تھیں تب بھی نہیں تو پھر اب اس مبارک موقع پر تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''ہر مہینے دھیان سے الٹرا ساؤنڈ کروانا۔ ورنہ اپنی بہن کا قصہ تو یاد ہے ناں تمہیں۔'' تائی امی نے پٹاخا چھوڑا۔

''یا اللہ خیر......''

''میری بہن کے ساتھ ایسا ویسا کچھ نہ ہو۔'' اس نے بے اختیار دہل کر خدا سے دعا کی۔

''ہاں بھئی اللہ سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ ہم تو خدا سے یہی دعا کرتے ہیں بس۔'' رویشہ کو ایک فیصد بھی یقین نہ تھا۔ نہ ان کی باتوں پر نہ ان کی دعاؤں پر۔

کہر آلود شام کو اندھیرے نگل رہے تھے۔ برآمدے میں پلنگ کے پائے سے لپٹی صبغہ اپنا سر کھجا رہی تھی۔ اس نے سردی کی شدت میں اضافے کو محسوس کر کے اسے اندر لے جانا چاہا تو اس کے پیر سے بندھی زنجیر نے اس کی آنکھیں بھگو دیں۔

☆☆☆

وقت سست رفتاری سے گزرا مگر، بہرحال......

اسے بلال کی خبر گیری کی عادت پڑ ہی گئی۔ خوش ہوئے بغیر وہ اس کے ایس ایم ایس اور کال کی منتظر رہنے لگی۔

زین تو اس دن کے بعد سے پلٹ کر نہیں آیا۔

بس وہ آخری پیغام اور اس سے جڑی طویل خاموشی ایک ایسا زخم تھا جو معمولی سی یاد کی ٹھیس سے پکنے لگتا۔ رِسنے لگتا اور ایسے میں بلال کو زبردستی سوچنا نکال نکال کر اس کے میسجز پڑھنا...... ایک پین کلر کے مانند...... ایک درد کشا کے بہلاوے کی طرح۔ درد کشا...... جس کا زخم کی گہرائی اور اس کی نوعیت سے اتنا واسطہ نہیں ہوتا لیکن وہ زخم کھانے والے کو وقتی طور پر درد سے نجات دلا کر ایک پُرسکون غنودگی میں دھکیل دیتا ہے۔

ایسا ہی ایک درد کشا منہل کو چاہیے تھا۔ اپنے شریکِ سفر کی بے رخی، بے اعتنائی کاٹنے کے لیے۔ ساتھ ہوتے ہوئے بھی تنہائی کا عذاب بھوگنے کے لیے اور اس کے پاس اس کی تنہائی کے رفیق فی الحال یہ سناٹے اور خاموشی ہی تھی۔

وہ اکیلے ان بدنما، عفریت نما دوستوں سے نبرد آزما رہتی اور زین چپ، چاپ اپنے کام میں گم۔

وہ آزمائش کی کن گتھیوں سے الجھ رہی تھی اسے خود بھی نہیں پتا تھا۔

وہ کسے آزما رہی تھی۔ خود کو، اپنے ضبط کو یا زین کی محبت کو جو کسی اور کے در پر تشنہ چھوڑ آیا تھا۔ وہ خود نہیں جانتی تھی۔

آگہی کا ناگ جو لاشعور سے شعور کے درمیان کھنچے باریک حاشیے پر کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ اسے تب ڈستا جب وہ ادراک کے دروازے کھولتی اور یہ کواڑ تو ایک نہ ایک دن وا ہونے ہی تھے پھر وہ دن جلد ہی آن پہنچا۔

تائی امی یمنیٰ کی خوشخبری کی مبارکباد دے کر آنے کے بعد سے ہی اسے ٹٹول رہی تھیں۔ اٹھتے بیٹھے، کھاتے پیتے چلتے ہوئے وہ ان کی نظریں خود پر محسوس کرتی جز بز ہوتی رہتی۔

''کتنے ہفتے ہو گئے شادی کو اب تک کوئی خوشی کی خبر نہیں سنائی تم نے۔'' انہوں نے بہت نرمی اور سبھاؤ سے بات شروع کی تھی۔ وہ اسی وقت فون پر بیرونِ ملک مقیم اپنی بیٹی سے بات کر کے اس موضوع پر مشاورت کر کے بیٹھی تھیں۔

''جی!'' منہل بات کو یہیں تک رکھنا چاہتی تھی۔

''جی...... کیا جی'' انہوں نے حیرت سے گھورا۔

''کل چلنا میرے ساتھ۔'' بالکل اچانک فیصلہ ہوا۔

''کیوں؟'' وہ ہکا بکا سی ہو گئی۔

''ارے چیک اپ کراؤں گی تمہارا اور کیوں۔''

''لیکن کیوں...... کس لیے؟''

''لو جیسے تمہیں کچھ پتا نہیں۔ اتنے مہینے ہو گئے شادی کو اور بچے کی آمد کے کوئی آثار ہی نہیں۔ آج کل ویسے ہی زمانہ خراب ہے۔ نت نئی بیماریاں سن لو آئے دن بیٹھے بٹھائے۔'' تائی امی ناگواری سے بولتی چلی جا رہی تھیں۔

''لیکن میں کوئی بیمار نہیں ہوں۔'' وہ غصے کے مارے اتنا ہی بول سکی۔

''تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اچھی بھلی عورتیں شادی کے بعد بانجھ نکلتی ہیں۔ یہ تو ڈاکٹر ہی بتائے گی۔''

''کیا بتائے گی ڈاکٹر؟ میرے بانجھ پن کی تصدیق کرے گی وہ...... تو سن لیں کان کھول کر۔ میں بانجھ نہیں ہوں گی اور محرومی آپ کے بیٹے میں ہے۔ سنا آپ نے۔''

''ہیں...... کیا بکواس کر رہی ہو لڑکی......؟'' وہ اچھل ہی تو پڑیں۔

''جی، ٹھیک کہہ رہی ہوں میں۔ پوچھیے اس سے جا کر۔ اگر میری بات غلط ہے تو اتنے مہینوں سے......''

بات کچھ مکمل کرتے، کچھ نہ کرتے اس کی آواز، انا، نسوانیت سب ریت کا ڈھیر بن گیا۔ اور آنسوؤں کے سیلاب میں یہ ریت بہہ ہی جاتی لیکن وہ اٹھ کر تیزی سے کمرے میں چلی گئی۔

تائی امی گنگ تھیں۔ حیرت سے یا شاید صدمے سے۔

☆☆☆

بلال کے بالکل اچانک ہی باہر جانے کے انتظامات مکمل ہو گئے۔ وہ دل میں اٹھتے اداسی کے احساسات کو کچلنے کا سوچ کر ہی دنگ رہ گئی۔

''محبت رنگ بدلتی ہے۔''

اس نے سنا تھا کبھی۔ اب شاید اس تجربے سے گزرنے کا وقت آیا ہی چاہتا تھا۔ جبھی اس نے جانے سے پہلے ایک بار رُبا سے اپنے آنے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ انکار نہ کر سکی۔

''دوپہر کے کھانے میں ذرا اہتمام کر لینا۔ باہر چلا گیا تو جانے کب واپسی ہو گی۔'' امی نے کہا۔

کباب، بریانی، کوفتے، ٹرائفل اور چائنیز سوپ۔ اس اہتمام میں سب ہی کچھ شامل تھا۔ چاہے ایک فرد کے لیے ہی سہی لیکن اسے مستقل ایسا لگتا رہا جیسے سب کچھ اوپری سا ہے۔

''اور اگر اسی جگہ آج زین کو آنا ہوتا یا زین مجھے چھوڑ کر جا رہے ہوتے تو......؟'' ایک خیال بڑا بے موقع چبھ گیا۔ گرم گرم سوپ چمچے سے اس کے ہاتھ پر ٹپک گیا۔

اس نے ''سی'' کی آواز کے ساتھ ہاتھ مل کے نیچے کر دیا۔ چند ہی لمحوں میں وہاں ایک ننھا سا آبلہ بن چکا تھا۔

وہ کئی لمحے اس آبلے کو دیکھتی اسے زین کی یاد سے جُڑے تحفے سے تعبیر کرتی رہی۔ یہاں تک کہ بیل بج اٹھی۔

امی نے دروازہ کھولا تھا۔ اسے لاؤنج سے بلال کے دھیرے دھیرے بولنے کی آواز آرہی تھی اور اپنے کمرے سے صبغہ کے چلّانے کی بھی۔ اسے رات سے شدید بخار تھا۔

''مجھے بھی جا کر سلام کرنا چاہیے۔''

ہر مرحلہ ایک پُرسوچ آزمائش بن چکا تھا۔ (اور بھلا پوری زندگی آزمائش میں گزاری جاسکتی ہے؟ جانی بوجھی آزمائش)

''ایک شخص کے بدلنے سے کیا کچھ بدل چکا تھا۔ کہاں کہاں، کس کس جگہ۔'' اس نے گہری سانس لے کر قسمت کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

بلال کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر ایک واضح چمک آئی۔ یا شاید اس کی آنکھیں چمکدار ہی ہوں گی۔ اس وقت چمک بڑھ گئی تھی اور اس چمک کا عکس چہرے پر جھلملا کر اسے روشن کر رہا تھا۔

''کیسی ہو رہا؟'' الفاظ کے سوا سب ہی کچھ مختلف تھا...... آواز، لہجہ اور انہیں ادا کرنے والا۔

وہ ''ٹھیک اور خیریت'' کی رسم کے درمیان معلق ہوئی چاہتی تھی کہ کمرے سے یکدم صبغہ کے چیخنے کی آواز آئی۔

''میں ابھی آتی ہوں۔''

وہ پل میں لپک کر اندر چلی گئی۔ اور وہ پل کے لیے بے مزہ سا ہو گیا۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر نہیں رہی۔ اسے جلدی واپس جانا تھا۔ اس لیے جلد ہی کھانا چُن دیا گیا۔

وہ پہلی بار اپنی ہونے والی سسرال یوں تنہا آیا تھا۔ وہ بھی گھر والوں کے علم میں لائے بغیر اس کے خیال میں امی یا بابا اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ وہ اکیلے یہاں آئے۔ لیکن دراصل وہ اکیلے ہی آنا چاہتا تھا تاکہ من چاہی ہستی کے ساتھ تھوڑا وقت گزار سکے۔ کھانا مزیدار تھا۔ اور پھر یادگار بھی ہو گیا۔

روبیشہ بالکل سامنے ہی تو بیٹھی تھی۔ رکی رکی سی، نیچی نظریں، دھیمی دھیمی آواز لہجہ اور انداز۔ ایک مسحور کُن احساس اسے اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا سادہ چہرہ دمک رہا تھا۔ کچھ دیر کے لیے اسے تکتے ہوئے، وہ اپنے برابر میں بیٹھی اس کی تواضع کا دھیان کرتی امینہ بیگم کو بھی بھول گیا۔ جبھی ایک سوچ......

''اگر زین بھائی دیوانے تھے بھی تو، یونہی تو نہیں ہوں گے۔'' ایکا ایکی دل میں ابھرنے والے اس خیال نے لحظہ بھر کے لیے اسے دنگ کیا پھر مضطرب......

ابھی وہ خود کو پیش کی جانے والی تاویل کی پھسلتی ڈور کو سنبھال ہی رہا تھا کہ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ اس نے یونہی بے دھیانی میں مڑ کر دیکھا۔ اور پھر جیسے ایک دم ہڑبڑا کر رہ گیا۔ وہ کون تھی؟ روکھے بے ترتیب بال۔ بڑے بڑے باہر کو ابلتے دبلے دبلے ہونٹوں کے کناروں سے نکلتی رال اور عجیب بھاری اور ڈراؤنی آواز۔ اسے لگا، اس کا دل سینے سے باہر نکلتے نکلتے بچا ہے۔

''ارے صبغہ۔ تم کہاں آگئیں یہاں۔'' ربا نے ایک دم بڑھ کر اسے سنبھال لیا پھر برابر میں بٹھا لیا۔ بلال نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اور نظر چرا کر دوبارہ بیٹھ گیا۔

''گھبراؤ نہیں یہ کچھ نہیں کہے گی تمہیں۔'' امینہ بیگم نے اس کی گھبراہٹ بھانپ لی تھی۔ وہ جھینپ کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

روبیشہ اب خود کھانے کے بجائے اسے کھلا رہی تھی۔ وہ ایک چمچہ سوپ لے کر اس کے منہ میں ڈالتی پھر، باچھوں سے بہہ نکلنے والا لعاب کپڑے سے صاف کرتی۔

بلال کے لیے کھانا مشکل ہو گیا۔ اسے بے اختیار

گھن آنے لگی۔ اس نے جلد ہی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور پھر مزید اصرار کے باوجود اور نہیں کھا سکا۔

روبیشہ جانتی تھی یہی ہوگا۔ اس نے بلال کا ردعمل دیکھنے کے لیے صبغہ کو وہاں بٹھایا تھا۔ اور اس کا ردِعمل اس کی توقع سے مختلف نہ تھا۔ اس کے دل میں بے اختیار دکھ نے سر اٹھایا اور کسی احساسِ زیاں نے بھی۔

زین نے آج تک کبھی صبغہ سے گھن کھائی تھی نہ خوف۔ وہ ہمیشہ بہت آرام سے اسے چھوٹی بچی کی طرح ٹریٹ کرتا تھا۔ اور بلال ابھی تک اس پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر جھرجھری لے رہا تھا۔

''اوہ خدایا!''

بلال کے دل سے بار بار صدا نکلتی۔

''یہ روبیشہ سے اس قدر مشابہہ کیوں ہے؟''

اس کی نظر اڑ اڑ کران دونوں پر پڑتی رہی، جب تک کہ روبیشہ وہاں سے اٹھ کر چلی نہ گئی۔ لیکن اس نے جان بوجھ کر صبغہ کو وہیں چھوڑ دیا۔

''جب زندگی بھر کا ناتا جڑنے جارہا ہے۔ تو بہتر ہوگا کہ وہ مجھے اور مجھ سے جڑے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح پرکھ لے۔'' اس کی سوچ تھی۔

اسے چائے پکڑا کر واپس آتے ہوئے اس نے بلال کے چہرے پر کراہیت دیکھی۔ اس کا دل نئے سرے سے دُکھا۔

ابھی وہ اسی خیال میں گم چائے کی کیتلی سنک میں رکھے اسے گھور رہی تھی۔ جب اس نے صبغہ کی آواز سنی۔ وہ زور زور سے اسے بلا رہی تھی۔ اماں جانے کہاں چلی گئی تھیں۔ پھرتی سے پلٹ کر کچن سے نکلتے نکلتے اسے بلال بھی آواز دے چکا تھا۔

صبغہ اس کا ہاتھ مٹھی میں دبوچے بری طرح کھینچ رہی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں گرم چائے کا کپ اور ساسر تھی۔ جسے وہ بچانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ لیکن کوشش ناکام رہی اور گرم چائے اس کی سفید بے داغ شرٹ پر الٹ گئی۔ چائے بے حد گرم تھی۔ یقیناً اسے تکلیف ہوئی ہوگی۔ روبیشہ نے بے اختیار زبان دانتوں میں دبالی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ صبغہ کو روکتی یا کچھ کرتی۔ بلال نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا کے صبغہ کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔

''ہا......'' روبیشہ کا منہ کھلا رہ گیا۔

صبغہ کی آواز کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ ہلچل مچاتے منظر پر سکتہ طاری ہوگیا۔ وہ بری طرح الٹ کر پیچھے گری۔

''صبغہ......صوبی میری جان۔''

روبیشہ کا دل جیسے کسی نے بھاری بوٹ تلے مسل دیا۔ وہ لپک کر بہن کو اٹھانے لگی۔ صبغہ کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ عجیب وغریب انداز میں بھونڈی سی آواز میں دھیرے دھیرے رونے لگی۔ روبیشہ اسے بے تحاشا چوم رہی تھی۔ بلال کو اس نے یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ بلال چند لمحے کوفت زدہ انداز میں اسے اپنی جڑواں ابنارمل بہن کو پیار کرتے دیکھتا رہا پھر اپنی سفید شرٹ پر پڑے بدنما داغ دیکھتا ہوا سیدھا نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

دوپہر ڈھل کر منڈیروں پر سمٹ گئی تھی۔ زرد، اداس اکیلی دوپہر۔ اسے اپنے وجود میں اور اس دم توڑتی دوپہر میں کوئی فرق محسوس نہ ہوا۔ عزتِ نفس کی موت اگر انسان کی اپنی موت ہوتی تو وہ کب کی مرچکی ہوتی۔

''بانجھ......بیٹے سے پوچھیں۔''

ادھوری پرچھائیاں......

''مجھے کوئی بیماری نہیں۔'' بولتا لہجہ اور بدلتا منظر۔

خون آشام جڑیلی، سوکھی بیلیں، تند و تیز ہواؤں کے جھکڑ میں ڈولتی......

''بانجھ ہے یہ...... یہ ہے بانجھ۔ اتنے...... کتنے......کتنے مہینے ہوگئے ہے؟''

غصے میں چیختی چلاتی انگلی اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کرتی......

وہ اس منظر میں موجود ہی نہیں تھی۔ جہاں وہ تھی،

وہ تو کہیں اور پہنچی ہوئی تھی۔

گھنا، تاریک، تنہا، جنگل.... کالی گھور سیاہ رات...... اور سر سے زمین تک لٹکتی سیاہ بیلیں جن میں کوئی پتہ نہ تھا، کوئی پھول نہ تھا، فقط سرنگیں سیاہ...... جن کے نوکیلے ابھری نیلی رگوں والے ہاتھ لمبے ہو کر فضا میں لہرا رہے تھے۔ اس کے بازوؤں کو اپنے شکنجے میں جکڑ رہے تھے۔ اس کے وجود سے لپٹ کر اسے بے بس کر رہے تھے۔ وہ چاہ کر بھی اپنا آپ چھڑا نہیں پا رہی تھی۔ تبھی کہ تبھی......

''دھپ'' کوئی چیز اس کے برابر میں آ کر گری۔ اس کی چمٹی ہوئی پلکیں جھپک گئیں۔ اس نے چونک کر برابر میں دیکھا۔

''یہ کچھ کتابیں ہیں۔ تمہیں رات میں نیند نہیں آ رہی تھی ناں آج بھی شکایت ہو تو...... پڑھ لینا وقت اچھا گزرے گا۔''

اس کی اجنبی نظریں مانوس خدوخال پر ٹھہری تھیں اور وہ اندر جا چکا تھا۔ اسے لگا اسے یہیں بیٹھے بیٹھے رات بِتا دینی چاہیے۔

جانے کتنا وقت گزرا تھا۔ وہ ڈراؤنا خواب دیکھتے، دیکھتے۔

عصر سے عشاء کا وقت ہونے کو آیا۔ جب کھلی آنکھوں میں چلتا خواب ٹوٹا بھی تو اسی دشمنِ جاں کی آواز پر جو اس کا سکون غارت کر کے اب بیڈ روم میں بند ہو چکا تھا۔

تائی امی کا موڈ جانے کس بات پر خراب تھا۔ دوپہر میں زین کی چھوٹی بہن اپنے میکے کا چکر لگا کر گئی تھی۔ وہ تبھی سے خار کھائے بیٹھی تھیں۔

تو یہ طے ہے کہ آج کے دن کا آخری کھانا بھی مجھے تنہا زہر مار کرنا ہے۔ دوپہر میں بھی ساس امی نے اپنی بیٹی کے ساتھ دوپہر کا کھانا اپنے کمرے میں ہی کھا لیا تھا۔

اس کا جی ہر چیز سے اچاٹ ہونے لگا۔ جی چاہا ایک ہاتھ مار کر یہی سجائی ٹیبل الٹ دے۔ وہ اپنے خیال کو عملی جامہ تو نہ پہنا سکی۔ لیکن کمرے میں زین وقت سے کہیں پہلے خدا جانے سو رہا تھا یا سونے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔ اس نے جا کر بری طرح جھنجھوڑ دیا۔

''کیا بات ہے؟ کیا مصیبت ہے؟''

''میرے اندر آگ لگی ہے۔'' اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہ تھی۔

''بھانبھڑ جل رہے ہیں۔ عزت داؤ پر لگی ہے اور تم یہاں پڑے سو رہے ہو۔'' آخر میں اس کی آواز چیخ میں بدل گئی۔

''کیا بکواس کر رہی ہو۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔''

''اور سمجھ آئے گا بھی نہیں۔ اس منحوس کی پٹی آنکھوں سے اترے گی تب ناں۔''

''کون؟'' اس نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ ''روبیشہ!''

''ہاں اسی ڈائن کی بات کر رہی ہوں میں۔''

اس وقت وہ خود کسی بلا کی طرح اسے نیند سے جگا کر بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہو گئی تھی۔ زین لب بھینچے اسے دیکھتا رہا۔ پھر یکدم اس کا بازو پکڑ کر زور دار جھٹکا دیا۔

''ڈائن وہ نہیں، ڈائن تم ہو تم۔ ایسی ڈائن جس نے میرے خوابوں کو کھا لیا، میری خواہشوں کو نگل لیا، میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی کو ختم کر دیا تم نے اور اگر تھوڑے دن تم اور یہاں رہو گی تو ایک دن، مجھے بھی ختم کر دو گی۔''

چبا چبا کر بولتا وہ ایک جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑ کر اٹھا۔ وہ سکتے کی کیفیت میں پیچھے کو لڑکھڑائی اور وہ تیزی سے اٹھ کر چپلیں گھسیٹتا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

کتنی صدیاں بیتی تھیں۔ کتنے زمانے گزرے تھے۔ جانے کتنا وقت باقی تھا صبح صادق کے آثار نمودار ہونے میں۔ زیست پر چھائی کالی رات ٹلتی نظر نہ آتی تھی۔ صبح کا ستارہ ناامیدی کی گود میں جا سویا تھا۔ جلتی آنکھیں، بھیگے لب، کسی نقصان کا نوحہ پڑھ رہے تھے۔

گہری بدلیوں نے چاند کے چہرے پر نقاب ڈال دیا تھا۔ اس کے دل کی طرح بھرے بھرے بادل کسی بھی لمحے برس پڑنے کو بے تاب تھے۔ تن تنہا...... خالی کمرا، ویران وجود، بے شکن بستر۔ سب اس کی بربادی میں برابر کا غم بانٹنے کو تیار تھے۔

جبھی کمرے میں رقص کرتی وحشت کے گھنگرو تھمے اور سناٹے نے ہانپتے ہوئے سانس بھری۔

ایک مانوس سی موسیقی کمرے میں جاگ رہی تھی۔ ایک بار، دوبار... اس نے جھنجلا کر سیل اٹھایا۔ زین کے موبائل پر رومیشہ کا نمبر دیکھ کر اس کا دل چاہا کہ اس موبائل کو سامنے دیوار پر پوری قوت سے دے مارے مگر...... جانے کس خیال نے دستک دی تھی۔ اس نے کال ریسیو کرلی۔

''زین...... زین آپ پلیز گھر آجائیں۔ صوبی کی طبیعت بگڑ رہی ہے۔ اسے شام سے فٹس پڑ پڑ کے حالت خراب ہوگئی ہے۔ شدید بخار چڑھ گیا ہے پلیز آجائیں۔''

وہ اس سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی کچھ ایسا جو اس کے اندر جلتے الاؤ پر سرد چھینٹے ڈال دے۔ جو اس کے اندر بھری نفرت اور غصے کو ایک جملے میں اس پر انڈیل دے۔ جیسے اس کی اپنی نیندیں جل اٹھی تھیں۔ ویسے ہی اس کی نیندیں بھی جہنم رسید کردے لیکن وہ تو پہلے ہی رو رہی تھی۔ منہل کو قرار سا ملنے لگا۔ وہ مضطرب تھی۔ زین کو پکار رہی تھی۔.. بلا رہی تھی مگر...... زین تو......

''وہ گھر پر نہیں ہیں۔''

اس کے خیال میں اسے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بات مکمل کرتے ہی لائن کٹ گئی۔ کال پھر آنے لگی۔

''کہاں ہیں زین! پلیز ان سے کہیں گھر آجائیں۔''

''کیسے کہہ دوں جب وہ یہاں ہیں ہی نہیں۔''

''دیکھیں میں آپ کی منت کرتی ہوں۔ باہر بہت شدید بارش ہے۔ ورنہ میں اکیلی اسے اسپتال لے جاتی۔ ابو اور ان کی فیملی بھی یہاں نہیں۔ پلیز میری زین سے بات کروادیں۔ ایک بار خدا کے لیے......''

اس کے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔

''تمہیں ایک بار کی بات سمجھ نہیں آتی۔ نہیں ہے وہ یہاں اور اب فون مت کرنا۔'' اس نے سختی سے بات کرکے فون سرہانے کی طرف اچھال دیا اور واش روم میں جاکر منہ پر یخ پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔

جلتی آنکھوں کو ذرا سا سکون دے کر جب باہر نکلی تو سیل متواتر بج رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کن انداز میں موبائل آف کرکے سائڈ ٹیبل کی سب سے نچلی دراز میں پھینک دیا۔

☆☆☆

اگلے دن کی صبح کسی قیامت سے کم نہ تھی۔ پاس پڑوس کی عورتوں کی آمدورفت شروع ہوچکی تھی۔ گھر کا سامان باہر نکالا جارہا تھا۔ دن چڑھا اور سورج کی ادھ مری تپش آنگن تک آئی، تو چاندنیوں اور سپاروں کے انتظامات کیے جانے لگے۔

جن بازوؤں نے آخری وقت میں اسے سمیٹا تھا۔ وہی بازو گھٹنوں پر لپیٹے۔.. ان میں منہ چھپائے وہ کب سے خاموش سب سے پرلی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

آہیں، آوازیں، سوگواریت، دنیا، لوگ...... ہر چیز سے چھپنا چاہتی تھی وہ۔ کہیں کسی اندھیرے کونے میں دور بہت دور۔ جہاں کوئی آواز اس تک نہ پہنچے۔ کوئی زندگی کا احساس دلاتی چیز نہ سنائی دے، نہ دکھائی دے، نہ محسوس ہو...... کوئی جنبش نہیں...... کوئی سانس، کوئی دھڑکن تک نہیں۔

میت کو غسل دیا جاچکا تھا۔ رشتے دار جمع ہوگئے تھے۔ خواتین، اماں کے سسکتے وجود کو دلاسا دینے کے لیے لپٹاتیں۔ یمنیٰ کو صبر کی تلقین کررہی تھیں۔ جب کسی نے اس کا شانہ ہلایا۔

''بہن کو دیکھ لو بیٹی، آخری بار''

آواز اداسی میں ملفوف ادھوری رہ گئی۔

"آخری بار" اس نے دھیرے سے سر اٹھایا۔ پتھرائی آنکھوں سے سامنے سفید لباس میں لپٹی بے جان مورت کو دیکھا۔ پھر اس کے پاس، سرہانے جا کر بیٹھ گئی۔

بال نظر نہیں آتے تھے۔ عیب دار آنکھیں...... پپوٹوں تلے چھپ گئی تھیں۔ لب خاموش، خشک شاید آج سے پہلے وہ کبھی اتنی صاف ستھری اور پاکیزہ نہیں لگی تھی۔ صاف ستھری پاکیزہ لیکن بے جان۔ ہو بہو اس کی شکل ...اُسی کا قدبت...... اس کی جڑواں بہن...... وجود کا حصہ۔

ایک آنسو اپنی بے قدری کا احساس لپیٹ کر پلکوں کی دہلیز سے نکلا اور رزقِ خاک ہو گیا۔ کتنے گھنٹوں سے باندھا گیا بند ٹوٹ گیا اور نمکین سیلاب بہہ نکلا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی اس سے لپٹ رہی تھی۔ اسے بے تحاشا چوم رہی تھی۔

جبھی برسوں کے بعد، جانے کتنے زمانوں کے بعد صداقت علی اور ان کے بالکل پیچھے زین العابدین نے گھر میں قدم رکھا۔

اس نے اپنی سرخ انگارہ آنکھیں اٹھائیں۔ کمرے کے کھلے دروازے سے نظر آتے صحن کے وسط میں وہ اور اس کے پیچھے منہل...... وہ اٹھی اور باہر نکلی آگے بڑھتے صداقت علی کو نظر انداز کرتی سیدھی زین کے سامنے پہنچ گئی۔

زین نے اسے اپنے سامنے حال سے بے حال کھڑے دیکھا۔ اور اس کے سینے میں کسی نے بھالا اتار دیا۔

"اب آئے ہیں آپ یہاں اتنی دیر لگا کر؟ کہاں تھے کل رات سے؟ کتنا بلایا میں نے۔ میری بہن چلی گئی مجھے چھوڑ کر زین...... سب کو بوجھ لگتی تھی وہ۔ سب اس کے زندہ رہنے سے تکلیف میں تھے۔ مگر آپ تو ایسے نہیں تھے۔ کیوں کیا آپ نے ایسا؟ کیوں نہیں آئے آپ؟ کتنا بلایا میں نے، کہاں تھے آپ؟ کیوں نہیں آئے؟"

بے تحاشا روتے ہوئے وہ اس کا گریبان تھام کر، جیسے دنیا جہان بھلا کر کسی اپنے سے اپنا غم کہہ رہی تھی۔ دو قدم پر کھڑے صداقت علی کی ہمت نہ تھی کہ اسے روک لیتے۔

کمرے کے اندر باہر...... گھر کے پورے منظر پر جمود طاری تھا۔ ان کے ساتھ کھڑے دو خاندانوں نے جدا جدا تاثرات سے یہ منظر دیکھا۔ ان میں بلال بھی شامل تھا اور ہانیہ بھی۔ تائی امی بھی تھیں اور منہل بھی۔ لیکن آج اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ پھٹے بانس کی طرح بیٹھی آواز اور خراش زدہ حلق کے ساتھ زور زور سے روتی وہ صرف زین کو دیکھ رہی تھی۔ اس سے شکوہ کر رہی تھی۔ جو اسے سنبھالتے، سمیٹتے بے بس ہوا جا رہا تھا۔ بالآخر اس کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ ان ہی مہربان بازوؤں میں ہوش و حواس سے بے بہرہ ہو گئی۔ جن کا سہارا لینا اس کے نصیب میں نہ تھا اور وہ اپنے نصیب سے ہار چکی تھی۔

☆☆☆

زیست کیسا کیسا وقت سامنے لاتی ہے۔ کڑا سماں، مشکل لمحات، کٹھن مرحلے...... انسان جانتے بوجھتے کسی منظر سے چرا کر آنکھیں بند کرتا ہے۔ پھر بند آنکھوں کے پیچھے اسی منظر سے گھبرا کر آنکھیں کھولتا ہے۔ پھر بند کرتا ہے، جھٹلاتا ہے، جھنجلاتا ہے، شعور کی تیز نوکیلی آواز کو ان سنا کرتا ہے۔ بہرہ بن جاتا ہے۔ لیکن سچائی کسی عینک کی طرح ادراک کے دونوں اطراف کمانیاں اڑا کر بیٹھ جاتی ہے۔ دائیں بائیں اوپر نیچے اسے کتنا ہی ہٹانے کی کوشش کرو وہ شعور کی آنکھ سے چپکی ہی رہتی ہے۔ تاوقتیکہ انسان اپنی تمام انا، ضد اور بعض اوقات عزت کو بھی بالائے طاق رکھ کر اس حقیقت کو قبول کر لیتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی منظر کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔

ایک جلتا ہوا منظر، ایک سلگتی ہوئی حقیقت، جس نے پچھلے چند ایک سال سے سجائے ہوئے اپنے تئیں تمام سپنے اور ارمان، ایک طنزیہ ہنسی اور پاؤں کی

حقارت بھری ٹھوکر سے ہوا میں اڑا دیے تھے۔

اپنے دل کی سنتے، سنتے وہ جس حقیقت سے نظریں چرا کر اسے جھٹلانے چلا تھا۔ اب وہ حقیقت اپنے چہرے پر کڑوی آگہی مل کے، پوری آنکھیں کھول کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔ نہ کوئی جائے پناہ تھی نہ راہِ فرار۔ بس چند آوازیں تھیں۔ پچھل پیریوں کی طرح تعاقب کرتی۔ راستے میں کھڑی کالی بلی کی طرح۔

''میں نے آپ کو بلایا تھا۔ آپ کیوں نہیں آئے۔''

''سب کو اس سے تکلیف تھی سوائے آپ کے۔''

یہ سن کر تو بلال کو وہیں صحن میں ہی سرما کی دھوپ میں پت جھڑ کی زردی گھلتی محسوس ہونے لگی تھی۔ اسے لگا جیسے رویشہ نے انگلی اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کیا ہو۔

☆☆☆

امینہ بیگم کے لیے یہ دن پوری زندگی سے زیادہ بھاری تھے۔ جب صداقت علی ان کے گھر میں روز ہی تشریف لا رہے تھے۔ دنیا کی عورتوں کے لیے ان کے مرد سے بڑھ کر کوئی سہارا نہیں ہوتا۔ وہ کیسے خاوند تھے کہ ان کی آمد اور موجودگی نے امینہ بیگم کے دکھ کو دگنا کر دیا تھا۔ ان کے دل کا بوجھ اور بڑھا دیا تھا۔ پہلے دن سے لگی آنسوؤں کی جھڑی اب تک نہ ٹھہری تھی۔ اور سر کا درد گھر کے افراد کی طرح مکین تھا۔

بالآخر بہت سوچ سمجھ کر اور وقت کے ساتھ وہ اپنے باپ کے روبرو تھی۔

''آپ اپنے گھر چلے جائیں واپس۔'' نظریں زمین میں گاڑے اس نے پتھر سے لڑھکائے۔ صداقت علی ایک دم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی نظروں میں حیرت اور بے یقینی ثبت تھی۔

''بیٹی میں بہت شرمندہ......''

''برائے مہربانی'' اس نے نرمی سے ہاتھ اٹھا کر ان کی بات کاٹی۔

''ہم ان بھاری الفاظ کے قابل نہیں۔ بس آپ آئندہ تشریف لانے کی زحمت نہ کریں۔ ہمارا خرچہ اٹھا کر پہلے ہی آپ نے ہمیں اپنے احسانات کے بوجھ تلے دبا رکھا ہے۔ اب اگر مزید آپ یہاں رک بھی گئے تو اس احسان کے بوجھ سے ہمارا دم گھٹ جائے گا۔'' اس کی آواز بھاری ہو گئی۔ آنکھوں میں جلن اور نمی بڑھ گئی۔

''ایسا مت کہو بیٹا۔ میری بات تو سنو۔''

''آپ میری بات سن لیں میں اپنی بہن کو کھو چکی ہوں، ماں کو کھونے کی ہمت نہیں۔ اور ویسے بھی ہم آپ کے بغیر جینا سیکھ چکے ہیں۔ ہمیں آپ کی عادت نہیں رہی۔''

بیرونی دروازے سے داخل ہوتے زین نے رویشہ کو پھوٹ پھوٹ کر روتے۔ اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کرتے دیکھا۔ چچا تھکے، تھکے برآمدے سے باہر نکل کر صحن میں آئے تھے۔

وہ لمحہ بھر کے لیے زین کے قریب ٹھہرے۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور باہر نکل گئے۔ ان کی آنکھوں میں امڈتی نمی زین کی نظروں سے مخفی نہیں رہی تھی۔

زین نے ایک بڑی محرومی کا دکھ ازسرِنو اپنے بائیں پہلو میں کروٹیں لیتا محسوس کیا۔ اس نمی میں کیا کچھ تھا۔ شاید افسوس، شاید پچھتاوا یا شاید صرف جذباتیت۔ وہ خود بھی چپ چاپ ہاتھوں میں کپڑے، دواؤں اور پھلوں کے شاپرز برآمدے میں ٹیبل پر رکھ کر واپس پلٹ گیا۔

☆☆☆

منہل چلی گئی۔

تائی امی کو آئینہ دکھا کر۔ زین کے سامنے اعترافِ جرم کر کے۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔

''اس رات آپ کے جانے کے بعد......'' وہ جانتی تھی۔ زین واقف ہو چکا تھا۔

اس طوفانی رات کی صبح جب اس نے اپنا موبائل

فون تلاش کیا تو وہ اسے سائیڈ ٹیبل کی دراز میں آف پڑا ہوا ملا۔ وہ خود تو فون وہاں نہیں رکھ کر گیا تھا۔ ظاہر ہے کسی نے جان بوجھ کے ہی وہاں ڈالا تھا۔ فون آن کرتے ہی ربا کی ڈھیروں مسڈ کالز اور میسجز نے ساری حقیقت اس کے سامنے عیاں کر دی تھی۔ بعد میں اس ہی نے صداقت اور دوسرے لوگوں کو اطلاع دی تھی۔ لیکن اس نے منہل سے کوئی بھی سوال نہیں کیا تھا۔ کوئی باز پرس نہ کی تھی۔ منہل کی سزا کے لیے اس کے ضمیر کی چبھن ہی کافی تھی۔

"مجھے معاف کر دیں۔ میں غصے میں بالکل اندھی، بہری بن گئی تھی۔" وہ سر جھکائے سسک رہی تھی۔

زین نے تب بھی کچھ نہیں کہا۔ صرف اس کے بندھے ہاتھ کھول کر، اس کے آنسو صاف کر دیے اور تھکے ماندے قدموں سے گھر سے باہر نکل گیا۔

تب وہ اٹھی اور اپنا سامان سمیٹ کر ساس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

"آپ تو ماں ہیں اور ماں اپنی اولاد کی ہر تکلیف، ہر خوشی، ہر خواہش کو سمجھ لیتی ہے پہچان لیتی ہے...... اس وقت سے جب اسے ہنسنا اور رونے کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔ پھر آپ کیوں نہیں سمجھ سکیں اس کے دل کی خواہش کو؟ اس کی آرزو کی گہرائی کو ناپ کیوں نہیں سکیں امی؟"

تائی امی حیرت زدہ و نادم سی اسے سن رہی تھیں۔

"اب بھی بہت دیر نہیں ہوئی۔ سنبھل جائیں۔ سمجھ جائیں۔ وہ گھل رہے ہیں، اندر ہی اندر جل رہے ہیں۔ یہ زبردستی کا ساتھ نہیں نبھا پائیں گے۔ وہ میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ساتھ نہیں ہوتے۔ وہ روبیشہ سے ملتے نہیں۔ اسے دیکھتے تک نہیں۔ اس کی آواز بھی نہیں سنتے مگر اس کے ساتھ ہوتے ہیں ہر وقت۔ فضول کے واہموں میں گھر کر اپنی اولاد کو اس عذاب میں مزید مت تڑپائیں۔ پتا نہیں آپ کو اتنے سالوں میں کیوں نظر نہیں آیا وہ سب، جو میں نے فقط ایک منظر میں دیکھ لیا۔ وہ سب جو آپ کو سالوں پہلے نظر آ جانا چاہیے تھا اور رہی میں، تو مجھ میں کوئی کمی نہیں، کوئی خامی نہیں۔ کوئی عیب نہیں...... پھر میں کیوں زبردستی ایک ایسے شخص کے سر پر سوار رہوں جو دانستہ یا نادانستہ میری ذات کی نفی کر کے خود تو ندامت سہے گا ہی، مجھے بھی نفسیاتی مریض بنا دے گا۔"

تائی امی کا سر جھک گیا۔ ندامت کے احساس تلے چُور چُور ہو گئیں۔ جو باتیں منہل آج ان سے کہہ رہی تھی۔ یہ تو وہ ہمیشہ سے سمجھتی تھیں، جانتی تھیں۔ وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گئی اور ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"آپ نے اپنے بیٹے کی خود سے محبت آزمالی۔ وہ آپ کی خواہش کیا احترام میں اپنی زندگی سے ہی دستبردار ہو گئے۔ اب آپ انہیں زندہ کر دیں امی! اپنے بیٹے کو اس کی زندگی، ایک جیتی جاگتی زندگی لوٹا دیں۔ ہاں میں ان کی بیوی ہوں مگر میں ایک عورت بھی تو ہوں اور عورت کا ظرف ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا۔ سمندر جتنی وسعت اور ظرف عطا کیا ہے قدرت نے عورت کو۔ آپ کے پاس بھی اتنا ہی وسیع ظرف ہے۔ اتنا ہی بڑا دل ہے۔ بس اس کی کھوج لگا لیجیے گا۔ بہت سی الجھنیں سلجھ جائیں گی۔"

☆☆☆

وقت کے پیمانے سے قطرہ قطرہ ٹپکتے دنوں نے اس گہرے گھاؤ پر ٹھنڈے پانی سے بھیگا پھایا رکھا تو تھا۔ پر کبھی کبھی کوئی یاد دل میں چٹکی بھرتی تو کچے زخم سے کھرنڈ اتر جاتا اور وہ کہیں کونے کھدرے میں منہ دے کر دل ہلکا کر لیتی۔ کیونکہ وہ امی کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ زین کی آمد و رفت ختم نہیں مگر کم ضرور ہوگئی تھی۔ روبیشہ البتہ اُس سے بات کرنے میں احتیاط ہی برتتی تھی۔ ان ہی دنوں اُس کا گھر ٹوٹنے کی خبر پورے خاندان میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

امی نے زین سے تفصیلات تو جاننے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ افسوس ضرور کیا۔ مگر وہ کوئی بھی ردِ عمل ظاہر کیے بغیر خاموش بیٹھا رہا۔ رُبا وہاں نہیں تھی مگر اندر کمرے میں امی کی بات ضرور سن رہی تھی۔ اس کا گھر

ٹوٹنے کی خبر نے اسے کوئی خوشی نہیں دی تھی۔ اسے اپنے دل پر قابو رکھنا آچکا تھا۔ دل میں اب بھی اس کی محبت پورے دھڑلے سے دھرنا دیے بیٹھی تھی۔ مگر اسے پانے کی خواہش دم نہیں مار سکتی تھی۔ بلال بیرونِ ملک جا چکا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے ایک مختصر سے میسج میں اسے خدا حافظ کہا تھا اور بس۔

یمنیٰ کی ڈلیوری کے دن نزدیک آگئے۔ بچے ٹوئنز تھے اس نے خاندان میں نہیں بتایا تھا۔ اس کے گھر آنے والی اس نئی خوشی کی تیاری نے امینہ بیگم اور روبیشہ کو صبغہ کی موت کے غم سے سنبھلنے میں بہت مدد دی۔ یمنیٰ نے بھی جان بوجھ کر انہیں اپنی تیاریوں میں مصروف کر دیا تھا۔ اور یہ خوشی بہرحال کوئی چھوٹی بھی نہ تھی۔ وہ بہرحال کئی سالوں بعد بہت دعاؤں اور منتوں مرادوں سے ماں بننے جا رہی تھی۔

بلال کے فون اور میسجز میں صبغہ والے واقعے اور پھر دوسرے ہی دن اس کی دائمی جدائی کے بعد بہت تیزی سے کمی آئی تھی۔ روبیشہ نے بھی نوٹس لینا ضروری نہیں سمجھا کہ وہ بہرحال اس حادثے میں کسی حد تک اسے بھی قصوروار سمجھتی تھی۔ اس دن صبغہ کو تیز بخار تھا اور اسے زندگی میں کبھی کسی نے سختی سے چھوا تک نہ تھا۔ کجا کہ کسی مردانہ ہاتھ کا تھپڑ...... اس کی طبیعت جب ہی سے بگڑنا شروع ہوئی تھی اور روبیشہ کے دل میں جنم لیتا بلال نامی نرم گوشہ تبھی سے پتھر ہونا شروع ہوا۔

☆☆☆

وہ جنوری کی ایک سرد ٹھٹھرتی ہوئی رات تھی۔ جب تیسرے پہر اسپتال کے یخ بستہ کاریڈور میں اس کے لبوں پر دعائیں جاری تھیں۔ آپریشن تھیٹر سے نکلتی ڈاکٹر نے تفکر آمیز انداز میں انہیں دیکھا اور نزدیک آئی۔

"مبارک ہو ٹوئنز ہیں، بیٹیاں"

"میری بہن......؟" وہ بے تابانہ بولی۔

"وہ بالکل ٹھیک ہیں خدا کا شکر ہے لیکن بچیوں کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ دونوں بہت ویک ہیں۔ خاص طور پر ایک بچی کے بچنے کے چانسز بہت کم ہیں۔ پیدائش سے پہلے ہی اس کی بریتھنگ (تنفس) میں رکاوٹ آگئی تھی اور ہارٹ بیٹ میں بھی۔ آپ دعا کریں بس۔"

وہ بے دم انداز میں بینچ پر گر گئی۔

"اور کتنی آزمائش باقی ہے خدایا!"

امینہ بیگم کے لب بے آواز پھڑپھڑائے۔ انہیں لگا وقت الٹی چال چلنے لگا ہے۔ ان کی زندگی کے سخت ترین لمحات دوبارہ دُہرائے جانے والے ہیں۔

چند گھنٹے گزرے تو یمنیٰ کو روم میں شفٹ کر دیا گیا اور ایک کامنی، پھول سی بچی اس کی گود میں آگئی۔ گلابی روئی کے گالے جیسی۔

"دوسری ابھی نرسری میں ہے"

نرس بے تاثر انداز میں اطلاع دے کر چلتی بنی۔

زین، تائی امی کو لے کر فجر کے وقت پہنچا۔ یمنیٰ کے شوہر کو گھر بھیجا اور خود ٹھہر گیا۔ یمنیٰ کی ساس گو کہ ضعیف تھیں مگر اس وقت مستقل وہیں موجود رہ کر امی کا حوصلہ بڑھانے کا سبب بنی رہیں۔ روبیشہ نے ان کی تھکن کا خیال کر کے انہیں بھی بیٹے کے ساتھ روانہ کر دیا۔

وہ ننھی منی فرشتہ سی جیتی جاگتی گڑیا کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ اسے چوم رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک انمول خوشی تھی اور چہرے پر بچکانہ شوق۔ عرصے بعد زین نے نظر بھر کر اسے دیکھا تھا۔

تبھی ایک وارڈ بوائے وہ منحوس خبر لے کر آیا۔ جس نے سب کے دلوں پر غم کی کہر جما دی۔ یمنیٰ بے اختیار ہو کر زار و قطار رونے لگی۔ زین نے فوراً اس کی سسرال اور شوہر کو خبر دی۔ روبیشہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے اللہ نے ایک بار پھر صبغہ کو ان سے واپس لے لیا ہے۔ لیکن وہ کفر کی مرتکب نہیں ہونا چاہتی تھی۔

"چپ ہو جاؤ یمنیٰ۔ اور شکر ادا کرو ایک بیٹی زندہ سلامت تمہارے پاس موجود ہے۔ خدا کی مرضی میں چھپی مصلحتوں کو بھلا ہم جیسے نادان کیا

سمجھیں گے۔''

☆☆☆

''دیکھا...... دیکھا آپ نے؟'' آمنہ ریحان بری طرح خار کھائے بیٹھی تھیں۔

''وہی ہوا ناں جس کا ڈر تھا۔ جڑواں بیٹیاں ہوئی تھیں یمنیٰ کے یہاں...... ایک ہی بچ سکی۔'' ریحان سعدی خاموش تھے۔ وہ توہم پرستی کے سخت خلاف تھے مگر بیگم کو جھٹلانے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھے۔

''میں ابھی فون کرتی ہوں بلال کو۔ اب تو میں کسی طور اس لڑکی کو بہو نہیں بنا سکتی۔ بس ہو گیا فیصلہ۔''

وہ قطعی انداز میں بولتی اٹھ کر فون ملانے چل دیں۔

☆☆☆

کوسوں، میلوں، سمندروں پار کتابیں کھولے وہ اپنی سوچوں سے اکیلا ہی نبرد آزما تھا۔ لندن فلائی کرنے سے ایک دن پہلے اس نے شاہ نور کو اندھیرے میں ٹیرس پر روتے ہوئے دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بہن اس سے محبت کرتی ہے۔ لیکن اتنی زیادہ وہ نہیں کہ اس کے جانے پر یوں چھپ چھپ کر آنسو بہائے۔ وہ حیرت زدہ انداز میں پوچھنے کی غلطی کر بیٹھا۔

''تمہیں کسی کے آنسو نظر آتے ہیں حیرت ہے؟'' وہ تڑخ کر بولی۔

وہ گنگ رہ گیا تھا۔ مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

''اور نظر آئیں بھی تو کیا۔ تم نے تو کر لی ناں اپنی خوشی پوری۔ اور اس کے پیچھے جو تین لوگ خوار ہوئے وہ؟ ہاں یقیناً تمہارے لیے تو تمہاری اس روبیشہ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ پھر میں ہوں، ہانیہ یا دانیال...... کوئی جئے یا روئے، جیے یا مرے۔ تمہیں اس سے مطلب؟''

وہ پھٹ پڑی تھی۔ اور کب سے اپنے دل میں جمع شدہ غبار کو نکال کر وہاں سے چلی گئی تھی۔

کئی مہینے پرانا ایک پریشان کُن منظر بالکل کسی گرما گرم خبر کی طرح ابھی آنکھوں میں تازہ تھا۔ اس کے رنگ پھیکے نہ پڑے تھے۔ کہ ان رنگوں میں شاہ نور کے آنسو گھلنے لگے۔

''تم اتنے بے حس بھی ہو سکتے ہو بلال۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔''

بھلا وہ بے حس کب تھا جو شاہ نور نے ایسا کہا۔

''آپ کیوں نہیں آئے؟ میں نے رات میں کتنا بلایا۔'' روبیشہ کے لفظوں کی گونج، یہ اس کے احساسات ہی تو تھے۔ جنہوں نے جینا مشکل کر دیا تھا۔ ایک معمولی فقرے میں پوشیدہ جذبے اس پر ایک پل میں واہو گئے تھے۔ پھر بھلا وہ بے حس کہاں تھا۔

روتے ہوئے لہجے، ٹوٹے ہوئے مان کا مرثیہ پڑھتے الفاظ چابک کے مانند اس کی سماعتوں پر شائیں کر کے پڑتے اور وہ تکلیف سے سن ہو جاتا۔

دنوں پرانی باتیں یاد آتی جاتیں۔

''وہ جس نے زندگی میں کبھی تمہارے سوا کسی اور کی طرف دیکھا تک نہیں۔ وہ کیا کرے۔''

ایک عنکبوت اس کے گرد کس رہا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس میں پھنسنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

''اب بتاؤ۔ کیا اب بھی تمہارا دل مانتا ہے یہ شادی کرنے کو؟'' آمنہ بیگم فون پر بلال کی برین واشنگ میں مصروف تھیں۔

''ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں بیٹا!''

اس کی مسلسل خاموشی نے انہیں دھیما کر دیا۔

''تم خود سوچو، بے شک فیوچر کے بارے میں کسی انسان کو نہیں پتا۔ مگر جان بوجھ کر غلط فیصلہ کرنا تو کوئی عقل کی بات نہیں۔ ارے تم نے دیکھا نہیں تھا۔ اس کی جڑواں بہن کو۔''

آمنہ بیزاری سے اسے بتا رہی تھیں۔

''بالکل ایبنارمل لڑکی تھی وہ، خود سوچو، بھلا جس

خاندان میں اس طرح کے کیسز ان کی ماں کے زمانے سے چلے آ رہے ہوں تو۔ وہاں سے کون لڑکی لے گا۔ ذرا ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرو۔"

بلال کی خاموشی ان کا حوصلہ بھی بڑھا رہی تھی۔ اور وہ دل ہی دل میں ڈر بھی رہی تھیں۔

"اور وہ لڑکی رویشہ...... وہ خود کون سا خوش تھی منگنی کے وقت...... ارے سارا خاندان جانتا ہے وہ اور زین انوالوڈ تھے ایک دوسرے کے ساتھ۔ زین کی بیوی بھی اسی وجہ سے اسے چھوڑ کر چلی گئی اور......"

"امی پلیز......" بہت دقت سے اس کے منہ سے نکلا۔

امی کو روانی سے بولتے بولتے بریک لگ گیا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ مگر ابھی دیر نہیں ہوئی۔ میں ان لوگوں سے معذرت کرلوں گی۔ تم بیٹا اپنے مستقبل کے بارے میں سوچو۔ ہانیہ کا سوچو۔ اس بیچاری کا اس معاملے میں کیا قصور ہے۔ وہ تو جب سے تمہاری منگنی ہوئی ہے۔ مستقل بیمار رہنے لگی ہے بیٹا۔"

بلال نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی۔

"تو پھر میں جاؤں ان لوگوں کی طرف؟ ابھی تو اتنے دن بھی نہیں گزرے۔"

"ٹھیک ہے امی! جو آپ کا دل کرے وہ کریں۔"

ایک گھنٹے امی کی بات سننے کے بعد صرف اتنا کہنے میں ہی اس کے اعصاب شل ہوگئے۔ بے انتہا دکھ اور غم کے دم گھوٹتے احساس کے ساتھ اس نے ریسیور رکھا اور بستر پر گر گیا۔

"مجھے مستقبل کی کوئی فکر تھی نہ اپنی اولاد کا کوئی خدشہ لیکن...... لیکن......"

آنکھیں صاف کرتے ہوئے وہ دھیرے سے بڑبڑایا اور تکیے میں منہ دے دیا۔

کبھی لوٹ آئیں تو نہ پوچھنا ہاں دیکھنا انہیں غور سے
جنہیں راستے میں خبر ہوئی کہ یہ راستہ کوئی اور ہے

☆☆☆

خاندان کے دو گھروں میں ایک ہی شام اپنی ڈھیر ساری رونقوں سمیت اتری تھی۔ اور صداقت علی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس گھر میں رکیں اور کس کو نظر انداز کریں۔

رویشہ اور ہانیہ دونوں ہی ان کی بیٹیاں تھیں۔ ان کا اپنا خون۔

بے شک وہ ایک لمبے عرصے تک رویشہ کے وجود سے بے پروا اور غافل رہے۔ مگر صبغہ کی موت نے انہیں دیر سے ہی سہی مگر ان کے حقوق یاد دلا دیے تھے۔

وہ ایک ہی وقت میں دو بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہونے جا رہے تھے۔ خدا جانے اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت تھی یا کیا...... مگر پورا دن گھر میں ہونے والی تقریب کے سلسلے میں وہ بے حد مصروف رہے۔ مغرب سے ذرا پہلے بمشکل وقت نکال کر جب اُدھر پہنچے تو وہاں بھی تمام انتظامات مکمل ہی تھے۔

زین بصد احترام ان سے ملا۔ تائی امی اور ان کی بڑی بیٹی جو خاص طور پر شہر سے باہر سے اس رسم کے لیے آئی تھی۔ دونوں کا ہی رویہ البتہ تھوڑا سرد سا تھا۔

صداقت علی کو آج یہی بات خوش کر رہی تھی کہ وہ رویشہ کے نکاح میں سرپرست کی حیثیت سے شامل ہو رہے تھے۔ اور آج یہی بات انہیں افسردہ بھی کر رہی تھی کہ کچھ عرصہ پہلے تک وہ اپنی پہلی بیوی اور بیٹیوں کے وجود سے کس قدر غافل تھے۔ بار بار ان کی آنکھیں چمکتیں اور وہ بار بار فخر سے ایک اڑتی پڑتی نگاہ زین پر ڈال کر دل میں اطمینان اور سکون کی لہریں اترتی محسوس کر رہے تھے۔

انہیں آج پوری طرح احساس ہو رہا تھا کہ آج اگر یہاں زین کے بجائے بلال بیٹھا ہوتا تو وہ شاید اس نکاح میں شامل ہی نہ ہو پاتے۔ ہو بھی جاتے تو ان کی خوشی اور اطمینان کا یہ عالم نہ ہوتا۔

وہ کس طرح ایک بیٹی کا گھر بسانے کے لیے دوسری بیٹی کا گھر بسنے سے پہلے ہی اجڑتا ہوا دیکھتے۔ نکاح کے بعد مبارک سلامت کے معمولی سے تبادلے کے دوران انہوں نے اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ رویشہ کے

سر پر رکھا۔ پھر شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر اسے اپنے سینے سے لگا کر سسک پڑے۔

قسمت نے اس مقام پر اسے شکست دی تھی۔ جب اسے اپنی جیت کا پورا یقین ہو چلا تھا۔ منگنی کے بجائے نکاح کی تقریب کا مشورہ شاید نہیں یقیناً بزرگوں نے مستقبل کی پیش بندی کے طور پر کیا تھا۔ تاکہ بلال آئندہ کسی اور کو اس نظر سے نہ دیکھ سکے۔ جس پر صرف اور صرف ہانیہ کا حق تھا۔

اس نے جگمگاتے ہوئے لان میں اِدھر سے اُدھر پھرتے ماں باپ، خالہ خالو، اپنی کزن کم منکوحہ...... بہن اور بہنوئی سب کے چہرے کھوج ڈالے۔ ہر چہرے پر چمک تھی، خوشی تھی۔ پالینے کا غرور تھا۔ سب لوگوں کے درمیان صرف ایک وہی تھا جو سنجیدہ شکل بنائے بیٹھا تھا۔

اس کے کانوں میں ہانیہ کے کھلکھلانے کی آواز آئی، شاہ نور ہنستے ہوئے اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔

''میں نے اپنی بہن کے دل کی خوشی لوٹانے کے لیے اپنے دل کی خوشی کو لوٹا دیا تو کیا اب میں اتنا بھی نہیں کرسکتا کہ ان لوگوں کی خاطر تھوڑی سی ایکٹنگ ہی کرلوں۔ کیا پتا کبھی محبت میرے دل پر بھی ہانیہ کے نام کا صحیفہ رقم کر ہی دے۔'' کھلکھلاتی ہوئی شاہ نور اور ہانیہ...... چہکتا ہوا دانیال۔ اس کے امی، ابو، سب کس درجہ خوش، مطمئن اور شاد تھے۔

''شاید میں نے...... ان کی خوشی کی قیمت چُکا دی ہے اور یہ لوگ بھی مجھے کم عزیز تو نہیں پھر ملال کیسا۔''

یہ وہ پہاڑ سا مرحلہ تھا۔ جو اسے کسی کے علم میں لائے بغیر اکیلے ہی سر کرنا تھا۔

دل کو راہِ راست پر لانے میں کچھ وقت لگے گا
پاگل ہے اس کو سمجھانے میں کچھ وقت لگے گا

اس نے تشویش سے خود کو دیکھتی ماں کو دیکھا۔ جو اشارے سے فکرمندی سے ''کیا ہوا ہے؟'' پوچھ رہی تھیں۔

وہ بے وجہ ہی نرمی سے مسکرا دیا۔

☆☆☆

اسے معلوم تھا زندگی اور وقت ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ اس کے لیے بھی اپنے دامن میں خوشی اور طمانیت چھپائے فقط اسے انتظار کروا رہی ہے۔ اور وہ یہ انتظار ختم ہونے کی تحمل سے منتظر تھی۔ اس کے صبر اور خاموشی کا کیا انعام اسے ملنے والا تھا۔ اس بارے میں سوچنا بیوقوفی ہی تھی۔

منہل کی طرف سے ایک دن اچانک ہی خلع کا نوٹس موصول ہوا اور زین نے کسی اضافی جھنجٹ میں پڑے بغیر اس کی مشکل آسان کردی۔

''میرے دل میں کوئی افسوس نہیں، اس کے لیے۔ اس نے اپنے لیے بہتر فیصلہ کرلیا۔ وہ یقیناً اس سے کہیں اچھی زندگی گزارے گی جو میں اسے دیتا۔ ادھوری خوشیوں کے ساتھ یا مکمل دکھوں کی لپیٹ میں۔''

زین نے ہفتہ بھر پہلے ہی اسے تمام بات بتائی تھی اور صاف لفظوں میں یہ بھی کہ وہ اب مزید کسی انتظار کا تحمل نہیں ہوسکتا۔ وہ تقدیر کے اس اچانک پلٹنے پر اس قدر حیران ہوئی کہ جیسے خوش ہونا ہی بھول گئی۔ بس ایک حیرانی سی حیرانی اسے اپنے حصار میں لیے رکھتی۔

''ہاں بس ایک خیال سا آتا ہے۔ اگر امی نے پہلے اتنی ضد نہ کی ہوتی تو شاید منہل میری زندگی میں آتی ہی نہ...... تب اس کا دل ٹوٹنے سے بچ جاتا اور ہم پہلے ہی مل چکے ہوتے۔'' زین کے گمبھیر لہجے میں یکا یک در آنے والا استحقاق، اس نے دل سے محسوس کیا۔ اس کی ہتھیلیوں میں ٹھنڈک سی اتر آئی۔

ابا کے اندر آنے والی مثبت تبدیلی کی بڑی وجہ بھی شاید یہ رشتہ ہی تھا۔ ورنہ بلال جس طرح ان کی دوسری بیٹی کو ٹھکرا کر اسے اپنانے کی خواہش کا اظہار کر بیٹھا تھا۔ اس سے بہت سارے لوگوں کے خواب بکھر جانے تھے۔

وہ نکاح والے دن لاشعوری طور پر صبح سے ابا کے آنے کی منتظر رہی۔ وہ بلاشبہ زندگی میں پہلی بار ان کا انتظار کررہی تھی اور انہوں نے بھی اسے مایوس نہیں کیا

تھا۔ جبھی نکاح کے بعد وہ جس طرح اسے لپٹا کر روئے، روبیشہ کا دل پگھلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ایک تواتر سے آنسو گرتے چلے گئے۔ وہ ننھی معصوم بچی کی طرح ان کے بازوؤں میں سمٹ گئی۔ سینے سے چمٹ گئی اور بلک پڑی۔

آج اس کی زندگی کا سب سے بڑا دن تھا۔ اور وہ اس دن کوئی گلہ شکوہ دل میں نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

ٹیرس کی طرف کھلنے والے دروازے سے جاتی سرما کی ٹھنڈ اور نم ہوا کے جھونکے جالی دار پردوں کے پیچھے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔

بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کے بیٹھا زین اور اس کے برابر میں بیٹھی وہ خود بزبانِ خاموشی محوِ گفتگو تھے۔

کتنے لمحے سرک چکے تھے۔ کتنے زمانے بیت گئے تھے۔ اس پر ایک عالمِ خود فراموشی طاری تھا۔ یوں جیسے وہ شام سے اب تک کسی خواب میں جی رہی تھی۔ اسے لگتا تھا اس کی آواز تو کیا معمولی سی جنبش بھی اس خواب کو توڑنے کی قصوروار ٹھہر سکتی ہے۔

وہ دم سادھے بس خاموشی سے کمرے کی تزئین و آرائش کا جائزہ لیتی رہی۔ کمرا بے حد جلدی میں سنوارا گیا تھا مگر پھولوں سے بے تحاشا بھر دیا تھا۔ خوش رنگ گلابوں کی بہتات اور امڈتی خوشبو اس کے حواسوں پر چھا رہی تھی۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر اس مدہوش کُن مہک کو اپنے اندر اتارا۔ جبھی زین نے اس کا ہاتھ اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔

''کوئی بات کرو رُبا۔'' اس کی آواز مدھم اور جذبوں سے معمور تھی۔

اس کی گرم مضبوط گرفت میں ربا کا نازک ہاتھ ایک عجیب استحقاق کے ساتھ دبا ہوا تھا۔ وہ غیر محسوس انداز میں سمٹ سی گئی۔

''کیا بولوں، مجھے تو اب تک یقین نہیں آ رہا کہ......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ایک بات بتاؤں تمہیں۔'' وہ اب سامنے کی اور دیکھتا دھیرے دھیرے اس کا ہاتھ سہلا رہا تھا۔

''مجھے اب تمہیں پانے کے بعد احساس ہو رہا ہے کہ اگر تم مجھے نہ ملتیں تو شاید میں بہت زیادہ دن جی نہ پاتا۔''

روبیشہ دہل سی گئی۔ زندگی میں پہلی بار محبت کا اظہار اور وہ بھی اتنے خطرناک انداز میں۔

''پھر تو شکر ہے ہم مل گئے۔'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

''ہوں۔'' زین نے ذرا سا ترچھا ہو کر شرارت سے اس کی شکل دیکھی۔

''کیسا لگ رہا ہے؟'' وہ پُرشوق گرم نگاہوں سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔

''میں اور تم...... ایک نیا رشتہ...... اور یہ تنہائی۔''

اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی اور ربا کی آواز اس کے حلق میں پھنس گئی۔

''ظ...... ظاہر...... ر...... ہے اچھا۔'' وہ اٹک اٹک گئی۔

''ہوں۔'' اس نے دھیرے سے اپنے ہاتھ میں دبے ربا کے ہاتھ کا بوسہ لیا۔

''اور اب......'' ربا نے بے بسی سے تھوک نگلا۔

زین کے انداز نرالے تھے۔ بولتی آنکھیں، مسکراتے لب اور دبی دبی شرارتیں۔ ربا کی مزاحمت دم توڑ رہی تھی۔ دل الگ بغاوت پر آمادہ تھا۔ زین اس کی بے بسی سے محظوظ ہوتا رہا پھر وفورِ جذبات سے اپنا دایاں بازو پھیلا کر اسے خود سے لگا لیا۔

''ربا...... تم جان ہو میری۔''

روبیشہ جو اس کی قربت کی آنچ سے پگھلی جا رہی تھی اس خوبصورت اظہار پر اس کے من مندر میں گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔

تحفظ کے گہرے احساس کے ساتھ اس نے زین کے سینے سے اپنا سر لگا دیا۔

حقیقت کیا ہے؟ وہ جو آنکھ دیکھتی ہے، دل محسوس کرتا ہے، دماغ سوچتا ہے یا پھر وہ منظر جو ٹی وی اسکرین پر دکھائی دیتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے۔ کسی کو کیا پتا کہ کون سا در ایسا ہے جو دِکھتا تو بند ہے مگر درحقیقت کھلا ہوا ہوتا ہے...... کہاں جا کر شعور کی حد ختم ہوتی ہے اور خواہش کی شروع۔ ہمیں کیا خبر کہ قدرت جب بظاہر سفاک ہونے پر آتی ہے تو وہ ہمیں پتا بھی نہیں چلنے دیتی کہ دراصل وہ ہمارے ساتھ رحم دلی کر رہی ہوتی ہے۔

ماضی کی مشہور منجھی ہوئی ٹی وی اشاد بانو کسی ٹی وی پروگرام میں ایک خوب صورت سے سجے سجائے سیٹ پر صوفے پر بیٹھی، میزبان خاتون کے ساتھ زور زور سے ٹھٹھے لگا رہی تھی، ہنس رہی تھی گا رہی تھی، یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا حالانکہ ابھی چند ہفتے پہلے ہی اس کی زندگی میں بہت کچھ ہوا تھا۔ اس کی مکمل کائنات ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں تحلیل اور فنا ہو چکی تھی جس کے بعد لگتا

زندگی تماشا بنی

نیلم احمد بشیر



تھا کہ وہ خود بھی فنا ہو جائے گی مگر وہ تو بڑے آرام سے بیٹھی اپنے گزشتہ ایکٹنگ کیریئر اور مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں یوں گفتگو کر رہی تھی جیسے اسے کچھ یاد ہی نہ تھا۔

''ہائے آپی! اس کو دیکھو کیسے مزے سے باتیں کیے جا رہی ہے۔ شاید اسے پتا ہی نہیں چل سکا کہ کیا ہو گزرا ہے۔'' میری چھوٹی بہن نے اسکرین پر نظریں جماتے ہوئے حیرت سے کہا۔

''ہاں لگتا تو یہی ہے کہ اس نے اس خوف ناک حادثے کو ذہنی طور پر قبول ہی نہیں کیا بلکہ رد کر دیا ہے۔ بعض اوقات انسان کا دماغی نظام یوں بھی کام کرتا ہے کہ آپ کو زندگی میں رونما ہونے والے واقعات اور تلخیوں کو قبول نہیں کرنے دیتا۔ اچھا ہی ہے اس نے اسے بھلا دیا ہے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

میں اور میری چھوٹی بہن تو جانتے تھے کہ ابھی چند ہفتے پہلے ہی اس مشہور اداکارہ کی آنکھوں کی روشنی...... اس کا لاڈلا، اکلوتا بیٹا رضا قتل ہو چکا تھا اور اس کی لاش ان کی اپنی گلی کی جھاڑیوں میں گری پڑی ملی تھی مگر آج اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ اس حقیقت سے بے پروا ہو چکی تھی کہ وہ اب اس پوری دنیا میں مکمل طور پر تنہا ہو چکی ہے اور اس کا کوئی پرسانِ حال یا جینے کا سہارا بچا نہیں تھا۔

لگتا تھا کسی بے خبر کو شعور ہی نہ تھا کہ اس کا شہر بھنبھور لوٹا جا چکا ہے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی ہے۔ ایسی حالت میں اسے اس انداز میں گفتگو تو نہیں کرنی چاہیے تھی۔ لگتا ہے سٹھیا گئی ہے کیونکہ پہلے ہی وہ ہوش و خرد کی دنیا سے بہت دور رہتی تھی۔

انٹرویو لینے والی خاتون کہہ رہی تھی۔ ''ناظرین! دیکھیے بانو کو...... ہنستی مسکراتی، زندگی کی طرف لوٹتی بانو......''

میرے کانوں میں بائیسکوپ والے کی گھنٹی کی آواز سنائی دینے لگی۔ ''بارہ من کی دھوبن دیکھو، آگرہ کا تاج محل دیکھو، بلی کے دھڑ والی لڑکی دیکھو۔'' میرا جی چاہا میں دوڑ کر گلی میں جاؤں اور اس شیشوں والے بائیسکوپ پر اپنی نظریں گاڑ دوں...... مگر یہ بائیسکوپ کا تماشا جو میرے سامنے ہو رہا تھا، کچھ کم دلچسپ تو نہ تھا۔ اب بانو کے پرانے ٹی وی ڈراموں کی جھلکیاں دکھائی جا رہی تھیں جن میں وہ دبلی پتلی، صحت مند، جوان، خوب صورت، تروتازہ، فنکارانہ صلاحیتوں سے مالا مال دکھائی دے رہی تھی اور آج کی بانو کیا ہو گئی تھی...... خاک، ملیامیٹ، مٹیالی رنگت والی ایک بجھی ہوئی عورت۔ اپنے دامن میں مہکنے والے واحد پھول کی خوشبو سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا، تنہا، دیوانی سی۔

☆☆☆

میری بہن جسے ہم سب پیار سے چھوٹی کہتے اکثر بانو کی خبر گیری کے لیے اس کے پاس جاتی اور آ کر مجھے اور سب گھر والوں کو بتاتی رہتی کہ مایہ ناز اداکارہ آج کس حال میں ہے چھوٹی کو ہمیشہ سے ہی اکیلی، دکھیاری، لاوارث عورتوں کو گود لینے کا شوق رہا ہے۔

بانو کو بھی اکثر وہ گھر لاتی، نہلاتی، کھلاتی پلاتی، کھانے، کپڑے لتے دے کر پھر اس کے گھر چھوڑ آتی کیونکہ وہیں اسے سکون ملتا تھا۔ وہ اپنے گھر سے جنون کی حد تک محبت کرتی تھی جہاں وہ اور اس کا کتا رہتے تھے۔ یہ کتا بھی اس کے بیٹے رضا کی نشانی تھا کیونکہ رضا ہی اسے گلی سے اٹھا کر لایا تھا جہاں وہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے خوراک تلاش کرتا پیاؤں پیاؤں کر رہا تھا۔ رضا اسے کھلاتا پلاتا، باہر لے کر جاتا اور ماں کے پاس اس وقت گھر چھوڑ جاتا جب وہ اکیلی ہوتی۔ کتا دونوں ماں بیٹے سے بہت مانوس تھا۔ ہم دونوں بہنیں سوچنے لگیں۔ ''اب کتے کا خیال کون رکھتا ہوگا۔ بانو کو تو اپنا ہی ہوش نہ رہتا، کتے کی بھوک کا کیا ہوتا ہوگا؟''

چھوٹی تو اب بانو کی مدر ٹریسا بنی تھی مگر میں بانو کو تب سے جانتی تھی جب وہ نئی نئی ڈراموں میں آنا شروع ہوئی تھی۔ ٹی وی کے ابتدائی دن تھے، سبھی ہر شام ڈرامے دیکھنے کے لیے باقاعدگی سے ٹی وی کے آگے بیٹھا کرتے تھے۔ بانو کے ڈرامے ہم سب کو بہت بھاتے تھے۔ پھر ایک روز میرے کالج کے بڑے

سے آنگن کے بیچوں بیچ لگے پرانے سے برگد کے نیچے کھڑی ایک معصوم سی لڑکی کو دیکھ کر کسی نے کہا۔

''دیکھو یہ وہی لڑکی نہیں جو ڈراموں میں آتی ہے؟'' ہم سب سہیلیاں اس کی طرف لپکیں اور اسے حیرت واستعجاب سے دیکھنے لگیں یوں جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔ ایک شرمیلی سی سادہ کپڑوں میں ملبوس ہرنی جیسی حیران آنکھوں والی معصوم صورت لڑکی ہاتھ میں کتابیں لیے خاموشی سے اکیلی کھڑی تھی۔

''آپ بانو ہیں ناں؟ حیرت کدہ والی؟'' میں نے اسے اشتیاق سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس نے بغیر کوئی تاثر دیے سر ہلا دیا اور پھر آگے کو چل دی۔ مجھے لگا یہ لڑکی کسی اور سیارے کی مخلوق ہے۔ اس دھرتی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ شاید بھولی بھٹکی کوئی پرانی روح جو کسی کی متلاشی ہے مگر کس کی! یہ اسے خود بھی خبر نہیں۔

میری اس سے دوستی ہوگئی مگر وہ زیادہ بات چیت نہیں کرتی تھی۔ البتہ ذہین بہت تھی۔ کلاس میں پوچھے گئے ہر سوال کا جواب اسے آتا تھا۔ میں جو کہ خود بہت لائق تھی لہٰذا مجھے وہ اچھی لگنے لگی تھی کہ ذہین لوگ ہمیشہ سے ہی میری کمزوری رہے ہیں۔ ایک دفعہ وہ کئی روز تک کالج نہیں آئی تو مجھے تشویش ہوئی۔

جیسے ہی وہ کالج آئی میں اس کی جانب لپکی۔

''کہاں غائب تھیں بانو پری؟'' میں اسے پیار سے پری کہا کرتی تھی۔

''بیمار تھی۔ بخار ہوگیا تھا۔'' اس نے ہلکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

''ارے کیسے؟''

''رات بارش میں بھیگتی رہی ناں تو بس صبح بخار ہوگیا تھا۔'' اس نے نیچی نظر۔ بس اوپر نہ اٹھائیں۔

''رات بھر کیوں، باہر تھیں کیا؟''

''ہاں، وہ شوٹنگ سے آئی تھی ناں تو بارش ہورہی تھی۔ امی نے اندر سے ہی پوچھا۔ ''چیک لائی ہو؟'' میں نے جواب دیا۔ ''نہیں۔ پروڈیوسر نے کہا ہے اگلے ہفتے۔ میں نے بہت مانگا پر وہ نہ مانا۔'' امی کو غصہ آگیا پھر انہوں نے دروازہ ہی نہیں کھولا۔''

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی چلی گئی۔

''تم نے کہا نہیں کہ دروازہ کھولیں امی۔'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''بہت کہا، گڑگڑائی، رات بھر سردی میں باہر بارش میں بھیگتی رہی مگر صبح ہونے پر ہی انہوں نے دروازہ کھولا تو اندر گئی بس پھر بخار چڑھ گیا۔''

وہ آرام سے یوں بولے جارہی تھی جیسے کسی ڈرامے کا سین سنا رہی ہو اور اس سین سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے مگر وہ کتابیں اٹھا کر کلاس روم کی طرف چل دی۔

پھر کالج لائف ختم ہوگئی اور ہمارا آپس کا رابطہ بھی۔ ہم دونوں اپنی اپنی ڈگر پر چل نکلیں۔ میں سنتی رہی کہ بانو کامیابی کی منازل طے کرتے کرتے بہت بڑی اداکارہ بن چکی ہے۔ اس کی ایک دو شادیاں ناکام بھی ہو چکی تھیں مگر اس کی ماں نے اس کے بیٹے رضا کی پیدائش کے بعد رضا کے باپ سے بانو اور رضا کے لیے کم از کم ایک گھر ضرور لکھوا لیا تھا جس کے بعد سے وہ لوگ آج تک اس میں ہی رہتے چلے آرہے تھے۔

بانو کو اب اسی گھر میں رہتے ہوئے قریباً تیس سال ہو چکے تھے۔ گلبرگ کے اس گھر میں بانو کی جان تھی۔ اب ذہنی مریضہ بن جانے کے باوجود وہ اپنے گھر کو ہی اپنی جائے امان سمجھتی تھی اور کسی صورت کہیں اور رہنے کو تیار نہ ہوتی۔ پے در پے محرومیوں اور مشکلات نے اس کا ذہن الٹ کر رکھ دیا تھا اور وہ ہوش و خرد کی دنیا سے بہت دور جاتی گئی۔ جب ہی چھوٹی نے یک دم اس کے ساتھ پیار محبت اور دوستی کا تعلق پیدا کرلیا اور باقاعدگی سے اس کی خیر خبر لینے جانے لگی۔ بانو کو کئی بار ذہنی امراض کے ادارے والے آکر لے کر بھی جاتے رہے۔ اسے داخل بھی کرایا جاتا رہا مگر وہ ہر بار وہاں سے رسیاں تڑوا کر بھاگ آتی اور اپنے وحشت کدے میں ہی قرار پاتی۔

آہستہ آہستہ ہم سب گھر والے اس کی ذات،

اس کے دکھ، اس کے مسائل میں انوالو ہوتے جارہے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی دیکھ بھال میں دلچسپی لیتے اور پھر گھبرا کر رہ جاتے کہ یہ اکیلی ذات زندگی کو کیسے برتے گی...... کیسے زندہ رہ سکے گی...... کیا ہوگا اس کا؟ میں ذرا دانستہ طور پر اس کی زندگی سے دور رہتی کیونکہ مجھے ڈر لگتا تھا کہ کوئی بھی اس جیسے انجام کو پہنچ سکتا ہے۔ وہ مجھے اپنا آئینہ لگتی اور میں اس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اتنی بڑی اور مانی ہوئی مشہور اداکارہ زمانے کے سانحے سہہ کر معدوم ہو سکتی ہے تو میں کیا چیز تھی...... ایک ذرہ...... ایک ہی ٹھوکر سے ریزہ ریزہ ہو جانے والی کمتر ذات...... ویسے بانو مکمل طور پر اکیلی بھی نہ تھی۔ اس کی ماں تو آگ میں جل کر ختم ہو چکی تھی۔ ایک بہن ضرور تھی جو نعت خوانی اور مجالس میں مذہبی کلام پڑھ کر اچھے پیسے کما لیتی تھی مگر وہ اپنے شوہر بچوں میں اتنی مصروف تھی کہ اسے ذہنی مریضہ بہن کا خیال رکھنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔

☆☆☆

جب چھوٹی نے بانو کے بیٹے کے قتل کا بتایا تو میرا دل پارہ پارہ ہو گیا۔ سوچا دو دن سے وہ گھر میں بند پڑی ہوگی۔ کچھ کھانے کو نہ ہوگا۔ کیوں نہ اس سے افسوس کروں اور کچھ کھانے کو دے آؤں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے گاڑی اس کی گلی میں موڑ دی۔ گلبرگ کے اس پوش علاقے میں رونقیں ہی رونقیں لگی رہتیں۔ گلی کے آغاز پر ایک جدید ترین کافی شاپ کھل جانے کی وجہ سے شہر کے امراء کے لڑکے لڑکیاں وہاں باقاعدگی سے آتے جاتے اور آپس میں میل ملاقات کرتے۔ ایک ہزار روپے کی کافی کا کپ ان کی جیب پر گراں نہیں گزرتا کیونکہ ان میں سے اکثر کے باپوں نے پاکستان کی لوٹ کھسوٹ اور کرپشن میں خوب مال بنایا ہوا ہے جسے ان کے بچے سہولت اور بے دردی سے نوچتے ہیں تو ان کے باپوں کو قطعاً تکلیف نہیں ہوتی بلکہ عین راحت نصیب ہوتی ہے۔

بانو کی بھوک کا خیال آتے ہی میں نے بھی گاڑی کافی شاپ کے باہر روک دی اور اندر جا کر تازہ مزے دار سینڈوچز، کیک اور کافی پیک کروا کر بیگ بھر لیا کچھ ہی دیر میں، میں بانو کے گھر پہنچ چکی تھی۔ میں نے گاڑی پارک کر دی اور پھر متعدد بار بیل بجائی مگر کوئی کھولنے کو نہ آیا۔ کچھ دیر میں ساتھ والے گھر کا ملازم لڑکا باہر آیا اور بڑے آرام سے بولا۔

”بی بی اوپر کی منزل پر ہوں گی مجھے ابھی نظر آئی تھیں۔“

”ہائے اس کا کیا حال ہے؟“ میں ملازم سے ہی پوچھنے لگی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اس دکھیاری ماں کی کسی طرح سے کوئی مدد کر دوں...... کچھ کروں اس کے لیے۔

”پتا نہیں باجی ہم تو انہیں نہیں پوچھتے۔ بیل بجاؤ تو وہ ڈنڈا یا جھاڑو لے کر ہمیں مارنے آجاتی ہیں اور ان کا حلیہ بھی عجیب وغریب ہوتا ہے۔“ ملازم زیرِ لب مسکرانے لگا۔ مجھے تھوڑا سا غصہ آیا مگر میں برداشت کر گئی۔ میں نے پھر بیل بجائی تو اوپر چھت پر سے ایک سفید بالوں والا سر نمودار ہوا۔

”کون ہے؟“ بانو نے نحیف آواز میں پکارا اور نیچے جھانکا۔

”بانو میں آئی ہوں چھوٹی کی آپا...... کچھ کھانے کو لائی ہوں تمہارے لیے۔“ میں نے اسے بتایا تو وہ نیچے آنے کے لیے سیڑھیاں اترتی دکھائی دینے لگی۔ چند لمحوں کی تاخیر کے بعد دروازہ کھل گیا۔ بانو میرے سامنے کھڑی تھی۔ میلے بے ترتیب کپڑے، الجھے ہوئے کھچڑی بال، ہونق چہرہ، ویران آنکھیں۔ اسے دیکھتے ہی میرے اندر جذبات کا ایک شدید طوفان اٹھا اور میں نے بے اختیار بانو کو گلے لگانا چاہا۔ مجھے اپنی طرف آگے بڑھتے دیکھ کر وہ غصے سے چیخی۔

”کیا کر رہی ہیں آپ......! میرے اوپر ہی چڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ پیچھے ہٹ کے کھڑی ہوں۔“

میں پل بھر کو چونکی اور اس کی بات سے سبکی محسوس کر کے کچھ پیچھے ہوگئی۔ پھر کچھ سوچا۔ یہ پگلی تو جانتی ہی نہیں ہے کہ اس کے ساتھ ہو کیا چکا ہے۔ اس کی کسی

بات کا کیا برا منانا سو پھر اسے مخاطب کیا۔

''بانو...... رضا کے حادثے کے بعد سے تم دو دن سے گھر میں بند ہو۔ بھوک تو لگی ہو گی۔ میں تمہارے لیے یہ کھانا لائی ہوں۔'' میں نے پلاسٹک کے فینسی بیگ میں نفاست سے پیک شدہ فائیو اسٹار ہوٹلوں جیسا کھانے پینے کا سامان اس کے آگے لہرایا ہی تھا کہ یک دم نہ جانے کہاں سے وہ لمبا چوڑا ہانپتا کانپتا کتا آیا، رالیں ٹپکاتا ہوا...... بیگ مجھ سے چھینا اور بھاگ گیا۔ میں حیران پریشان رہ گئی۔

''بانو...... یہ کھانا تو میں خاص طور پر آپ کے لیے لائی تھی۔'' میں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ دنیا کتوں کی دنیا ہے اور کتوں کو بہت بھوک لگتی ہے۔ یہ رضا کا کتا ہے...... اس سے بچھڑ کر بہت بھوکا ہوگا۔ رضا ہی تو اسے کھلاتا پلاتا تھا۔'' وہ میکانکی انداز میں بولتی چلی گئی۔ اسے اپنے آپ کے پھر سے بھوکے رہ جانے کا قطعاً احساس ہوتا نظر نہ آتا تھا۔

یک دم ایک گاڑی گیٹ پر رکی اور اس میں سے ایک خوش لباس، صحت مند خاتون باہر نکلی جس کے ہاتھ میں تھاما موبائل فون اس کی انگلیوں میں سجی ہیرے کی انگوٹھیوں کے رنگ سے میچ کرتا دکھائی دیتا تھا۔

''بانو یہاں باہر کیوں کھڑی ہے۔ چل اندر۔'' اس نے آتے ہی بانو کو غصے سے ڈانٹا۔

''آپ کون؟'' میں پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

''اس کی بہن ہوں نجیبہ۔ دیکھنے آئی ہوں کہ گھر میں بھی ہے یا کہیں سڑکوں پر ماری ماری پھر رہی ہے۔'' اس نے بڑی بیزاری سے کہا۔

''بہن؟'' میں نے دل میں سوچا۔ کیسی بہن ہے جس کی پگلی بہن کی آنکھوں کا نور اس کے جینے کا واحد سہارا اس سے چھین لیا گیا ہو اس کے لیے اتنا سخت لہجہ اور کٹھور پن...... کم از کم اس کے کھانے کے لیے ہی کچھ لے آتی۔ کوئی روٹی سالن، چائے کا سامان، پانی کی بوتل مگر وہ تو خالی ہاتھ آئی تھی اور بانو کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہی تھی۔ عجیب بہن تھی۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ بانو کا ایک بھائی انڈیا کا بہت بڑا طبلہ نواز تھا۔ مگر بانو تو اب کسی گنتی یا کھاتے میں ہی نہیں رہی تھی۔

''یہ بھوکی ہوگی۔'' میں کہے بغیر نہ رہ سکی اور اس کی بہن کی طرف بغور دیکھا۔

''ہم کیا کریں۔ بڑا تنگ کیا ہوا ہے اس نے۔ ابھی میں نے اور میرے میاں نے تھانے سے رضا کی لاش چھڑائی ہے۔ اسے قبر میں اتارنا ہے۔ سو کام ہیں۔ کھپ گئے ہیں ہم تو اس کے بکھیڑوں میں۔''

''وہ میں کہنا چاہتی تھی کہ میری چھوٹی بہن نے بتایا کہ اس کے گھر میں گیس کی بدبو پھیلی ہوئی ہے۔ شاید کوئی پائپ لیک کر رہا ہے۔ کہیں کسی دن گیس سے......'' میں ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''میں کیا کر سکتی ہوں۔ فاؤنٹین ہاؤس داخل کرواؤ تو وہاں سے بھاگ آتی ہے۔ میرے اپنے بال بچے ہیں۔ میرا اپنا کام ہے۔ میں اس کا خیال کیسے رکھ سکتی ہوں کسی کی سنتی تو ہے نہیں۔'' بہن جھنجلا کر بولی۔

''یہ لے بانو کاغذ سائن کر۔ تھانے والے تیرے سائن کے بغیر لاش نہیں دیں گے۔'' اس نے ایک چھپا ہوا کاغذ آگے بڑھایا اور پین سے بانو سے سائن کروا لیے۔ بانو بالکل چپ کھڑی اس کا حکم بجالاتی رہی یوں جیسے وہ انسان یا ماں نہ ہو، کوئی بے جان کاٹھ کا پتلا ہو، جس میں نہ تو کوئی جذبات ہوتے ہیں نہ احساسات جو بس آگ میں جل کر خاک ہونا ہی جانتا ہو اور اس کے علاوہ اس میں کوئی قابلیت نہیں ہوتی۔

میں بانو کے پیچھے پیچھے اس کے گھر میں داخل ہو گئی۔ کتا لان کے ایک کونے میں بیٹھا مزے سے سینڈوچ اور کیک اڑا رہا تھا۔ اپنی بدنصیب مالکن کے پیٹ اور دل کے خالی رہ جانے کا اسے کوئی احساس ہوتا دکھائی نہ دیتا تھا۔

بانو حیرت کدہ ڈراموں میں کام کرتی رہی تھی مگر میں جس گھر میں قدم رکھ رہی تھی وہ ہی اصل حیرت کدہ تھا۔ چاروں طرف کسی آسیب کا سایہ چھایا محسوس ہوتا تھا یک دم مجھے احساس ہوا جب سب لوگ چلے جاتے

ہیں تو لو دے کے تمام دیپے بجھ جاتے ہیں۔ سورج سر نیہوڑائے سوچتا ہے اب پنچھی بھی اڑ جائیں گے اور رات شاید مستقلاً ٹھہر جائے گی۔

اس گھر میں شاید دن کبھی نکلتا ہی نہ تھا۔ اندھیرے تھے اور گیس کی بدبو۔ میں نے حیران ہو کر سوچا۔ یہ عورت کتنی ڈھٹائی سے زندگی بسر کیے جارہی ہے۔ ٹوٹتی ہی نہیں۔ زندگی اس کے ساتھ شدید دشمنی کیے چلی جارہی ہے اور یہ ہے کہ ہتھیار پھینکنے کو تیار ہی نہیں۔ جیے چلی جارہی ہے۔

''بانو...... میں گیس کا والو بند کردوں؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے گیس پائپ کی طرف قدم بڑھائے تو وہ چیل کی طرح مجھ پر جھپٹی۔

''خبردار جو میرے گھر کی کسی چیز کو ہاتھ لگایا۔'' وہ یوں چیخی جیسے میں نے اس کے راج محل کی کسی دیوار سے سونے کی ایک اینٹ کھسکانے کا ارادہ کیا ہو۔ میں خاموشی سے پیچھے ہوگئی اور اس کے وحشت زدہ گھر کے در و دیوار کا جائزہ لینے لگی۔ سارا گھر ٹوٹے پھوٹے سامان، لکڑی کے ٹکڑوں، پرانے کپڑوں، پھٹے ہوئے گدیلوں اور گند بلا سے اٹا ہوا تھا۔ کتے کی غلاظت، کاکروچوں، چوہوں کے مُردہ جسموں کے ڈھانچے فرش سے چپک کر فرش کا حصہ بنے نظر آتے تھے۔ ایک کمرے کا دروازہ جل کر سیاہ ہوچکا تھا۔

''بانو یہ کیا ہوا؟'' میں نے اس کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔

''آگ لگ گئی تھی۔'' اس نے بڑے سکون سے جواب دیا اور بیٹے رضا کی بڑی سی فریم شدہ تصویر گود میں لے کر ہولے ہولے گانے لگی۔

''جانا تھا ہم سے دور بہانے بنالیے...... کیوں اتنی دور تم نے ٹھکانے بنالیے......'' کس قدر سریلی آواز تھی بانو کی۔ میں سن کر کانپ گئی اور میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ مگر بانو بے خبری سے گاتی چلی گئی۔ پھر اپنے ادھڑے پھٹے میلے بدبودار بستر پر دراز ہوکر اس نے دوسرا گانا شروع کردیا۔

''زندگی تماشا بنی۔ دنیا دا ہاسا بنی۔ کدی وی نہ پیار ملیا......

''کون کہتا ہے یہ عورت پاگل ہے۔ اسے حقیقتوں کی سمجھ نہیں۔'' میرا دل روئے چلا جارہا تھا۔ بانو کا دل اتنا چھلا ہوا تھا۔ میں اسے پیار کرکے تھپکانا چاہتی تھی مگر وہ تو اس وقت اپنے بیٹے رضا کے ساتھ تھی۔ میں نے اس کے اور اس کے بیٹے کے تعلق کے بیچ مخل ہونا مناسب نہ سمجھا اور اٹھ کر اس حیرت کدے کے دوسرے کمروں کا جائزہ لینے لگی۔ سیلاب بلا کس کے گھر آ پہنچا تھا۔ آج معلوم ہوگیا تھا۔

بیٹھک کی دیوار پر لگے پرانے سے بدوضع آئینے پر کسی بجھتی ہوئی شمع کی لو سے لکھا تھا ''نسخہ ہائے وفا'' ایک پلنگ الٹا کھڑا تھا جس کے اردگرد وی سی آر کی ٹیپوں کے کالے کالے فیتے یوں لپٹے ہوئے تھے جیسے انہوں نے اس پلنگ پر لیٹے ہوئے کسی خیالی پیکر کو جکڑ دیا ہو۔

''بانو یہ ٹیپس......؟'' میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ لیا۔

''میرے ڈراموں کی ہیں ذرا دیکھیں تو سہی میں نے کتنے ٹی وی ڈرامے کیے ہیں۔ اس طرح سے میرا کام میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔'' وہ ہنس ہنس کر فخریہ انداز میں بولتی چلی گئی۔ نہ جانے ایسا کیوں ہوتا ہے مگر ہوتا رہتا ہے۔ تخلیقی ذہن رکھنے والے لوگ اکثر ذہنی انتشار کا شکار ہوجاتے ہیں۔

مجھے ماضی کی مشہور اور کامیاب ہندوستانی اداکارہ پروین بابی یاد آنے لگی جو شیزوفرینیا جیسے الجھا دینے والے مرض کا شکار ہوکر گوشہ نشین ہوگئی تھی۔ اس نے بھی اپنے آپ کو اپنے فلیٹ میں تنہا مقید کرلیا تھا اور دنیا سے کوئی واسطہ نہ رکھتی تھی۔ پھر امریکی اداکارہ مارلن منرو کے عروج و زوال کی کہانی سے کون واقف نہیں۔ مارلن کو ایک بار ذہنی امراض کے اسپتال میں بھی داخل کروایا گیا تھا جہاں وہ مارلن سے نورما جینز (جوکہ اس کا اصلی نام تھا) بن کر وقت گزارتی رہی۔ اس کا بھی اپنی ماں سے کوئی نفسیاتی مسئلہ تھا جس نے اسے ذہنی طور پر کمزور اور ہمہ وقت بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا کر رکھا تھا ایسی خواتین اکثر محبت میں بھی ناکام رہتی ہیں اور اس کی تلاش میں کئی ناخوشگوار تجربے کرتی

چلی جاتی ہیں۔

☆☆☆

ایک دن چھوٹی کو کسی چینل والوں کا فون آیا۔ وہ بانو کو اپنے ایک گرینڈ ایوارڈ فنکشن میں بلانا چاہتے تھے مگر انہیں پتا تھا وہ اکیلی آنے کے قابل نہیں ہے لہٰذا انہوں نے بطور ہمراہی مجھے مدعو کرلیا جس کے لیے وہ لاہور سے کراچی تک کا ہوائی سفر ٹکٹ بھی دینے کو تیار تھے۔

میں شش و پنج میں پڑگئی۔ بانو گو مجھ سے مانوس تھی مگر ذہنی طور پر اس قابل ہرگز نہ تھی کہ اسے دوسرے شہر کا سفر کروایا جاتا۔ ٹی وی چینل والوں کو ریٹنگ درکار تھی لہٰذا ان کے فون پر فون آنے لگے۔ بانو بھی سن کر مچل اٹھی کہ اسے کراچی بلایا جارہا ہے۔ اس کا اشتیاق دیکھ کر میں بھی سوچ میں پڑگئی۔

''میں ضرور جاؤں گی کراچی میری امی کا شہر ہے۔ ہمارا وہاں فلیٹ بھی ہوا کرتا تھا۔ اسی میں امی جل کر مرگئی تھیں۔ پھر وہ فلیٹ نجیبہ نے لے لیا۔'' بانو اپنی رو میں خاندانی رازوں سے پردے اٹھاتی چلی جارہی تھی۔ اس دم مجھے وہ مکمل طور پر ٹھیک اور سمجھدار لگی یوں جیسے اس نے جہانِ دیوانگی میں کبھی قدم تک نہ رکھا ہو۔ کیا دیوانگی اور فرزانگی کی سرحدیں اتنی قریب ہوتی ہیں۔ مجھے دیکھ دیکھ کر حیرت ہورہی تھی۔

میرا دل بھی پسیج گیا۔ سوچا بے چاری جھلی اگر چند لمحوں کے لیے بہل جائے خوش ہوجائے تو میرا کیا جائے گا۔ میں نے اس کے ساتھ کراچی جانے کی ہامی بھرلی۔

فنکشن میں شامل ہونے کے لیے بانو کے پاس نہ ڈھنگ کے کپڑے تھے نہ سوٹ کیس، وہ میلے کچیلے پھٹے پرانے چند جوڑے ایک ٹوٹے پھوٹے بکسے میں ڈال کر ایئرپورٹ جانے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ ہفتوں یا شاید مہینوں سے نہ نہائی ماضی کی عظیم اداکارہ اپنے مردہ پیلے سے رنگ والے چہرے پر سرخ لپ اسٹک لگا کر شانِ بے نیازی سے ایک کالا بیوٹی بکس ہاتھ میں تھامے بت بنی خلاؤں میں نہ جانے کیا دیکھے جارہی تھی۔

مجھے گلزار کی بنائی ہوئی فلم Sunset Boulevard یاد آگئی جس میں اس نے اسی طرح ماضی کی عظیم اداکارہ نادرہ کی کہانی دکھائی تھی۔ جو ایام گزشتہ کے عروج کے ختم ہوجانے کے باوجود خود کو حسین، جوان، مقبول اداکارہ سمجھے جانے پر اصرار کرتی۔ حقیقتیں اسے سانپ کی طرح ڈستی رہتی تھیں۔

اف یہ پرانی اداکارائیں...... میرا دل تلخیٔ ایام کی بے درد کٹھنائیوں کے احساس سے بھر آیا۔ کامیابی کتنی بڑی ناکامی اور عذاب ہوتی ہے۔

اپنے پاس سے کچھ کپڑے اور ایک بہتر سوٹ کیس دے کر میں اسے لے کر ایئرپورٹ روانہ ہوگئی۔

جہاز میں اس نے وہ بدنما پرانا بیوٹی بکس اپنے قریب رکھ لیا اور پھر فلائٹ شروع ہوتے ہی اسے کھول لیا۔ اس میں ٹوٹے پھوٹے آئینوں اور میک اپ کے سامان کے علاوہ کسی سیپارے کے بوسیدہ پھٹے ہوئے اوراق بھی تھے جنہیں اس نے ہاتھ میں تھام کر اونچی اونچی آوازمیں پڑھنا شروع کردیا۔ مسافر اسے پہچان کر آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ تلاوت کے بعد یک دم اس نے اس گرد آلود کالے بیوٹی بکس کو اٹھایا اور

زور زور سے جھاڑنا شروع کر دیا تو جہاز میں دھول پھیلنے لگی۔ میں نے گھبرا کر اسے روکنا چاہا مگر وہ تو اس وقت کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوئی تھی۔

جہاز کے سفر کے دوران وہ کچھ نہ کچھ بولتی رہی۔ نہ جانے کون اس کے سامنے تھا جو اسے اتنا ستا رہا تھا۔ اس نے کھڑکی سے شٹر اٹھا دیا رات کا غلاف تھا باہر آسمان پر، چاند چمک رہا تھا۔ بانو نے اپنے بیٹے رضا کی تصویر کھانے والی ٹیبل پر سجا لی اور چاند سے یوں باتیں کرنے لگی جیسے وہ رضا ہو۔

وہاں ایوارڈ کے فنکشن میں اتنا مجمع دیکھ کر بانو جھوم اٹھی اور بیچ میدان میں اٹھ کر ناچنے لگی اور بار، بار یہی کہتی چینل والوں نے میرے بیٹے کو کتنا اچھا خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ میرا بیٹا اسی عزت کا مستحق تھا۔

ہم دونوں بہنیں اکثر اسے گلبرگ کی سڑکوں پر اکیلی بھٹکتے اپنے بیٹے کے کپڑے پہنے چلتے پھرتے دیکھتیں تو ہمارا دل پارہ پارہ ہو جاتا۔ بانو نے چھوٹی کو ایک بار یہ بھی بتایا کہ کئی مطلب پرست خونخوار انسانی کتے دو وقت کی روٹی کا لالچ دے کر اسے کبھی کبھار اپنے ساتھ بھی لے جاتے ہیں یا پھر کھانا لے کر اس کے ہی گھر چلے آتے ہیں۔ چھوٹی یہ سن کر بانو پر بہت ناراض ہوئی اسے ڈانٹا سمجھایا مگر اسے کچھ سمجھ نہ آتی تھی۔ بس کھانا کھانے کی خواہش کا ہی اظہار کرتی رہتی یا پھر رضا کی باتیں سنانے بیٹھ جاتی۔ اب وہ بہت دبلی دِکھتی یوں جیسے کوئی کم عمر لڑکی ہو۔ بھوک اور تنہائی کا مہیب دیو اسے دھیرے دھیرے نگلتا جا رہا تھا۔

''آپی اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ میں حیران ہوں کہ زندہ کیسے رہ لیتی ہے؟'' ایک روز چھوٹی آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ ''سردیوں میں اسے سردی اور گرمیوں میں گرمی تو لگتی ہوگی۔ لوڈشیڈنگ میں اندھیرے سے بھی خوف کھاتی ہوگی اسے ڈینگی کا مچھر بھی تو کاٹ سکتا ہے۔'' چھوٹی فکرمندی سے بولی۔ میں کچھ دیر خاموش رہی پھر زبان کھولی۔

''اچھا ہو اگر یہ مر ہی جائے۔ اسے ڈینگی کا مچھر ہی کاٹ لے۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔ ''قدرت جب سفاک ہوتی ہے تو دراصل وہ رحم دلی کا مظاہرہ کر رہی ہوتی ہے۔'' میں نے دل ہی دل میں پھر سوچا۔ مجھے یاد آیا پروین بابی ایک روز اکیلی ہی اپنے فلیٹ میں دم توڑ گئی تھی۔ کئی دن تک اس کی موت کا کسی کو علم تک نہ ہو سکا تھا۔

''آپی یہ مرگئی تو کئی روز تک تو کسی کو اس کا پتا ہی نہیں چلے گا۔'' چھوٹی تڑپ کر بولی۔ ہم دونوں خاموش ہوگئیں۔

''اور اس کے کتے کا کیا ہوگا۔ اسے کھانا کون دے گا؟'' چھوٹی نے سوال کر کے مجھے لاجواب کر دیا۔

شاعر افتخار نسیم کی ایک نظم یاد آنے لگی جس کے آغاز میں اس نے اپنی پالتو بلیوں سے محبت کے بارے میں بتایا تھا اور یہ کہا تھا کہ اسے فکر رہتی ہے کہ اس کی موت کے بعد انہیں کھانا کون دے گا۔

''بانو بھوکی پیاسی کب تک زندہ رہ سکے گی۔'' ہم دونوں سر جوڑے بیٹھی سوچتی رہیں۔

''مگر آپی مجھے تو بانو سے زیادہ اس کے کتے کی بھوک کا خیال آتا ہے۔ بلکہ ڈر لگتا ہے سوچ کر۔'' چھوٹی سہم کر بولی۔ ''اگر بانو کو کھانا نہ ملا تو وہ مر بھی سکتی ہے۔''

افتخار نسیم نے اپنی نظم کے آخر میں لکھا تھا کہ اسے پھر بھی تسلی ہے کہ اگر وہ تنہا اپنے فلیٹ میں مر گیا تو اس کی بلیوں کے لیے کوئی انتظام تو ہو ہی جائے گا۔ وہ اس کے نلکے سے رستے ہوئے پانی کو پی کر اپنی پیاس بجھا لیں گی اور اپنے مالک کے مردہ جسم سے خوراک حاصل کر لیں گی۔ میں نظم میں کھوئی ہوئی تھی کہ یک دم چھوٹی کی آواز سے چونک گئی۔

آپی اگر ایک دن کتے کو شدید بھوک لگی اور باہر سے کچھ کھانے کو نہ ملا تو؟''

''ہاں مگر صوفے پر لیٹی ہوئی زرد رو نیم جاں چھپکلی نما جسم کو تو وہ......'' میری بات نے میرے لبوں پر ہی دم توڑ دیا۔ میں اپنی بات کو مکمل کرنے کی سکت خود میں نہ پا رہی تھی۔

وہ کون تھی

ہالہ احمد

وہ چپ چاپ اپنے بستر پر لیٹی چھت کو تکے جا رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اور بند دروازے کے اس پار آوازیں تھیں، شور وغل تھا، قہقہے تھے لیکن ان سب رونقوں کا حصہ بننے کا اس کا بالکل بھی من نہیں تھا۔ ہاں مگر...... کچھ ہی دیر پہلے تک تو وہ ان سب کا حصہ تھی سب سے باتیں کرتی ہوئی، چھوٹے بچوں کے ساتھ بچہ بنی شور مچاتی ہوئی...... بات بے بات زوردار قہقہے لگاتی ہوئی۔ اور بس ایک پل ہی لگا تھا اس کی مسکراہٹوں، اس کے قہقہوں کو یک لخت رک جانے میں...... ہاں ایک پل ہی تو لگا اس کے ہونٹوں پر چپ کی مہر لگ جانے میں۔

☆☆☆

کل سے اس کی دونوں نندیں آئی ہوئی تھیں، اپنے، اپنے بچوں کے ہمراہ چند دن میکے میں گزارنے کو...... ایک کے تین بچے اور دوسری کے چار بچے اور خود اس کا اپنا تین سالہ شرارتی گپلو سا بچہ...... آٹھ بچوں کی چہکاریں اتنی دلفریب تھیں کہ بڑے بھی اُن کے ساتھ بچہ بن جانے پر مجبور تھے۔ اس کی ساس سب بچوں کی بلائیں لیتے ہوئے حد درجہ خوش نظر آرہی تھیں۔ وہ اِدھر سے اُدھر کام کرتی پھر رہی تھی، کبھی جا کر نندوں کے پاس بیٹھ جاتی تو کبھی بچوں میں جا گھستی...... ساتھ ہی چپکے، چپکے اپنے شوہر کا بھی انتظار کرتی ہوئی، جس کے گھر آنے کا وقت بس ہوا ہی چاہتا تھا...... ویسے تو ہر روز ہی وہ جی جان سے شوہر کا انتظار کیا کرتی مگر آج تو اسے خاص طور سے انتظار تھا۔

☆☆☆

بات ایسی کچھ خاص بھی نہیں ہوئی تھی۔ یوں ہی ہنسی مذاق میں کسی ایک نقطے پر آکر اس کی شوہر سے بحث ہونے لگی۔ بالکل ویسے جیسے معمول کی بات ہو...... وہ بھی تو ہنستی ہوئی محض بات سے بات نکالے جا رہی تھی۔ ضد کا کوئی عنصر نہ تھا اور نہ کوئی طنز...... نامعلوم کیوں ایکا یک اس کے شوہر کو بے طرح غصہ آگیا۔ اس نے حیرت سے غصے کی وجہ جاننا چاہی



تو شوہر نے اسے بے بھاؤ کی سنادیں۔

''بات کرنے کی تمیز نہیں سکھائی کسی نے، شوہر سے خوب مقابلہ کرتی ہو، جواب دیے بغیر چین نہیں آتا تمہیں...... شوہر کی ذرا سی عزت نہیں تمہارے دل میں......'' یہ اور...... اس جیسی کئی اور باتیں وہ تو بِنا پلکیں جھپکے حیرت کی مورت بنی بس اپنے مجازی خدا کا چہرہ دیکھتی رہی کہ آخر بات کیا ہوئی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن یعنی آج کی صبح...... اس کا شوہر خاموشی سے ناشتا کرکے کام پر نکل گیا۔ نہ کوئی بات، نہ کوئی الوداع...... وہ بھی چپ رہی، شاید دل ہی دل میں خود سے ہونے والی زیادتی کا غصہ تھا یا ملال تھا۔ بہرحال کچھ دیر تو اداسی کی کیفیت رہی پھر آہستہ آہستہ گھر کے باقی افراد بھی بیدار ہونے لگے۔ خصوصاً بچوں کے بیدار ہونے کے بعد تو وہ گھن چکر ہی بن گئی۔ کسی کو ناشتے میں کچھ چاہیے تو کسی کو کچھ...... وہ بھی بڑے پیار سے سب کی فرمائشیں پوری کرتی رہی۔ ساس، نندوں کی پسند کا الگ سے خیال رکھنا بھی ضروری تھا۔ خیر سب کچھ خوشی، خوشی نمٹایا، ساتھ ہی دوپہر کے کھانے کی فکر نے سر اٹھایا۔ غرض وہی لگی بندھی سی روٹین...... تمام دن یونہی بھاگم بھاگ گزر گیا۔ اچھا تھا کاموں میں لگ کر وقت گزرنے کا احساس نہ ہوا ورنہ شوہر کے انتظار میں دن کیسے گزرتا...... صبح ناراض ہوکر گیا تھا بلکہ کل شام ہی سے ناراض تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ وہ کام سے گھر واپس آئے گا تو ناراضی کا شائبہ تک اس کے چہرے پر نہیں ہوگا بلکہ وہ اپنے کل کے رویے پر اس سے محبت کے ساتھ معذرت کے دو بول بھی بول لے گا کہ آخر غلط بات پر ناراض ہوا تھا...... بلاوجہ...... ایسے ہی...... بس یہی سوچ سوچ کر وہ آپ ہی آپ مسکرا اٹھتی تھی۔

''ماموں آگئے۔'' دروازے پر دستک ہوئی۔

''آگیا میرا بیٹا......''

''بھائی آگئے۔'' بچوں کا شور، ساس کی آواز، نندوں کی پکار...... وہ خود زبان سے تو ایک لفظ نہ بولی ہاں دوڑتی ہوئی دروازے تک ضرور گئی۔ دروازہ کھلا، شوہر اندر داخل ہوا، اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی بے اعتنائی سے منہ موڑ کر اندر کی طرف چل دیا۔ اس کا دل برا ہوا مگر ہمت پھر بھی نہیں ہاری، پیچھے پیچھے لپکی مگر ابھی اسے انتظار کرنا تھا۔ ماں، بہنوں، بھانجے، بھانجیوں اور بیٹے سے ملنے ملانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ تمام دن کا احوال ایک دوسرے سے پوچھا گیا۔ وہ بھی خاموش کھڑی رہی، ایک نگاہِ غلط بھی شوہر نے اس پر نہ ڈالی تھی۔ جب وہ منہ ہاتھ دھونے اندر کی طرف چلا تو وہ بھی پیچھے بھاگی۔ اندر جاکر خود سے مخاطب کیا مگر شوہر صاحب کا نخرہ ابھی باقی تھا۔ اس بری طرح سے جھاڑ پلائی اور کمرے سے چلے جانے کو کہا کہ اس کا تو دل ہی لرز کر رہ گیا۔ چہرے کی جوت بجھ گئی۔ یعنی کہ حد ہی ہوگئی تھی۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے والا معاملہ ہوگیا تھا۔

''سب کے ساتھ ہنس، ہنس کر باتیں اور مجھ سے ایسا رویہ وہ بھی بغیر کسی وجہ کے......'' اس کا شوہر تو تازہ دم ہونے کے بعد باہر سب کے درمیان جا بیٹھا تھا۔ اور وہ...... اپنے دل کو سنبھالنے میں لگی تھی۔ بے پناہ دل چاہا کہ کسی کو اپنی بپتا سنائے، کچھ اپنے من کا بوجھل پن ہی ہلکا کرے...... ایسے میں ماں سے بڑھ کر کون؟

''بتاتی ہوں اماں کو۔'' بڑے طنطنے کے ساتھ موبائل فون اٹھایا۔ نمبر ملایا۔ دوسری طرف ماں کی آواز۔

''میری بیٹی کیسی ہے؟ اللہ خوش رکھے تجھے، کتنے دن سے آواز نہیں سنی تیری۔'' کیسا پیار کیسا سکون تھا ماں کے لہجے میں...... ابھی تک تو وہ نہیں جانتی تھیں کہ بیٹی پر کیا گزری...... وہ بھی سوچ میں پڑ گئی...... کیا یہ سب رام کہانی سنا کر وہ ماں کے لہجے سے سکون منفی کردے؟ انہیں بے چین کردے؟ انہیں فکر میں مبتلا کردے؟ جو یہ سمجھ رہی تھیں کہ بیٹی

نے حال چال دریافت کرنے کو معمول کے مطابق فون کیا ہے۔

''نہیں، نہیں، نہیں۔'' ایک پل میں اس نے فیصلہ کیا اور اپنے آپ پر خوب صورتی سے قابو پاتے ہوئے بڑے حوصلے سے معمول کے مطابق بات کی اور فون بند کر دیا۔ کسے بتائے، کسے سنائے؟ ہاں۔۔ ہم جولیوں سے دل کی بات بڑی آسانی سے کہی جا سکتی ہے، اسے اپنی سب سے بہترین سہیلی یاد آئی۔ دل کچھ اور بھی بھر آیا۔ دوبارہ موبائل فون ہاتھ میں لیا مگر پھر سے دماغ کی رو بھٹک گئی۔

''کیا کہے گی؟ آج تک تو بڑا بھرم، بڑا مان رکھا...... میں نے سب سہیلیوں کے سامنے...... اب ایسی بات کر کے ہمیشہ کے لیے وہ بھرم' وہ مان توڑ دوں؟'' دل اور دماغ عجیب کشمکش میں تھے۔ آپس میں گتھم گتھا...... دل کہتا تھا کہہ ڈالو سب...... شاید خود پر پڑے بوجھ کو اٹھانے سے قاصر تھا جبھی یہ مشورہ دے رہا تھا۔ دوسری طرف دماغ تھا جو اسے ایسا کرنے سے روک رہا تھا...... اور پھر...... وہ رک بھی گئی۔

''گھر کی بات گھر ہی میں بھلی......'' بے شک سہیلیاں بہت پیاری مگر یہ بات ان سے کہنا چنداں مناسب نہیں...... اُف! کیا کروں؟'' دل تھا کہ غصے اور دکھ کے ملاپ سے بیٹھا ہی جا رہا تھا۔ بہت ضروری تھا کہ کسی سے دل کا حال کہہ لیا جاتا۔

''ارے اچھا ہے آج تو دونوں نندیں بھی ہیں یہاں...... ساس سے شکایت کرتی ہوں، خود ہی تینوں مل کر خبر لیں گی اپنے لاڈلے کی۔'' تیر کی تیزی سے اٹھی...... دروازے تک ہی گئی تھی کہ ساس کی آواز نے قدم روک دیے۔

''بھئی کہاں جا کر بیٹھ گئیں بہو......! آفس سے تھکا ہوا۔۔۔ میرا بچہ آیا ہے کوئی پانی کا پوچھتیں...... جاؤ بچے! اپنی ممانی کو بلا کر لاؤ۔'' دوسری آواز جو کانوں میں پڑی وہ بڑی نند کی تھی۔

''اللہ بھائی! کیا بھائی روزانہ یونہی کیا کرتی ہیں؟ اس وقت تو انہیں کمرے سے باہر ہونا چاہیے۔'' جواب میں مظلوم بھائی نے کیا کہا اس سے سنا نہیں گیا۔ وہ واپس چلتی بستر تک آئی۔ چپ چاپ لیٹ گئی۔ یہ تھیں ساس جن کی خدمت وہ دل و جان سے کیا کرتی تھی۔ یہ تھیں وہ نندیں جن کی خاطر مدارات اور ان کے بچوں کی فرمائشیں پوری کرتے وہ دن بھر ہلکان ہوا کرتی تھی اور ان سے وہ چلی تھی شوہر کی شکایت کرنے......؟ اس نے جانے یہ سوچا بھی کیونکر کہ وہ شکایت کرے گی تو ساس اپنے بیٹے کے کان کھینچیں گی۔ نندیں اپنے بھائی کو آڑے ہاتھوں لیں گی...تو گویا کوئی نہیں جس سے وہ سب کچھ کہہ ڈالے، افسوس! اس کی سوچوں کا ارتکاز ٹوٹا...... نگاہیں چھت سے ہوتی دروازے پر جا لگیں۔ جہاں دستک ہو رہی تھی۔

''ممانی...... نانو بلا رہی ہیں۔'' کسی بچے کی آواز...... بے دلی سے اٹھی، چپل پاؤں میں اُڑسی اور دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ ساس نے ترچھی نگاہ اس پر ڈالی، نندوں نے عجیب سی اچٹتی نظر اس پر ڈالی اور پھر سے باتوں میں مشغول ہو گئیں۔ اس نے سلے ہوئے لبوں کو اور بھی سختی سے بھینچ لیا۔ باورچی خانے سے پانی کا گلاس لا کر پھولے منہ والے شوہر کو پیش کیا۔ واپس باورچی خانے میں آ گئی اور رات کا کھانا پکانے کی تیاری کرنے لگی۔ آٹا بھی گوندھنا تھا۔ برتن بھی دُھلنے کے منتظر تھے اور پھر وہی فرمائشیں......

''ممانی! یہ کھانا، ممانی! وہ کھانا......'' اور وہ سر ہلاتے ہوئے جُت گئی۔ یہ سب کچھ اسے ہی دیکھنا تھا۔ یہ سب کام اسے ہی کرنے تھے۔ اس کے دل میں کیا پکڑ دھکڑ چل رہی تھی اسے سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اسے خود ہی دل کو بھی آسرا دینا تھا اور اپنا غم بھی غلط کرنا تھا اور کیوں نہ کرتی......؟ ضرور کرتی کیونکہ... وہ ایک بہو تھی، بھاوج تھی، ماں تھی اور بیوی تھی مگر اصل میں وہ تھی کون......؟ ہاں تھی تو عورت ہی ناں مگر کیا وہ ایک جیتی جاگتی انسان بھی تھی؟ وہ یہی سوال سوچتی کام میں جُت گئی۔

مکمل ناول

نبھانا ہے محبت سے

سکینہ فرخ



ابا کا موڈ سخت آف تھا...... اماں کا چہرہ مُتا ہوا تھا...... عافیہ نہ جانے کہاں چھپ کر بیٹھ گئی تھی اور عاشر تو صبح سویرے ہی بائیک لے کر کہیں نکل گیا تھا اور میں مشین کے کسی فالتو پرزے کی طرح یہاں وہاں لڑھک رہا تھا۔

پورے گھر میں اگر کوئی چہک رہا تھا تو وہ ماورا تھی۔ اس کے ہونٹوں پر صبح سویرے جو مسکراہٹ کھلی تھی وہ کئی گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی تر و تازہ تھی۔


Downloaded From
Paksociety.com

وہ مستعدی سے پیکنگ میں لگی ہوئی تھی...... نہ آج اسے نیند آ رہی تھی اور نہ ہی سر میں درد ہوا تھا...... نہ طبیعت گھبرائی اور نہ جی متلایا...... پہلی بار میں اسے اس قدر چاق و چوبند اور خوش دیکھ رہا تھا...... جبکہ میرا دل وقت کے ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ڈوبا جا رہا تھا...... ساری شوخی اور شرارت ہوا ہو چکی تھی۔ غصے سے ابلتا ہوا خون برف کی طرح ٹھنڈا ہوئے جا رہا تھا اور عقل کام کرنا چھوڑ چکی تھی۔

''اف یہ میں نے کیا کر دیا...... بات کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں تک جا پہنچی...... لیکن اب جو ہونے جا رہا تھا اس سے کیسے بچوں؟'' میں نے کنپٹی مسلتے ہوئے سوچا۔

اماں کی طرف بڑھا...... وہ آنسو پونچھ رہی تھیں۔ مجھ پر نظر پڑی تو منہ پھیر کے بیٹھ گئیں۔ ابا جو بظاہر ''مجھے کیا'' کی عملی تفسیر بنے بیٹھے ٹی وی پر چلنے والا ٹاک شو دیکھ رہے تھے مزید تیوریاں چڑھا کے اینکر کو گھورنے لگے گویا ابھی اسے ٹی وی سے نکال کر باہر لا پٹخیں گے۔

میں نے کچھ کہنے کی ہمت جمع کرتے ہوئے گلا صاف کرنے کو کھنکھارا...... مگر اس سے پہلے کہ منہ سے ایک لفظ بھی نکلتا ابا نے ایک دم ٹی وی آف کیا، ریموٹ میز پر پٹخا اور لاؤنج سے نکل گئے۔ اماں کی طرف مڑا تو وہ تنک کے اٹھیں اور دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے ابا کے پیچھے، پیچھے چل دیں۔ ابا تو خیر بھی کبھار غصہ کر ہی لیا کرتے تھے مگر اماں کافی متحمل مزاج تھیں...... زندگی میں پہلی بار میں انہیں غصے میں دیکھ رہا تھا...... گو کہ انہوں نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا صرف روئے جا رہی تھیں مگر ان کی نگاہوں میں جو کاٹ تھی وہ مجھے اندر تک کاٹے جا رہی تھی...... شاید غلطی صرف میری ہی تھی مگر جو کچھ بھی ہوا وہ اس قدر اچانک تھا کہ مجھے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ شاید مجھے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔ جتنی مصیبت میں، میں پچھلے دس ماہ اور گیارہ دنوں سے مبتلا تھا وہ شاید میں ہی جانتا تھا، میرے گھر والے مجھ پر بیتنے والے اس ظلم سے آگاہ نہیں تھے...... ہم مردوں کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟ آدھی زندگی ابا کے زیرِ تسلط اور باقی کی آدھی بیوی کے خوف میں گزر جاتی ہے...... کھلی ہوا میں سانس لینے کا موقع تب ملتا ہے جب سانس کی آمد و رفت ہی بند ہو جاتی ہے...... کمائیں ہم اور اس کمائی پر عیش دوسرے کرتے ہیں...... شادی شدہ مردوں کی زندگی تو ٹینس کی اس گیند کی طرح ہوتی ہے جو ایک کورٹ سے دوسرے کورٹ تک پھدکتی پھرتی ہے...... کبھی اماں ابا کی سائڈ تو کبھی بیگم کی طرف...... اور جہاں بھی جاؤ ''ہٹ'' ہی لگائی جاتی ہے۔ صبح سے اب تک گھر کے کئی چکر لگانے اور پھر کونوں کھدروں میں بیٹھ کر سگریٹ پینے کے علاوہ میں کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ تف ہے ایسی بے بسی کی زندگی پر...... آدمی جتنا شریف ہوتا ہے ہر طرف سے اس پر اتنے ہی جوتے برستے ہیں...... آنے والے مستقبل کا خوف ابھی سے لرزانے لگا تھا...... بارھویں سگریٹ کے بچے ہوئے ٹکڑے کو زمین پر پھینک کر زور، زور سے جوتے سے مسلنے کے بعد گویا میں نے اپنے اندر کی فرسٹریشن اس پر نکال دی۔

☆☆☆

''لڑکی مجھے سلیقہ شعار لگ رہی ہے...... گھر بھی صاف ستھرا تھا اور وہ خود بھی تمیز دار لگ رہی تھی۔'' اماں خوش ہو کے بولیں۔

''خاندان اچھا ہے، شریف لوگ لگتے ہیں۔''

''خوب صورت بھی ہیں۔'' عافیہ نے گویا میرے ذہن میں اٹھنے والے اس اہم ''سوال'' کو پڑھ لیا۔

عاشر شوخ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور میں مشرقی مردوں کی طرح سعادت مندی سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اپنے سے دو سال چھوٹے اس شریر بھائی سے نگاہیں ملانے سے گریز کر رہا تھا کہ مبادا نگاہیں ملیں اور میری ہنسی چھوٹ جائے اور اماں ابا کے سامنے شرمندگی ہو۔

''دو بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ سب سے چھوٹی ہے...... دونوں بڑی بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں...... دونوں بھائی بھی شادی شدہ ہیں...... اماں ابا بفضلِ خدا حیات ہیں بلکہ دادی بھی حیات ہیں اور کافی ضعیف ہیں اور سب ساتھ ہی رہتے ہیں۔'' اماں نے بائیو ڈیٹا بتایا۔

''اگلی بار تصویر بھی لے آؤں گی تاکہ آپ بھی دیکھ لیں۔'' عافیہ کا ذہن ہونے والی بھابی کی خوب صورتی میں اٹکا ہوا تھا۔

''ارے اب پہلے ان لوگوں کو اپنے گھر بلانا ہوگا تاکہ وہ بھی لڑکے کو اور ہمارے گھر کو دیکھ لیں۔'' اماں نے جلدی سے کہا۔

''بالکل صحیح کہا...... گھر تو ضرور دیکھ لیں...... ان کے گھر کے مقابلے میں کافی چھوٹا ہے ہمارا گھر......'' ابا کا لہجہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''آج کل سمجھ دار والدین لڑکے کو دیکھتے ہیں...... لڑکے کی تعلیم، اس کی جاب اور اس کی شخصیت...... اور ان سب میں ہمارا عامر ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ایک ہے۔''

''اس میں تو کوئی شک نہیں۔'' ابا فخر سے بولے۔ میں بدستور سعادت مندی سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ دل میں خوشی کے لڈو پھوٹ رہے تھے۔

ہر مشرقی اور شریف لڑکے کی طرح میرے دل میں بھی بڑے ارمان تھے۔ ایک اچھی محبت کرنے والی، خوب صورت اور خدمت گزار بیوی کے خواب میری آنکھوں میں تب سے مچلنا شروع ہو گئے تھے جب سے انجینئر بننے کے بعد اپائنٹمنٹ لیٹر ہاتھ میں آیا تھا اور اب اس خواب کی تعبیر ملنے جا رہی تھی۔

☆☆☆

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ ہمارے گھر کی پہلی اور ان کے گھر کی آخری شادی، سو دونوں اطراف سے تمام ارمان پورے کیے گئے۔

ماورا میری توقع سے زیادہ حسین تھی۔ بڑے گھر کی انتہائی لاڈلی، خوب صورت لڑکی میری بیوی بن چکی تھی۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا...... اس کے سامنے تو میں کچھ بھی نہ تھا...... میں اس سے مرعوب ہو گیا۔ نتیجتاً اسے خوش رکھنے کے لیے جو کچھ میرے بس میں تھا اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔

وہ حسین تھی...... حسین ترین ہو گئی، مغرور تھی مغرور ترین ہو گئی۔ اماں ابا بھی بہو کے لاڈ اٹھانے میں کسی سے پیچھے نہیں تھے...... عافیہ، بھابی کی دیوانی تھی اور عاشر بھی بہت خوش تھا گو وہ عمر میں عاشر سے چھوٹی تھی لیکن وہ بھابی سے انتہائی احترام سے پیش آتا۔

میرا گھر جنت بن چکا تھا...... شادی کے بعد دو مہینے کیسے گزرے پتا ہی نہیں چلا...... روز گھومنے پھرنے اور دعوتیں اڑانے کے ساتھ، ساتھ ہم دونوں پندرہ دنوں کے لیے شمالی علاقہ جات کی سیر بھی کر آئے۔

رفتہ، رفتہ زندگی معمول پہ آنے لگی۔

میں نے یا گھر والوں نے ماورا پر کوئی ذمے داری نہیں ڈالی۔ سب کا خیال تھا کہ وہ خود ہی آہستہ، آہستہ گھر کے ماحول میں رچ بس جائے گی۔ مگر شاید یہ ہماری خام خیالی تھی۔

شروع، شروع میں جب میں آفس جاتا تو وہ سو رہی ہوتی، واپس آتا تو وہ بنی ٹھنی کمرے میں بیٹھی ہوتی۔ اسے دیکھ کر میرا سیروں خون بڑھ جاتا۔ ہم دونوں لیلیٰ مجنوں کی طرح ایک دوسرے پر نثار ہوتے...... کبھی وہ میکے جانے کی فرمائش کرتی تو ہم وہاں چلے جاتے اکثر رات کا کھانا بھی وہیں کھا لیتے۔ اس کا گھر بڑا خوب صورت تھا...... کھلا، کھلا سا آراستہ و پیراستہ......

اس کا کمرا ابھی تک اس کی اماں نے جوں کا توں رکھا ہوا تھا...... وہ جب بھی جاتی کچھ دیر اپنے کمرے میں ضرور گزارتی...... ماں باپ تو خیر آؤ بھگت کرتے ہی...... دونوں بھائی اور بھابیاں بھی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ چھوڑتیں وہ میکے جا کے خوب چہکتی تو مجھے بھی خوشی ہوتی۔

کچھ وقت اور سرکا...... تو اماں نے کچھ دبے، دبے انداز میں شکایت کی۔

''کیا مطلب...... کیا ماورا دن میں کمرے سے باہر ہی نہیں نکلتی؟'' میں حیران ہوا۔ روزانہ صبح جب میں آفس جاتا تو مجھے ناشتا اماں یا عافیہ ہی دیتی تھیں۔ وہ سو رہی ہوتی تھی تو میں بھی اس کا آرام خراب نہ ہونے کی وجہ سے اسے نہیں جگاتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کچھ دیر کے بعد وہ اٹھ ہی جاتی ہو گی اور باہر آ کے اماں اور عافیہ کا ہاتھ بٹاتی ہو گی۔

''وہ تو سارا دن سوئی رہتی ہے...... شروع، شروع میں کچھ دن عافیہ اس کے لیے ناشتا لے کر گئی تو اس نے منع کر دیا کہ وہ ناشتا نہیں کرتی...... پھر دوپہر کے کھانے پر جگایا تو بولی آپ لوگ کھا لیا کریں میرا انتظار مت کریں۔ میں جب اٹھوں گی اور بھوک لگے گی تو خود ہی کھا لوں گی۔ اب اس کے بعد کبھی، کبھی تین چار بجے تک باہر آ جاتی ہے اور کچھ کھا پی لیتی ہے کبھی باہر ہی نہیں آتی...... خدا جانے سو رہی ہوتی ہے یا جاگ رہی ہوتی ہے...... پھر شام میں عافیہ چائے لے کر اس کے کمرے میں جاتی ہے تو وہ ہمیشہ کسی سے فون پر بات کر رہی ہوتی ہے عافیہ چائے رکھ کے چپ چاپ باہر آ جاتی ہے...... بیچاری کو بڑی تمنا تھی کہ بھابی سے دوستی کرے گی، گپ شپ کرے گی...... ایک بہن کی کمی پوری ہو جائے گی...... مگر......'' انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری اور میں شرمندہ سا ہو گیا۔ میں نے ماورا سے بات کرنے کا سوچا۔

''اور بھئی تم نے یہ تو نہیں بتایا کبھی کہ دن کیسے گزرتا ہے تمہارا......'' میں نے پیار سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے طریقے سے بات کا آغاز کیا۔

''انتہائی بور اور بیکار۔'' اس نے منہ بنایا۔

''کیا مطلب؟'' میں حیران ہوا۔

''مطلب یہ کہ کچھ کرنے کو ہی نہیں ہے۔ بس سوتی ہوں، سو کر اٹھتی ہوں، فریش ہوتی ہوں کچھ کھاتی پیتی ہوں اپنا کمرا صاف کرتی ہوں اور اس کے بعد ٹائم پاس کرتی ہوں...... کبھی فون پہ گپ شپ کر لی، کبھی کوئی مووی دیکھ لی۔'' اس نے منہ لٹکا کے کہا۔

مجھے اپنی اس معصوم بیوی پر پیار آ گیا۔

''تو کیوں اتنا بور ہوتی ہو...... کمرے سے باہر نکلا کرو۔ اماں، ابا، عافیہ سے گپ شپ کرو۔'' میں نے دانستہ ''کام'' کو گول کر دیا۔

''وہ لوگ میرے مزاج کے نہیں ہیں۔ آٹھ بجے تمہارے گھر ناشتا ہو جاتا ہے...... ایک ڈیڑھ بجے تم لوگ کھانا کھا لیتے ہو...... یہ انڈا، پراٹھا، دال، سبزی، بریانی ٹائپ چیزیں میں نہیں کھا سکتی......اور نہ ہی اتنی جلدی میرے ناشتے کھانے کا ٹائم ہوتا ہے...... آنٹی کے پاس خاندان والوں کے علاوہ کوئی ٹاپک ہی نہیں ہے بات کرنے کو...... عافیہ صرف اپنے کالج کے گھسے پٹے قصے لے کر بیٹھ جاتی ہے اور انکل سے کیا بات کروں......بس اپنے کمرے میں ہی بیٹھی رہتی ہوں۔''

اس کے جواب نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے۔ وہ میرے گھر والوں کے لیے کیسے جذبات رکھتی تھی، مجھے بے انتہا افسوس ہوا۔

''تم باہر نکلو گی سب کے ساتھ بیٹھو گی تب ہی تم ان کو اور وہ تم کو سمجھیں گے۔ آہستہ، آہستہ تم سب ایک دوسرے کو سمجھنے لگو گے تو خود بخود سب اچھا لگنے لگے گا۔'' میں نے اپنی مایوسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''میں زیادہ سوشل نہیں ہوں عامر۔'' اس نے منہ بنایا۔

''اس میں سوشل ہونے کی کیا بات ہے...... یہ تمہارا گھر اور یہ سب تمہارے گھر والے ہیں یار......'' میں ہلکا سا جھنجلا گیا۔

جواباً وہ کچھ نہیں بولی بس اپنے ہاتھوں میں پڑے کنگن سے کھیلتی رہی جو اسے میں نے منہ دکھائی میں پہنایا تھا۔ یہ کنگن اسے بہت پسند تھا۔ وہ اسے ہر وقت پہنے رہتی تھی اور میں یہ دیکھ، دیکھ کر خوش ہوتا تھا کہ اسے میری دی ہوئی چیز سے کتنی محبت ہے...... میرے دیے ہوئے تحفے سے اتنی محبت مگر مجھ سے جڑے رشتوں کی یہ قدر افزائی......؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''اچھا چلو ایسا کرو کل سے تم میرے لیے ناشتا بنایا

کرو۔'' میں نے محبت سے اس کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے مگر دل ہی دل میں ڈرتے ہوئے لگاوٹ سے کہا۔

''میں...... ناشتا......؟ سوری عامر میں تو ناشتا کرتی ہی نہیں بناؤں گی بھلا کیا! تم پلیز میری وجہ سے اپنی روٹین مت ڈسٹرب کرو...... جیسے چل رہا ہے چلنے دو۔'' وہ جلدی سے بولی۔

ماورا شاید عام لڑکیوں سے کچھ زیادہ ہی مختلف ہے...... یعنی میری انتیس سالہ زندگی میں، میں نے جتنے ڈرامے دیکھے یا دوستوں میں جو بھی گپ شپ ہوئی یا اپنے اور دوستوں کے گھروں کے جس قدر حالات سے میں واقف تھا وہاں کہیں دور، دور تک ایسی ''بہو'' یا بھابی دیکھی نہ سنی تھی۔

میرا تو خیال تھا کہ شادی کو تین ماہ گزرنے کے بعد اسے سب میں گھل مل کے اسی خاندان کا حصہ بن جانا چاہیے تھا...... خیر، لگتا ہے اسے گھلانے ملانے کے لیے مجھے ہی کوشش کرنی پڑے گی۔

☆☆☆

اس دن میں آفس سے جلدی آ گیا...... اماں نے دروازہ کھولا...... اور حیران رہ گئیں۔

''تم اس وقت...... سب خیر تو ہے بیٹا؟''

''جی اماں بس آج ذرا چھٹی مل گئی۔'' میں مسکرایا۔

''چلو آؤ...... ہم نے تو ابھی، ابھی کھانا کھایا ہے تم منہ ہاتھ دھولو، میں تمہارے لیے کھانا نکالتی ہوں۔'' انہوں نے جلدی سے کہا۔

''ارے نہیں اماں آپ کیوں...... میں ماورا سے کہتا ہوں۔'' میں نے بیڈ روم کی طرف قدم بڑھایا۔ اماں کچھ نہ بولیں مگر انہوں نے مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا میں نے کوئی انہونی ناقابلِ یقین بات کہہ دی ہو۔

میں بیڈ روم کا دروازہ کھول کے اندر داخل ہوا...... ماورا شاید نہا کے نکلی تھی اور ڈریسنگ ٹیبل پہ بیٹھی ہیئر ڈرائر سے اپنے بال سکھا رہی تھی...... اس نے چونک کے گردن گھمائی اور مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بھی حیرت در آئی۔ ''آپ اس وقت؟''

''ہاں یار، بس آج ذرا جلدی چھٹی ہو گئی...... تم ابھی جاگی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں آدھا گھنٹا ہو رہا ہے۔'' اس نے ہیئر ڈرائر ٹیبل پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے وال کلاک پر نظر دوڑائی وہاں سوا تین بج رہے تھے۔

''پھر تو تم نے بھی لنچ نہیں کیا ہوگا۔ مجھے بھی بڑی زبردست بھوک لگ رہی ہے۔ ایسا کرو کہ تم اپنا اور میرا کھانا یہیں لے آؤ...... دونوں مل کے کھاتے ہیں۔'' میں نے پلان کے پہلے حصے پر عمل کیا۔

''مگر میں تو لنچ نہیں کرتی۔ کچھ فروٹس اور دودھ لے لیتی ہوں اس وقت......'' اس نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔

''کوئی بات نہیں...... آج میرے ساتھ میرا دل رکھنے کو ہی لنچ کر لو...... میں کون سا روز، روز اس ٹائم دفتر سے آتا ہوں۔'' میں نے اسے اکسایا۔

''تم عافیہ سے کہہ دیتے ناں۔'' وہ جھنجلائی۔

''کیوں؟ اس سے کیوں کہوں...... بھئی اب میں بیوی والا ہوں اپنی بیوی سے کہوں گا کہ جائے میرے لیے گرما گرم روٹیاں بنائے اور پھر ہم دونوں اکٹھا کھانا کھائیں...... سوچو کتنا رومینٹک لگتا ہے ناں......'' میں نے ہنس کے کہا۔

''بالکل بھی نہیں...... روٹیاں بنانا ہرگز بھی رومینٹک کام نہیں ہے۔'' اس نے برملا کیا۔

''شوہر کے لیے روٹیاں بنانا رومینٹک نہیں لگتا تمہیں؟'' میں نے لہجے کو افسردہ بناتے ہوئے کہا۔

''پلیز عامر کیوں بور کر رہے ہو...... چھوڑو لنچ...... تم بھی میرے ساتھ آج فروٹ کھاؤ۔'' اس نے بیڈ روم فریج سے سیب اور مالٹے نکالتے ہوئے کہا۔

''مگر مجھے بھوک......'' میں نے کمزور سا احتجاج کرنا چاہا۔

''تو اس سے بھی بھوک مٹ جائے گی...... اور فروٹ تو صحت کے لیے بہت اچھے ہوتے ہیں...... اس

سے اسکن اچھی اور خون صاف ہوتا ہے...... یہ بتاؤ دودھ ٹھنڈا پیو گے یا گرم......'' اس نے پوچھا اور دودھ کا پیکٹ ہاتھ میں لیے مائیکرو ویو کی طرف بڑھی...... کمرے میں فریج بھی تھا، مائیکرو ویو بھی، جوسر اور بلینڈر بھی...... کافی میکر بھی...... اس نے اپنے جہیز میں ملنے والے کچن آئٹمز کو کمرے ہی میں سجا کے منی کچن تعمیر کر لیا تھا...... اب باہر نکلنے کی ضرورت بھی کیا تھی...... ان سب چیزوں کو دیکھ کر پہلی بار ان پر غصہ آیا۔

''دودھ تو میں نے دس بارہ برس کی عمر میں پینا چھوڑ دیا تھا۔'' میں نے منہ بنایا۔

''تو کافی بنا دوں؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، یہ کافی پینے کا کون سا ٹائم ہے...... تم کرو اپنے شوق پورے...... میں آرام کروں گا۔'' میں نے قدرے خفگی سے کہا۔ سارا پلان چوپٹ ہو گیا تھا۔ میرا تو مقصد اسے کمرے سے باہر نکالنا اور اماں کے پاس کچن میں بھیجنا تھا تاکہ کفر تو ٹوٹے کسی طرح...... مگر وہ شاید بہت چالاک تھی...... یا پھر ضدی...... اب عالم یہ تھا کہ واقعی بھوک سے برا حال ہو رہا تھا مگر اب باہر جا کے اماں سے کھانا مانگنے پر شرم بھی آ رہی تھی۔

میں نے بس جوتے اتارے اور آفس کے کپڑوں ہی میں بستر میں گھس گیا۔

ماورا بے نیازی سے مالٹے کے چھلکے اتارنے لگی۔

☆☆☆

وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ اماں کا موڈ مستقل آف رہنے لگا...... عافیہ کے ایگزامز چل رہے تھے، وہ پڑھائی میں مصروف تھی اور گھر کا سارا بار اماں کے کمزور کندھوں پر آ پڑا تھا۔ ابا ریٹائرمنٹ کے قریب تھے، اکثر بیمار رہتے تھے۔ دمے کا دائمی مرض تھا انہیں، جس نے انہیں کمزور کے ساتھ، ساتھ چڑچڑا بھی بنا دیا تھا۔ جب بیمار پڑ جاتے اور گھر میں رہتے تو اماں بیچاری ان کی دیکھ بھال کرتے ہی میں حال سے بے حال ہو جایا کرتی تھیں...... اور آج کل ان کی بیماری ہی کا دور چل رہا تھا اور اماں گھر کے کاموں اور ابا کی تیمارداری میں بری طرح الجھی ہوئی تھیں۔ عاشر کا میڈیکل کا فائنل ایئر تھا...... اس کی اسپتال ہی میں ڈیوٹی لگی ہوئی تھی۔ گھر آتا تو وہ بھی ابا ہی میں مصروف رہتا۔

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ گھر کے افراد مجھ سے کھنچے، کھنچے سے ہیں۔ وجہ میں بخوبی جانتا تھا مگر افسوس کچھ کرنے پہ قادر نہ تھا کہ میری بیوی اپنے طور طریقے بدلنے پر بالکل بھی راضی نہ تھی اور اب تو اسے ایک مستقل بہانہ ہاتھ آ گیا تھا...... وہ امید سے تھی...... اس پر سختی بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔

تنگ آ کر میں نے گھر کے کام کاج کے لیے ایک مستقل ملازمہ کا بندوبست کر دیا۔ گو کہ میری تنخواہ کا ایک معقول حصہ اس مد میں نکلنے لگا مگر اس کے سوا اور چارہ بھی نہیں تھا۔

اماں نے سکون کی سانس لی تو ان کے ماتھے کے بل بھی قدرے کم ہوئے...... مگر ظاہر ہے کام کا مسئلہ تو حل ہو گیا تھا مگر بہو اور سسرال والوں کے درمیان فاصلے تو بدستور برقرار تھے۔

شاید بچہ ہو جائے تو حالات بہتر ہو جائیں...... وہ اپنے خول سے باہر نکل آئے اور سب میں گھلنے ملنے کا قرینہ سیکھ جائے...... امید پر دنیا قائم تھی...... سو میں بھی اس کے ساتھ، ساتھ ''امید'' سے تھا۔

☆☆☆

''مجھے ماما یاد آ رہی ہیں......'' میں آفس سے گھر واپس آیا، تھکا ماندہ کمرے میں داخل ہوا تو سلام دعا کے بغیر اس نے رونی صورت بنا کے کہا۔

''تو ان کو فون کر لو......'' آج دفتر میں ظہیر صاحب...... جو کہ اتفاق سے میرے باس ہوتے تھے...... سے میری ہلکی پھلکی جھڑپ ہو گئی تھی...... میرا موڈ سخت آف تھا۔ نوکری برقرار رکھنے کے لیے کیسوں کیسوں سے بنا کر رکھنی پڑتی ہے، آفیسرز کی تلخ و ترش سننی پڑتی ہے...... کتنی ہی بڑی ڈگری ہو یا بھاری بھرکم کوالیفکیشن...... جونیئر بہرحال جونیئر ہی ہوتا ہے...... سینئرز کب کس بات پر بھڑک جائیں...... کچھ پتا نہیں

ہوتا۔ میں ٹھنڈی سانسیں بھر بھر کے جوتے، موزے اتارنے لگا...... دوسری طرف ماورا منہ بنا کے بیٹھی رہی۔

"کیا ہوا؟" میں نے اس کی جانب خاموشی دیکھ کر مڑ کے اسے دیکھا۔

"فون میں ان کو روز کرتی ہوں...... مجھے ان کے پاس جانا ہے۔" وہ ٹھنکی۔

"ٹھیک ہے، کل ہفتہ ہے تمہیں ملا لاؤں گا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"کل نہیں آج...... بلکہ ابھی...... اور ملانہیں...... لاؤں گا میں وہاں رہنے جاؤں گی۔" اس نے بدستور ٹھنکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی تمہیں...... رہنے کا کیا مطلب...... تمہاری حالت ایسی ہے کسی بھی وقت کوئی ضرورت پڑ سکتی ہے ابھی تمہیں یہیں رہنا چاہیے۔" میں نے اپنے سر کے درد کو بہ مشکل ضبط کرتے ہوئے اسے سمجھایا۔

"میں نے کہہ دیا کہ جانا ہے تو جانا ہے...... اور حالت کا کیا مسئلہ ہے، اگر وہیں کچھ ہوا تو گھر میں تین تین گاڑیاں ہیں سب لوگ ہیں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ ویسے بھی میرا دل یہاں نہیں لگتا...... وہاں سارے میرے اپنے ہیں......" اس کا آخری جملہ میرے سر میں جو درد سے پھٹنے کے قریب تھا راکٹ کی طرح جا کے لگا اور بالآخر سر پھٹ گیا۔

"کیا مطلب؟" میں چیخا۔ "وہاں تمہارے سارے اپنے ہیں اور یہاں پرائے بلکہ دشمن......"

اس نے پہلی بار مجھے اتنے غصے میں دیکھا تھا۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں ہلکا سا خوف جھانکا جس پر اس نے فوراً قابو پالیا۔

"یہ تم مجھ سے کس طرح بات کر رہے ہو؟" وہ غصے میں بولی۔

"یہ تم کس طرح کی باتیں کر رہی ہو......؟" میں بھی غصے میں پھنکارا۔

"میں نے کیا غلط کہہ دیا؟" وہ تنتنا کے کھڑی ہوگئی۔

"تم نے غلطی کی ہے اور اب غلط کہہ بھی رہی ہو...... تم نے میرے گھر والوں کو کبھی اپنا سمجھا ہوتا تو آج تمہیں تمہارے اپنے یاد نہ آ رہے ہوتے۔" میں چبا کے بولا۔

"تمہارے گھر والوں سے میرا مزاج نہیں ملتا...... ان کی اور میری سوچ میں بہت زیادہ فرق ہے...... تمہیں نہیں پتا میں یہاں کتنی مشکل سے رہتی ہوں...... کسی سے کچھ کہتی سنتی نہیں ہوں پھر بھی تمہاری ماں اور بہن اکثر کوئی نہ کوئی طنزیہ بات کر جاتی ہیں...... تمہارے باپ اور بھائی مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہیں۔" وہ کوفت بھرے لہجے میں بولی۔

"بالکل ایسا ہی ہوتا ہوگا اور اس کی وجہ تم خود ہو۔" مہینوں سے دل میں بھرا ہوا غبار نکلا تو میری زبان بھی کھلنے لگی۔

"تمہارے رویے سے ہی وہ سب تم سے بیزار ہوئے ہیں ورنہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ سب تمہیں کتنی محبت اور عزت سے بیاہ کر لائے تھے...... تم ان کے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو ذرا تھامتی تو سہی...... تم نے خود کھویا ہے ان سب کو......" میں نے اسے آئینہ دکھایا۔

"دیکھو میں یہ سب نہیں جانتی...... مجھے صرف اپنا اور اپنے بچے کا خیال ہے...... ساجد بھائی اور ان کی فیملی اگلے ہفتے دبئی شفٹ ہو رہے ہیں۔ سائرہ اور عذرا باجی پہلے ہی کینیڈا میں ہیں...... اب صرف عابد بھائی یہاں رہ جائیں گے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنے ماں باپ کے گھر شفٹ ہو جاؤں...... اتنا بڑا گھر ہے...... بھائیں، بھائیں کرتا ہے...... ساجد بھائی کے جانے کے بعد تو اور خالی ہو جائے گا...... مما، پاپا بھی میرے اس فیصلے سے خوش ہیں......" میں آنکھیں پھاڑے اس کی گفتگو سن رہا تھا...... مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"تم مجھے چھوڑ کے یہاں سے چلی جاؤ گی؟"

"تمہیں چھوڑ کے کیوں جاؤں گی...... تم بھی میرے ساتھ ہی جاؤ گے۔" وہ اس عرصے میں پہلی بار مسکرائی۔

"اور تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں تمہارے پیچھے پیچھے چل دوں گا؟" میں غرایا۔

"عقل سے کام لوگے تو چل ہی دو گے...... دیکھو تمہارا چھوٹا سا تین کمروں کا تو گھر ہے۔ ایک کمرا مجھے اور تمہیں ملا ہوا ہے...... ایک میں اماں اور عافیہ سوتے ہیں اور دوسرا جو ڈرائنگ روم کا کام دیتا ہے وہاں تمہارے ابا...... اور بیچارہ عاشر چھت پر بنے ہوئے اس نامکمل سے کمرے میں رہتا ہے۔ جہاں دس منٹ بیٹھنا بھی مشکل ہے...... اب تمہاری جاب اچھی سہی مگر ترقی کر کے زیادہ پیسے کما کے اپنا کوئی گھر بناؤ گے تو بھی اس میں بیس سال کا عرصہ تو لگ ہی جائے گا۔ جب قدرت تمہیں، مجھے اور ہمارے ہونے والے بچے کو ایک بہتر اور صاف ستھرا ماحول دینے جا رہی ہے تو انکار کیسا......؟" اس نے دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے سمجھایا۔

"جب تمہارے اماں، ابا تم سے میری شادی پر تیار ہوئے تھے تو انہیں میرا گھر نظر نہیں آیا تھا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"انہیں تمہاری ڈگری، تمہاری قابلیت اور تمہاری وجاہت نظر آئی تھی...... گھر کو انہوں نے اگنور کر دیا تھا...... سچی بات بتاؤں تو وہ یہ تھی کہ انہوں نے سوچا تھا۔ شادی کے کچھ دنوں کے بعد وہ کرائے پر ہمیں کوئی بہتر گھر لے دیں گے...... مگر تمہارا فیملی سسٹم...... میں پورے لاؤ لشکر کے ساتھ کہیں بھی شفٹ ہونا نہیں چاہتی تھی...... اس لیے......"

"تو اب تمہارا کیا خیال ہے میڈم...... کہ تم لاؤ لشکر یہیں چھوڑ کے صرف مجھے لے اڑو گی...... تو یہ تمہاری خام خیالی ہے...... نہ میں کہیں جاؤں گا اور نہ ہی تم...... سمجھیں......" میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کاٹ دیا...... دو عدد سر درد کی گولیاں پانی کے ساتھ نگلیں اور بغیر کچھ کھائے پیے بستر پر لیٹ گیا...... خون، رگوں میں گویا آگ کی طرح دوڑ رہا تھا...... ذلت اور بے عزتی کا ملا جلا احساس اندر ہی اندر کچوکے لگا رہا تھا۔ یہ لڑکی نادانی میں یہ سب کچھ کہہ رہی ہے یا غرور میں...... شاید نفرت میں یا ہو سکتا ہے غصے میں...... میری کنپٹیوں پر دستک دیتا درد دھیرے دھیرے کم ہونے لگا...... میں سونے لگا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح آنکھ کھلی تو میں نے مڑ کر اس کی سائیڈ پر دیکھا...... وہ موجود نہیں تھی...... دھیرے، دھیرے مجھے گزشتہ رات کی اپنی اور اس کی تلخ کلامی یاد آئی...... میں رات بھی غصے میں کھانا کھائے بغیر ہی سو گیا تھا۔

شادی سے پہلے چاہے کچھ بھی ہو جائے اماں مجھے کبھی بھوکا سونے نہیں دیتی تھیں اور اب پچھلے چند ماہ سے میں ان گنت بار بھوکا سو چکا تھا۔ اماں بھی شاید عادی ہو گئی تھیں...... نہ جانے وہ میرے اس عمل کو کیا معنی پہناتی ہوں گی۔ ان سے اب میرا آمنا سامنا کم ہی کم ہوتا تھا...... عافیہ کا یونیورسٹی میں داخلہ ہو چکا تھا۔ اب مجھے صبح ناشتا نسرین بنا کے دیا کرتی تھی...... اماں بھی کبھی کبھار نظر آ جاتی تھیں ورنہ وہ ابا کے ساتھ کمرے ہی میں ناشتا کرنے لگی تھیں۔ عاشر کا ہاؤس جاب چل رہا تھا وہ تو ہفتوں مجھے نظر ہی نہیں آتا تھا خدا جانے کب گھر آتا جاتا تھا...... ابا کے کمرے میں، میں خود ڈر کے مارے نہیں جاتا تھا، وہ ہی اگر باہر نظر آ جاتے تو دو گھڑی کو ان کے پاس بیٹھ جاتا ورنہ نہیں...... میں غیر محسوس طریقے سے اپنے گھر والوں سے دور ہوتا چلا جا رہا تھا...... شادی کے ان سائیڈ ایفیکٹس کے بارے میں، میں نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ لیکن ابھی یہ ہے کہاں...... میں نے اٹھ کر باتھ روم چیک کیا...... خالی ملا...... کہیں رات والی باتوں سے متاثر ہو کر میرے لیے ناشتا بنانے تو نہیں چلی گئی...... میں نے تصور کی آنکھ سے ماورا اور اماں، ابا کو کھانے کی میز پر ہنستے مسکراتے ناشتا کرتے دیکھا...... ایک ٹھنڈی سانس بھری اور باتھ روم میں گھس گیا۔

تیار ہو کے باہر نکلا تو اماں کچن کے سامنے کھڑی تھیں...... اور نسرین میرے لیے ٹیبل پر ناشتا

رکھ رہی تھی...... اس سے پہلے کہ میں اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد اماں سے ماورا کے بارے میں پوچھتا، اماں خود ہی بول پڑیں۔

''ماورا کے گھر سے صبح صبح گاڑی آئی تھی، وہ میکے چلی گئی ہے، کہہ کر گئی ہے کہ جب تمہیں فرصت ہو تو اس سے بات کر لینا۔'' اماں کا لہجہ بے تاثر تھا۔

''جی اماں......!'' میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ دل نہ چاہنے کے باوجود ناشتا کرنے بیٹھ گیا۔ تاکہ ہر چیز نارمل نظر آئے۔

''اگر ڈلیوری کے لیے اس کا پروگرام میکے جا کے رہنے کا تھا تو کم از کم تم ہی مجھے بتا دیتے، میں تو یہاں تیاریوں میں لگی رہی۔'' اماں سے نہ رہا گیا۔

میں اماں کو کیا بتا تا جب کہ اس کے پروگرامز مجھ پر کل رات ہی منکشف ہوئے تھے۔

''مجھے نہیں معلوم اماں کہ اس کا کیا پروگرام ہے۔'' میں نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

''تم نے تو عامر ہم سب کی ناک ہی کٹا دی بیٹا...... ہم تو یوں اپنی نگاہوں میں جرم نہ کر کے بھی مجرم بن گئے کہ کسی سے کیا کہیں؟'' وہ میرے سامنے بیٹھ کر کن انکھیوں سے کچن میں کام کرتی نسرین کو دیکھ کر دبے لہجے میں بولیں۔

''میں آفس سے آ جاؤں پھر اس پر بات کر لیتے ہیں......'' میں نے جلدی، جلدی چائے کے چند گھونٹ بھرے اور اٹھ کھڑا ہوا...... وہ کچھ نہ بولیں بس مجھے دیکھتی رہیں...... کچھ بھی تھا ماورا میری بیوی تھی...... میری سچ مچ کی پہلی چاہت...... اس کے آنے سے میری زندگی میں بہار آ گئی تھی...... وہ بہار دھیرے دھیرے کیوں خزاں میں تبدیل ہونے لگی مجھے ہرگز نہیں معلوم تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد سب کچھ ایک دم سونا، سونا لگنے لگا تھا...... میں نے باہر آ کے بے دلی سے کار اسٹارٹ کی اور آفس کی طرف روانہ ہو گیا...... وہاں پر بھی حالات نہ جانے کیسے ہوں گے کچھ پتا نہیں...... کل کا دن شاید میری زندگی کا ایک ایسا دن تھا جس نے مجھے کئی معاملات میں دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا اور شاید آج کا دن ممکن ہے کہ کسی فیصلے کا ہو...... میرا ذہن مختلف فکروں میں پھنسا ہوا تھا۔

☆☆☆

توقع کے خلاف آفس کا ماحول نارمل تھا۔ باس کا وہ منہ جو کل پھول کے غبارے کی شکل اختیار کر گیا تھا آج اپنے نارمل سائز پر واپس آ چکا تھا۔ میں بھی ایسا ہی بن گیا جیسے میں نے تو کچھ کہا ہی نہیں...... مستعدی سے اپنے فرائض انجام دینے لگا...... لنچ ٹائم پر گھر کا محاذ یاد آیا۔ ابھی ماورا کو کال کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ سسر صاحب کا نمبر موبائل اسکرین پر جگمگانے لگا۔

''اوہو...... لگتا ہے اپنے ماں، باپ سے میری خوب شکایتیں لگا دی گئی ہیں۔'' میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے سوچا۔

''کیسے ہو بیٹا......؟'' سسر صاحب کا لہجہ شہد میں ڈوبا ہوا تھا...... یہ بات میرے لیے حیرت انگیز تھی۔

''میں ٹھیک ہوں آپ کیسے ہیں؟'' میں نے بھی تابعداری کا مظاہرہ کیا۔

''ہاں ہم لوگ تو ٹھیک ہیں بس ماورا......'' وہ کہتے، کہتے رک گئے۔

''کیا ہوا ماورا کو؟'' میں ایک دم پریشان ہو گیا۔

''وہ اصل میں کافی اسٹریس میں تھی...... ایسی حالت میں اسٹریس کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔'' انہوں نے پھر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ شاید وہ میرے ضبط کا امتحان لے رہے تھے...... سو میں نے بھی خود پر کنٹرول کرنے کی ہر ممکن کوشش کی...... اور کچھ نہ بولا۔

میری خاموشی دیکھ کر وہ دوبارہ گویا ہوئے۔

''اب بہتر ہے اس کی طبیعت، اسپتال سے گھر لے آئے ہیں۔'' انہوں نے پھر پہیلی بجھائی۔

صبح سات بجے وہ میرے گھر سے نکلی...... اور اب دو بج رہے تھے...... اس عرصے میں وہ اسپتال سے بھی ہو آئی...... خیر......

''چلیں شکر ہے اب اس کی طبیعت بہتر ہے......

میری طرف سے بھی پوچھ لیجیے گا اسے۔'' میں نے جل کر کہا۔ ''اب فون بند کرتا ہوں۔''

''ارے، ارے سنو تو میاں...... تم آفس سے سیدھے اِدھر آؤ، تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' وہ بالآخر اصل مدعے پر آگئے۔

''جی ہاں فرصت ملے گی تو ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔'' میں نے پھر پھلجھڑی چھوڑی۔

''فرصت کیسی صاحبزادے، آپ آج ہی تشریف لائیں۔'' وہ بھی ذرا تیز ہوئے۔

''دیکھیے انکل' میں نے عرض کیا ہے ناں...... فرصت ملے گی جب آجاؤں گا۔'' میں نے تمام اخلاقیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انہیں ٹکا سا جواب دے کر فون بند کردیا...... جب میں ٹینشن میں ہوں تو تھوڑی سی ٹینشن دوسروں کو بھی سہی...... میرے سر میں دوبارہ درد شروع ہو چکا تھا۔

☆☆☆

گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلا تو جناب جنید جاوید یعنی سسر جی نے انگلیاں ٹیڑھی کرلیں یعنی ابا کو فون ملادیا۔

میں گھر پہنچا تو میری پھیلائی ہوئی ٹینشن گھوم پھر کے دوبارہ میرے اپنے گھر واپس آچکی تھی۔

''آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے؟'' ابا کا موڈ سخت خراب تھا۔

''جی مجھے نہیں معلوم......'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''تمہیں نہیں معلوم تو پھر کس کو معلوم ہوگا؟'' وہ تیز لہجے میں بولے۔

''تمہارے سسرال والے چاہتے کیا ہیں آخر......؟'' اماں کچھ، کچھ معاملے کی تہ تک پہنچ چکی تھیں۔

''ان لوگوں سے میری کوئی بات نہیں ہوئی۔ ماورا کے ابا نے مجھے گھر بلایا تھا اور میں نہیں گیا۔'' میں نے کندھے اچکائے۔

''ایک دن صبح، صبح تمہاری بیوی ایک چھوٹا سا بیگ اٹھا کے اپنے گھر سے گاڑی منگوا کے اپنے ماں، باپ کے گھر چلی جاتی ہے...... بغیر کسی پروگرام کے...... یہاں تک کہ تم بھی بے خبر...... تم دونوں میں لڑائی ہوئی ہے؟'' اماں نے کریدا۔

''اماں آپ تو جانتی ہیں اس کا رویہ سب کے ساتھ کتنا اجنبی ہے...... میرا وجود تک اس کے لیے بس اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ میں اس کا خیال رکھوں، اس کی باتیں مانوں تو ٹھیک ورنہ میری حیثیت کچھ بھی نہیں......'' میں جھنجلا کر بولا۔

''تو شریف لوگوں کے طور طریقے یہی ہوتے ہیں کہ گزارہ کرتے ہیں...... مصالحت کی کوشش کرتے ہیں...... لڑ جھگڑ کے تھوڑی بیٹھ جاتے ہیں۔'' اماں نے سمجھایا۔

''تم اس کے گھر جاؤ...... ان لوگوں سے ملو اور بات ختم کرو...... ماورا کو واپس گھر لے آؤ......'' ابا نے فیصلہ سنا دیا۔

''اور جو وہ واپس ہی نہ آنا چاہے؟'' میں منہ، منہ میں بڑبڑایا۔

''کیا کہا تم نے؟'' ابا چونکے۔

''کچھ نہیں......'' میں سر جھکا کے بولا۔

''تو پھر تم کل جا رہے ہو۔'' ابا اٹھتے ہوئے بولے۔ اماں بھی ابا کی تائید میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

جانے میں تو کوئی حرج نہیں...... اگر صرف ماورا کو واپس لے کر آنا ہوتا تو میں سو مرتبہ جانے کو تیار تھا...... مگر میں جانتا تھا کہ معاملہ ماورا کو لانے کا نہیں بلکہ میرے وہاں رک جانے پر ختم ہونے والا ہے...... یہ بات میرے بھولے والدین نہیں جانتے تھے اور میں ان کو بتا کے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

''ماورا ہماری سب سے چھوٹی اور سب سے زیادہ لاڈلی بیٹی ہے۔'' جنید صاحب مجھے چائے بسکٹ' سموسے، پیسٹری ٹھنسانے کے بعد مطلب کی بات پر

آ گئے۔

''ہم نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنا کر پالا ہے۔'' بیگم جنید بھی گویا ہوئیں۔

''تو اس میں میرا کیا قصور ہے......'' میں دل ہی دل میں چلاّیا۔

''ہمیں تم نیک اور شریف لڑکے لگے تھے۔'' جنید صاحب پہلو بدل کے بولے۔

''مطلب بے وقوف اور احمق......'' میرے دل سے آواز آئی۔

''ہمیں لگا تم ہماری بیٹی کو خوش رکھ سکتے ہو......وہ بہت کمزور دل کی ہے۔'' بیگم جنید نے ساڑی کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

''بالکل آپ کو اپنی بیٹی کے لیے جو کمزور دل کے ساتھ، ساتھ کمزور دماغ کی بھی ہے، ایک بے دُم کا بودم چاہیے تھا۔ جو ڈگڈگی پہ ناچ کے آپ کی بیٹی کو خوش رکھ سکے۔'' میں پھر دل میں بدبدایا۔

''تم تو کچھ کہہ ہی نہیں رہے ہو۔'' مسز جنید نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''کہہ تو رہا ہوں .... اگر آپ ہی کو سنائی نہیں دے تو میں کیا کروں......'' میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پھر دل ہی دل میں کہا۔

''دیکھو بیٹے......'' جنید صاحب کھنکھارتے ہوئے سیدھے ہوتے ہوئے بولے۔ ''ہمیں ماورا عزیز ہے......تم بھی بے حد عزیز ہو......میری خواہش ہے کہ تم اپنے والدین کی اجازت سے ہمارے پاس میرا مطلب ہے اس گھر میں شفٹ ہو جاؤ...... اتنا بڑا گھر ہے......اوپر کا پورشن اگلے ہفتے خالی ہو جائے گا۔ ساجد اپنی فیملی کے ساتھ دبئی شفٹ ہو رہا ہے، تم لوگ آرام سے رہ سکتے ہو۔'' انہوں نے بالآخر وہ کہہ دیا جو میں سننے کے لیے گھنٹے بھر سے تیار بیٹھا تھا۔ میری کیفیت عجیب ہو رہی تھی اور اس عجیب کیفیت میں میرے منہ سے نکلا۔

''ٹھیک ہے انکل مجھے منظور ہے۔'' میں نے ایک دم کہا اور خود ہی حیران رہ گیا۔......دونوں میاں، بیوی کے چہروں پر حیرت دوڑ گئی۔ ان کے منہ کھلے اور بند ہوئے وہ دونوں شاید اس جواب کی توقع نہیں کر رہے تھے۔

چند لمحے خاموشی طاری رہی وہ شاید اپنی خوشی کو ہضم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''تو پھر اگلے ہفتے تم لوگ یہاں شفٹ ہو جاؤ...... کسی بھی قسم کا سامان لانے کی ضرورت نہیں...... یہاں سب کچھ موجود ہے اور ہاں اپنے والدین کا خیال ضرور رکھنا ......میرا مطلب ہے خرچا وغیرہ پہلے کی طرح دیتے رہنا کوئی کوتاہی مت کرنا......والدین کے بڑے حقوق ہوتے ہیں۔'' جنید صاحب میٹھے، میٹھے لہجے میں کہتے ہوئے مجھے اس وقت زہر لگ رہے تھے...... بجائے اپنی بیٹی کو سمجھانے کے وہ مجھے قابو کرنے چلے تھے۔ ماورا کو سمجھانے کی رہی سہی امید بھی جاتی رہی تھی...... جہاں ماں، باپ خود ہی بیٹی کی ہر جائز ناجائز بات پر پشت پناہی کریں وہاں ہر کوشش بیکار ہو جاتی ہے......میرا بچہ اس دنیا میں عنقریب آنکھیں کھولنے والا تھا اور میں ابھی کسی قسم کی محاذ آرائی میں نہیں پڑنا چاہتا تھا...... ماورا کی ضدی طبیعت سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ میرے انکار پر مزید کون سا قدم اٹھا لے۔

یہ فیصلہ تو میں نے فوراً ہی کر لیا مگر گھر آ کے اماں، ابا کو بتانا شاید میرے لیے اب تک کی زندگی کا سب سے مشکل ترین کام تھا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا اگلی صبح ماورا اپنا ضروری سامان لینے آئی تو انہیں خبر ہو ہی گئی۔

ان کی نگاہوں میں غصہ، افسوس، بے بسی سب ہی کچھ تو تھا...... میں جس ذہنی کرب سے گزر رہا تھا اس سے شاید وہ ناواقف تھے...... ورنہ میری بیچارگی پر افسوس کرتے یوں مجھ سے خفا نہ ہوتے......

بیٹیوں کی پیدائش پر والدین کے ذہن میں یہی خیال ہوتا ہے کہ ایک نہ ایک دن انہیں رخصت کرنا ہوگا مگر بیٹوں کے لیے کم از کم ہمارے معاشرے میں ایسا کوئی تصور موجود نہیں...... اس بیٹے سے جس کو محنت

مشقت سے پال پوس کر تعلیم دلا کر کسی قابل بنایا جاتا ہے، ماں، باپ بڑی امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں...... میں نے اپنے والدین کی ساری امیدیں خاک میں ملا دی تھیں۔

مجھے گھر سے رخصت کرتے ہوئے میرے ماں، باپ، بہن اور بھائی مجھے جن نگاہوں سے دیکھ رہے تھے وہ کچھ اس قسم کی تھیں جیسے میرا جنازہ رخصت کر رہے ہوں...... میں اندر ہی اندر لرز گیا۔ ان کے لیے دوبارہ زندہ ہونا اب میری زندگی کا نصب العین تھا......

☆☆☆

ماورا کے گھر کا اوپر کا پورشن ہمارے لیے صاف ستھرا اور ٹھیک ٹھاک کر دیا گیا تھا۔ ماورا اب اس کو سجانے بنانے میں لگی ہوئی تھی اور مجھے اس سجاوٹ بناوٹ سے قطعی کوئی مطلب نہیں تھا...... وہ ہر روز کچھ نہ کچھ خرید کے لے آتی...... کبھی نئے پردے بنواتی تو کبھی کوئی نیا فرنیچر آ رہا ہوتا...... وہ داد وصول کرنے والے انداز سے مجھے دیکھتی اور میں کوئی دلچسپی نہ لیتا...... وہ جز بز ہو جاتی۔

گھر سیٹ کرنے کے بعد اس کا زیادہ وقت نیچے اپنے ماں، باپ کے ساتھ گزرنے لگا...... میں آفس سے آتا تو وہ نیچے بیٹھی سب کے ساتھ خوش گپیاں کر رہی ہوتی...... لاؤنج میں قہقہے بکھیر رہی ہوتی اور میں جل کے کباب ہو جاتا...... ان آٹھ دس دنوں میں اس کی صحت پہلے سے کہیں زیادہ اچھی ہو گئی تھی...... ہر وقت طبیعت کی خرابی کی شکایت کرنا اس نے بالکل چھوڑ دیا تھا...... وہ خوش تھی اور میں اداس...... میں اس کی نیچے موجودگی کو نظر انداز کر کے سیدھا اپنے پورشن کی طرف بڑھ جاتا...... مجھے دیکھ کر وہ لپک کے پیچھے آتی۔

''عامر نیچے رکیں ناں سب کے پاس...... بابا آپ کو پوچھ رہے ہیں۔'' وہ کہتی۔

''میں تھکا ہوا ہوں...... آرام کروں گا۔'' میں اپنے پیچھے اٹھنے والی نظروں کو نظر انداز کرتا ہوا زینہ چڑھ جاتا۔

کبھی وہ میرے پیچھے آ جاتی...... کبھی تھوڑی دیر کے بعد آتی مگر آتے ہی شکایت کرتی......

''عامر کتنا برا لگتا ہے...... وہ لوگ بیٹھے ہوتے ہیں اور آپ سلام دعا کے بغیر اس طرح اوپر آ جاتے ہیں۔''

''اس میں برا لگنے کی کیا بات ہے...... میری اپنی زندگی ہے مجھے جس میں آرام ملے گا میں اس طرح رہوں گا۔'' میں نے کندھے اچکائے۔

''اچھا...... سنڈے کو بابا ایک گیٹ ٹو گیدر رکھ رہے ہیں اس دن ذرا جلدی آ جائیے گا۔'' اس نے مصالحانہ انداز میں کہا۔

''سنڈے کو تو میرے ایک دوست کی شادی ہے...... اب تم تو اس حالت میں جاؤ گی نہیں، اس لیے مجھے ہی اکیلے جانا ہوگا۔ تم یہاں کا فنکشن اٹینڈ کر لینا۔'' میں نے ڈریسنگ روم میں گھستے ہوئے جواب دیا۔

باہر نکلا تو وہ بیڈ پر منہ لٹکائے بیٹھی تھی۔

''کھانے کے لیے چلیں۔'' اس نے مجھے دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

''کہاں......؟'' میں حیرت زدہ رہ گیا۔

''اصل میں آج میری طبیعت خراب تھی اس لیے میں نے کچھ نہیں بنایا۔ مما نے کہا کہ تم لوگ آج کھانا ہمارے ساتھ ہی کھا لو۔'' اس نے مجھے اطلاع دی۔

''دیکھو میں پچھلے آٹھ دنوں سے تمہارے ہاتھ کا بنا ہوا الٹا سیدھا جنک فوڈ زہر مار کر رہا ہوں...... ایک دو بار نیچے سے تمہارے لیے قورمہ، بریانی آ گئی تو وہ بھی میں نے برداشت کر لی...... مگر ایک بات میں تمہیں واضح بتا دوں کہ مجھے میرے گھر کا پکا ہوا، میری کمائی سے آیا ہوا سیدھا سادہ کھانا چاہیے۔ اس لیے آئندہ خیال رکھنا۔'' میں خفگی سے بولا۔

''حد ہو گئی میں برداشت کر رہی ہوں اور تم بڑھے ہی جا رہے ہو......'' وہ تنک کے کھڑی ہو گئی۔

''تو نہ کرو برداشت...... چیخو، چلاؤ جو مرضی آئے کرو...... میں نیچے جا کے کھانا نہیں کھاؤں گا۔'' میں بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔

"ماما، بابا کیا سوچیں گے، آج تو کھالو پھر نہیں کہوں گی۔" میری آواز بلند ہوتے دیکھ کر اس نے بہ مشکل اپنے غصے پر قابو پالیا۔

میرے گھر رہتے ہوئے اس کی حرکتوں کی وجہ سے جو دباؤ مجھ پر تھا کہ میرے ماں، باپ، گھر والے کیا کہیں گے اگر ماور کا چیخنا چلانا انہوں نے سن لیا تو...... اب وہی دباؤ ماورا کے اوپر تھا...... وہ اپنے گھر والوں کو سب اچھا ہے ہی دکھانا چاہتی تھی...... ماں، باپ سے زیادہ اس پر بھابی کا پریشر تھا جو ہر وقت ہمیں معنی خیز نگاہوں سے دیکھا کرتی تھیں۔

"ٹھیک ہے میرا کھانا اوپر لے آؤ۔ میں نیچے نہیں جاؤں گا......" میں نے اسے ایک اور آزمائش میں ڈال دیا اور خود آرام سے لیٹ کر ریموٹ سے ٹی وی آن کرلیا...... وہ چند لمحے بے بسی سے مجھے دیکھتی رہی پھر نیچے چلی گئی۔

☆☆☆

میرے ان سب کو نظر انداز کرنے کی حرکت بالآخر ساس صاحبہ اور سسر صاحب کی نگاہوں میں آگئی۔ ایک دن میں آفس سے واپس آیا تو وہ لوگ اوپر براجمان تھے۔

"بھئی ہم نے سوچا کہ تم مصروف ہو تو کیا ہوا...... ہم تو فارغ ہی ہیں، آج تم سے ملنے کو آگئے ہیں۔" سسر صاحب محبت سے گلے لگاتے ہوئے بولے۔

"جی بہت شکریہ......" میں ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

"جاب کیسی چل رہی ہے؟" رسمی سوالات کا آغاز ہوگیا۔

"بہت اچھی......" میں نے مختصر جواب دیا۔

"والدین ٹھیک ہیں۔" ساس صاحبہ گویا ہوئیں۔

"ٹھیک ہی ہوں گے......" میں نے ٹکڑا توڑ جواب دیا۔

"کیا مطلب...... تم وہاں گئے نہیں......؟" سسر صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

"جی نہیں...... کس منہ سے جاتا......" جملے کا اگلا حصہ صرف میں نے سوچا۔

"تمہیں جانا چاہیے تھا۔" ساس صاحبہ نے دریا دلی کا مظاہرہ کیا۔

"اصل میں ماما، یہ اتنے مصروف رہتے ہیں کہ وقت ہی نہیں ملتا۔" ماورا بیگم لوازمات کی ٹرالی کے ساتھ تشریف لاتے ہوئے بولیں۔

"یہ بات تو ٹھیک ہے بیٹا کہ تم مصروف رہتے ہو...... مگر کچھ وقت نکالو...... ماورا کے لیے، ہمارے لیے اور اپنے والدین کے لیے کہ سب تمہارے اپنے ہیں......" سسر صاحب نے چائے کی جگہ ساری چینی اپنے جملے میں ملادی۔

"جی بالکل...... آپ کہہ رہے ہیں تو ضرور جاؤں گا ان سے ملنے۔" میں نے سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔

"ارے پہلے ہم سے تو مل لیا کرو...... ہم تو تم سے زیادہ قریب رہتے ہیں......" ساس صاحبہ جلدی سے بولیں۔ جواب میں، میں انہیں صرف دیکھ کر رہ گیا۔

"آپ سے تو ایسا ملوں گا کہ یاد رکھیں گی۔" ماورا کی ضد میں اس کا ساتھ دینے والی یہی خاتون تو تھیں۔

☆☆☆

"آج چھٹی کا دن ہے کہیں باہر چلیں؟" اتوار کی صبح ماورا نے مسکرا کر پوچھا۔

"آج کا دن میں امی اور ابو کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں...... چلنا چاہو تو تم بھی چلو......" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر آئی مسکراہٹ ایک دم غائب ہوگئی۔

"وہاں کسی اور دن چلے جائیں گے...... آج تو......"

"نہیں وہاں آج ہی جائیں گے...... تمہیں شاید یاد ہوگا جب تم سسرال میں تھیں تو ہر اتوار اپنے میکے میں گزارا کرتی تھیں اور میں بھی سارے پروگرامز چھوڑ کے تمہارے ساتھ یہاں آجایا کرتا تھا۔" میں نے جتاتے ہوئے کہا۔

''تو تم اس کا بدلہ لو گے۔'' وہ خفگی سے بولی۔

''اس میں بدلے کی کیا بات ہے...... چیزوں نے اپنی جگہیں بدل لی ہیں مگر حقیقتیں تو اپنی جگہ ہی رہیں گی...... کل تمہارے تو آج میرے والدین منتظر ہیں۔''

''میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولی۔

''شوق سے مت جاؤ...... مگر میں تو جاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا اور الماری سے اپنے کپڑے نکال کر ڈریسنگ روم میں گھس گیا۔

میری تیاریاں دیکھ کر وہ منہ بنائے بیٹھی رہی اور میں نے بھی اس کی پروا نہیں کی...... اماں، ابا کے گھر پہنچا تو وہاں دوسرا امتحان تیار تھا۔

مجھے دیکھ کر سب کے چہروں پر خوشی کی جھلک نظر آئی جو کمالِ مہارت سے چھپالی گئی...... سب بظاہر سرد مہری سے ملے۔

ابا لاتعلقی سے اخبار میں منہ گھسائے بیٹھے رہے...... عاشر ضروری کام کا بہانہ کر کے باہر نکل گیا...... اماں اس قدر انہماک کے ساتھ بھنڈیاں کاٹنے میں لگی رہیں جیسے دنیا میں اس سے زیادہ اہم اور کوئی دوسرا کام نہیں رہا ہوگا...... البتہ عافیہ میرے لیے جھٹ پٹ میری پسند کی کڑک چائے بنا کے لے آئی...... میں نے شکر گزار نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ نظریں چرا گئی۔

مجھے اسی قسم کے استقبال کی امید تھی...... رویوں پر طاری اس جمود کو توڑنے کے لیے تو میں یہاں آیا تھا...... وہ پورا دن میں نے سب کو منانے میں گزار دیا...... جب واپس جانے لگا تو اس حد تک کامیابی ملی تھی کہ اماں مجھ سے باتیں کرنے لگی تھیں اور اپنی کاٹی ہوئی بھنڈیاں فریج میں رکھنے کے بعد عافیہ کو میرے لیے پلاؤ بنانے کا کہہ چکی تھیں...... سو اپنی پسندیدہ ڈش خوب پیٹ بھر کے کھائی...... اماں اور عافیہ سے گپیں لگانے اور اماں کے بیڈ پر لیٹ کر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں بڑی حد تک تازہ دم ہو چکا تھا۔ شام ڈھلے عاشر بھی واپس آ گیا مجھے وہیں پا کر حیران رہ گیا۔

اماں، ابا کا نارمل چہرہ دیکھ کر وہ بھی نارمل ہو گیا۔ رات کا کھانا سب نے مل کر کھایا...... پہلے دن اتنی کامیابی ہی بہت تھی...... ساڑھے گیارہ بجے جب قصرِ راحت پہنچا تو حسبِ روٹین دروازہ لاک اور لائٹس آف تھیں...... میرے پے در پے ہارن پر سالے صاحب سڑا ہوا منہ بنا کر دروازہ کھول گئے...... میں گنگناتا مسکراتا سیدھا اوپر چلا گیا۔

ماورا نہ جانے واقعی سو رہی تھی یا سوتی بن گئی تھی...... کمرے کی لائٹس آف تھیں اور وہ آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔

میں بھی شب خوابی کا لباس پہن کر بیڈ پر آ گیا۔

☆☆☆

کچھ دن اور سرک گئے۔ اس کے گھر والے مجھ سے قدرے اکھڑے، اکھڑے لگ رہے تھے۔ میں ان کی محبت کا جواب محبت سے جو نہیں دے رہا تھا۔ پھر وہ شام آئی جب میرے بیٹے نے اس دنیا میں آنکھیں کھولیں۔ سب کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔

اماں نے پوتے کو گود میں اٹھایا مگر ان کی آنکھوں میں خوشی سے زیادہ حسرت تھی۔ یہ وہ پوتا تھا جس کی چاہ وہ میرے روزگار سے لگنے کے فوراً بعد ہی کرنے لگی تھیں۔ مگر اس کو کھلانے کا ارمان پورا ہونا بظاہر ممکن نہیں تھا۔ ماورا کی اماں پورے استحقاق سے بیٹی کے قریب اور نواسے کو دبوچے بیٹھی مجھے ایک آنکھ نہ بھا رہی تھیں۔

ماورا اسپتال سے گھر واپس آ گئی اور بچے میں بری طرح مصروف ہو گئی۔ وہ اس کے چھوٹے، چھوٹے کاموں میں لگی رہتی اور میں حیران ہوتا کہ یہ وہی ماورا ہے جسے اپنی ذات کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

''عامر، پاپا کی طبیعت اتنی خراب ہو گئی آپ نے انہیں پوچھا تک نہیں۔'' ایک دن آفس سے آنے پر اس نے شکوہ کیا۔

''کیا ہو گیا انہیں؟'' میں نے حیران بن کر پوچھا۔ دو دنوں سے وہ مجھے گھر پر دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی گاڑی بھی گھر ہی پہ دکھائی دے رہی تھی

لیکن میں نے اس کی وجہ جاننے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

''اتنا زبردست فلو ہو گیا ہے انہیں...... اوپر سے بی پی شوٹ کر گیا تھا۔'' وہ تشویش کے عالم میں بولی۔

''فلو...... اوہ...... تو دیکھو یاسر کو ہرگز نیچے مت لے کر جانا...... فلو تو چھوت کا مرض ہے، اتنے چھوٹے بچے کو بالکل نہیں ہونا چاہیے۔'' اس نے حیرت کے عالم میں میری طرف دیکھا جیسے اسے مجھ سے اس جواب کی توقع ہرگز نہ رہی ہو۔

مجھے خود بھی اپنے آپ سے ایسے جواب کی امید نہیں تھی...... مگر کبھی، کبھی انسان اپنی امید کے خلاف بھی تو کچھ کر جاتا ہے۔

☆☆☆

ماورا کے بابا سچ مچ زیادہ بیمار ہو گئے...... ہاسپٹلائزڈ ہو گئے...... سارا گھر پریشان تھا...... سوائے میرے...... ایک دفعہ غیروں کی طرح جا کے انہیں اسپتال میں دیکھ آیا اور بس......

''آپ آفس سے کچھ دنوں کی چھٹی کر لیں۔'' ماورا روتے ہوئے بولی۔

''آفس سے چھٹی...... یہ ممکن نہیں بہت ضروری پروجیکٹ پر کام کر رہا ہوں......''

''میرے باپ کا آپ کو کوئی احساس نہیں۔'' وہ چیخی۔ ''آپ کے لیے آپ کی ذات اور کام زیادہ اہم ہیں...... کسی کی زندگی نہیں......؟'' وہ زور سے بولی۔

''آہستہ بولو...... نہیں تو مجھے بھی چیخنا آتا ہے۔'' میں بھی قدرے تیز آواز میں بولا۔

''یہ تم نے ہی مجھے سکھایا ہے کہ انسان کی ذات، اس کی پسند ناپسند، اس کا آرام سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے...... باقی دوسروں کی اس کی زندگی میں اہمیت اس کے بعد آتی ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ اپنا بریف کیس اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گیا...... یہ دیکھے بغیر کہ وہ بت بنی اپنی جگہ پر کھڑی ہوئی ہے۔

☆☆☆

''آپ کو مجھ پر غصہ ہے...... اس کا بدلہ میرے ماں، باپ سے تو مت لیں۔'' میں حسبِ عادت رات گئے دیر سے گھر واپس آیا...... وہ یاسر کے ساتھ جاگ رہی تھی...... مجھے کچھ دیر خاموشی سے دیکھتی رہی...... پھر بولی۔

''میں بہت تھکا ہوا ہوں...... کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔''

''کھانا تو کھا کر ہی آئے ہوں گے آپ؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔

''ظاہر ہے...... سسرال کے ٹکڑوں کی لالچ میں سارا کام چھوڑ کے گھر تو آنے سے رہا...... دیر سے آیا ہوں تو کھانا بھی کہیں زہر مار کر ہی لیا ہوگا۔'' میں نے ڈریسنگ روم کا دروازہ زور سے بند کرتے ہوئے جل کر جواب دیا۔ سلیپنگ سوٹ پہن کر باہر نکلا تو وہ رو رہی تھی۔

مجھے افسوس سا ہوا...... مگر میں منہ سے کچھ نہیں بولا اور بیڈ پر دوسری طرف کروٹ بدل کے لیٹ گیا...... اماں کا آج آفس میں فون آیا تھا۔

ابا کی طبیعت خراب تھی...... عاشران کا چیک اپ کروانے گیا تھا...... اماں سخت پریشان تھیں...... میں آفس سے سارا کام چھوڑ کر اماں کے بتائے ہوئے اسپتال پہنچ گیا...... ڈاکٹر نے بے شمار ٹیسٹ بتادیے تھے۔ عاشر اسی بھاگ دوڑ میں لگا تھا...... ابا مجھے دیکھ کر منہ سے کچھ نہ بولے مگر ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سا اطمینان اور سکون اتر آیا۔ عاشر بھی مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا...... ہم دونوں بھائیوں نے مل کر ابا کے سارے ٹیسٹ مکمل کروائے...... کچھ کی رپورٹس فوراً مل گئیں...... کچھ کی اگلے دن اور کچھ کی چار پانچ دنوں تک ملنے والی تھیں...... عاشر خود ڈاکٹر تھا...... ابا کی رپورٹس اس کی پیشانی کے بلوں میں اضافہ کر رہی تھیں۔

''کیا ہوا ہے؟'' میں نے اس سے آہستہ سے پوچھا۔

''دعا کریں...... باقی رپورٹس بہتر ہوں...... ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا......'' اس نے جیسے مجھے بہلانے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر زعیم ہارٹ اسپیشلسٹ اور عاشر کے میڈیکل کالج میں استاد بھی تھے۔ انہوں نے ابا کو کچھ ضروری دوائیں دے کر ایک ہفتے کے بعد آنے کو کہا۔ گھر کا راستہ سب نے خاموشی سے طے کیا...... عاشر کے پاس بائیک تھی، ابا کو وہ ٹیکسی میں لے کر آیا تھا...... واپس پر سب میرے ساتھ تھے...... مجھے یاد تھا جس دن میں نے یہ گاڑی لی تھی سب سے زیادہ خوش ابا تھے۔ ابا کی زندگی کا خواب تھا اپنی گاڑی خریدنا...... جس کی تعبیر انہیں میری گاڑی کی صورت میں ملی تھی۔

''ارے بھئی ہم نے تو جو کچھ کمایا اس سے شاید ایک ٹوٹی پھوٹی چھوٹی موٹی گاڑی خریدی جاسکتی تھی مگر میں ہوں ذرا عقل مند...... میں نے سوچا انویسٹمنٹ کر دیتے ہیں...... ایک انجینئر اور ایک ڈاکٹر پر...... دیکھو بھئی پہلی قسط منافع کی تو مل گئی۔'' انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''ابھی دوسری قسط دیکھتے ہیں کہ کب ملتی ہے۔'' وہ عاشر کو دیکھ کر مسکرائے۔

میں جانتا تھا ان کی خوشی گاڑی کی وجہ سے نہیں ہے...... وہ تو بس میری کامیابی پر خوش تھے...... نہ انہوں نے میری گاڑی کبھی چلائی اور نہ ہی ایک آدھ دفعہ سے زیادہ اس میں بیٹھے......بس مجھے کار چلاتا دیکھ کر خوش ہوا کرتے تھے۔

آج میرے برابر میں خاموش بیٹھے نہ جانے کیا سوچ رہے تھے۔ گھر واپس آکر اماں اور عافیہ کو تسلی دی۔ سب کے ساتھ کھانا کھایا...... ابا کو ان کی دوائیں کھلائیں اور اگلے دن آنے کا کہہ کر واپس ماورا کے گھر آگیا۔

میں نے اس کے والد کی خیریت تک دریافت نہیں کی...... وہ روتی رہی...... میں کڑھتا رہا اور نہ جانے کب نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

☆☆☆

میرے اس سرد رویّے کی وجہ سے ماورا کے گھر والے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگے...... میں نے ایک دن وقت ملنے پر نیچے جا کر انکل کی خیریت دریافت کی...... وہ اسپتال سے گھر واپس آچکے تھے...... آج کل گھر ہی میں آرام فرما رہے تھے......

''زندہ ہوں۔'' میرے پوچھنے پر مجھے گھور کے بولے۔

آنٹی سارا ٹائم منہ میں رس گلے بھرے چپ بیٹھی رہیں...... طویل خاموشی سے اُکتا کے میں وہاں سے اٹھ کے اپنے پورشن میں آگیا اور آکے ماورا سے اس کے والدین کے نازیبا رویّے کی شکایت کی۔

''اس میں آپ کا قصور ہے...... وہ تو سب آپ سے اتنی محبت کرتے تھے، آپ نے اپنا رویّہ دیکھا ہے ان کے ساتھ۔'' وہ تلملا کر بولی۔

''محبت کرتے تھے تو کرتے رہنا چاہیے ناں...... میری رویّے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو ویسے بھی داماد ہوں...... کوئی بہو تھوڑی ہوں۔'' میں نے معصوم بن کے کندھے اچکائے...... وہ مجھے گھورتی رہی مگر بولی کچھ نہیں۔

''اچھا آج اتوار ہے...... مجھے میرے میکے جانا ہے...... تم چلوگی ساتھ......؟'' میں نے اسے آفر کی۔

''جی نہیں...... آپ ہی جائیں اپنے میکے...... مجھے نہیں جانا......'' وہ چڑ کے بولی۔

''اچھا ٹھیک ہے...... مجھے اپنے میکے میں کام ہے تین چار دن وہیں رہوں گا۔'' میں نے ایک اور بم پھوڑا۔

''کیا؟'' وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی...... ''رہیں گے کیوں؟''

''رہ کیوں نہیں سکتا......لڑکیاں بھی تو مہینے، مہینے جا کے میکے رہتی ہیں...... میں چار دن رہ لوں گا تو کون سی قیامت آجائے گی۔'' میں نے بے نیازی سے کہا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ غصے سے بولی۔

''کیوں، ضرورت کیوں نہیں ہے...... میرے ابا بیمار ہیں...... اور پرسوں ان کا آپریشن ہے...... میرا وہاں رہنا ضروری ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''میرے ابا بیمار تھے تب تو ایک دن کی چھٹی بھی نہیں کی۔'' اس نے خفگی سے کہا۔

''اس لیے کہ وہ تمہارے ابا تھے اور یہ میرے ابا

ہیں۔'' میں نے جلتی پر تیل ڈالا۔

''اوہ...... ٹھیک ہے...... تو پھر آپ کا خاندان آپ کا اور میرا خاندان میرا۔'' وہ تنک کر بولی۔

''میرا خیال ہے کہ پچھلے ایک سال چار ماہ اور چھیالیس دنوں سے کچھ ایسا ہی ہے کہ تمہارا خاندان ہی تمہارا ہے۔ میرا خاندان تمہارا ابھی نہیں رہا۔'' میں نے الماری سے اپنے کپڑے نکال کر سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''میں اکیلی کیسے رہوں گی......'' وہ مجھے سوٹ کیس بھرتا دیکھ کر سراسیمگی کے عالم میں بولی۔

''اکیلی کیوں...؟ تمہارا سارا خاندان ہے ناں تمہارے ساتھ...... ایک میرے نہ ہونے سے تمہیں کون سی کمی ہوگی۔'' آخری جملہ ادا کرتے ہوئے میرا دل سچ مچ بھر آیا...... جسے چھپانے کے لیے میں باتھ روم میں گھس گیا۔

اگر میں نے ماورا سے سچ مچ اتنی زیادہ محبت نہ کی ہوتی تو شاید اس کا رویہ مجھے اتنی تکلیف بھی نہیں دیتا۔

☆☆☆

شکر تھا کہ ابا کا آپریشن کامیاب ہوگیا تھا لیکن انہیں ایک لمبے عرصے تک احتیاط کرنی تھی۔ گھر میں سب نے شکرانہ ادا کیا......

تیسرے دن ماورا بھی اپنے ماں، باپ کے ساتھ ابا کو دیکھنے آئی...... ابا کو آئی سی یو سے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔

انکل پہلے کی طرح تپاک سے ملے......

''بیٹا تم اتنے دن اتنے زیادہ پریشان رہے اور ہمیں کانوں کان خبر بھی نہیں ہونے دی۔'' انہوں نے بڑی اپنائیت سے کہا...... نہ جانے ماورا ان سے کیا کہہ کر انہیں لائی تھی۔

''بس انکل اب تو سب ٹھیک ہے۔'' میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''یاسر کو دو دن سے بخار ہے...... ماورا بھی بڑی پریشان ہے دو دنوں سے۔'' آنٹی نے مجھے اطلاع دی۔ بیٹے کی بیماری کا سن کر میں سچ مچ پریشان ہوگیا۔

''بخار کیسے ہوگیا؟'' میں ماورا کی طرف مڑا۔

''فلو نہیں ہوا ہے......'' وہ جل کے بولی۔

''ویکسینیشن کروائی تھی اس وجہ سے ہوا ہے۔''

''اوہ'' میں نے سکون کی سانس لی اور سیدھا ہوگیا۔

''تم کب تک واپس آجاؤ گے؟'' مسز جنید پہلو بدل کے بولیں۔ اصل پریشانی یہ تھی انہیں۔

''جب ابا گھر شفٹ ہو جائیں گے......'' میں نے ابا کے سرہانے لگے مانیٹر کو بغور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''اس میں تو ابھی کافی ٹائم لگے گا۔'' انہوں نے منہ ہی منہ میں کہا۔

''جی ہاں تقریباً ہفتہ تو لگ ہی جائے گا اگر فاسٹ ریکوری ہوئی تو......'' میں نے پلٹ کر کہا، وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔ ان کے میاں نے ان کو گھورا اور بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

''بالکل بیٹا، تم کو ابھی یہیں رکنا چاہیے بلکہ میں تو کہتا ہوں ماورا کو بھی تمہارے ساتھ تمہارے گھر میں رہنا چاہیے۔'' جنید انکل مجھ سے کہتے ہوئے ایک دم ماورا کی طرف مڑ کے بولے۔ ماورا اس اچانک حملے پر گڑبڑا گئی۔ میں نے زخمی نگاہوں سے ماورا کی طرف دیکھا جو اپنے بابا کی بات سنی ان سنی کر کے اپنے موبائل کی اسکرین پر خدا جانے کیا تلاش کر رہی تھی...... مجھے ماورا کا جواب مل چکا تھا اور مجھے اس جواب کے علاوہ اور کسی بات کی امید بھی نہیں تھی......

''شاید وہ دن کبھی نہ کبھی تو آئے جب تمہیں اپنی غلطی اور اپنے رویے کی بدصورتی کا احساس ہو...... اور تب تک...... مجھے تمہیں یہ احساس دلانے کی کوشش کرنی ہی پڑے گی۔'' میں نے دل، دل میں کہا۔

☆☆☆

میں تقریباً پندرہ دنوں کے بعد ماورا کے گھر واپس پہنچا...... میں تو واپس جانا ہی نہیں چاہ رہا تھا مگر

اماں نے مجھے واسطے دے، دے کر واپس بھیجا۔

''تمہارا بیٹا ہے وہاں...... تم کو اس کے لیے جانا ہوگا۔ شریف مرد ہر حال میں گزارہ کرتے ہیں۔ نہ تمہارا گھر خراب ہو اور نہ ہی خاندان میں بدنامی ہونی چاہیے۔'' وغیرہ وغیرہ ایک شادی کر کے مرد کے اوپر کتنے پریشر آجاتے ہیں...... یہی پریشرز عورت کے اوپر بھی آتے ہیں مگر وہ صنفِ نازک ہونے کا فائدہ اٹھاتی ہے۔ عورت روئے تو سب وجہ جانے بغیر اس کے آنسو پونچھنے کو آگے بڑھتے ہیں...... مرد کو تو رونے کا الاؤنس ہی نہیں ملتا اور جو اگر کبھی رونے کی غلطی کر بیٹھے تو سب اس پر ہنستے ہی ہیں۔ آنسو کوئی نہیں پونچھتا...... مردوں کے آنسوؤں کو مگر مچھ کے آنسو سے زیادہ اہمیت ہی نہیں دی جاتی۔

ابا تیزی سے روبصحت تھے...... گھر شفٹ ہو چکے تھے...... میں نے اس عرصے میں دل و جان سے ماں باپ کی خدمت کی...... ایسی خدمت تو شاید زندگی میں پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ شاید اس خدمت کے پیچھے مجھے ان کو چھوڑ کر جانے کا احساس تھا...... اور یہ احساسِ جرم مجھے اپنے کیے کی تلافی پر اکسا رہا تھا۔

ابا مجھ سے راضی ہو چکے تھے۔ اماں تو خیر موم کی بنی ہوئی تھیں میری ذرا سی محبت کی آنچ بھی انہیں پگھلا دیا کرتی تھی...... عافیہ اور عاشر بھی پہلے کی طرح بے تکلفی سے ہنسنے بولنے لگے تھے...... ساری دوریاں مٹ چکی تھیں۔ میں جلدی آنے کا کہہ کر بجھے دل سے واپس آگیا۔

ماورا نے سارے گھر کو سجایا ہوا تھا...... بیڈ روم میں تازہ، تازہ پھول مہک رہے تھے...... خود ماورا بھی خوب سجی سنوری تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکرا کے میرے قریب آگئی۔

''کیسے ہو؟'' اس کا لہجہ نرم تھا۔

''ٹھیک ہوں اور تم......؟'' میں اس پر نظر ڈالتے ہوئے بیٹے کے کاٹ کی طرف آگیا جو جاگ رہا تھا اور قلقاریاں مار رہا تھا۔

میں نے جھک کر اسے اٹھالیا...... وہ میرے چہرے کو بغور دیکھنے لگا۔ ماورا بھی میرے نزدیک چلی آئی۔

میں ماورا کو نظرانداز کر کے بیٹے کو کھلانے لگا......

مجھے دیکھ کر اس کے معصوم چہرے پر جو مسکراہٹ ابھری تھی اس نے میری زندگی کی آدھی تھکن دور کر دی تھی۔ وہ معصوم سا بچہ نہ جانے کیوں مسکرا رہا تھا۔ ہوسکتا ہے اسے اس بات کی پہچان ہو کہ میں اس کا باپ ہوں۔ خون نے جوش مارا ہو یا پھر میرے کھلانے اور... گدگدانے پر مسکرایا ہو۔ میں کچھ دیر بیٹے سے کھیلتا رہا...... اسے ہنساتا رہا...... ماورا مجھے خاموشی سے دیکھتی رہی...... پھر یاسر کو نیند آنے لگی اور وہ دھیرے، دھیرے سو گیا۔

میں نے آہستہ سے اسے کاٹ میں لٹادیا۔

''تم فریش ہو جاؤ...... میں کھانا نکالتی ہوں......'' ماورا مجھے دیکھ کر بولی۔

''نہیں، کھانا تو میں کھا کر آیا ہوں...... بس چینج کر کے سوؤں گا...... کل آفس بھی جانا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''آج جلدی کھانا کھالیا......؟'' اس نے گھڑی پر نظر ڈالی جہاں ساڑھے نو بج رہے تھے۔

''ہوں...... آج اماں نے میری پسند کا پلاؤ بنایا تھا اس لیے کھائے بغیر رہ نہ سکا۔'' میں نے اسے جتاتے ہوئے کہا۔

''اچھا......'' اس نے مایوسی سے کہا۔ اور میرے قریب بیٹھ گئی۔

میں نے ایک طائرانہ نگاہ کمرے پر ڈالی...... اے سی...... کی ہلکی، ہلکی خنکی، مدھم مدھم روشنی اور پھولوں کی مہک نے ایک عجیب سا رومانوی ماحول بنا دیا تھا۔ یوں جیسے حجلۂ عروسی ہو...... مجھے اپنا حجلۂ عروسی یاد آگیا...... وہ کمرا جو سارے گھر والوں نے محبت سے مل کر میرے اور ماورا کے لیے سجایا تھا...... اب لاکڈ پڑا تھا...... میرے وہاں جانے پر اماں نے اس کمرے کو کھولنا چاہا مگر میں نے منع کر دیا...... ماورا کے بغیر وہاں قدم بھی رکھنا میرے لیے

دشوار تھا...... وہ کمرا تو آباد ہی ماورا کے دم سے تھا...... میں جتنے دن بھی رہا ابا کے ساتھ ان کے کمرے میں ہی رہا...... ان کے بیڈ کے برابر نیچے قالین پر اپنا بستر لگا کے سوتا رہا...... وہ ناراض ہوتے، منع کرتے مگر میں نہ سنتا...... عاشر بھی نیچے آگیا تھا...... اماں اور عافیہ بھی دیر تک وہاں بیٹھی رہتیں...... رونق لگی رہتی۔

''تمہیں یاد ہے آج سے کچھ عرصے پہلے ایک اور کمرا بھی اسی طرح پھولوں سے مہکا کرتا تھا۔'' میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

وہ کچھ نہ بولی۔

''وہ کمرا تمہارے اس کمرے کے جتنا بڑا اور خوب صورت نہیں تھا مگر وہ ہمارے گھر کا سب سے اچھا اور بڑا کمرا تھا...... اس کمرے میں میرے ماں، باپ رہا کرتے تھے مگر میری شادی کے وقت انہوں نے وہ کمرا اس بہو کے نام کر دیا تھا جسے وہ پورے مان اور محبت کے ساتھ گھر میں لا رہے تھے...... میں نے وہاں اٹیچڈ باتھ روم بنوایا تھا تاکہ تمہیں تکلیف نہ ہو...... عاشر نے نہ جانے کہاں، کہاں سے پیسے بچا کے اکٹھا کر کے اس کمرے کو اے سی کا تحفہ دیا تھا کہ بھابی آرام سے گرمیوں کے دن گزار سکیں۔ وہ کمرا ایسا تھا جہاں ہوا کا گزر سب سے زیادہ تھا۔ کھڑکی کے پاس چھوٹے سے باغیچے میں جہاں کیاریوں میں اماں نے گلاب، موتیے اور رات کی رانی کے پودے لگوائے تھے ان پھولوں کی خوشبو اس ہوا کے ساتھ کمرے میں آتی تھی اور پورا کمرا مہک جاتا تھا...... تم نے شاید وہ کھڑکی کبھی کھولی ہی نہیں...... اس لیے تم اس خوشبو سے محروم ہی رہ گئیں......'' میں جیسے کسی ٹرانس میں بولے جا رہا تھا۔

میں نے اس پر ایک نظر ڈالی...... وہ خاموش کھڑی تھی۔

میں بیڈ کے کنارے ٹک گیا اور اپنے جوتے اتارنے لگا۔

''تمہارا رویہ روز بروز مشکل ہوتا جا رہا ہے...... مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں ہو کیا گیا ہے......'' وہ میرے نزدیک آ کے بیٹھ گئی۔

میں نے اس کا جملہ نظر انداز کر کے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جب ایک متوسط خاندان اپنے گھر میں بہو لا رہا ہوتا ہے اور بہو بھی وہ، جو اس سے بڑے گھر سے آ رہی ہو تو وہ اسے عزت، محبت اور اس گھر کے مالکانہ حقوق دیتے ہوئے اپنے گھر کی زینت بناتا ہے...... تو ایسے میں اس بہو کو کیا کرنا چاہیے؟ تمہارا کیا خیال ہے اس بارے میں؟'' میں نے بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

''دیکھو عامر...... میری اپنی زندگی ہے، اسے میں اپنے انداز میں گزارنا چاہتی ہوں۔ مجھے کسی سے کوئی مسئلہ نہیں ہے مگر میں کسی دوسرے کی خوشی کے لیے اپنی زندگی کو بدل نہیں سکتی......'' وہ کچھ دیر سوچتی ہوئی بولی۔

''بات تو ٹھیک ہے...... مگر دوسری بات یہ بھی ہے کہ جب تم کسی کی خوشی کی خاطر خود کو نہیں بدل سکتیں تو کوئی دوسرا بھی تمہاری خوشی اور مرضی کے لیے اپنی قربانی کیوں دے...... بہر حال میری پروموشن ہوگئی ہے اور میں اگلے ہفتے دبئی برانچ آفس کا چارج سنبھالوں گا......'' میں نے تکیے پر سر رکھتے ہوئے آرام سے کہا۔

''کیا......؟ تم دبئی جا رہے ہو...... اور مجھے ابھی بتا رہے ہو......؟'' وہ حیرت زدہ رہ گئی...... ''اور میرا کیا ہوگا...... مجھے ساتھ لے کر جاؤ گے؟'' وہ ایک سیکنڈ کے بعد دوبارہ بولی...... اس بار لہجے میں پریشانی تھی۔

''تمہاری مرضی ہے...... یہاں رہنا چاہو تو یہیں رہ لو...... اماں، ابا کے گھر تو رہو گی نہیں...... ہاں ایک کام کر لینا کہ اپنا سامان وہاں سے منگوا لینا...... تین ماہ کے بعد عاشر کی شادی اور عافیہ کی رخصتی ہے...... وہ کمرا اماں، عاشر کی بیوی کو دینا چاہ رہی ہیں۔'' میں نے اسے ایک اور اطلاع دی۔

''عاشر کا رشتہ طے ہو گیا؟'' اس نے حیرت سے

پوچھا۔ عافیہ کا نکاح تو چند سال قبل ہمارے پھوپی زاد سے ہوا تھا جو انگلینڈ میں تعلیم مکمل کرنے کی غرض سے مقیم تھا۔

''ہاں اصل میں عافیہ کی رخصتی کرنی تھی...... ابا کی علالت کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ عاشر کی جلدی شادی کردی جائے تاکہ اماں، ابا گھر میں اکیلے نہ رہیں کوئی ان کی خدمت کے لیے ان کے پاس ہو۔'' میں نے یاسر کے ننھے ہاتھوں پر آہستگی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا جو بے خبر سو رہا تھا۔

''میں، وہاں ہوتی تو پھر عاشر کو کون سا کمرا دیتے وہ لوگ......'' وہ تنک کر بولی۔

''تو شاید اتنی جلدی عاشر کی شادی ہی نہ کرتے...... پہلے اوپر کی منزل مکمل کرواتے پھر یہ نیک کام کرتے...... لیکن خیر یہ چھوڑو کہ ایسا ہوتا تو کیا ہوتا ویسا ہوتا تو کیا ہوتا...... یہ دیکھو کہ ہو کیا رہا ہے......'' میں نے ٹکا سا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''تم مجھے اپنے ساتھ دبئی کیوں نہیں لے جاتے......'' اس نے پہلو بدلتے ہوئے سوال کیا۔

''دیکھو یہ اتنی جلدی ممکن نہیں ہوگا...... پہلے مجھے وہاں سیٹل تو ہونے دو......'' میں نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔

''تم کسی چھوٹی موٹی نہیں بلکہ ایگزیکٹو پوسٹ پر جارہے ہو، تمہیں تو فوراً ہی رہائش مل جائے گی پھر فیملی نہ لے کر جانے کا مطلب......؟'' اس نے جرح کی۔

''دراصل میں ابھی یہ طے نہیں کر پا رہا ہوں کہ تم میرے ساتھ خوش بھی ہو یا نہیں...... تم اپنے پیاروں کو چھوڑ کے میرے ساتھ جانا پسند کرو گی یا نہیں...... میرا مطلب ہے کئی سوال تھے میرے ذہن میں اور وقت کم تھا اس لیے فی الحال میں نے وہاں اکیلے آنے کی اطلاع دی ہے۔ تم بھی سوچ لو اور پھر فیصلہ کرو......'' میں نے آنکھیں موندتے ہوئے کہا۔

''تم کیا سمجھتے ہو دبئی جانے کے لیے میں تمہاری محتاج ہوں......؟ کئی دفعہ جا چکی ہوں اور اب بھی اپنے خرچے پر جاسکتی ہوں...... تم بے شک مت لے

فرحانہ ناز ملک کی برسی

جانے والا سب کے دل کو توڑ جاتا ہے
جو جاتا ہے وہ رنگ اپنا چھوڑ جاتا ہے
یاد کرے جب ایک تو دو جا دوڑ جاتا ہے
دل کو دل سے راہ ہے دل ہر موڑ جاتا ہے

بے شک میں نے فرحانہ ناز کو کبھی نہیں دیکھا لیکن وہ مجھے نظر آرہی ہے۔ کتنی ہی محبتیں تو وہ ساتھ لے گئی ہے اور کتنی ہی یہاں چھوڑ گئی ہے۔ یہ اس کی خوش اخلاقی کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ آج اس کو گئے ایک سال ہوگیا ہے مگر وہ ہم میں موجود ہے۔ وہ مجسم اپنے بچوں کی زندگی میں شامل رہے گی اور رہنمائی بھی کرے گی کہ پیار کرنے والے ہر جگہ سے حاضری دے سکتے ہیں۔

فرحانہ تجھے سلام

شاعرہ: کوثر خالد، جڑانوالہ

جاؤ مگر میں تمہیں وہاں جا کے دکھا سکتی ہوں...... کسی بھی ہوٹل میں آرام سے کئی دن رہ سکتی ہوں۔'' وہ چبا چبا کر بولی۔

''اوہ...... یقیناً شوق سے...... ضرور جاؤ...... بلکہ دبئی کیا امریکا اور کینیڈا بھی ہو آؤ...... نو پرابلم......'' میں ایک جھٹکے سے اٹھ کے بیٹھ گیا اور اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''یو نو واٹ...... جب تمہارا رشتہ آیا تھا تو سب نے منع کیا تھا کہ کوئی جوڑ نہیں...... تمہارے اور ہمارے اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے...... مگر بابا...... وہ نہیں مانے وہ تمہاری قابلیت...... وجاہت اور خاندانی شرافت سے متاثر تھے اور انہوں نے سب کو منا لیا...... اور میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے کہ میں مان گئی......'' وہ کندھے اچکا کے اور آنکھیں گھما کے طنز سے بولی۔ اس کی بات پر میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

''اوہو...... ایک بات تو رہ گئی...... تمہارے بابا میری ان چیزوں سے متاثر ہوتے کے ساتھ، ساتھ تمہاری بد لحاظی اور بد زبانی سے پریشان بھی

تھے...... تمہارے دو رشتے تمہاری ان ہی کوالیٹیز کی وجہ سے ختم ہو چکے تھے۔ انہیں لگا کہ میں اس سچویشن میں تمہارے لیے بالکل فٹ رہوں گا...... میں اور میرا خاندان تمہارے سامنے زبان تک نہیں کھولیں گے اور کچھ ہی عرصے میں تم بہلا پھسلا کر یا لالچ دے کر مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر تک لے آؤ گی اور پھر راوی آگے تم سب کے لیے سکھ ہی سکھ لکھتا رہے گا۔'' میں نے اس کے کندھوں پر اپنے ہاتھ کا دباؤ سخت کر کے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

وہ ایک دم گڑبڑا گئی......

''تمہیں کیسے معلوم ہوا...... کیا عرشیہ بھابی نے بتایا؟'' اس کا ذہن عرشیہ بھابی کی طرف مڑ گیا......

''نہیں، تمہاری بھابی بیچاری تو میرے سامنے ہی کم آتی ہیں...... وہ کیا بتائیں گی، میری معلومات کے ذرائع اور بھی ہیں...... جیسے ایک بہو سسرال میں آتی ہے تو وہاں کے راز از خود اس پر آشکار ہو جاتے ہیں...... ویسے ہی ایک داماد جب گھر داماد بن جاتا ہے تو بہت کچھ اس کے کان میں پڑ ہی جاتا ہے۔'' وہ میرے ہاتھوں کے دباؤ سے اپنے کندھے آزاد کرنے کی کوشش کرنے لگی......

''چھوڑو مجھے۔'' ناکام ہو کے چلائی۔

''دل تو یہی چاہتا ہے۔'' میں نے دل میں کہا۔

''تمہیں ایک موقع دیتا ہوں...... سدھر جاؤ...... رشتوں کی اہمیت کو سمجھو......'' میں نے ایک دم اس پر سے ہاتھ ہٹا لیا...... وہ اپنے زور میں لڑکھڑا گئی۔ ''یہ جو شادی سے بنائے ہوئے رشتے ہوتے ہیں ناں ان کی واقعی کوئی حیثیت نہیں ہوتی...... نہ شرعی...... نہ قانونی...... یعنی ساس، سسر، دیور، جیٹھ، نند، سالا اور سالی...... صرف میاں بیوی کے رشتے کی شرعی اور قانونی حیثیت ہوتی ہے...... لیکن یہ رشتے کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی خود بخود اتنے نزدیک چلے آتے ہیں کہ بسا اوقات خون کے رشتے بھی پیچھے رہ جاتے ہیں...... صبح شام کا ساتھ ہو جاتا ہے ان کے ساتھ، اکٹھا کھانا پینا رہنا سہنا ہو جاتا ہے...... خود ہی سوچو کیا ہر وقت ساتھ رہنے والے ان رشتوں سے نفرت کر کے کوئی سکھ سے رہ سکتا ہے......؟'' میں نے تھوڑا نرم لہجہ رکھا۔

''میں مانتا ہوں کہ ان سے فوری طور پر محبت ہو ہی نہیں سکتی...... بسا اوقات ان رشتوں کو محبت کبھی نصیب نہیں ہوتی...... کوئی بات نہیں، یہ کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں، محبت ہو جائے تو اچھا نہیں ہو سکے تو نہ سہی...... برداشت تو ہو سکتی ہے ناں...... تھوڑا سا دکھاوا ہی ہو سکتا ہے ناں......'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا...... وہ خاموش رہی۔

''اگر گھر کا ماحول اچھا رکھنے کے لیے، اپنے شوہر کو مطمئن رکھنے کے لیے اور دنیا کو انگلیاں اٹھانے سے روکنے کے لیے عورت سسرال میں سسرالیوں کے ساتھ محبت نہ سہی تھوڑا سا محبت کا دکھاوا بھی کرلے، تھوڑے سے خلوص کا مظاہرہ ہی کرلے تو میرے خیال میں وہ بھی بہت ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''میں دکھاوا نہیں کر سکتی۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

''دکھاوا میں بھی نہیں کر سکتا تھا مگر کر رہا ہوں...... ورنہ میرا تو دل چاہتا ہے کہ تمہارے باپ اور بھائی کو کھری کھری سناؤں۔'' میں آج تمام حساب بے باق کرنے کے موڈ میں تھا۔

''کیا مطلب......؟ انہوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے...... تم ان سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہو؟'' وہ ٹھٹکی۔

''بگاڑا تو شاید میرے گھر والوں نے بھی تمہارا کچھ نہیں تھا مگر وہ لوگ بھی تمہیں خواہ مخواہ برے لگتے تھے......'' میں نے کندھے اچکائے۔

''تم نے تو ایک دن بھی یہ کوشش نہیں کی کہ میرے گھر والوں کو محبت نہ سہی عزت اور احترام کے لائق ہی سمجھ لو...... جس طرح ایک عورت کو اس کے والدین اور بہن، بھائی بہت عزیز ہوتے ہیں اسی طرح ایک مرد بھی اپنے گھر والوں کے لیے وہی جذبات رکھتا ہے۔ فرق بس اتنا ہوتا ہے کہ عورت ماں، باپ سے جدا ہو کر ان کے لیے پہلے سے زیادہ بے قرار ہو جاتی ہے

اور مرد شادی کے بعد اپنے گھر میں اپنے والدین کے ساتھ رہتے ہوئے وہ بے قراری محسوس نہیں کر پاتا...... لیکن تم نے مجھے اس بے قراری سے آشنا کر دیا۔ اس کے لیے تمہارا شکریہ......" میں طنزیہ انداز میں بولا۔

"تو یوں کہو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے ہی نہیں...... صرف اپنے والدین کا خیال ہے۔" وہ خفگی سے بولی۔

"مجھے تمہیں یہ احساس یا یقین دلانے کی اب ضرورت ہی نہیں کہ میں نے تم سے کتنی محبت کی ہے...... لیکن تمہاری ضد اور میرے گھر والوں سے بے جا نفرت نے شاید میرے دل سے تمہاری محبت اور تمہارے گھر والوں کی عزت باہر نکال دی۔" میں نے کندھے اچکائے۔

"محبت ایک دفعہ ہو جائے تو کبھی دل سے نہیں جاتی......" اس نے کتابی فقرہ ادا کیا۔

"جھوٹ...... ایک دم بکواس...... محبت ایسی کوئی ماورائی شے نہیں ہے جو ایک دفعہ ہو جائے تو دائمی ہو...... انسانی احساسات اور جذبات وقت اور حالات کے زیرِ اثر بدلتے رہتے ہیں...... نفرت شاید محبت میں تبدیل ہونے میں کافی وقت لے لے مگر محبت کو نفرت میں بدلنے کے لیے صرف چند لمحے درکار ہوتے ہیں۔ محبت اور نفرت کا یہ کھیل تمام زندگی جاری رہتا ہے، دونوں میں سے کوئی کیفیت بھی مستقل نہیں ہوتی۔ سامنے والے کا رویہ اس سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔" میں نے کافی گہری بات کی تھی جو میرے لیے اپنی زندگی کا نچوڑ تھی۔

"اگر اولاد ناخلف، نالائق اور اذیت دینے والی ہو تو پیٹ سے پیدا کرنے والی ماں بھی بیزار ہو جاتی ہے، چڑنے لگتی ہے، ہو سکتا ہے محبت تب بھی کرتی ہو مگر وہ محبت اس وقت تک کے لیے سو جاتی ہے جب تک کہ کوئی جوار بھاٹا نہ آئے۔ باقی کے رشتے اس استثنا سے عاری ہیں محترمہ...... ورنہ بھائی، بھائی کا خون نہ کرتا...... باپ، بیٹے کو گھر سے نہ نکالتا...... بیٹی، ماں، باپ کو ذلیل کر کے گھر سے نہ بھاگتی...... یہ دنیا ہے میڈم...... جب خون کے رشتے بیگانے ہو سکتے ہیں تو بنائے ہوئے رشتے کیوں نہیں۔"

"تم کیا چاہتے ہو آخر......؟" وہ تھک کر بولی۔

"کچھ نہیں، میرے چاہنے کا وقت گزر چکا...... اب صرف ذمے داری باقی رہ گئی ہے۔ تمہاری اور اپنے بیٹے کی...... وہ میں نبھاؤں گا...... تمہیں تمہاری اسٹینڈرڈ کی زندگی دینے کے لیے کماؤں گا...... اپنے بچے کو اچھی زندگی دینے کے لیے خود کو داؤ پر لگا دوں گا تاکہ کچھ سالوں کے بعد اسے میری طرح اپنے گھر، اپنی حیثیت پر شرمندہ نہ ہونا پڑے۔"

"تو گویا...... تمہیں مجھ سے محبت ہے ہی نہیں......" اس نے آخری حربہ استعمال کیا۔

"ہو سکتا ہے کہ اب نہ رہی ہو...... مگر تم کو تو مجھ سے محبت کبھی تھی ہی نہیں...... تو پھر کیا، کیا جائے......" میں نے دوبارہ بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

وہ خاموشی بیٹھی رہی۔

"ہائے محبت......" میں نے آہ بھری۔ "اب تو شاید دنیا ہی سے اٹھتی چلی جا رہی ہے...... ایک نفسانفسی کا عالم ہے...... کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں، سب اپنے اپنے بکھیڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں...... ہاں تو صحیح ہے جب کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا، جب کوئی کسی سے محبت بھی نہیں کرے گا تو پھر سب کو اپنے سارے کام خود کرنے پڑیں گے اور محبت بھی خود ہی اپنے آپ سے کرنی ہوگی...... تو سوچ رہا ہوں کہ اب خود سے محبت کر کے دیکھوں...... دیکھوں تو کیسا لگتا ہے۔" میرا جملہ بظاہر طنزیہ تھا مگر دل کرچی کرچی ہو رہا تھا۔

وہ بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔

"سو جاؤ بہت رات ہو گئی ہے۔" میں نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا وہ پھر بھی یوں ہی بیٹھی رہی۔

رات گزرتی رہی۔ میں اور وہ دونوں جاگ رہے تھے مگر ہمارے درمیان خاموشی تھی۔ فاصلے تھے اور شکایتیں تھیں۔

☆☆☆

"کل رات گاڑی اندر لاتے ہوئے تمہارے ابا کی گاڑی سے ٹکرا گئی ہے۔ بمپر ٹوٹ گیا ہے ان کی کار کا۔" میں نے صبح تیار ہوتے ہوئے اسے اطلاع دی۔

"اور تم مجھے اب بتا رہے ہو۔" وہ یاسر کو فیڈ کروا رہی تھی چونک کے بولی۔

"رات کو بتا دیتا تو تم کیا کر لیتیں؟ اب اپنے خاندانی مکینک کو بلا کر ٹھیک کروا لینا......" میں نے بیزاری سے جواب دیا۔

"ایسا لگتا ہے جیسے تم اس گھر میں رہ تو رہے ہو مگر سب سے انتقام لیتے ہوئے۔" اس نے یاسر کو بیڈ پر لٹاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"داماد ہو یا بہو...... اپنے گھر میں کسی دوسرے کو جگہ دینا اور رکھنا پھر اس کی حرکتوں کو برداشت بھی کرنا یقیناً بڑے ہی صبر وضبط کا کام ہے۔" میں نے فوراً اس کی تائید کی۔

"خیر اب تو کچھ ہی دنوں کی بات ہے...... میرے بوجھ سے تمہارے گھر والوں کو نجات مل جائے گی۔" میں نے خود پر اچھی طرح پرفیوم چھڑکتے ہوئے بے نیازی سے اگلا جملہ ادا کیا۔

"تم آخر چاہتے کیا ہو؟" وہ تنک کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"پہلے تو تمہیں چاہتا تھا...... اب نہ جانے کیا چاہتا ہوں۔" میں نے کندھے اچکائے۔

"میں تمہارے ساتھ دبئی جا رہی ہوں۔ کان کھول کر سن لو......" وہ تیز لہجے میں بولی۔

"سبحان اللہ کیا انداز ہیں...... اپنی بات منوانے کے لیے لہجے کو شیریں اور الفاظ کو نرم رکھنا ضروری ہوتا ہے...... آپ شاید اس سے بھی واقف نہیں۔" میں نے اسے سامنے سے ہٹاتے ہوئے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا...... میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا مگر مجھے یقین تھا کہ وہ اسی جگہ بے بسی سے کھڑی ہوگی۔

☆☆☆

کہانی میں ہلکا سا ٹوئسٹ تھا...... میں نے ماورا کو جو کچھ بتایا سب سچ تھا، بس معمولی سے فرق کے ساتھ...... یعنی میں دبئی جا رہا تھا...... میری پروموشن بھی ہوئی تھی بس فرق صرف اتنا ہی تھا کہ وہاں میرا ٹرانسفر نہیں ہوا تھا بس ایک ماہ کا ڈیپوٹیشن تھا۔

عافیہ کی رخصتی اور عاشر کی شادی بھی یقیناً تین ماہ کے بعد ہی تھی۔ اور عاشر کو میرا کمرا ابھی دیا جانے والا تھا کیونکہ میں اوپر کا نامکمل پورشن مکمل کروانے جا رہا تھا...... اسے جدید انداز میں بنوانے کے لیے مجھے کافی پاپڑ بیلنے پڑے...... کام کا آغاز ہو چکا تھا اور میں اس سلسلے میں تن من دھن سے لگا ہوا تھا...... مجھے اس مسئلے کا یہی حل نظر آیا تھا کہ ماورا کو اس کے مزاج کے مطابق ایک عدد گھر سیٹ کر کے دے دیا جائے۔ جہاں وہ بھی خوش رہے اور اطمینان سے یاسر کی پرورش کر سکے اور میں بھی اپنے والدین کے نزدیک رہ کر ان کی خدمت کر سکوں...... سب سے بڑھ کر اپنے گھر میں عزت سے سر اٹھا کے رہ سکوں...... گھر دامادی کے ذلت آمیز لیبل سے نجات حاصل کر سکوں...... ویسے بھی اب بات میری یا ماورا کی نہیں تھی...... بلکہ یاسر کی تھی اور یاسر کی شخصیت کی بہترین تعمیر اور اس کی خود اعتمادی کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس گھر میں ہوش سنبھالے جو اس کے باپ کا ہو۔

مجھے یقین تھا کہ ماورا میرے اس فیصلے سے انحراف نہیں کرے گی...... اتنی سمجھ تو اب تک اسے بھی آ ہی چکی ہوگی۔

بس اب مسئلہ صرف یہ تھا کہ میں یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ اسے اس ایک ماہ کے لیے اپنے ساتھ دبئی لے جاؤں یا نہیں؟ لے کر جاتا ہوں تو شاید ماحول کی تبدیلی سے محترمہ کے مزاج پر اچھا اثر پڑے...... اور نہ لے کر جاؤں تو شاید میری زندگی تھوڑی آسان رہے...... لے کر جاؤں یا نہیں......؟ ویسے آپ کا کیا خیال ہے......؟

اختر شجاعت

صبر...... رضائے الٰہی

اے میرے معبود! میں تیری تسبیح کرتا ہوں، تو مجھ پر کرم بالائے کرم فرما...... بارِ الٰہا! میں تیری تسبیح کرتا ہوں اور تو بلند و برتر ہے...... اور عزت تیرا ہی جامہ ہے اور عظمت تیری ہی ردا ہے...... کبریائی تیری دلیل و حجت ہے جو کچھ تہ خاک ہے تو اسے سنتا اور دیکھتا ہے۔ تیری ذات ہر راز دارانہ گفتگو سے مطلع ہے...... پاک ہے تو اے وہ جس سے بڑی سے بڑی امیدیں باندھی جاتی ہیں...... جو کچھ پانی کی گہرائی میں ہے اسے تو دیکھتا ہے۔ (تیری ذات) تو سمندروں کی گہرائیوں میں مچھلیوں کے سانس لینے کی آواز سنتا ہے...... تیری ذات، پاک اور منزہ ہے میں تیری تسبیح کرتا ہوں...... تعجب ہے کہ جس نے تجھے پہچانا وہ کیونکر تجھ سے خوف نہیں کھاتا۔

اے اللہ! میں حمد و ثنا کے ساتھ تیری پاکیزگی بیان کرتا ہوں۔ پروردگار! حضرت محمد مصطفیٰؐ اور ان کی آل پر سب رحمتوں سے افضل و برتر رحمت نازل فرما...... وہ جو برگزیدہ معزز و گرامی اور مقرب ہیں ان پر اپنی کامل ترین برکتوں کا اضافہ فرما...... ان پر اور ان کی آلِ پاک پر ایسی پسندیدہ رحمت نازل فرما جس سے بالاتر کوئی رحمت نہ ہو...... آمین!

☆☆☆

صبر کے لغوی معنی ہیں...... برداشت، تحمل، قناعت...... مزید صبر کے معنی باندھنے اور روکنے کے ہیں...... قرآن وسنت کی اصطلاح میں خلافِ طبع چیز پر ثابت قدم رہنے اور نفس کو قابو میں رکھنے کو صبر کہا جاتا ہے۔

صبر کی تین اقسام ہیں۔

1۔ صبر علی العمل
2۔ صبر فی العمل
3۔ صبر عن العمل

1۔ صبر علی العمل: یہ ہے کہ نفس کو کسی کام پر روک لینا یعنی اس کام پر استقامت اختیار کرنا جم جانا اور قائم رہنا...... مثلاً نماز، روزہ، زکواۃ اور اعمال صالح کی پابندی اختیار کرنا۔

2۔ صبر فی العمل...... یہ ہے کہ عمل کرتے وقت نفس کو دوسری طرف التفات کرنے اور متوجہ ہونے سے روکنا...... طاعات بجالاتے وقت اور عبادات میں مصروفیت کے وقت ہمہ تن متوجہ رہنا اور حضوری قلب سے انہیں بجالانا...... ان کے حقوق و آداب کو سکون و اطمینان سے بجالانا...... مثلاً نفس کو اس طرف راغب کرنا کہ سرکشی چھوڑ کر دل لگا کر نماز و اذکار وغیرہ میں مشغول ہو جائے۔

3۔ صبر عن العمل: یہ ہے کہ جن باتوں سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے اور وہ جو راہِ سلوک میں رکاوٹ ہیں ان سے رُکا رہے۔ مثلاً حسد، بغض، شہوت، ہر ممنوعہ عمل سے رکنے اور اپنے نفس کو باز رکھنے کو صبر عن العمل کہا جاتا ہے۔

مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ کا ارشاد ہے کہ ”صبر کی نسبت بے قراری زیادہ تکلیف دہ ہے۔“

حضرت خواجہ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ”صبر اس

شخص کا ہے جو جزا کے سوال کو درمیان سے اٹھا دے تا کہ اس کا صبر محض اللہ تعالیٰ کے لیے ہو نہ کہ بدن کی سلامتی کے لیے۔"

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ "صبر کے معنی یہ ہیں کہ کڑوی چیز کو کھا کر منہ نہ بگاڑیں...... "صبر نفس کو خدا کے ساتھ رکھتا ہے۔

حضرت منصور حلاجؒ فرماتے ہیں۔ "صبر یہ ہے کہ ہاتھ پاؤں کاٹ کر دار پر لٹکایا جائے تو آہ نہ کرے۔"

قرآن پاک میں صبر کا ذکر بارہا آیا اور اللہ نے فرمایا...... "میں صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوں......" اگرچہ دیگر تمام عبادات کا اجر بھی بہت ہے لیکن...... "اللہ کے ساتھ" کا اجر صرف صابرین کے لیے مخصوص ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ صبر کی مزید تعریف یوں فرماتے ہیں کہ "کسی کڑوی چیز کو ناک منہ بنائے بغیر گھونٹ گھونٹ پی جانا صبر ہے۔" ہم عموماً صبر اور برداشت میں تفریق نہیں کر پاتے...... اگر ہم نے کڑوی چیز کو ناک منہ چڑھا کر بالجبر پیا تو یہ برداشت ہے......لیکن اگر کڑوی چیز کو ناک منہ بنائے بغیر ہنسی خوشی پی گئے تو یہ صبر ہے...... برداشت کا انعام نہیں ہے لیکن صبر کا اجر ہے......اللہ کی دوستی اور ساتھ کی شکل میں۔

کچھ بزرگوں کے نزدیک صبر سے مراد یہ ہے کہ ربِ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے مصائب کو اپنی تقدیر کا حصہ سمجھ کر شکر کے ساتھ برداشت کر لیا جائے۔

میرے نزدیک صبر وہ مقام ہے جہاں انسان نعمت اور مصیبت کا فرق کرنا چھوڑ دیتا ہے......نعمت کے حصول پر اسے جتنی خوشی ہوتی ہے اللہ کی طرف سے بھیجی گئی مصیبت کو بھی وہ اسی خندہ پیشانی کے ساتھ جھیل لیتا ہے۔

اللہ کے احکامات کی بجا آوری کے دوران درپیش آنے والی دشواریوں اور زحمتوں کو ہنسی خوشی سہنا......تمام مصائب و مشکلات کو ہنسی خوشی برداشت کرنا، تو انسان پھر اس مقام پر جا پہنچے...... جہاں وہ دیدارِ الٰہی کا منتظر رہنے لگے اور اس انتظار کی راہ میں آنے والی صعوبتوں کو ہنسی خوشی برداشت کر جائے...... یہ بہت اعلیٰ پائے کا مقامِ صبر ہے اور اس مقام پر بہت کم لوگ فائز ہوتے ہیں۔

صبر کے اس مقام تک پہنچنے سے بیشتر دیگر بہت سے مقامات طے کرنا ہوتے ہیں......ان میں سے ایک مقام "مقامِ رضا" ہے۔

"رضا سے مراد یہ ہے کہ بیماری ہو یا پریشانی جب دل میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے اور انسان کی سوچ ایک ہی نقطے پر ٹھہر جائے کہ یہ سب میرے آقا، میرے رب کی عطا کردہ ہے۔ اس سے گھبرانے کے بجائے میں اسے اپنے آقا اور مالک کی عطا سمجھ کر سینے سے لگا رکھوں تو یہ مقامِ رضا ہوگا۔

اپنے رب کی طرف سے جو بھی عطا ہو، اسے اپنی تقدیر کا حصہ سمجھ کر ہنسی خوشی قبول کر لے...... خواہ وہ رحمت ہو یا زحمت...... یہ درجہ خالصتاً اللہ کی توفیق ہی سے عطا ہوتا ہے۔

ایک بزرگ حضرت فضیل بن عیاضؒ محافل میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "فقر میرے لیے امارت سے بہتر ہے...... بیماری میرے لیے صحت سے بہتر ہے اور موت میرے لیے حیات سے بہتر ہے۔" کسی شخص نے جا کر حضرت امام حسینؓ سے عرض کیا کہ فضیل بن عیاضؒ یہ جملے کہتے ہیں۔ حضرت امام حسینؓ نے فرمایا۔ "اللہ ان کے حال پر رحم فرمائے...... یہ رضا کا ایک مقام ہے۔"

☆☆☆

ایک صحابی نے آپ ﷺ سے عرض کیا......" یا رسول اللہ ﷺ پہلے تو میرا مال چلا گیا...... اب میرا جسم بیمار ہو گیا......" اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تمہارے اندر کچھ نہ کچھ بہتری کا سامان موجود ہے جس کی بنا پر یہ حالات آئے ہیں۔" اس پر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے تعجب کا اظہار فرمایا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اے ابو بکرؓ......! کیا تم کبھی بیمار نہیں ہوئے؟ کیا تم پر کبھی کوئی مصیبت نہیں آئی؟ کیا تم کبھی رنجیدہ

نہیں ہوئے؟ کیا تم نے کبھی مشکلیں نہیں سہیں؟ اگر تم نے زندگی میں یہ سب جھیل لیا تو اس سے تمہارے گناہوں کا تو کفارہ یہیں ادا ہو گیا...... اللہ تمہاری مغفرت فرمائے۔"

پھر آپ ﷺ نے فرمایا...... "جب اللہ تعالیٰ کسی کو مشکل میں ڈالتا ہے یا بیمار کرتا ہے تو اس کو سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ کو دراصل اس کی بھلائی مقصود ہے اور اللہ اسے کوئی ایسا درجہ عطا کرنا چاہتا ہے جس پر ان مشکلات کو عبور کیے بغیر پہنچنا ممکن نہیں۔" آپ ﷺ نے فرمایا۔ "کہ جب کوئی شخص اللہ کی قربت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے مشکل میں ڈال کر آزماتا ہے۔"

بدقسمتی سے ہم میں سے اکثر لوگ ایسے ہیں جو کوئی مشکل آجانے پر بولائے بولائے پھرتے ہیں اگر اس لمحے ہم صرف یہ سوچ لیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مشکلات میں ڈال کر دراصل ہمارے گناہوں کو دھو رہا ہے...... یا پھر ہمیں اس مصیبت سے گزار کر کوئی اعلیٰ درجہ عطا کرنا چاہتا ہے اور یہ مصیبت زحمت نہیں بلکہ رحمت ہے...... تو اس پر صبر کا انعام اللہ کے ساتھ کی صورت میں عطا ہو جاتا ہے۔ اگر ہم اللہ کا ساتھ چاہتے ہیں تو اس کی طرف سے آنے والے ہر غم اور ہم (مشکل) کو اس جذبے کے ساتھ قبول کرنا ہوگا کہ یہ ہمارے لیے بہترین ہے۔

☆☆☆

کوئی شخص اس وقت تک ایمان کی لذت نہیں پاتا جب تک وہ کسی آفت میں مبتلا نہ ہو اور پھر اس پر صبر کرے اور راضی رہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص ایک رات بیمار رہا اور اس نے صبر کیا اور خدا کی مرضی پر راضی رہا تو وہ گناہوں سے ایسے پاک ہو جاتا ہے جیسے آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔"

حضرت ضحاکؒ کا قول ہے کہ جو شخص ہر چالیسویں رات میں ایک رات بھی کسی مصیبت یا رنج و غم میں مبتلا نہیں ہوتا اس کی خدا کے نزدیک خیر نہیں ہوتی۔ حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے

کہ "جب اللہ تعالیٰ کسی بندۂ مومن کو بیماری میں مبتلا کرتا ہے تو اس کے بائیں طرف کے فرشتے کو کہتا ہے کہ اس سے قلم اٹھا لے...... (یعنی اس کے گناہ لکھنے چھوڑ دے) اور دائیں طرف کے فرشتے کو حکم دیتا ہے کہ میرا بندہ نیک عمل کرتا ہے اس سے زیادہ لکھ۔"

حدیثِ قدسی میں ارشادِ ربِ العزت ہے" جو میری قضا (حکم) پر راضی نہ ہوا اور میرے عطیہ (دیا ہوا) کا شکر نہ کیا...... اسے چاہیے کہ میرے سوا اور کوئی رب تلاش کرے۔"

حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب کوئی بندہ بیمار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف دو فرشتے بھیجتا ہے اور انہیں کہتا ہے کہ دیکھو میرا بندہ کیا کہتا ہے...... اگر وہ اس حالت میں الحمدللہ کہتا ہے یعنی شکر ادا کرتا ہے تو وہ عمل خدا کی طرف اٹھایا جاتا ہے...... پھر اللہ فرشتوں سے فرماتا ہے کہ گواہ رہو اگر میں اس بندے کو اس حالت میں فوت کروں گا تو جنت میں جگہ دوں گا اور اگر شفا دوں گا تو اس کے گوشت کو اچھے گوشت سے تبدیل کروں گا اور اچھا خون پیدا کروں گا اور اس کے گناہوں کو معاف کر دوں گا۔

حدیثِ رسول ﷺ ہے کہ "صبر نصف ایمان ہے۔" ایک اور جگہ فرمایا۔ "صبر جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔" مزید ارشاد فرمایا...... "مصائب پر صبر کرنے میں بڑی برکت ہے۔"

☆☆☆

ایک بار حضور اکرم ﷺ حضرت اُمِ صائبؓ کے گھر تشریف لے گئے اور پوچھا...... "اے اُمِ صائب......! کیا ہوا جو تم اتنی کپکپا رہی ہو؟" انہوں کہا "کمبخت بخار آ گیا۔"

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ "بخار کو برا مت کہو۔ کیونکہ یہ تو انسان کے گناہوں کو اس طرح ختم کر دیتا ہے جیسے بھٹی لوہے کے میل کچیل کو صاف کر دیتی ہے۔"

☆☆☆

ایک عورت خانہ کعبہ کا طواف کررہی تھی اور نہایت خوش ہُو ہو کر اپنے مولا کے سامنے ''لبیک لبیک حاضر ہوں اے اللہ، میں حاضر ہوں''، کہہ رہی تھی۔ ایک بزرگ جو اس کی یہ حالت دیکھ رہے تھے انہوں نے جب اس کی یہ کیفیت دیکھی تو سوچا کہ یہ عورت بے حد خوش حال اور بے فکر معلوم ہوتی ہے کہ کس قدر خوشی کے لہجے میں لبیک لبیک پکار رہی ہے۔ عورت جب طواف سے فارغ ہوئی تو آپ نے اس عورت سے خوشی کا سبب دریافت کیا تب اس عورت نے کہا۔

''اے مرد بزرگ......! میرا مکان ملکِ شام میں تھا میرا خاوند ایک بڑا تاجر تھا ایک بار جب وہ سفر پر گیا تو دورانِ سفر جہاز غرق ہو گیا اور مجھے خبر ملی کہ میرا خاوند ڈوب گیا...... میں نے یہ سنا اور سن کر صبر کیا......

پھر میرے دو ننھے بچے گھر میں کھیل رہے تھے ایک بچے نے کھیلتے کھیلتے چولھے میں ہاتھ دے دیا...... دوسرے پر جلتی ہوئی ہنڈیا الٹ گئی...... دونوں بچے جل کر خاک ہو گئے...... میری جوان بیٹی جو دریچے سے یہ منظر دیکھ رہی تھی اپنے بھائیوں کو جلتا دیکھ کر دوڑی...... اس کا پیر پھسلا نیچے گری اور اسی وقت مر گئی...... میں نے ان تمام باتوں پر صبر کیا اور میں اپنے پروردگار کے تمام فیصلوں پر راضی ہوں...... پھر اس کی رضامندی اور صبر کا یہ نتیجہ ہے کہ اپنی لبیک کے ساتھ ہی اس کی لبیک کی آواز اپنے کانوں سے سنتی ہوں اور گویا میرا معبود ہر وقت میرے ساتھ ہے۔'' سبحان اللہ!

☆☆☆

حضرت ایوب علیہ السلام کا قصہ اہلِ بلا اور سالکین کے لیے صبر کی بہترین مثال ہے۔ آپ اہلِ ثروت تھے۔ مال و دولت کی فراوانی تھی، زرعی زمین اس قدر تھی کہ کھیتی باڑی کے لیے بیلوں کی پانچ سو جوڑیاں تھیں...... ہزاروں کی تعداد میں بھیڑ بکریاں تھیں۔ سات بیٹے اور سات بیٹیاں تھیں اور ہر قسم کی آسائش میسر تھی لیکن جب اللہ تعالیٰ نے انہیں آزمائش میں مبتلا کیا تو کھیتیاں جل کر راکھ ہو گئیں۔ مال مویشی سب وبا کی نذر ہو گئے۔ بیٹے اور بیٹیاں سب ایک مکان کی چھت گرنے سے لقمۂ اجل بن گئے اور آپ ایک ایسی جلد کی بیماری میں مبتلا ہوئے کہ سارا بدن گل سڑ گیا...... زخموں میں پیپ اور کیڑے پڑ گئے...... اس حالت میں بس ایک وفادار بیوی کے علاوہ سب عزیز و اقارب، دوست یار اور عقیدت مند ساتھ چھوڑ گئے' وبا کے ڈر سے شہر والوں نے بستی سے نکال دیا۔ اس بیماری میں آپ نے کئی سال گزارے...... کہیں سات سال، کہیں بارہ سال اور کہیں بیس سال کا ذکر ملتا ہے۔

بہر حال یہ تمام عرصہ آپ نے بے حد کسمپرسی میں گزارا...... مگر آزمائش کے ان دردناک لمحات میں بھی آپ نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا...... اور اپنے مالک سے اپنے رب سے ایک بار بھی ناقابلِ برداشت تکلیف کا شکوہ تک نہیں کیا...... سارا جسم بیماری میں مبتلا تھا فقط ایک زبان سالم تھی اور وہ ہر وقت خالق و مالک کی ثنا میں معروف رہی...... اور جب یہ کیفیت انتہا کو پہنچی تو زبان سے صرف اس قدر الفاظ ادا ہوئے کہ ''اے میرے رب مجھے تکلیف ہو رہی ہے تو مجھ پر رحم فرما کہ تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔''

اور پھر رب العزت نے آپؑ کی آزمائش ختم کی اور آپؑ اس آزمائش میں سرخرو ہوئے...... تو اللہ نے آپؑ پر رحمتوں کی بارش کر دی...... آپؑ صحت یاب ہو گئے، حسن و شباب پھر لوٹ آیا...... مال و دولت کی پہلے سے زیادہ فراوانی کر دی...... اولاد کو بھی دوبارہ زندہ کر دیا گیا۔ جو حضرات رنج و مصیبت میں صبر کا دامن چھوڑ دیتے ہیں وہ حضرت ایوبؑ کے قصے سے سبق حاصل کریں۔

واقعۂ کربلا صبر و رضا کی عظیم ترین مثال ہے...... جہاں حضرت امام حسینؓ صبر و رضا کا پیکر بن کر سامنے آئے۔

حضرت یحییٰ حضرمیؒ فرماتے ہیں کہ میں سفرِ صفین میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ تھا۔ تو جب آپؓ نینوا کے برابر پہنچے تو آپؓ نے پکارا...... ''اے ابو عبداللہ

فرات کے کنارے صبر کرنا......'' میں نے عرض کیا...... یہ کیا؟'' آپؐ نے فرمایا...... کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ '' مجھے جبرئیلؑ نے بتایا ہے کہ حسینؓ فرات کے کنارے قتل ہوگا اور مجھے وہاں کی مٹھی بھر مٹی دکھائی......'' اور بھی روایات ہیں جن میں حضورِ اکرمؐ ...... نے حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا اظہار و اعلان فرمادیا تھا...... لیکن یہ کسی روایت میں نہیں پڑھا کہ کسی نے دعا کی ہو کہ الٰہی کربلا میں ہونے والا واقعہ یا آنے والے مصائب نہ آئیں۔ حضور ﷺ دعا فرمادیتے...... حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت فاطمہؓ و حضرت امام حسنؓ اور خود حضرت امام حسینؓ ہی دعا فرمادیتے کیونکہ کاملین کی دعا تقدیرِ مُبرم کو بھی بدل دیتی ہے۔

تو کسی نے دعا کیوں نہ فرمائی؟ اس لیے کہ وہ راضی برضا تھے...... اور جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ایک امتحان اور آزمائش ہوگی۔

اور واقعۂ کربلا میں حضرت امام حسینؓ بے مثال صبر و ضبط کا پیکر بن کر جامِ شہادت نوش کرتے ہیں صرف اپنے مولا کی رضا کے لیے۔

بلاشبہ کھرے اور کھوٹے، سچے اور جھوٹے کی اگر پہچان ہوتی ہے تو امتحان کے میدان میں ہی ہوتی ہے...... اور ہر شخص کا امتحان اس کی دینی و ایمانی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے۔ جس قدر کوئی دین و ایمان میں مضبوط اور سخت ہوتا ہے اسی قدر اس کے امتحان میں سختی کی جاتی ہے...... چنانچہ سرور کائنات ﷺ کا ارشاد ہے کہ سب سے زیادہ سخت امتحان انبیا کا ہے...... ان کے بعد صالحین کا...... یوں درجہ بدرجہ ان لوگوں کا جو ان کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں۔

☆☆☆

آقائے دو جہاں ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کریں تو دیکھیں کہ آپؐ...... یتیم پیدا ہوئے...... چھ سال کی عمر میں والدہ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا پھر دادا نے آپ ﷺ کی پرورش کی...... نو سال کے ہوئے تو

خوش آمدید

اسے تھی دسمبر سے گہری نسبت
ملا، تو بھی دسمبر میں
بچھڑا، تو بھی دسمبر ہی میں
تھا مزاج بھی دسمبر کی طرح
سرد، برفیلا سا
تبھی تو دوستو!
ہر سال دسمبر کو اپنے اشکوں کی مالا پہنا کر
خونِ جگر کی، سرخ کارپٹ بچھا کر
ہلکا سا مسکرا کر
خوش آمدید کہتی ہوں

☆☆☆

دسمبر پوچھتا ہے

یخ بستہ دسمبر کی، اِک سرمئی سی شام
جب تقدیر نے تجھ سے ملایا
وہ لمحہ، وہ موسم، آج بھی ہے
سوچ کی دہلیز پر ٹھہرا ہوا
یہی تو تھا وہ موسم، جب میری زندگی رنگین ہوئی
میری پلکوں سے اشکوں کو چن کر
تم نے سپنے دکھائے
دسمبر کی اس خنکی کو تو نے
اپنی نرم باتوں اور جذبوں کی حدت سے گرما دیا تھا
میری سماعتوں کو قہقہوں سے آشنا کیا تھا
آج...... پھر دسمبر کی وہی شام ہے
مگر...... ٹھٹرتی، سہمی سی میں تیرا ہجر رو رہی ہوں
کہاں ہے تو
تیرا خیال انگلی بن کے، میرے اشک پونچھتا ہے
ان ہجر لمحوں میں، دسمبر تیرا پوچھتا ہے

شاعرہ: عین الحیا ترمذی، وادیٔ کاغان

دادا بھی رحلت فرما گئے...... پچیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہؓ سے شادی کی۔ اور جب فریضۂ تبلیغ شروع کیا تو کفار کی جانب سے بے تحاشا اذیتیں دی گئیں۔ آپ ﷺ کی پیاری بیوی حضرت خدیجہؓ اور آپؐ کے چچا حضرت ابو طالب نے آپؐ کا بے حد ساتھ دیا اور بالآخر یہ دونوں بھی وفات پا گئے۔ آپؐ ...... نے اس بڑے صدمے کو بے حد صبر کے ساتھ سہا...... آپؐ کی اولادیں آپؐ کے سامنے وفات پا گئیں مگر آپ ﷺ کے قلب و ذہن پر ہمیشہ صبر کی مہر لگی رہی۔

غزوۂ احد میں کفار نے آپ رسول اکرمؐ پر تیر برسائے...... کنکر پھینکے...... دندانِ مبارک شہید کیے لیکن آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے ان کے حق میں بھی الفاظ نکلے...... ''اے اللہ! ان کو معاف فرما یہ نادان ہیں۔'' آپؐ کی حیات میں شاید ہی کوئی پریشانی ایسی ہو جس سے آپ ﷺ کا واسطہ نہ پڑا ہو...... لیکن کبھی زبانِ مبارک سے دشمنوں کے حق میں بددعا نہ نکلی...... آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ صبر و ضبط کی مکمل تفسیر ہے۔

☆☆☆

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے صبر کو ارکانِ ایمان میں سے ایک رکن قرار دیا آپؓ نے فرمایا...... ''اسلام چار ستونوں پر مبنی ہے۔

1۔یقین 2۔صبر 3۔جہاد 4۔عدل'

حضرت علیؓ نے فرمایا۔ ''ایمان میں صبر کی مثال ایسی ہے جیسے بدن میں سر...... جس کا سر نہ ہو اس کا بدن نہیں ہوتا اور جسے صبر حاصل نہ ہو اس کا ایمان نہیں ہوتا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ وہ لوگ اپنا اجر دوگنا پائیں گے جس پر انہوں نے صبر کیا۔'' (سورۃ القصص)

اور فرمایا...... ''صبر والوں کو ہی ملتا ہے ان کا اجر بغیر حساب کے۔'' (سورۃ الزمر)

یعنی صبر کی جزا کو ہر عمل کی جزا سے دوگنا بتایا ہے۔

مشہور واقعہ ہے کہ دریائے دجلہ میں ایک درویش پھنس گیا وہ تیرنا نہیں جانتا تھا کسی نے کنارے سے پکار کر کہا...... ''اے درویش! اگر تم چاہو تو کسی کو بلاؤں تاکہ وہ تمہیں نکال لے......'' درویش نے کہا۔ ''نہیں'' اس شخص نے کہا کہ کیا غرق ہونے کی خواہش ہے؟'' درویش نے کہا۔ ''نہیں'' اس نے کہا کہ ''پھر کیا چاہتے ہو؟ جواب دیا۔ ''وہی چاہتا ہوں جو میرا رب میرے لیے چاہتا ہے۔'' سبحان اللہ......

افسوس صد افسوس...... آج مخلوق سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے افعال و احکامات پر ہر لمحے اعتراض کرنے میں مصروف نظر آتی ہے...... اس کے موسموں پر اعتراض...... اس کے قضا و قدر سے ناراضا مندی...... اس کی آزمائشوں پر بے صبری...... اور بہت زیادہ قابلِ اعتراض فقرے اب ہماری زبانوں پر اس عظیم ربِ کائنات کے خلاف دن رات جاری رہتے ہیں...... جن سے ہمیں سخت احتیاط برتنا چاہیے...... اور اللہ تعالیٰ کے ہر فعل پر راضی رہنا چاہیے...... جیسے حضرت منصور حلاجؒ خوشی خوشی اس کی رضا کے لیے سولی پر چڑھ گئے۔

ہمیں اپنے رب کی رحمت پر پختہ یقین ہونا چاہیے...... اور انتہائی صبر کے ساتھ اچھے وقت کا انتظار کرنا چاہیے...بغیر کسی شکوہ شکایت کے...... اللہ ہمیں صابرین میں شمار فرمائے...... (آمین)

اے میرے پروردگار! اس مضمون کی تیاری میں کہیں کوئی غلطی کی کوئی کوتاہی دانستہ یا نادانستہ ہوگئی ہو تو میرے پیارے رب مجھے معاف فرما اور اس میں تعاون کرنے والوں کو اس کا مطالعہ کرنے والوں کو توشۂ آخرت بنادے۔

آمین......

نوٹ: قارئین کرام! محترمہ اختر شجاعت آٹھ دس مصنفین کی کئی، کئی جلدوں پر مشتمل تصانیف سے مکمل تحقیق استفادے کے بعد یہ جامع صفحات آپ کے لیے ترتیب دیتی ہیں۔ (جزاک اللہ)

کیا خیال ہے

عظمیٰ آفاق سعید

"تعریف شاید دنیا کا سب سے مشکل اور تکلیف دہ کام ہے جو اگر کسی سے نہ چاہتے ہوئے بھی انجام پا جائے تو وہ یقیناً اکیلے میں اپنا منہ پیٹتا ہوگا کہ یہ میں نے کیا کر ڈالا۔

"کسی کی تعریف کر کے ہم کیوں کسی کو خوشی مہیا کریں؟"

"ہماری کون تعریف کرتا ہے جو ہم کسی کی کریں؟"

"دماغ خراب کرنا ہے تعریف کر کے......"

یہ وہ چند جملے ہیں جو ہم بیشتر اوقات سنتے ہیں۔ یعنی گویا تعریف نہ کر کے آپ اچھے خاصے لوگوں کو پاگل ہونے سے بھی بچا سکتے ہیں۔ چاہے آپ سند یافتہ ڈاکٹر ہوں یا نہ ہوں۔

اب ایسا ہی کچھ ہمارے ساتھ بھی ہوا کہ جب ہم نے نیا گھر خریدا...... گویا جیسے چاند کا ٹکڑا خرید لیا ہو (ماشاءاللہ) ---- یہ ہماری رائے ہے اوروں کا اس سے متفق ہونا ---- بے حد ضروری ہے۔

نیا گھر تھا تو چیزیں بھی اپنے حساب کتاب سے بڑھ کر یا عرفِ عام میں کہیں تو اوقات سے بڑھ کر رکھ ڈالیں اور جو پرانی والی بھی رکھیں انہیں بھی منہ دھلوا کر سرخی پاؤڈر لگا کر رکھا تاکہ پرانی سی نہ لگیں۔

جب سارا تام جھام سج گیا تو وہی خصلت جو ہر ایک میں موجود ہے کہ اب انہیں دکھایا جائے اور تعریف بھی سنی جائے...... دوسروں کو جلایا جائے...... (یہ بات بار بار دل میں آئی جسے لات مار کر بھگایا کہ بری بات ہے)

"شبانہ آنٹی کو تو ہارٹ اٹیک ہی ہو جائے گا ہمارا گھر دیکھ کر۔ اسما خالہ تو بے ہوش ہو جائیں گی۔ رفیق ماموں کا تو دماغ الٹ جائے گا...... اور شبو آنٹی تو اسپیچ لیس ہو جائیں گی" (گمان بھی تو دیکھیے ایف سکسٹین 330 کی اڑان رکھتے تھے)

یہ وہ چند گزارشات عرض کی گئی ہیں جو ہم اور ہمارا خاندان اس دعوت سے پہلے کورس میں گایا کرتا تھا جو ہم نے اپنے نئے گھر کے سلسلے میں رکھی تھی۔ مگر اس دعوت کے بعد ہمارا اپنا دماغ الٹا، ہم بے ہوش ہوئے اور اٹیک آتے، آتے بچا...... کیونکہ ہمارے احباب بھی تو اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جہاں کسی کی تعریف کرنا، گناہِ کبیرہ تھا۔ (ٹٹ فار ٹیٹ اسی کو تو کہا جاتا ہے۔)

"کہاں سے مل گئیں یہ چیزیں؟ اور پتا کیسے چل گیا تمہیں کہ کون سی چیز کہاں رکھی جاتی ہے؟" چھوٹی آنٹی جب ہمارے گھر آئیں تو بیزاری سے تمام چیزوں کا جائزہ لیتی ہوئی بولیں۔ (مجال ہے کہ منہ سے واہ نکلا ہو)

"وہ میں نے یہ تمام چیزیں......" ابھی میری بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ انہوں نے جملہ اچک لیا۔

"اب یہ مت کہنا کہ تمام چیزیں تم نے ڈیزائن کی ہیں...... یا ڈیکوریٹر کے ساتھ مل کر تم نے سیٹ کی ہیں۔" جملہ اب مکمل ہوا۔

"واقعی میں نے ہی ڈیزائن کی ہیں، کب سے لگی ہوئی تھی تقریباً ایک سال لگا ہے تمام چیزیں مکمل ہونے میں۔" میں نے انہیں یقین دلاتے ہوئے کہا۔ (اور حقیقت بھی تھی...... مجھ سے بڑھ کر شاید ہی کوئی ہاؤس ڈیکوریٹر ہو...... ہر ہر چیز کا)

"بھئی دیکھو برا مت ماننا، ہم نے تمہارا پرانا گھر بھی دیکھا ہوا ہے اور تمہارا ڈیزائنر مائنڈ بھی دیکھا ہوا ہے۔ تو ہم سے تو تم یہ باتیں کرو نہیں......" بڑی آنٹی نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

"جی کیا کہہ رہی ہیں آپ......؟" کسی ہیروئن کی طرح سر تمام کر پوچھا گیا۔

"ارے بچوں کے کھلونے ڈرائنگ روم میں رکھتی تھیں۔ کبھی جو چائے کی پیالی کے نیچے اس کپ کی میچنگ ساسر رکھی ہو؟ ہمیشہ کوارٹر پلیٹ رکھی ہوتی تھی۔" میری پرانی

سہیلی مجھ پر چوٹ مار رہی تھی..... جس کا مطلب تھا کہ جس طرح ڈھنگ کے کپڑے نہیں پہنتیں اسی طرح ڈھنگ کے برتن بھی نہیں رکھتیں۔

''تمہارے بچوں کے لیے ہی تو رکھتی تھی کھلونے ڈلیلوں.....'' میرے اوپر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے کہ یہ میرے اپنے ہیں..... (وہ الگ بات کہ کھلونے ڈیکوریشن پیس سمجھ کر ہی رکھے تھے کیونکہ صاف اور نئے وہی تھے)

''سنو یہ اتنا اچھا صوفہ کہاں سے مل گیا.....؟''

یعنی تعریف میں بھی ایک برچھی چھپی ہوئی تھی۔

''کہاں سے مل گیا کا کیا مطلب.....؟ ڈیزائن سوچا تھا ویسا ہی بنوایا ہے ہم نے۔'' میں نے اتراہٹ سے کہا کہ چلو اب کے تو کوئی تعریف سننے کو ملی..... جب چچی نے صوفے پر بیٹھ کر ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔

''دماغ تو رہنے ہی دو تم اپنا، وہ کہاں چلتا ہے تمہارا، کسی سے گھر سیٹ کروایا ہے تم لوگوں نے ورنہ یہ سب تمہارے بس کی بات نہیں.....'' وہ برا سا منہ بنا کر بولیں..... کہ اگر بالفرض ایسا ہوا بھی تھا..... تو بھی تعریف کرنے میں کیا حرج تھا۔

''کیا آپ ایسا سمجھتی ہیں مجھے.....؟'' میں نے مصنوعی ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہا..... حالانکہ اس وقت میرے غصے کی حدود گالم گلوچ کی سرحدوں کو بھی پار کر گئی تھیں۔

''کیوں نہ سمجھوں؟ دو دفعہ تو اتنی تیس پہن کر تم ہمارے گھر آ چکی ہو..... اگر اتنی ہی دماغ کی تیز ہوتیں تو ہمیں پتا چل چکا ہوتا.....'' بس سب تیر برسا رہے تھے۔

(اور میں کھا رہی تھی)

''کہاں جنگل میں گھر بنا لیا ہے اتنی دور.....'' کسی نے جملہ مارا۔

''اب ہم آ گئے ہیں منگل کریں گے.....'' میں نے جملے کی مزاحمت میں کہا۔

''سمندر کے قریب گھر لینے کی کیا ضرورت تھی۔ ابھی اگر طوفان آیا تو سب سے پہلے تمہارا ہی نمبر آئے گا.....'' ایک قہقہے کے ساتھ یہ جملہ ادا ہوا۔

''اب کوئی طوفان نہیں آئے گا..... کیونکہ ہم کسی طوفان سے کم تھوڑی ہیں.....'' دوسرے رشتے دار کا منہ بند کیا گیا..... (اور خیال آیا..... یہ جو عرصے سے طوفان آتے، آتے رک جاتا ہے..... یقیناً اللہ کس، کس کی دعاؤں کو قبول کر رہا ہے اور کرتا رہے گا)

''اتنا بڑا گھر لینے سے کیا فائدہ.....کوئی مار کے بھی چلا جائے تو پتا نہ چلے کہ کب مرے اور کس نے مارا.....'' کسی نے اپنے سینے میں ٹھنڈ محسوس کرتے ہوئے کہا۔

(ہم کوئی مشہور لوگ تھوڑی ہیں)

''یہاں تو کوئی بھی کسی سے نہیں ملتا.....ایک دم نکو بن جاؤ گی۔''

''کوئی کسی سے بے شک نہ ملے..... مگر ہم سے ضرور ملے گا..... ہمیں لوگوں کی عزت کرنی آتی ہے.....'' دل تھام کر کہا..... جس پر تمسخرانہ قہقہے سنے گئے۔

''جس کو رشتے داروں سے نفرت ہو وہ یہاں آ کر رہے۔'' (ہم نے تو اپنی محبت کے بیان کبھی نہیں دیے تو نفرت کیسے کریں گے)

غرض اسی طرح کی اور کئی باتیں جو سننے کو ملیں اس دعوت میں، جس میں ہم میزبان تھے اور مہمان قسائی جن کے ہاتھوں میں بغدے تو نہیں تھے مگر زبانیں کسی تیز دھار چھری سے کم نہیں تھیں۔ دعوت سے نمٹنے کے بعد فون کی قطاریں لگ گئیں۔

''جی ہاں، مجھے کہیں جانا ہے اور میں بہت خوش ہوں ابھی کل ہی فون آیا ہے کہ بڑی ممانی نے بھی میرے گھر کے پیچھے ہی گھر بنا لیا ہے اور ایک ہفتے میں ان کے گھر بھی دعوت ہے سو میں نے بھی اپنی زبان کو دھار لگانا شروع کر دی ہے اور وہی جملے میری سماعتوں میں گونجنے لگے ہیں کہ اس تعریف کا وقت آ گیا ہے جو میں نے بھگتی ہے۔

آج کل میں بہت خوش ہوں اور کیوں نہ ہوں..... کہ مجھے بھی تو کافی دنوں بعد کسی کی اچھی طرح تعریف کرنے کا موقع ملنے والا ہے۔

کیوں، کیا خیال ہے.....؟

☆☆☆

باتیں بہار وخزاں کی

زندگی رات دن کی گردش ہے
کچھ خزاں کی ہے کچھ بہار کی بات

عزیز بہنو! ہم ہمیشہ ہی سے کچھ نہ کچھ نیا اور دلچسپ کرتے چلے آئے ہیں سو آج بھی ایک مختصر مگر جامع سوالنامہ حاضرِ خدمت ہے تا کہ آپ کی اپنی شخصیت کے بھی کچھ نہاں پہلو سب کے سامنے آئیں اور آپ کے ذاتی افکار، خیالات اور تجربات سے ہم سب بھی آگاہ ہوں اور لطف بھی اٹھائیں۔ امید ہے آپ کو یہ چھوٹا سلسلہ بہت پسند آئے گا۔

سوالات حاضرِ خدمت ہیں۔

1۔ روز و شب کے اس گزرتے گورکھ دھندے میں خواتین اپنی شخصیت کو کیسے پُر اثر بنا سکتی ہیں، آپ کا مشورہ اپنے تجربے کے حوالے سے......

2۔ آپ کی زندگی کا کوئی دلچسپ قصہ، واقعہ یا لمحہ جس نے آپ کے فکر و خیال کا رخ موڑ دیا۔

3۔ پاکیزہ کے مختلف سلسلے کیوں پسند ہیں؟ اور آپ کون سا ایسا سلسلہ شروع کرنا چاہیں گی جو سب کو پسند بھی آئے؟

4۔ پاکیزہ مصنفات سے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں......کوئی دل کی بات؟

5۔ اپنے تعارف کو دو جملوں یا دو اشعار میں بیان کیجیے۔

آپ کے قیمتی خیالات کا انتظار رہے گا۔ آپ چاہیں تو اپنی تصویر بھی ارسال کر سکتی ہیں۔

پروین افضل شاہین......بہاول نگر

1۔ اپنی شخصیت کو پُر اثر بنانے کے لیے ہر انسان سے پُر خلوص ہو کر ملیں اور چہرے پر مسکراہٹ سجائے رکھیں۔

2۔ اپنے ابو کے دنیا سے چلے جانے کے بعد میرے فکر و خیال کا رخ تبدیل ہو گیا ہے۔ کیا، کیا کچھ دیکھنا پڑ رہا ہے۔

3۔ میں اکثر گنگناتی ہوں، پاکیزہ ڈائری، بزم پاکیزہ مجھے اس لیے پسند ہے کہ ان سلسلوں میں بہنیں بہت ہی دلچسپی سے حصہ لیتی ہیں اور یہ سلسلے سب کو ہی پسند ہیں۔ میں چاہوں گی کہ ایک سلسلہ ملاقات کے عنوان سے شروع کیا جائے جس میں بہنیں ایک دوسرے کو پیغام دیں۔

4۔ ضمیر کی عدالت میں ضرور جائیں کیونکہ وہاں غلط فیصلے نہیں ہوتے اور نہ ہی وکیلوں کی فیس ادا کرنی پڑتی ہے۔

5۔ میرا تعارف انہی دو اشعار میں ہے۔

دوستی میں خود کو جھکا دینا کوئی عیب نہیں فراز
چمکتا سورج بھی ڈوب جاتا ہے چاند کی خاطر
جو مانگی تھیں دعائیں زندگی میں اپنی خوشیوں کی
میں ان ساری دعاؤں کو تمہارے نام کرتی ہوں

طلیبہ عنصر مغل، راولپنڈی

1۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ خواتین کو دوسروں کے ساتھ ساتھ اپنا خیال بھی رکھنا چاہیے۔ لیکن اس میں انہیں اپنے اندر کے ہنر کا جوہر ضرور تلاشنا ہوگا۔ میں نے اپنی شادی شدہ زندگی کے ابتدائی سال اپنی سسرال کو اپنا بنانے اور ان میں گھلنے ملنے میں گزار دیے۔ اس سارے میں اپنی ذات کہیں گم ہو گئی۔ یقین کریں میں مختلف جرائد میں شادی سے پہلے لکھا کرتی تھی لیکن وہ سب چھوٹ گیا تھا۔ اس طرف واپس لانے والی ہستی انجم انصار جی کی ہے انہوں نے مجھے واپس لکھنے کی ترغیب دی۔ سو آپ ہاؤس وائف ہیں یا ورکنگ وومن......آپ اپنے ہنر کو استعمال میں لائیں

اور اپنے اخلاق کو ہر قدم پر بہتر رکھیں۔

2۔ مجھے نہیں پتا کہ میری پاکیزہ بہنوں کو یہ واقعہ دلچسپ لگے یا نہیں لیکن میرے لیے بہت اہم ہے جب ہماری نئی ،نئی شادی ہوئی تو ہمیں سب سے زیادہ بے چینی اپنے پیارے پاکیزہ کو پڑھنے کی تھی۔ ہمارے میاں جانی نے ہمارے شوق کو دیکھتے ہوئے باقاعدگی سے پاکیزہ ہمیں لا کے دینا شروع کیا۔ میری سسرال میں مطالعے کا کوئی شوقین نہیں تھا ہمیں اپنی ساسو امی سے ڈر لگتا تھا کہ کہیں ان کو اعتراض نہ ہو...... میں خوب دل لگا کر کام کرتی اور پھر وقت ملتے ہی کمبل میں چھپ کر پاکیزہ پڑھتی ...... پر جناب ایک دن جب دوپہر کے کام نبٹا کے ہم نے سب کو آرام کرتے پا کر اپنے کمرے کی راہ لی اور کمبل میں گھس کر پاکیزہ میں ایسے گم ہوئے کہ پتا بھی نہیں چلا کہ ساس امی کب ہمارے پلنگ پر آ کے لیٹ گئی ہیں۔ پتا تو تب چلا جب انہوں نے ہمارے کندھے پر دھپ لگائی اور پوچھا یہ کیا ہے جو تم روز پڑھتی رہتی ہو ہماری تو سٹی گم ہوگئی لیکن ان کی اگلی خواہش پہ تو ہم حیران ہی رہ گئے جب امی نے ہم سے کہا کہ جب پڑھنا ہی ہے تو تھوڑا اونچا پڑھا کرو تاکہ میں بھی سن لیا کروں ...... پھر ہم ساس بہو کا یہ معمول بن گیا کہ میں ان کو ناول سناتی اور وہ سنتیں اور مزے کے تبصرے بھی کرتی تھیں۔ ان کے اسی عمل نے مجھے ان سے بہت قریب کر دیا اور مجھے ایک سہیلی مل گئی۔

3۔ پاکیزہ کے مختلف سلسلے اس لیے پسند ہیں کہ ان میں انفرادیت ہے...... اصلاح ہے، مزہ ہے۔ خواہش ہے کہ یہ ایک سلسلہ شروع ہو کہ پاکیزہ کی قاری بہنیں (اخلاق کے دائرے میں رہ کر) ایک دوسرے کو پیغامات دے سکیں۔ دوسرا ہم جیسی نو آموز شاعرات کو بھی موقع ملنا چاہیے۔

4۔ پاکیزہ مصنفات سے بہت پیار اور احترام سے یہ استدعا کرنا چاہوں گی کہ وہ اپنے ناول کے اوپر ڈراما ضرور بنائیں مگر اس سے ناول کا حسن مجروح نہ ہو۔

5۔ الفاظ میں پڑ جائے گی جان مکمل
لے آئیں گے ہم عشق پہ ایمان مکمل
آجائے میرا نام پاکیزہ کے ہمراہ
ہوجائے کسی روز تو پہچان مکمل

فرخندہ جعفری، گجرات

1۔ میں اپنے تجربے کے حوالے سے یہ کہوں گی کہ خواتین سروس کر رہی ہوں یا امورِ خانہ داری ......دن رات گورکھ دھندوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ پلاننگ کے تحت زندگی گزاریں اور عقلمندی سے اپنی شخصیت کو پُراثر بنانا اور حالات کا مقابلہ کرنا آتا ہو تو کوئی بھی گورکھ دھندا یا مشکلات ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتے ......وہ اپنے حسن سلوک سے دوسروں کے دکھ درد میں ان کا ساتھ دیں تو ان کی شخصیت خود بخود پُراثر ہو جائے گی۔

2۔ بہت سے واقعات ہو سکتے ہیں کسی ایک کا کیا ذکر...... پاکیزہ سے بہت کچھ سیکھا۔

3۔ پاکیزہ کے سب ہی سلسلے بہت پسند ہیں سب میں زندگی کی رمق نظر آتی ہے۔ اختر شجاعت صاحبہ کا شمع ہدایت پڑھ کر دل کو سکون ملتا ہے۔ اس کے تمام سلسلے مل کر ایک گلدستہ بن جاتا ہے اور اسی گلدستے کا نام پاکیزہ رسالہ ہے۔ ہر خط کا جواب بڑی محنت سے دیا جاتا ہے۔

4۔ میں پاکیزہ مصنفات سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آپ سب بہت محنت کر رہی ہیں، بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ کوئی ناولٹ ہو، کوئی افسانہ ہو یا کوئی کہانی ہو سب میں کچھ نہ کچھ پیغام دے رہی ہیں۔ ماشاءاللہ ......مگر کہانی میں اتنا ظلم بھی نہ دکھایا کریں کہ ان پر دل دکھی ہو جائے خاص کر بیٹیوں کے بارے میں ......

5۔ تعارف کے سلسلے کیا کہوں میرا نام فرخندہ جعفری ہے جو آپ جان گئی ہوں گی اور میں پاکیزہ کی

مستقل قاری اور لکھاری ہوں۔

گلشاد نذیر......مری

1: روز و شب کے اس گزرتے وقت میں دوسروں سے گلے شکوے کم سے کم کریں بلکہ دوسروں کے کام زیادہ آئیں۔ ضروری نہیں کہ پیسے خرچ کریں بلکہ دوسروں کے ساتھ بیٹھ کر ان کے دکھ درد سن کر اور انہیں اچھے مشورے دے کر اپنی شخصیت کو پُر اثر بنائیں۔ میں نے بھی ہمیشہ دوسروں کو عزت دی۔ خواہ وہ صفائی والا ہو، مانگنے والا ہو یا کوئی اور بڑی شخصیت، یہی وجہ ہے کہ میں ان کی طرف سے عزت پاتی بھی ہوں کہ عاجزی تو میرے مولا کو بھی پسند ہے۔



2: تفسیرِ قرآن پاک پڑھنے کے بعد خیالات میں بڑی مثبت تبدیلی آئی ہے اور دنیا کی محبت دل سے ختم ہوگئی بلکہ اب میں صرف اپنے رب کو راضی کرنے کے لیے کوشاں رہتی ہوں۔

3۔ پاکیزہ ڈائری بہت پسند ہے کہ عظمیٰ کو دریا کوزے میں بند کرنا آتا ہے۔ جلترنگ، اداریہ، حمد و نعت، شعر، لطیفے غزل، غرضیکہ ان صفحات میں سب کچھ مل جاتا ہے۔ خواتین کے لیے مختلف موضوعات پر مختصر مضامین لکھنے کا سلسلہ بلکہ انعامی سلسلہ شروع کیا جائے کیونکہ ہر بہن افسانہ نہیں لکھ سکتی۔ مگر مختصر موضوعات کو قلم بند کرسکتی ہے۔

4۔ پاکیزہ مصنفات سے کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے مگر صرف اتنا کہوں گی کہ حقیقت سے قریب ترین تحریر ہی دلوں کو چھوتی ہے۔ بس اس کا خیال رکھیں۔

5۔ یہ محفل جو آج سجی ہے اس محفل میں
ہے کوئی ہم سا ہم سا ہو تو سامنے آئے

کوثر خالد، جڑانوالہ

1: مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

میں نے سسرال والوں کے لیے اپنی لڑکپن کی عادات بدلیں اور پھر ان لوگوں کو بدلنے پر مجبور کردیا۔ آج میں سرخرو ہوں، راج کرتی ہوں۔ اس شعر کی مکمل تفسیر بنی ہوں کہ

اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں اس جہاں میں
ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا

سچ بولنا اور سادہ رہنا...... گھر کے ڈھیروں کام کم کر دیتا ہے اور سکون بھی رہتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی وقت ملتا ہے۔ میں تو یہی کہوں گی کہ تقویٰ، سادگی، سچائی اور میانہ روی کامیابی کا زینہ ہے۔

2۔ جناب... کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں...... ہزاروں واقعات، کروڑوں لمحے ہوں گے جب ہم نے دعا کی ہوگی کہ اللہ ایسا بنا دے اور اللہ ایسا بننے سے بچالے۔ پانچویں جماعت میں مس محمودہ کی بیٹی بے بی آئیں...... کلاس لی اور لڑکیوں سے رسالے برآمد ہوئے تو ایک بات کہی...... دیکھو میں رسالے پڑھنے کی اجازت اس بچی کو دوں گی جو ہیرو سے متاثر ہو کر نیکی کی ہر بات خود میں پیدا کرے اور بدکرداروں سے پناہ چاہے...... ہم اس بات پر آج تک قائم ہیں۔ بسم اللہ پڑھ کر رسالہ کھولتے ہیں اور دعا مانگتے ہیں کہ اس رسالے کی ساری اچھی باتیں مجھ میں پیدا کر دے مولا...... اور باقیوں سے بچالے کہ دعا ہی مومن کا ہتھیار ہے۔

3۔ میں چاہتی ہوں کہانیاں کم اور مختصر ہوں بلکہ ان کی جگہ بالکل سچے واقعات ہوں تاکہ ہمیں پتا چلے پاک لوگ دن بھر میں کیا کرتے ہیں اور ماضی میں کیا، کیا...... ہر رسالے میں حمد و نعت اور اسلامی سلسلوں کو بہت زیادہ ہونا چاہیے۔ غلط باتوں کو سرِعام نہ کریں۔

4۔ پہلے تو میں ہر بندے سے ہر عالم سے ہر مصنف سے پوچھنا چاہتی تھی مگر جب ایک حدیث پڑھی۔

امنت باللہ کہہ اور قائم رہ...... کسی سے سوال نہ

پوچھنا پڑے گا...... تو الحمدللہ اب سوالوں کے جواب خود ہی چل کر آجاتے ہیں۔ یہ آپ کا سوالنامہ بھی میری دعا یا آرزو کا نتیجہ ہے کہ میں نے بارہا واقعہ لکھ کر بھیجنے کا سوچا مگر نہ کر سکی۔ تو میرے مولا نے سوال بھیج دیے۔

ظاہر میں کچھ ایسی ہوں نوکر دو کر دکھتی ہوں
باطن میرا ایسا ہے سب پر حکومت کرتی ہوں
آخر میں اِک پیغام مسلمانوں کے نام......
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

یاسمین کنول...... پسرور

1۔ اپنی شخصیت کو پُراثر بنانے کے لیے اپنا خیال رکھیں صرف کاموں کو زندگی کا مقصد نہ بنائیں وہ تو ہوتے رہتے ہیں۔ اپنے اوپر بھی توجہ دیں خصوصاً متوازن خوراک کی طرف تاکہ اپنے خاندان کو سنبھال سکیں ویسے بھی ایک صحت مند جسم ہی صحت مند دماغ رکھتا ہے۔



2۔ میرا چھوٹا بیٹا باتوں، باتوں میں کہہ گیا پہلے ماما فوت ہوں گی اور آخر میں، میں کیونکہ میں سب سے چھوٹا ہوں۔ فکر و خیال کا رخ فوراً دنیا سے آخرت کی طرف مڑ گیا۔ ہم نے بچوں کو کیا بنانا ہے ان کی بہتر تعلیم و تربیت کریں گے تو بعد میں یاد رکھیں گے۔

3۔ اشعار والے سلسلے زیادہ پسند ہیں۔ غزلیں، نظمیں علیحدہ صفحات پر ہونی چاہئیں۔

4۔ پاکیزہ مصنفات سے اتنی گزارش ہے کہ زندگی کے تلخ واقعات ضرور لکھیں مگر شیریں بیانی کے ساتھ...... ہر طرف یہاں بری خبریں بکھری پڑی ہیں۔ انسان مایوسی کی طرف چلا جاتا ہے اپنی تحریروں میں امید اجاگر کریں تاکہ عام آدمی کا مورال بلند ہو۔

5۔ یاسمین کنول ایم اے، ایم ایڈ...... انجم انصار صاحبہ کی بہت پرانی فین...... پاکیزہ سے رشتہ کبھی نہ توڑنے والی ایک معمولی شاعرہ ہے جس کی دو کتابیں ''خاموشی جب کلام کرتی ہے'' اور ''آنکھ میں سمندر'' شائع ہو چکی ہیں۔

رداحسین، کراچی

1۔ آج گھر کے اندر بیٹھ کر آس پاس سے...... بےخبر ہو کر زندگی نہیں گزاری جا سکتی اس لیے اپنی ذات کی انفرادیت کو سب سے پہلے پہچاننے کی کوشش کریں اور پھر ہر طرح کے لوگوں اور ماحول میں اپنی جگہ بنائیں۔

2۔ میں نے مصنف ہاشم ندیم کا ناول ''عبداللہ'' خرید کر رکھا ہوا ہے جب کبھی روٹین لائف سے اکتاہٹ ہونے لگتی ہے تو اس کتاب کے مختلف حصے پڑھ لیتی ہوں کیونکہ یہ وہ پہلی کتاب ہے جس کو پڑھ کر میری زندگی میں بہت سی مثبت تبدیلیاں آئیں۔

3۔ پاکیزہ میں بے شمار موضوعات ہوتے ہیں جو روزمرہ زندگی کے حوالے سے ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر لڑکی کو پاکیزہ پڑھنا چاہیے...... سوشل میڈیا کے حوالے سے مفید معلومات کا سلسلہ بھی شروع کریں۔

4۔ پہلی مرتبہ محترمہ ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا پڑھی اگلے ماہ کے پاکیزہ کا انتظار ہے اسی طرح ہمارے لیے اچھی، اچھی چیزیں لکھتی رہیں۔

5۔ مجھے نئے، نئے لوگوں سے ملنا اور ان کے بارے میں جاننا اچھا لگتا ہے۔ اس طرح لوگوں کے رویے اور ان کی فطرت کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے جو زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔

بنت اصغر حسین...... کراچی

1۔ اس تیز رفتار دور میں اپنی شخصیت کو مضبوط اور پُراثر بنانے کے لیے باعمل اور بامقصد کاموں کو اپنی زندگی کا لازمی حصہ بنائیں۔

2 زندگی میں ہونے والا ہر حادثہ یکسر تبدیل کرتا گیا اور آج بھی گزرے کل سے مختلف ایک نئی شخصیت ہوں۔

3۔ افسانے بہت پسند ہیں کیونکہ ایک ہی وقت میں بیٹھ کر ایک سبق آموز تحریر دلچسپی کا باعث بنتی ہے.....اور بیوٹی ٹپس کا سلسلہ بھی ہونا چاہیے۔ (اب تو یہ حاضر ہے جناب)

4۔ سب مصنفات کی تحریروں میں انفرادیت ہوتی ہے اکثر کسی نہ کسی کہانی میں اپنی شخصیت کی جھلک نظر آتی ہے تو بے اختیار مصنفہ سے روبرو ملاقات کر کے یہ بات بتانے کو بہت دل کرتا ہے کہ آپ کی کہانی کا یہ کردار تو بالکل میرے جیسا ہے۔

تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

انجم مشیر......کراچی

1۔ اپنے قیمتی وقت کے کچھ لمحے اپنے ان عزیزوں کے نام کریں جو نادار ہیں، بیمار ہیں، ضعیف ہیں اور بے اولاد ہیں۔ خلوصِ دل سے ان کی مدد کریں، احوال پوچھیں، دل جوئی کریں۔ شخصیت خود بخود پُراثر بن جائے گی۔



2۔ بہت پرانی بات ہے، والد صاحب کا انتقال ہوچکا تھا والدہ اور دو چھوٹے بھائی تھے۔ بھائی والدہ سے زیادہ ہم سے ڈرتے تھے کہ ہم نے کہا ہوا تھا کہ آپ دونوں سات بجے کے بعد گھر سے کہیں نہیں جائیں گے ایک دن چھوٹا والا بھائی جس کی عمر نو، دس سال تھی ٹیوشن سے گھر آتے ہوئے ساتھی بچوں کے ساتھ کھیل تماشے میں لگ گیا۔ باقی بچے اپنے گھروں کو چلے گئے اور وہ نو بج جانے کی وجہ سے ڈر کے مارے گھر نہ لوٹا.....اور ساری رات ایک زیرِ تعمیر مسجد کے سامنے پڑی بجری پر سوتے جاگتے گزار دی۔ ہم گھر والے، محلے والے رات بھر ڈھونڈتے رہے۔ صبح ہونے پر لوگ ڈھونڈ کر لائے تو ہم نے پوچھا ایسا کیوں کیا رات بھر خود بھی پریشان رہے اور ہم سب بھی تو بولا۔ آپ سزا دیتیں تب اس لمحے ہم نے عہد کیا کہ اب کبھی اتنی سختی نہیں کریں گے کہ یہ بھی غلط ہے۔

3 کیونکہ سب بہنوں کی محفل میں آکر سب سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ حال احوال پتا چلتا ہے جلترنگ مسکرانے قہقہے لگانے پر مجبور کرتا ہے۔ ہر ماہ ایک رائٹر کا انٹرویو ضرور ہو۔

4۔ عشق و محبت کی داستانوں میں دو پٹے کو اتنا پُرکشش بنا کر پیش کریں کہ ہماری نئی نسل جو اس سے بے نیاز ہوتی جارہی ہے اس کو دوبارہ سینے سے لگا لے۔

ہم روحِ سفر ہیں ہمیں ناموں سے نہ پہچان
کل اور کسی نام سے آجائیں گے ہم لوگ

سلوک

ایک مرتبہ حضرت علی ابن الحسینؓ المعروف امام زین العابدینؓ قحط کے زمانے میں مدینے کے لوگوں میں کھانا تقسیم فرمار ہے تھے۔ ایک شخص کی باری آئی تو اس نے کہا۔
''آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟''
آپؓ نے فرمایا۔ ''میں تجھے کیسے بھول سکتا ہوں جب ہم کربلا سے قیدی بن کر جار ہے تھے تب تُو نے ہمیں پتھر مارے تھے۔''
اس نے کہا۔ '' آپ پھر بھی مجھے کھانا دے رہے ہیں؟'' آپؓ نے فرمایا۔
''اس وقت ہم تیرے در پر آئے تھے اور وہ تیرا سلوک تھا لیکن......آج تُو ہمارے در پر آیا ہے اور یہ آلِ محمد ﷺ کا سلوک ہے۔''
سبحان اللہ......

مرسلہ: نیلوفر خان، بہارہ کہو

شائستہ زریں



آواز کی دنیا کا دُرِ نایاب

ربیعہ اکرم

پروگرام مینجر ایف ایم 101 کراچی سے دلچسپ باتیں

قارئینِ کرام! السلام علیکم
راہِ عمل میں جذبۂ کامل ہو جن کے ساتھ
خود ان کو ڈھونڈ لیتی ہے منزل کبھی کبھی
اور ہماری پاکیزہ کی مہمان اس شعر کی عملی تفسیر ہیں۔ ربیعہ اکرم نام ہے عزمِ مصمم اور عملِ پیہم کا...... پیکرِ اخلاص و محبت، ربیعہ اکرم کا کمال یہی ہے کہ نہایت جانفشانی اور خوش اسلوبی سے اپنی تمام تر منصبی ذمے داریاں نباہتے ہوئے بھی ہر دم ہنسی مسکراتی نظر آتی

ہیں۔ بذلہ سنج، خوش اطوار اور خوش ذوق ربیعہ اکرم کا تعارف لکھنے بیٹھی تو خیال آیا کیوں نہ لندن میں مقیم ممتاز براڈ کاسٹر اور عالمی اخبار کے چیف ایڈیٹر محترم صفدر ہمدانی صاحب سے جو ربیعہ اکرم کے ریڈیو کے استاد بھی رہ چکے ہیں، ربیعہ اکرم کے بارے میں تاثرات معلوم کیے جائیں اور اسے ابتدائیہ کا حصہ بنایا جائے۔ بے حد ممنون ہوں صفدر ہمدانی صاحب کی کہ انہوں نے میری درخواست پر ربیعہ اکرم کے بارے میں اپنی گرانقدر رائے دی جو نذرِ قارئین ہے۔

''پہلی بات ربیعہ اکرم کے بارے میں جو میرے لیے بہت اہم ہے، وہ محبت میں گندھا ہوا اس کا خمیر ہے کہ جس سے اس کے والدین کی تہذیب و تربیت کی خوشبوئے مسلسل آتی ہے۔ ریڈیو پاکستان کی اکیڈمی میں زیرِ تربیت پروڈیوسر کے طور پر اس کا استاد ہونے کے ناتے مجھے اس کی ریڈیو میں آمد یاد ہے اور پھر ملازمت کے مختلف مراحل سے گزر کر موجودہ مقام تک پہنچنے کا سارا سفر بھی معلوم ہے۔ ربیعہ میرے ان شاگردوں اور دوستوں میں سے ہے جو دنیا کے جس بھی کونے میں رہی اس نے مجھ سے رابطہ رکھا اور مناصب اور عہدہ بڑھنے کے باوجود مجھ فقیر کی عزت میں کوئی کمی نہیں آنے دی جو بلاشبہ اس بے بصر اور مفاد پرست عہد میں ایک نعمت ہے۔ بلاشبہ ربیعہ ایک بہت اچھی انسان ہے عزت کرنا اور کروانا جانتی ہے۔ وہ ایک بہت پیاری بیٹی ہے، محبت کرنے والی بیوی اور ماں ہے۔ دوستی کی حدود جاننے والی دوست ہے۔ افسر کیسی ہے اس کا مجھے تجربہ نہیں لیکن یقین ہے ٹریک ریکارڈ کے طور پر ہردلعزیز ہوگی۔ میرے الفاظ میں وہ تخلیق کار پروڈیوسر ہے۔ نشریات کی دنیا سے واقف ہے، جدید نشریاتی تقاضوں سے بھی آگاہ ہے۔ محنت اور لگن سے نشریاتی سفر پر رواں دواں ہے۔ میں اگر اس کا استاد تھا تو مجھے بے پناہ خوشی ہے کہ وہ اب خود استاد کی جگہ موجود ہے۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اس نے میرے فلسفۂ نشریات کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ ریڈیو پر کئی عشروں سے زوال کی کیفیت طاری ہے لیکن مجھے زوال کے اس عہد میں بھی ربیعہ اکرم اور ایسے ہی درجن بھر تخلیق کاروں میں ایک بار پھر اس قومی ادارے کے عروج کی امید نظر آتی ہے۔''

اور اب ملتے ہیں پاکیزہ کی مہمان ربیعہ اکرم سے......

پاکیزہ ✧......''پوت کے پاؤں پالنے میں دیکھے جاتے ہیں۔'' یہ مثل آپ پر کتنے فیصد صادق آتی ہے؟

ربیعہ اکرم ❖......یہ مثل خاکسار پر ۱۰۱ فیصد صادق آتی ہے کیونکہ بچپن ہی سے اپنی خداداد صلاحیتوں کے اظہار کے لیے بے تابی تھی یہی وجہ تھی کہ دوسری جماعت کی ننھی منی طالبہ نے بھرے مجمع کے سامنے اسٹیج پر اپنے اسکول کی سینئر طالبہ کے ساتھ لگائی بجھائی کرنے والی بڑھیا کا کردار فل گیٹ اپ کے ساتھ سفید بال، پانوں سے رنگا منہ اور چوڑی دار پاجامہ کرتا پہنے جب انٹری دی تو پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا اور سب نے پرفارمنس کے بعد بہت سا پیار کیا۔ پھولے پھولے گالوں کو خوب نوچا اور وہیں کسی نے یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ یہ بچی مستقبل میں عرشِ منیر ثابت ہوگی۔

پاکیزہ ✧......زمانۂ طالبعلمی میں کس نوعیت کی غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیتی تھیں؟

ربیعہ اکرم ❖......اسٹیج ڈرامے، تقاریر، مباحثے، ذہنی آزمائش، ٹیبلو، ملی نغموں، مضمون نویسی، کلاس سجانے، کارڈز بنانے، مصنوعی پھول بنانے غرض ہر طرح کے مقابلوں میں حصہ لیا۔

پاکیزہ ✧......عموماً زمانۂ طالبعلمی میں ہر فن مولا قسم کی طالبات تعلیم ختم ہوتے ہی تمام سرگرمیوں سے ہاتھ کھینچ لیتی ہیں۔ اس کے برعکس ماشاءاللہ آپ تواتر سے سرگرمِ عمل ہیں، راہ میں رکاوٹ نہیں آئی؟ آپ کے عزائم بلند تھے یا پھر حوصلہ افزائی کا ٹانک ملتا رہا اور سفر جاری رہا؟

ربیعہ اکرم ❖......جی ہاں! الحمدللہ سفر جاری رہا۔ راہ میں رکاوٹ تو آئی لیکن وہ رکاوٹیں مجھے بہت

پیاری تھیں۔ مثلاً پیا کے گھر ہجرت کر جانا، ماں کے عظیم رتبے پر فائز ہو جانا۔ لہٰذا بچوں کے بچپن اور ازدواجی زندگی کے آغاز پر اپنے بلند عزائم کو کچھ عرصہ silent mode پر رکھ دیا، تاہم جب بچے بڑے ہو گئے اور وہ خود میرے مددگار بنے تو یہ بلند عزائم دوبارہ سے میرے رگ و پے میں موجود محرکات کو پیش منظر میں لانے کا باعث بنے اور اگر شوہر کی جانب سے حوصلہ افزائی کا ٹانک براہِ راست نہ ملتا تو پھر شاید یہ سفر جاری نہ رہ پاتا۔

پاکیزہ ✧...... آواز کی دنیا سے شناسائی کیسے ہوئی؟

ربیعہ اکرم ❖...... یہ 1979ء کی بات ہے کہ ہم علامہ اقبال کے یوم پیدائش پر تقریری مقابلے میں حصہ لینے کے لیے پاکستان نیشنل سینٹر حیدرآباد گئے وہاں پر ریڈیو پاکستان کے ایک کارکن تنویر عسکری جو طلباد طالبات کے سیکشن سے وابستہ تھے بحیثیت جج موجود تھے۔ انہوں نے کہا بی بی! آپ اتنی اچھی تقریر کرتی ہیں تو ریڈیو پاکستان کے طالبعلموں اور نوجوانوں کے پروگراموں میں حصہ کیوں نہیں لیتیں؟ مقابلوں کے دوران مائیکروفون پر گفتگو کرنے کا حوصلہ تھا ہی اس لیے فوراً ہی ہم رضامند ہو گئے کہ چلو ریڈیو پاکستان کے مائیکروفون پر بھی اپنے فنِ خطابت کو آزمائیں اور پھر 1979ء سے ہی آواز کی دنیا سے شناسائی ہوگئی۔

پاکیزہ ✧...... آپ نے ہوم اکنامکس میں ایم ایس سی کی سند حاصل کر کے براڈ کاسٹنگ کی راہ لی جبکہ آپ نے کامیابی بھی امتیازی نمبروں سے حاصل کی تھی۔ اس کی کیا بنیادی وجہ ہے؟

ربیعہ اکرم ❖...... جی ہاں ہوم اکنامکس میں ایم ایس سی کرنے والی میں واحد براڈ کاسٹر ہوں جس نے کسی کالج میں لیکچرر بننے کے بجائے ریڈیو پاکستان حیدرآباد کی پروڈیوسر بننے کو ترجیح دی۔ سندھ پبلک سروس کمیشن کا امتحان Top کرنے کے باوجود میں کالج آف ہوم اکنامکس اس لیے جوائن نہیں کر سکی کہ ریڈیو پاکستان حیدرآباد کے اس وقت کے اسٹیشن ڈائریکٹر عنایت بلوچ صاحب جو کہ اسمِ بامسمیٰ تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ربیعہ! لیکچررز تو ہمارے شہر میں ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں لیکن خاتون پروڈیوسر آپ پورے حیدرآباد میں واحد ہیں لہٰذا یہ ہی شناخت قائم رکھیں اور شکر ہے کہ یہ شناخت پھر وجۂ شہرت بنی، تو بنیادی وجہ وہ جذباتی بلیک میلنگ بنی۔ سو آج تک ریڈیو پاکستان ہی سے وابستہ ہوں۔

پاکیزہ ✧...... حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن پر آپ کی تقرری کس بنیاد پر ہوئی؟

ربیعہ اکرم ❖...... ہم یہ بات اللہ رب العزت کا بہت سا شکرانہ ادا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ریڈیو پاکستان حیدرآباد میں ہماری تقرری خالصتاً میرٹ پر ہوئی اور 1988ء-1989ء کے ریڈیو پاکستان کے پروڈیوسرز کے بیچ میں صوبہ سندھ سے منتخب ہونے والی میں واحد لڑکی تھی جس نے تحریری امتحان اور انٹرویو میں امتیازی نمبروں سے اپنی جگہ بنائی۔ (بہت خوب)

پاکیزہ ✧...... آپ کی ریڈیائی تربیت میں کس کا کردار اہم رہا؟

ربیعہ اکرم ❖...... ریڈیو میں میری تربیت میں سب سے پہلے تو میرے مشاہدے، تجربے اور ذوقِ سماعت نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ میرے سینئرز اشفاق احمد خان، محمود صدیقی، سید نور اظہر جعفری، الیاس رضا، پرویز اختر، قاصد عزیز، اسرار احمد خان اور دیگر بہت سے نام ہیں۔ جنہوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی اور تربیت کا عمل تو آج بھی جاری ہے۔ جبکہ دورانِ تربیت میرے اساتذہ میں صفدر ہمدانی، مشکور صدیقی، ضمیر صدیقی، سلیم خان اور نشاط انجم شامل تھے۔ جنہوں نے ہمیں پاکستان براڈ کاسٹنگ اکیڈمی میں نشریات کی الف ب پڑھائی۔ کراچی میں میری سینئر کمپیئر شبینہ افتخار صاحبہ کو میں نے سن کر بہت کچھ سیکھا اور وہ بھی میرے استادوں میں شامل ہیں۔

پاکیزہ ✧...... بحیثیت پروڈیوسر پہلا پروگرام کون سا تھا اور خود آپ کی ذاتی دلچسپی کس نوعیت کے

پروگراموں میں ہوتی ہے؟

ربیعہ اکرم ❖......خواتین کا ہفتہ وار پروگرام ''انجمن'' تھا جس میں نصف گھنٹے میں ہم سامعین کو بہت کچھ فراہم کرتے تھے اور مجھ سے پہلے یہ پروگرام ریکارڈ ہوتا تھا لیکن میں نے براہِ راست پیش کرنے کا رسک لیا یہ 1989ء کا ذکر ہے۔



گزشتہ سال کے اختتام پر صبح پاکستان کے ریڈیو پاکستان کے مقبول پروگرام کا ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد ڈائریکٹر پروگرام محترمہ نیر جمال اور سابق انچارج FM101 تنویر اقبال صاحب کے ساتھ ایک یادگار تصویر

پاکیزہ ✧......خواتین کے پروگرام کرتے وقت کن امور کو ملحوظ رکھتی تھیں؟

ربیعہ اکرم ❖......خواتین کے پروگرام چونکہ میں حیدرآباد اسٹیشن سے کرتی تھی جس کی نشریات کا دائرۂ سماعت ہماری دیہی آبادی تک بھی پھیلا ہوا تھا لہٰذا میں شہری اور دیہات میں رہنے بسنے والی خواتین دونوں کے حساب سے سیگمنٹ ترتیب دیتی تھی تاکہ وہ خواتین بھی ایسا محسوس کریں کہ میں نے یہ سوچا گویا کہ یہ بھی میرے دل میں تھا۔ صحت کے مسائل، بجٹ بنانا، کم خرچ والی ڈشز بنانا، لڑکیوں کی تربیت اور دیگر ٹپس پروگرام میں شامل ہوتی تھیں۔

پاکیزہ ✧......بحیثیت ڈراما پروڈیوسر کون، کون سے یادگار ڈرامے کیے؟

ربیعہ اکرم ❖......حیدرآباد میں ابنِ اثر تجلی کا لکھا ہوا ڈراما ''کلیاں اور چنگاری'' صابر وسیم کا لکھا ہوا ڈراما ''پروڈیوسر'' پروین کاظمی صاحبہ کا لکھا ہوا ڈراما ''اوپر والا ہاتھ'' یادگار ڈرامے تھے۔ ان ڈراموں میں پروڈکشن کے علاوہ صداکاری بھی کی جبکہ کراچی اسٹیشن سے میثاق حسین زیدی کا تحریر کردہ ڈراما ''خواب نگری'' نادیہ فاطمہ کا لکھا ہوا ڈراما ''انمول رشتے'' وغیرہ۔

پاکیزہ ✧......کبھی ایسے کرداروں کی ادائیگی کا موقع ملا جو آپ کے لیے آزمائش اور سامعین کے لیے باعثِ حیرت تھے؟

ربیعہ اکرم ❖......ایسے بہت سے ڈراموں میں صداکاری کے مواقع ملے جو واقعی ایک چیلنج تھے۔ مثلاً مردانہ کردار، تیسری جنس کا کردار، 80 برس کی بوڑھی خاتون کا کردار، تیز طرار لڑاکا خاتون کا کردار اور جو سب سے کامیاب بات رہی وہ یہ کہ لوگ مجھے پہچان نہیں سکے کہ یہ کردار میں نے کیے، سامعین نے حیرت اور ستائش کا اظہار کیا۔

پاکیزہ ✧......اپنی نسائیت اور نغمگی سے بھرپور آواز میں جب مردانہ اور تیسری جنس کردار ادا کیا تو سامعین کے کیا تاثرات تھے؟ اور اس مشقت میں خود آپ پر کیا گزری؟

ربیعہ اکرم ❖......سامعین کی جانب سے تو پزیرائی ملی ہی لیکن میرے اپنے صوتی ڈبے یعنی vocal chords پر بہت شدید اثر پڑا اور گلا بیٹھ گیا، غرارے کرنے پر ٹھیک ہوا۔

پاکیزہ ✧......کس قسم کے ڈرامے پیش کرنے میں زیادہ دلچسپی لیتی ہیں؟

ربیعہ اکرم ❖......سچ جانیے تو مجھے ہلکے پھلکے

طنزیہ ومزاحیہ ڈرامے پروڈیوس کرنے میں زیادہ مزہ آتا ہے کیونکہ خود میری نیچر میں دوسروں کو ہنسانا، خوش رکھنا شامل ہے۔ حیدر آباد ریڈیو پر میں نے محترمہ انجم انصار صاحبہ کی معرکتہ الآراء کتاب جلترنگ سے بھی مزاحیہ خاکے منتخب کر کے ان کی ڈرامائی تشکیل کی اور بہت لطف آیا، کراچی میں 101 پر پوسٹنگ ہوئی تو انجم انصار صاحبہ کو ٹیلیفون پر آن لائن لے کر جلترنگ سے منتخب حصے ان ہی کی آواز میں نشر کرتی تھی۔ اور پاکیزہ کا یہ مقبول سلسلہ مجھے بے حد پسند ہے۔

پاکیزہ ✧......کراچی اسٹیشن آئیں تو بطور پروڈیوسر کس شعبے کی ذمے داری آپ کے حصے میں آئی؟

ربیعہ اکرم ❖......کراچی اسٹیشن پر آپ کا خط ملا کے ساتھ، ساتھ ڈراما پروڈکشن اور ڈیک جوکی پروگرام ''گل نغمہ'' کی ذمے داری بھی سونپی گئی۔ اور ہم نہایت جوش و خروش کے ساتھ ان ذمے داریوں کو نباہتے تھے۔

پاکیزہ ✧......سینٹرل پروڈکشن یونٹ سے کس نوعیت کے پروگرام نشر ہوتے تھے؟

ربیعہ اکرم ❖......سینٹرل پروڈکشن یونٹ میں موسیقی کی مختلف اصناف مثلاً گیت، غزلیں اور کلاسیکل آئٹمز کی ریکارڈنگ ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ مشاہیر کی برسیوں، تہواروں خصوصی اور اہم ایام کے فیچرز، دستاویزی پروگرام اور تقاریر ہوتی تھیں۔ سینٹرل پروڈکشن یونٹ میں پوسٹنگ کے دوران مجھے موسیقی کی بہترین پروڈیوسر کا ایوارڈ بھی ملا تھا۔ وہیں پر مجھے ایک خصوصی پروگرام بھی تفویض کیا گیا تھا جس کا نام شب بخیر تھا۔ اس پروگرام کی خاص بات یہ تھی کہ زندگی میں پہلی مرتبہ محترم انور مقصود صاحب نے ریڈیو پر کسی پروگرام کی میزبانی کے فرائض انجام دیے۔ اس پروگرام میں ہمارے ''آواز خزانے'' میں موجود مختلف یادگار پروگراموں سے انتخاب پیش کیا جاتا تھا۔ مجھے پہلا نیشنل ایکسی لینس ایوارڈ اسی پروگرام پر ملا تھا۔

پاکیزہ ✧......آپ کے حصے میں یہ اعزاز بھی آیا کہ ریڈیو پاکستان میں اپنی مدتِ ملازمت کے ایک عشرے کے بعد ہی آپ کو وائس آف امریکا کے لیے بھیج دیا گیا آپ کا انتخاب کیسے اور کس بنیاد پر کیا گیا؟

ربیعہ اکرم ❖......وائس آف امریکا کے لیے میرا انتخاب خبروں کے ترجمے میں مہارت اور آواز کی بنیاد پر ہوا تھا۔ وہاں جانے کے لیے میرٹ ہی بنیادی شرط ہوتی ہے۔

پاکیزہ ✧......کبھی فی البدیہہ ترجمہ کرنے کا موقع ملا اور یہ تجربہ کیسا رہا؟

ربیعہ اکرم ❖......اس وقت کے امریکا کے صدر بل کلنٹن تقریر کر رہے تھے اور میں ساتھ ساتھ آن لائن ترجمہ کرتی جا رہی تھی، شدید سردی کے باوجود پسینہ آ گیا تھا، وقتی طور پر گھبراہٹ ہوئی جو فوری طور پر میری طاقت بھی بن گئی اور فطری خود اعتمادی سے ترجمہ کرتی رہی۔ وائس آف امریکا کے انچارج نے بہت تعریف کی جس سے میرا حوصلہ بڑھا اور اس روز مجھے جو اعتماد ملا براڈ کاسٹنگ کے سفر میں وہ آج بھی میرا اہم قدم ہے۔

پاکیزہ ✧......وائس آف امریکا کی اردو سروس سے آپ کس حیثیت سے منسلک رہیں؟ اور کون، کون سے کامیاب پروگرام آپ کے حصے میں آئے؟

ربیعہ اکرم ❖......وائس آف امریکا سے انٹرنیشنل ریڈیو براڈ کاسٹر کی حیثیت سے منسلک رہی وہاں پر پروگرام صبح بخیر اور سوالوں کے موتی جوابوں کی مالا اور امریکا میں مقیم پاکستانیوں کی سرگرمیوں کی رپورٹس بہت کامیاب رہے۔ مجھے آٹھ روزہ دورے پر خصوصاً کیلی فورنیا بھیجا گیا تا کہ وہاں پر مقیم پاکستانی کمیونٹی کے نمایاں افراد کے انٹرویو کروں۔ بہت مزہ آتا تھا۔ اس کے علاوہ خبریں اور رپورٹس تو روز کی ذمے داری تھے۔

پاکیزہ ✧......ریڈیو پاکستان اور وائس آف امریکا کے پروگراموں میں واضح فرق کیا محسوس کیا؟

ربیعہ اکرم ❖......بنیادی فرق پالیسی کا ہے۔ بس اس ایک جملے کو ہی بہت جانیے۔ ہاں قدر



ربیعہ اکرم اپنی فیملی کے ساتھ

مشترک یہ تھی کہ یہاں ہم حکومت پاکستان کی پالیسیوں کے ترجمان ہوتے ہیں جبکہ وہاں امریکی سرکار کی پالیسیوں پر عمل پیرا ہونا پڑتا تھا۔

پاکیزہ ✧......وائس آف امریکا میں ریڈیو پاکستان سے وابستہ کون، کون سے سینئر براڈ کاسٹر تھے کہ آپ کو ان سے سیکھنے کا موقع ملا؟

ربیعہ اکرم ❖......محترم اظہار کاظمی صاحب، محترمہ صفیہ کاظم، شہناز عزیز صاحبہ، صلاح الدین احمد صاحب، سلطان غازی صاحب شامل تھے۔ اور ان تمام سینیئرز سے بہت زیادہ سیکھنے کا موقع ملا۔ ان کو سُن، سُن کر ترجمہ کرنے میں روانی آتی گئی۔

پاکیزہ ✧......وطن واپسی کب ہوئی؟

ربیعہ اکرم ❖......وطن واپسی 2001ء ماہِ ستمبر کے اختتام پر ہوئی اور پھر یکم اکتوبر کو سینٹرل پروڈکشن یونٹ کراچی جوائن کیا۔

پاکیزہ ✧......سینٹرل پروڈکشن سے ایف ایم 101 تک رسائی کیسے ہوئی؟

ربیعہ اکرم ❖......cpu سے ایف ایم ۱۰۱ تک رسائی میں انتہائی اہم کردار سابق کنٹرولر جناب نثار میمن نے ادا کیا۔ وہ جوہر شناس براڈ کاسٹر تھے اور ایف ایم ۱۰۱ کی پروگرامنگ کے لیے ہمیشہ خلوصِ دل سے کوشاں رہتے تھے لہٰذا ان کی ذاتی کوششوں سے ایف ایم ۱۰۱ پر میری پہلی تعیناتی ہوئی۔

پاکیزہ ✧......ایف ایم 101 کراچی مرکز سے آپ نے اپنے سابقہ دور میں خواتین کے کون کون سے کامیاب پروگرام کیے؟

ربیعہ اکرم ❖......نامور خواتین کا کھانا پکانے کا پہلا تجربہ آن لائن پوچھا جاتا تھا۔ دوسرا گھر بیٹھے آمدنی کے ذرائع حاصل کرنے کے طریقے، اس وقت کی اپوا کی روحِ رواں اور معروف ڈراما آرٹسٹ جہاں آراء حئی صاحبہ سے معلوم کیے جاتے تھے۔ بہت مقبول ہوا وہ پروگرام۔ پھر غذا اور غذائیت پر مبنی سلسلے ماہرینِ غذائیت کو مدعو کر کے معلوماتی گفتگو ہوتی تھی۔ پروگرام خواتین کے لیے قانونی مشورے ایڈووکیٹ جنرل تبسم غضنفر قانونی مشورے دیتی تھیں۔ گھر میں حادثات سے نمٹنے کے لیے خواتین کو احتیاطی تدابیر بتانے کے لیے معروف برن سرجن پروفیسر ڈاکٹر شائستہ آفندی اہم ٹپس بتانے آتی تھیں۔ بیوٹیشن سیماخان کا پروگرام گوری کرت سنگار بھی خواتین کا پسندیدہ رہا۔

پاکیزہ ✧......گویا آپ کی امورِ خانہ داری کی

سند یہاں کام آئی؟

ربیعہ اکرم ❖...... جی بالکل اور مجھے اطمینان بھی محسوس ہوتا تھا ایسے پروگرام کر کے۔

پاکیزہ ✧...... ایف ایم 101 ہاٹ لائن پیشکش کا تجربہ کیسا رہا؟ اور سامعین اس سے کیسے مستفید ہوئے؟

ربیعہ اکرم ❖...... یہ ایک نمایاں اور شاندار تجربہ رہا اور ہمارے ایک پروگرام کو جو اولڈ ہومز کے بارے میں تھا' اسلام آباد میں اسٹیشن ڈائریکٹرز کی کانفرنس میں بہت سراہا گیا۔ معاشرے کی بہت سی دُکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا۔ ایف ایم 101 کے مائیکروفون کو اسٹوڈیو سے نکال کر عوام الناس تک لے گئے۔ اور معاشرے کے مختلف مسائل کی نشاندہی کرنے کے ساتھ' ساتھ ان کا حل بھی پیش کیا گیا۔ سامعین شدت سے انتظار کرتے تھے اس پروگرام کا۔ 5,6 گھنٹے کی ریکارڈنگ میں سے آدھے گھنٹے کا پیکج تیار کرنا بھی کارِ دارد تھا۔

پاکیزہ ✧...... خود آپ کو کبھی آؤٹ ڈور براڈ کاسٹنگ کا موقع ملا؟

ربیعہ اکرم ❖...... جی بالکل ہم نے مختلف مواقع پر Road Shows کیے' OB کوریج بھی کی اور خوشی ہوتی تھی کہ ہم ریڈیو پاکستان/ایف ایم 101 کے نمائندوں کی حیثیت سے اپنی شناخت کے ساتھ تقریب کور کرتے تھے۔

پاکیزہ ✧...... فرائضِ منصبی کے حوالے سے وہ کون سے اصول ہیں جن پر آپ کبھی سمجھوتا نہیں کر سکتیں اور ان ہی کی وجہ سے آج آپ کامیاب براڈ کاسٹر اور پروگرام منیجر ہیں؟

ربیعہ اکرم ❖...... میں کسی بھی پروگرام کی تیاری میں غیر سنجیدہ رویے بالکل برداشت نہیں کر سکتی۔ چھوٹے سے چھوٹا یا بڑے سے بڑا کوئی پروگرام ہو میں خود involve نہ ہوں تو مطمئن نہیں ہوتی۔

پاکیزہ ✧...... فیچر اور ڈاکومینٹری پیش کرتے وقت روایتی انداز اختیار کرتی ہیں یا اپنی جدت پسند طبیعت کے مطابق کرتی ہیں؟

ربیعہ اکرم ❖...... روایتوں سے انحراف کرنا ہی میری جدت پسندی کا خاصہ ہے اور میں لگے بندھے فرسودہ طریقوں سے پروڈکشن نہیں کر سکتی۔

پاکیزہ ✧...... پروگرام منیجر کا عہدہ ملنے پر کیا احساسات و عزائم تھے؟ پُرامید تھیں کہ خوش اسلوبی سے تمام ذمے داریاں نباہ لیں گی؟

ربیعہ اکرم ❖...... PM کا عہدہ ملنے کے بعد بھی مجھے تو پروڈیوسر کی طرح ہی کام کرتے ہوئے پایا گیا بلکہ PM بننے کے بعد انتظامی امور کے ساتھ ساتھ پروڈکشن کا بے تحاشا کام کیا۔ مسلسل چار سال قومی نشریاتی رابطے کے تمام اہم پروگرام پی بی سی کراچی سے پیش کیے۔

پاکیزہ ✧...... پروگرام منیجر کی بنیادی ذمے داری کیا ہے؟ فرائض کی ادائیگی میں آزمائش کی گھڑی آئی تو آپ کیسے نبرد آزما ہوئیں؟

ربیعہ اکرم ❖...... PM کی بنیادی ذمے داری تو پروگرام کا انتظام و انصرام ہے لیکن چونکہ پروڈکشن اسٹاف کی کمی ہے۔ لہٰذا پروڈکشن کا کام بھی کرنا پڑتا ہے اور ریڈیو پاکستان کی ملازمت کا تو دوسرا نام ہی آزمائشوں سے نبرد آزما ہوتا ہے بس یوں سمجھ لیجیے ع
ایک آگ کا دریا ہے اور تیر کے جانا ہے۔ بس آپ کو تیراکی کا ماہر ہونا چاہیے۔

پاکیزہ ✧...... قومی نشریاتی رابطے پر آپ نے پہلا پروگرام کب اور کون سا کیا؟

ربیعہ اکرم ❖...... قومی نشریاتی رابطے پر پہلا پروگرام تو میں نے پروڈیوسر بننے سے بھی کافی پہلے بحیثیت میزبان کر لیا تھا۔ جب ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے ہم ہر ہفتے ایک نیا ڈراما پیش کرتے تھے تو اس وقت کے پروڈیوسر پرویز اختر صاحب مجھ سے براہِ راست پورے ڈرامے کا خلاصہ اتعارف قومی نشریاتی رابطے پر پڑھوایا کرتے تھے۔

پاکیزہ ✧...... ایف ایم 93 سے عرصۂ دراز سے



ربیعہ اکرم پروگرام ''یہ بچہ کس کا ہے'' کی میزبانی کرتے ہوئے

نشر ہونے والے پروگرام ''یہ بچہ کس کا ہے'' میں بحیثیت میزبان اور پروڈیوسر اپنی ذمے داری کیسے پوری کی ۔اس ضمن میں کوئی کامیابی آپ کے حصے میں آئی ؟

ربیعہ اکرم ❖......ایف ایم 93 پر ہمارے سابق اسٹیشن ڈائریکٹر تنویر اقبال صاحب نے پروگرام ''یہ بچہ کس کا ہے'' کی ذمّے داری سونپی۔ میں نے اس پروگرام کے اندازِ پیشکش کو بھی جو برسوں پرانا تھا تبدیل کیا۔ ایدھی ہوم سے آنے والے بچوں کے ساتھ میرے اندازِ گفتگو کو سامعین اور اسٹاف نے بہت سراہا۔ یقین کیجیے کہ میں خود بچوں سے گفتگو کرتے وقت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی تھی اور مجھے خوشی ہے کہ میرے انٹرویو کیے 95 فیصد بچے اپنے گھروں کو پہنچ گئے۔ یہ پروگرام مجھے تو ایک ثوابِ جاریہ محسوس ہوتا تھا۔ میں تنویر اقبال صاحب کی انتہائی شکر گزار ہوں۔ جنہوں نے اس کام کے لیے مجھ پر اعتماد کیا۔

پاکیزہ ✧......ایف ایم 93 کے پروگرام ''صبحِ پاکستان'' میں بحیثیت میزبان پروڈیوسر آپ نے صرف سامعین کی تعداد ہی میں نہیں مقبولیت میں بھی اضافہ کیا۔ آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

ربیعہ اکرم ❖......پروگرام ''صبحِ پاکستان'' میرے لیے ایک بہت بڑا چیلنج تھا کیونکہ مجھ سے پہلے عظیم سرور، اقبال فرید اور نرگس رشید جیسے مقبول براڈ کاسٹرز یہ پروگرام پیش کر چکے تھے اور ایک عرصہ دراز کے تعطل کے بعد یہ پروگرام دوبارہ شروع ہوا تھا۔ اس لیے سب کچھ نئے سرے سے کرنا تھا۔ اللہ کی بے حد شکر گزار ہوں کہ اپنی محنت اور نیند کی قربانی کی بدولت اس پروگرام کی پیشکش میں کامیاب رہی اور تیسرا انیشنل ایکسی لینس ایوارڈ ملا۔ اس پروگرام کو ریڈیو پاکستان کا مقبول ترین پروگرام قرار دیا گیا۔ یہ وہ واحد پروگرام تھا جس کے لیے ریڈیو پاکستان کی اس وقت کی ڈائریکٹر جنرل محترمہ ثمینہ پرویز نے خود فون کر کے مجھے پروگرام کرنے کے لیے کہا۔ اس پروگرام کی بدولت مجھے ملک بھر کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے لاکھوں سامعین کی محبت، ستائش اور خلوص حاصل ہوا جو میرا اثاثہ تھا۔

پاکیزہ ✧......ایف ایم 94 کے بارے میں بتایئے؟

ربیعہ اکرم ❖......ایف ایم 94 سے ریڈیو پاکستان کے ''آواز خزانے میں'' موجود بیش بہا ریکارڈنگز کے مناسب کمپیئرنگ کے ساتھ باقاعدہ پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ ایف ایم 94 ریڈیو پاکستان کے ورثے کو مقبول عام کر رہا ہے۔

پاکیزہ ✧......ایف ایم 93 اور ایف ایم 101 کے مزاج میں بنیادی فرق کیا ہے؟

ربیعہ اکرم ❖......ایف ایم 93 اور ایف ایم 101 دونوں کا اندازِ پیشکش مختلف ہے۔ ایف ایم 93 پر ریڈیو پاکستان کے روایتی طرز کے پروگرام ہوتے ہیں۔ جبکہ 101 پر پروگراموں میں موسیقی کا تناسب زیادہ ہوتا ہے جبکہ پبلک سروس کا بھی خیال رکھا

جاتا ہے۔ یہاں پر نسبتاً نوجوانوں کو میزبانی کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔جس کا ٹیمپو فاسٹ ہوتا ہے۔

پاکیزہ ✧......آپ کے زرخیز تخلیقی ذہن نے ہمیشہ ریڈیو پاکستان کے توسط سے خواہ وہ ایف ایم 101 ہو یا ایف ایم 93 خواتین کے لیے کارآمد اور مفید پروگرام پیش کیے۔آج کل ایف ایم 101 سے خواتین کے کون،کون سے پروگرام پیش کررہی ہیں؟

ربیعہ اکرم ❖......آج کل ایف ایم 101 سے معاشرے کی کامیاب خواتین کے انٹرویوز پر مبنی پروگرام ''کہانی میری کامیابی کی'' نشر ہو رہا ہے اس کے علاوہ رشتوں ناتوں کی نزاکتوں پر مبنی روحانی مسائل پر مبنی نفسیاتی مسائل اور ان کے حل پر مبنی اور ایف ایم 101 کی خواتین آرجیز کی آپس کی کھٹی میٹھی باتوں پر مبنی پروگرام پیش کیے جارہے ہیں۔

پاکیزہ ✧......کیا آپ سمجھتی ہیں کہ آپ اپنے مقصد میں کامیاب رہیں؟

ربیعہ اکرم ❖......مقصد میں کامیابی اگر سامعین کی تعداد میں اضافہ ہے تو یقیناً یہ کامیابی ہے۔

پاکیزہ ✧......آواز کی دنیا میں اپنے ہم عصروں میں سے کس کی آواز اور کارکردگی سے متاثر ہیں؟

ربیعہ اکرم ❖......اپنے سینئرز سید نور اظہر جعفری،شہناز وسیم، شبینہ افتخار صاحبہ، یاسمین طاہر صاحبہ،تنویر اقبال صاحب،خلیل چنہ صاحب میری پسندیدہ آوازیں اور ماہرین نشریات ہیں۔

پاکیزہ ✧......براڈکاسٹنگ کے شعبے میں آنے کے خواہشمندوں کو آپ کیا صلاح دیں گی؟

ربیعہ اکرم ❖......براڈکاسٹنگ کے شعبے کو ملازمت سمجھ کر نہ آئیں اسے ایک جذبہ یا شوق سمجھ کر اپنائیں۔

پاکیزہ ✧......پسندیدہ ادیب و شاعر کی فہرست میں سرفہرست کون سے نام ہیں؟

ربیعہ اکرم ❖......ادیبوں میں مشتاق احمد یوسفی کی دلدادہ ہوں جبکہ پسندیدہ شاعر فیض صاحب اور پروین شاکر ہیں۔

پاکیزہ ✧......ہمارے قارئین کی دلچسپی کے لیے بتائیے کہ فیض صاحب سے اپنی عقیدت کا عملی ثبوت آپ نے کیسے پیش کیا؟

ربیعہ اکرم ❖......میں نے اپنے بیٹے کا نام ہی فیض خان رکھ دیا۔فیض صاحب کا شعر ہے

فیض ان کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنہیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام

بیٹی کا نام وفا ہے گویا مذکورہ شعر کے مصرعۂ اول سے ہم نے بیٹے اور بیٹی دونوں کا نام رکھ کر فیض صاحب سے اپنی عقیدت کا عملی ثبوت پیش کردیا۔

پاکیزہ ✧......بیٹی بھی اکلوتی اور بیٹا بھی ،کیا آپ ان کی تعلیم وتربیت پر مساوی توجہ دیتی ہیں؟

ربیعہ اکرم ❖......ربیعہ اکرم:جی ہاں اولادوں کے سلسلے میں چاہے وہ تعلیم ہو یا تربیت مساوی سلوک کی قائل ہوں،دعاگو ہوں کہ میری بیٹی وفا اعلیٰ نصیب ہو اور ایک قابل ڈاکٹر کے روپ میں مسیحا بنے جبکہ بیٹا فیض اپنے والد کا سہارا بنے اور خاندان کا نام روشن کرے آمین!

پاکیزہ ✧......وہ کون سی حکمتِ عملی ہے جسے اختیار کرکے ملازمت پیشہ عورت گھر اور دفتر دونوں میں توازن برقرار رکھ سکتی ہے؟ آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے؟

ربیعہ اکرم ❖......سچ بتاؤں تو میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ یہ توازن برقرار رکھنا انتہائی مشکل ہے بلکہ کسی حد تک ناممکن بھی۔میرا اپنا تجربہ تو یہ کہتا ہے کہ خواتین کو ملازمت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ بہرحال نہ صرف گھر بلکہ صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔

پاکیزہ ✧......ازدواجی زندگی کے استحکام کے لیے گھریلو اور ملازمت پیشہ عورت کا کردار ایک ہی ہے......یا جدا جدا؟

ربیعہ اکرم ❖......جدا جدا ہیں بھئی ،ملازمت پیشہ خواتین تو بیچاری دوہری ذمّے داریاں ادا کرتی ہیں۔پھر بھی طعنے ہی سنتی ہیں جبکہ گھر بیٹھی خواتین زیادہ فائدے میں رہتی ہیں۔



ربیعہ اکرم جنرل راحیل شریف کی ہمشیرہ محترمہ خالدہ سعادت کا انٹرویو کرتے ہوئے

پاکیزہ ✧......آپ کی نظر میں آزادیِ نسواں کا تصور کیا ہے؟

ربیعہ اکرم ❖......میری نظر میں آزادیِ نسواں اس حد تک ہی ہے جب ہماری مذہبی اقدار متاثر نہ ہوں ،معاشی استحکام کے لیے باہر کام ضرور کریں لیکن اگراس کام سے تمام نمازیں قضا ہو جائیں تو پھرکوئی فائدہ نہیں۔

پاکیزہ ✧......آپ کا پسندیدہ رشتہ، رنگ، خوشبو، موسم، وقت، کتاب، ڈش، تہوار، تفریحی مقام اور کھیل کون کون سے ہیں؟

ربیعہ اکرم ❖......پسندیدہ رشتہ ماں، رنگ نیلا، گلابی اور سفید، خوشبو ہراچھے پرفیوم کی، موسم بہار کا، ڈش کڑھی چاول اور کوفتے، پالک پنیر، باربی کیو، وقت عصراور مغرب کا درمیانی وقت، کھیل کرکٹ اور تفریحی مقام ساحلِ سمندر۔

پاکیزہ ✧......آپ کا شمار پاکیزہ ڈائجسٹ کے قارئین میں کس وقت سے ہوتا ہے، اپنی یادیں تازہ کریں گی؟

ربیعہ اکرم ❖......میں پاکیزہ ڈائجسٹ کی اس وقت سے قاری اور شیدائی ہوں جب لڑکیوں کو ڈائجسٹ پڑھنے کی اجازت نہیں تھی اور وہ لحاف میں چھپ چھپ کر یا کتاب میں چھپا کر پڑھتی تھیں۔ ہمارا بھی کچھ یہی حال تھا پاکیزہ کے فہرست والے صفحے سے لے کر آخری اشتہار تک کئی بار نظر سے گزرتے تھے اور پھر اگلے ماہ کا انتظار شروع ہو جاتا۔ میری شادی کی تصویر بھی پاکیزہ میں چھپی تھی۔ اب دفتری اور گھریلو ذمے داریوں میں الجھ کر وہ پہلی سی فرصت ہی نہیں ملتی۔ بے قاعدگی سے ہی موقع ملے تو پاکیزہ پڑھتی ضرور ہوں۔

پاکیزہ ✧......با اعتبارِ مجموعی پاکیزہ کیسا ڈائجسٹ ہے؟

ربیعہ اکرم ❖......پاکیزہ ڈائجسٹ بھی اسمِ بامسمیٰ ہی ہے اور یہی پاکیزہ کا کمال ہے۔

پاکیزہ ✧......پاکیزہ ڈائجسٹ کی قارئین بہنوں سے کچھ کہیں گی؟

ربیعہ اکرم ❖......خود بھی خوش رہیں اور اوروں کو بھی خوش رکھیں۔ پاکیزہ کی قارئین بہنوں کی انتہائی شکر گزار ہوں، جنھوں نے مجھے آخری سطور تک برداشت کیا، بس جن نگاہوں سے یہ سطور گزر رہی ہیں پلیز وہ میری اور میرے اہلِ خانہ کی صحت و سلامتی کے لیے خصوصی دعا کریں اور مجھے دیارِ رسول ﷺ اور خانۂ خدا کی حاضری نصیب ہو اور میں وہاں احسن طریقے سے تمام ارکان پورے کر سکوں آمین۔ ثم آمین!

آخر میں بہنو! ہم اپنی اور ادارۂ پاکیزہ کی جانب سے ربیعہ اکرم کے بے حد ممنون ہیں کہ جنھوں نے انتہائی مصروفیت کے باوجود پاکیزہ کو میزبانی کا شرف بخشا اور معلومات سے پُر دلچسپ گفتگو نذرِ قارئین کی۔ انشاء اللہ اسی طرح ہم میزبانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے مزید گوہرِ نایاب اس محفل میں لانے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

☆☆☆



بہنوں کی محفل

مدیرہ

★ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ!

★ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔ پیاری بہنو...... اللہ پاک آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور اپنے خزانۂ غیب سے وہ سب کچھ عطا فرمائے جو آپ کے حق میں بہتر ہو۔ یاالٰہی دونوں جہان میں ہم سب کی خیر ہو اور تو ہم سے ہمیشہ راضی رہے۔ آمین ثم آمین۔

☆ پیاری بہنو! 2015ء کے آخری شمارے کے ساتھ حاضر ہوں...... 2015ء کب آیا اور کب ختم ہوا کہ دن بھاگ رہے ہیں اور وقت کا پہیا تیز چل رہا ہے۔ کتنے پیارے لوگ ہم سے بچھڑ گئے اور کتنے حادثات اور سانحات اس سال کی جھولی میں آگرے...... پھر بھی اللہ کا ہم جتنا بھی شکر ادا کریں کہ اس نے ہمیں ہماری اوقات سے بہت زیادہ عطا کیا۔ ہماری خطاؤں، گناہوں اور نافرمانیوں کے باوجود...... ہمیں اپنی پناہ میں رکھا۔ (الحمدللہ)

پیاری بہنو! آج آپ سے چند باتیں اپنے بچوں کے متعلق کہنی ہیں...... کہ بطور ماں ہمارا کام انہیں صرف کھلانا، پلانا، اسکول اور ٹیوشن بھیجنا ہی نہیں ہے...... آپ اپنے بچوں کی دوست بھی بنیں کہ وہ بات جو بچہ کسی نے نہ کہہ سکے وہ اپنے والدین سے شیئر کر سکے۔ میں نے بہت سے ایسے گھرانے دیکھے ہیں جہاں غربت کے باوجود بچوں کا اتنا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے کہ ان بچوں میں احساسِ کمتری کہیں دور، دور تک نظر نہیں آتا...... یاد رکھیے جس بچے کا اپنے گھر میں کسی بھی وجہ سے مذاق اڑایا جاتا ہے وہ بزدل بن جاتا ہے...... اور جس بچے پر اعتبار نہیں کیا جاتا وہ دھوکے دینا سیکھتا ہے جن گھرانوں میں بچوں کی ہر، ہر بات پر تنقید کی جاتی ہے کہ تم نے ایسا کیوں کیا، ویسا کیوں نہیں کیا، تم تو کبھی اپنی جماعت میں فرسٹ آ ہی نہیں سکتے وغیرہ تو ایسے بچے کوشش کرنا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اور یہ جان کر شاید آپ کو حیرت ہو کہ بچہ اپنی تعریف سن کر بے حد خوش ہوتا ہے اور تعریف اسے توانا بنا دیتی ہے اس کا حوصلہ بڑھتا ہے مگر جن گھرانوں میں اپنے بچوں کی تعریف اس وجہ سے نہیں کی جاتی کہ کہیں ان کا دماغ خراب نہ ہو جائے ایسے زیادہ تر بچے اچھی چیزوں کو پسند کرنا ہی ختم کر دیتے ہیں۔ آج بھی ہمارے بیشتر گھرانوں اور اسکولوں میں مارنے پیٹنے کا رواج ہے۔ میڈیا پر ایسے بہت سے شواہد دکھانے کے باوجود بچوں کو گھروں میں مارنا بند نہ ہوا...... والدین بھی انہیں مارتے ہیں، استاد بھی، جہاں وہ ملازمت کرتے ہیں وہاں کے مالکان بھی تشدد کرتے ہیں...... اور ایسے تمام بچوں کی صلاحیتیں دب جاتی ہیں...... ایک اخباری سروے کے مطابق بہت سے بچوں کے قد چھوٹے ہونے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی...... انہیں بچپن میں بے حد مارا پیٹا گیا...... اور بہت سے بچوں کی سماعت بھی کم ہو گئی۔ نئے سال کا سورج طلوع ہونے کو ہے اب یہ آپ کا فیصلہ ہے کہ اپنے پھول جیسے بچوں کا کیسا اور کتنا خیال رکھنا ہے۔

☆ آیئے اس سے قبل کہ اپنی بہنوں کی سرگرمیوں سے آگاہ ہوں، آیئے پہلے ایک بار درود ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے، ابھی پڑھ لیں اور اس کے بعد صرف تین بار آیتِ کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

★ اگر ہمیں ویزا مل گیا تو انشاءاللہ، جنوری میں آپ کی باجی انجم انصار، سڈنی (آسٹریلیا) میں ہوں گی وہاں پاکیزہ کی قاری بہنیں ٹیلی فونک رابطہ کرنا چاہیں تو مجھ سے فی الحال کراچی کے اس نمبر پر رابطہ کر کے اپنا فون نمبر بتا دیں اور دیگر بہنیں بھی میرا یہ نیا نمبر نوٹ کر لیں کیونکہ پرانا نمبر میں نے بند کروا دیا ہے۔ میرا کراچی کا نیا نمبر یہ ہے۔ 021-36964779

★ پاکیزہ کی مستقل قاری عصمت، اوکاڑہ کے بھائی ڈاکٹر سرور چوہدری کی بیٹی میشا نے اپنا میڈیکل مکمل کر لیا ہے اور 24 جنوری کو اس کی شادی طے پا گئی ہے۔ (مبارکاں)

- پاکیزہ کی مستقل قاری ثنا عباس بھتیجی پیر گودھا نے اپنا ایل ایل بی کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کرلیا ہے۔(ماشاء اللہ)
- مصنفہ ساجدہ حبیب کی پیاری بھتیجی جس نے حال ہی میں ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا ہے اس کی شادی گزشتہ دنوں... میرپور آزاد کشمیر میں بخیر و خوبی انجام پائی۔(مبارکاں)
- مصنفہ تسنیم منیر علوی اپنے قریبی عزیزہ کی شادی میں شرکت کرنے اس ماہ دبئی سے کراچی آرہی ہیں۔(خوش آمدید)
- پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ شمسہ الماس، عزیز و اقارب سے ملنے کے لیے ناروے سے پاکستان آنے والی ہیں۔(خوش آمدید)
- پاکیزہ کی معروف شاعرہ شگفتہ شفیق، لندن میں ہونے والے ایک مشاعرے میں شرکت کرنے کے لیے کراچی سے لندن روانہ ہوگئی ہیں۔(ماشاء اللہ)
- مصنفہ سلمیٰ غزل چھ ماہ اپنے بیٹے کے پاس امریکا رہنے کے بعد واپس کراچی آگئی ہیں۔(خوش آمدید)
- پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ذکیہ ایوب، لاہور سے کراچی آگئی ہیں۔(ماشاء اللہ)
- پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ارم کمال، فیصل آباد کی بیٹی کی شادی ہوئی ہے۔(مبارک باد)
- پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار سمیرا حمید فاروق، کراچی کی ڈاکٹر بیٹی، سعدیہ کی شادی عبداللہ کے ساتھ خوب دھوم دھام سے ہوئی...... جس میں شرکت کرنے کے لیے بیرون ممالک سے، بہت سے مہمان آئے۔(مبارکاں)
- پاکیزہ کی مستقل قاری مس ریما کی منگنی اپنے کزن فیصل کے ساتھ انگلینڈ میں ہوئی۔(مبارک باد)
- پاکیزہ کی مستقل قاری مسز فریدہ سجاد کی بھتیجی ثنام شاہد نے اے لیول کے امتحان میں ٹاپ کیا اور اب اسکالرشپ پر لندن میں داخلہ ہوگیا ہے(ماشاء اللہ)
- گزشتہ دنوں مصنفہ رخ چوہدری کی پیاری سی بھانجی ربیعہ کی منگنی خرم کے ساتھ خوب دھوم دھام کے ساتھ ہوئی۔
- مصنفہ اور تبصرہ نگار نائلہ بلیغ الرحمن، بہاول پور کی اس ماہ سالگرہ ہے۔
- پاکیزہ کی تبصرہ نگار فرحانہ پروین، راول پنڈی کی اس ماہ سالگرہ ہے۔
- پاکیزہ کی تبصرہ نگار رخسانہ امجد، ملکوال کی بھی اس ماہ سالگرہ ہے۔
- اس ماہ تبصرہ نگار فصیحہ آصف خان، ملتان کی بہن حمیرا کی سالگرہ ہے۔(مبارک باد)

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

- ☆ مصنفہ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی کی طبیعت ناساز ہے۔
- ☆ میرا کزن سید احمد کمال بخاری، امریکا میں شدید بیمار ہے۔
- ☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز ستارہ شیخ، کراچی علیل ہیں۔
- ☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار شازیہ محبوب، کراچی کی طبیعت ناساز ہے۔
- ☆ ہماری بہت سی دیگر تبصرہ نگار بہنیں اور مصنفات ان دنوں موسم کی تبدیلی کے باعث موسمی بخار و نزلہ و زکام میں مبتلا ہیں۔
- ☆ مصنفہ سیما بنت عاصم کی والدہ کے لیے دعائے صحت۔
- ☆ مصنفہ شائستہ زریں کی والدہ کے لیے دعائے صحت۔
- ☆ مصنفہ نگہت غفار کی سمدھن ان دنوں بیمار ہیں۔
- ☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ذکیہ ایوب، کراچی علیل ہیں۔
- ☆ شاعرہ فریدہ جاوید فری، لاہور ان دنوں بیمار ہیں۔
- ☆ پاکیزہ کی مستقل قاری ڈاکٹر میمونہ غوری، کراچی گھٹنوں کی تکلیف میں مبتلا ہیں۔
- ☆ مصنفہ شاعرہ سیما رضا ردا، ریڈیو پاکستان کراچی کی خورشید آپا شدید بیمار ہیں۔
- ☆ پاکیزہ کی مستقل قاری شہلا ظفر، کراچی ہنوز بستر علالت پر ہیں۔
- ☆ مصنفہ پاکیزہ کی مستقل قاری عذرا بی بی، راول پنڈی بیمار ہیں۔

☆ مصنفہ فاخرہ گل، اٹلی کی پاکستان میں مقیم والدہ علیل ہیں۔
☆ شاعرہ اور تبصرہ نگار ظل شاہین، رحیم یار خان کی والدہ بیمار ہیں۔
☆ ہم سب کی لاڈلی تبصرہ نگار اور شاعرہ امینہ عندلیب، سلانوالی اس ماہ بھی شدید بیمار رہیں اور انہیں کئی بار اسپتال بھی ایڈمٹ ہونا پڑا۔
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری فریدہ، شریف آباد بے حد پریشان ہیں۔
☆ بہن الف، ج، سندھ کی اپنے شوہر سے بحث و تکرار اتنی زیادہ بڑھی کہ ان کے شوہر نے کہا کہ اگر انہوں نے یہ چائے پی لی تو وہ ان پر حرام ہیں اور وہ بہن وہ چائے سرعت سے پی گئیں۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو نیک ہدایت دے...... اور اب ان کے شوہر لگاتار ساٹھ روزے رکھیں یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائیں اور ایسے معاملات مجھ سے پوچھنے کے بجائے دارالعلوم سے رابطہ کیا کریں..... مگر ہماری بہنیں سب کے لیے لازمی دعا کریں کہ ایسے لوگوں کو عقلِ سلیم عطا فرمائے...... اور اپنا دماغ فضول باتوں پر خرچ نہ کریں کہ مذاق میں یا بحث میں طلاق یا حرام کی باتیں کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

انتقالِ پُرملال

☆ گزشتہ دنوں مصنفہ سدرۃ المنتہیٰ کے والد ماجد انتقال کر گئے۔
☆ مصنفہ حمیرا نوشین، منڈی بہاؤالدین کے بھائی اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔
☆ پاکیزہ کی شاعرہ اور تبصرہ نگار راشدہ صمد، ٹورنٹو اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئیں۔
☆ نوٹ: تمام مرحومین کی مغفرت کی دعا کے ساتھ صرف تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کریں۔

☆☆☆

✉ عصمت، اوکاڑہ سے۔ "پاکیزہ کی بہنوں کی محفل میں میرا خط شائع ہوا...... میرے پاس تو بہت فون آئے مگر مجھ سے زیادہ میرے ڈاکٹر بھائی سرور چوہدری کے پاس آئے۔ وہ چائلڈ اسپیشلسٹ ہے۔ اس کی تمام مریض خواتین نے اس سے کہا آپ کی آپا کا خط پاکیزہ میں لگا ہے۔ ماشاء اللہ یہاں ہمارا بہت بڑا حلقۂ احباب ہے اور میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ سرگودھا اور اوکاڑہ والے آپ سے بہت محبت کرتے ہیں اور آپ کی تحریروں کو پسند کرتے ہیں۔" (ہمیں بھی تو آپ لوگوں سے محبت ہے...... اور محبت کا جواب تو محبت ہی ہوا کرتا ہے)

✉ تحسیم فضل خالق، پشاور سے۔ "اداریہ زبردست تھا۔ ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا کیسی خوب صورت روداد ہے...... کیسا پیارا لکھا ہے ذکیہ صاحبہ نے کہ ان پر بے اختیار پیار آ جاتا ہے۔ نگہت سیما کی اعتبارِ وفا کی ہر قسط دوسرے سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ عنیقہ محمد بیگ کی کہانی وہ طلب گار تھا میں مریم مجبور تھی اسے معافی دینے کے لیے کہ رویّے انسان سے بعض فیصلے کرا دیتے ہیں۔ نبیلہ ابر راجا کا متاعِ دل ہمیشہ کی طرح دلچسپ تھا۔ دُرِ ثمین بلال کے ناول کی یہ قسط بھی زبردست تھی۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ رفاقت جاوید کا افسانہ ایک حقیقت ایک فسانہ پڑھ کر کہیں لڑکیاں فوجیوں سے شادی کرنے سے منکر نہ ہو جائیں۔ صدف آصف کی وقعت پڑھ کر مزہ آیا۔ دلچسپ کہانی تھی۔ شیریں حیدر کی زندگی خاک نہ تھی کا یہ حصہ بھی بے حد اثر انگیز تھا۔ غزالہ عزیز کی جیت خرد کی جیت تو تھی ہی لیکن اس کہانی میں خدا پر یقین کا خوب صورت سبق دیا گیا ہے۔ قیصرہ حیات کی آخری امید اس شمارے کی جان تھی...... کتنے لوگ ہوں گے جن کا ایمان اس کہانی کو پڑھ کر مضبوط تر ہوا ہوگا۔ تم میرے قریب ہوتیں قیصرہ تو میں تمہاری انگلیاں چوم لیتی۔ اقبال بانو کا اپنا الگ انداز ہے ان کے ناولٹ کے دوسرے حصے نے مزہ دیا۔ اُمِ ایمان قاضی کی شناخت دلچسپ کہانی تھی لیکن اینڈ میں جلدی کر دی۔ فاطمہ خان کی مختصر کہانی، کہانی محبت کی نے مزہ نہیں دیا۔ مکمل ناول حقیقت سحر ساجد کی سچ سچ کی حقیقت تھی کچھ حقیقتیں کڑوی ضرور ہوتی ہیں لیکن ہوتی تو حقیقت ہی ہیں۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ اختر شجاعت کی شمعِ ہدایت سچ مچ ہدایت کی شمع تھی۔ سندھ میں شادی کی رسمیں نے علم میں اضافہ کیا...... رفعت شبانہ بڑی پیاری سی ہیں۔۔۔ پاکیزہ کے مہمان، اب رائٹرز کے علاوہ اور لوگ بھی ہونے لگے...... سارہ رضا خان سے ملاقات اچھی لگی۔ جلترنگ ہمیشہ کی طرح زبردست تھا۔ عیدی، سب سے اچھا لگا...... اللہ آپ کو اور آپ کے قلم کو سلامت رکھے آمین۔" (تفصیلی تبصرے کا شکریہ)

✉ شگفتہ قدیر، لاہور سے۔ ”انجم باجی میں جاب کرتی ہوں اور گھر کے کام کاج بھی مگر آپ میری روحانی استاد ہیں اور آج آپ کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے رابطہ کر رہی ہوں جب سے آپ نے روزانہ دو نفل شکرانے کے پڑھنے کے لیے بتایا تب سے میں روز پڑھا کرتی ہوں اور آپ کی بتائی ہوئی باتوں سے بہت کچھ سیکھتی ہوں۔ میں ریڈیو سے بھی فوجی بھائیوں کا پروگرام پیش کرتی ہوں۔ پاکیزہ میں آپ کی تحریریں ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں...... آج آپ سے اس وجہ سے بھی رابطہ کیا ہے کہ عظمیٰ آفاق کی تحریروں کی بھی تعریف کروں، مجھے ذیشان کی شادی کا احوال بے حد اچھا لگا ہے...... اتنی سچائی سے ایسا سب کچھ لکھنا...... شاباش ہے بھئی میری مبارک باد دیجیے گا عذرا بہن کو۔“ (پیاری شگفتہ اس محفل میں خوش آمدید...... تم نے تو آتے ہی میری اس قدر تعریفیں کر دی ہیں کہ سچی مجھے شرم آرہی ہے...... یہ سب آپ بہنوں کی محبت ہے اور اللہ کا مجھ پر کرم کہ میں جو بھی جیسا بھی لکھ دوں آپ سب کو اچھا لگتا ہے۔ ہاں عذرا رسول آپ کا شکریہ ادا کر رہی ہیں کہ آپ ذیشان کی شادی کا احوال پسند آیا)

✉ صفیہ بیگم، لالہ موسیٰ سے۔ ”ذیشان کی شادی کا احوال پتا نہیں کتنی مرتبہ پڑھا ہے آپ کو بتا نہیں سکتے اور تصویریں تو بار، بار دیکھ رہے ہیں۔ ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے ہیں کہ شادی کا احوال مزے کا ہے یا تصویریں زیادہ اچھی ہیں...... ہر چیز اتنی پیاری ہے کہ مزہ ہی آگیا۔“ (شکریہ)

✉ صبا نور، لیہ سے۔ ”باجی آپ کے حکم کے مطابق اب میں انٹر کا امتحان علامہ اقبال یونیورسٹی سے دینے والی ہوں...... اور میری تعلیمی قابلیت بڑھانے میں سو فی صد آپ کا ہاتھ ہے۔ (یہ سب تمہاری اپنی محنت وجہ سے ہو رہا ہے۔ اگر تم میری بات نہ مانتیں تو ایسا کیسے ہو سکتا تھا) اس ماہ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی قسط پڑھ کر بہت مزہ آیا مگر پلیز صفحات بڑھا دیں۔“ (ہاں اس دفعہ صفحات بڑھے ہوئے ہیں)

✉ نرگس نسیم، صابہ موہڑہ سے۔ ”ہر ماہ پاکیزہ لازمی پڑھتی ہوں اور تبصرہ بھی اکثر لکھتی ہوں مگر مسئلہ ڈاک میں پوسٹ کروانے کا ہے کہ کون جائے میری جاب ایسی ہے کہ گھر آتے آتے اکثر چار بج جاتے ہیں۔ آپی مجھے وہ وقت یاد آتا ہے جب میں ایک ہی دن میں رسالہ ختم کر کے اگلے ماہ کا بے چینی سے انتظار کرنے لگتی تھی اور بعض دفعہ تو آپ اور خاص کر کے نزہت کے کان کھا جاتی تھی کہ اگلا شمارہ کب آئے گا۔ عذرا آپی کیسی ہیں۔ میری طرف سے عذرا، عظمیٰ اور نزہت کو پیار و سلام کہیے گا۔ آپ کا تو مجھے سو فیصد یقین ہے کہ آپ مجھے بھولی نہیں کہ آپ ہر سالگرہ پر میرا نام انتہائی پیار سے دیتی رہیں ہیں۔ ہاں نزہت آپی مجھے بھول گئی ہوں۔“ (ہم پیارے قارئین، مصنفات، تبصرہ نگاران کسی کو نہیں بھولتے۔ وہ بھی نہیں بھولیں اب آپ مکمل تبصرے کے ساتھ آنا)

✉ افسر سلطانہ، کراچی سے۔ ”اکتوبر کا شمارہ ہاتھ میں ہے۔ آپ نے بالکل صحیح لکھا...... پچھلے سال حج میں یہ سب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا...... دل چاہتا ہے اس مقدس سفر کے بارے میں لکھوں اگر آپ کی اجازت ہو (جی ضرور) اب ہو جائے بات ناولٹ کی...... نبیلہ اور اقبال بانو کے ساتھ اُم ایمان قاضی کو بھی پڑھا...... تینوں ناولٹ اچھے رہے۔ افسانوں میں کرچیاں دل کی سب سے اچھا افسانہ رہا۔ خصوصی مضامین کے حوالے سے چاروں سلسلے اچھے تھے۔ ناہید سلطانہ اختر کب پاکیزہ کی مہمان بنیں گی۔ انتظار رہے گا۔ (بہت جلد، انشاء اللہ...... پیاری ناہید تیار ہو جاؤ) اعتبارِ وفا کی یہ قسط بھی اچھی رہی۔ اس دفعہ پاکیزہ ڈائری میں اشعار بہت زبردست لگے۔ جلترنگ میں عیدی اور بے اختیاری میں پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ اختر شجاعت اب باقاعدگی سے آرہی ہیں۔ اچھا لگتا ہے۔“ (تبصرے کا شکریہ)

✉ راحت وفا، لاہور۔ گڑیا آپ کو میرا فون اس وجہ سے نہیں مل رہا کہ پرانا نمبر بند کروا دیا ہے۔ اب آپ اور دیگر بہنیں میرا نیا نمبر نوٹ کر لیں۔ 021.36964779

✉ انیسہ زینب، فاروق آباد سے۔ ”نومبر کا شمارہ جلد ہی مل گیا تبھی وقت پر تبصرہ بھجوا رہی ہوں ورنہ ہمیشہ دیر کر دیتی ہوں میں۔ پورا تو ابھی تک پڑھ نہیں پائی مگر جلترنگ، وہ آئے بزم میں، شمع ہدایت اور ملنے کو جی کرتا ہے پہلے پڑھ لیا اور سب سلسلے پسند بھی آئے۔ افسانوں میں ابھی تک بھوک پسند آیا۔ باتیں بہار و خزاں کی نامی سلسلہ اچھا اضافہ لگا۔ سلسلے وار ناول بھی اچھے رہے باقی پڑھنے باقی ہیں۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی روداد دلچسپ لگی ہے اور اگلے حصے کا انتظار رہے گا۔“ (شکریہ)

✉ شبنم کنول، گاؤں پاپا نگری سے۔ ''آخری امید، قیصرہ جی کیا کمال ہے آپ کی۔ نگہت سیما، شیریں حیدر، فرحین اظفر تسی وی گریٹ او...... دُرِ ثمن بلال کے ناول نے اچھا اسٹارٹ لیا ہے امید ہے یہ اسٹوری ہمیں بور نہیں کرے گی اور پلیز اسے زیادہ لمبا بھی مت کیجیے گا۔ افسانے بھی سب اچھے تھے، یادوں کی مالا زبردست جی کیا ہی عشق ہے۔ ملنے کو دل کرتا ہے عظمیٰ آپی آپ کے سوا یہ منظر کوئی بیان ہی نہیں کر سکتا تھا کیا خوب صورتی سے منظر کھینچا ہے۔ ارے میں تو اپنے فیورٹ ناولٹ کو بھول گئی کیا نہیں جی ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ میں متاعِ دل کو بھول جاؤں نبیلہ جی ..... ناولٹ مکمل ہونے پر لاکھوں مبارک باد۔'' (ہماری مصنفات شکریہ کہہ رہی ہیں)

✉ ذوالنورین، ہری پور ہزارہ سے۔ ''رائٹرز کی کہکشاں عظمیٰ آفاق کے قلم سے پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ ویسے عظمیٰ جی آپس کی بات ہے ہمیں آپ کا دانہ شانہ کہیں نظر نہیں آیا بلکہ اپنی تحریر کی طرح آپ خود بھی بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ باجی آپ دوپٹے میں اتنی گریس فل لگ رہی ہیں کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ میں جب بھی رسالہ کھولتی ہوں پہلے آپ کی تصویر دیکھتی ہوں پھر آپ کو دیکھ کر آپ کے ساتھ مسکرا کے آگے بڑھتی ہوں۔ سلسلے وار ناول تمام رائٹرز بہت خوب صورتی کے ساتھ آگے بڑھا رہی ہیں۔ قیصرہ حیات، عبدالرحمٰن کے کردار کو پورے نام سے لکھ رہی ہیں ایسا ہی لکھنا اور بلانا چاہیے بعض رائٹرز صرف رحمٰن جی یا رحمٰن صاحب لکھتی ہیں اس طرح لکھنا یا بلانا غلط ہے رحمٰن اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام ہے۔ بھوک اور نھیا حقیقت سے قریب افسانے تھے۔ یادوں کی مالا اور شمع ہدایت مضامین میں بہت اچھا اضافہ ہیں۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

✉ رخسانہ امجد، ملکوال۔ گڑیا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں...... بہت دنوں سے تمہارے مراسلات نہیں ملے ہیں۔

✉ مقدس بیگم، کراچی سے۔ ''باجی آپ کو فیس بک پر کئی بار ریکوئسٹ بھیجی مگر آپ نے جواب تک نہیں دیا۔ آپ کی بہت ساری کتابیں میں نے نیٹ پر پڑھی ہیں۔ پلیز ہمیں پاکیزہ میں اور اپنے ساتھ نیٹ پر بھی شامل کریں۔'' (پیاری مقدس ...... پاکیزہ میں خوش آمدید...... میں اپنے فیس بک کا اکاونٹ روز چیک نہیں کیا کرتی اور جب میرا موبائل میرے پوتا، پوتی کے ہاتھ میں چلا جائے تو پھر تو وہ کیا کچھ کر ڈالتے ہیں...... آپ پاکیزہ میں بھرپور تبصرہ بھیجیں)

✉ ظل شاہین، رحیم یار خان سے۔ ''اداریہ پڑھا جہاں ہمیشہ ہی ایک بہترین موضوع ہوتا ہے بے شک انسان ایک معاشرتی حیوان ہے جو تنہا زندگی نہیں گزار سکتا۔ پھر جلدی سے صفحے پلٹے اور ذیشان بھیا کی شادی کے احوال اور تصاویر میں گم ہوگئے۔ ماشاء اللہ بہت پیارا کپل ہے دونوں کے چہروں پر معصومیت کے رنگ ہیں۔ اللہ کریم خوش و خرم رکھے، سلامت رکھے آمین۔ ویسے دولہا، دلہن کا کلوز اپ بھی ہونا چاہیے تھا۔ ویسے کی بھی صرف ایک تصویر ہے اور تمام تصاویر کلرڈ ہونی چاہئیں تھیں۔ تمام رائٹرز کی ہی تصاویر اچھی ہیں۔ اور عذرا آپا تو ماشاء اللہ دولہا کی والدہ کم اور بہن ہی لگ رہی ہیں۔ عذرا آپا اپنے مخصوص انداز میں سر پر دوپٹا اوڑھے بہت باوقار اور پیاری لگ رہی ہیں۔ ذیشان کی بہن سین کو ہم نے پہلی بار دیکھا وہ بھی خوب صورت لگ رہی تھیں۔ عذرا آپا کے قلم سے جھلکیاں پڑھیں عذرا آپا آپ کو یہ خوشیاں بہت، بہت مبارک ہوں اللہ کریم آپ کو مزید خوشیاں دیکھنی نصیب کرے۔ آپ کے بچوں کو سلامتی دے اور انکل معراج کو صحت و زندگی عطا فرمائے آمین۔ عظمیٰ کے مخصوص اندازِ تحریر میں شادی کا احوال پڑھا بہت خوب...... تمہارا طرزِ تحریر مجھ جیسی سیریس لڑکی کو بھی ہنسنے مسکرانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ میں نے کچھ اور لوگوں کی تحریر بھی پڑھی ہیں۔ شادی کے احوال کے حوالے سے مگر جو بات تمہاری تحریر میں ہے وہ ان میں نہیں کیونکہ عظمیٰ تم صرف خوب صورت لباس، جیولری، میک اپ اور کھانوں کی تشہیر نہیں کرتیں بلکہ اپنے اردگرد کے ماحول، ان کے رویے اپنے نیچرل تاثرات اور بچوں کی معصوم باتیں اور شرارتیں ان سب کو بھی تحریر میں اس طرح سموتی ہو کہ پڑھنے والا لمحہ بہ لمحہ بہت انجوائے کرتا ہے۔ اللہ کریم تمہارے قلم کو مزید نکھارے۔ عظمیٰ ڈیئر آپ کو تو انجم باجی کی بیٹی ہونے پر فخر ہوگا ہی مگر ہمیں بھی تم پر فخر ہے کہ تم باجی کے نقشِ قدم پر چل کر ان کی روایت کو لے کر آگے بڑھو گی۔ اللہ تعالیٰ ہماری انجم باجی اور تمہاری والدہ کو لمبی عمر عطا فرمائے، آمین۔ اعتبارِ وفا کی اس قسط نے تو ڈپریشن میں مبتلا کر دیا۔ ویسے نگہت آپا کی عقل و دانش کو داد دینی پڑتی ہے اتنی زبردست پیچ و خم والی کہانی اور بے شمار کرداروں کو کس قدر خوب صورتی سے لے کر چل رہی ہیں۔ محبت یوں نہیں ہوتی عام سی کہانی ہے مگر عزہ نے بروقت درست فیصلہ کیا۔ محترمہ درخ چوہدری کا انٹرویو پڑھا نہ جانے کیوں پڑھ کر ہم اداس ہوگئے۔ ویسے باتیں بہت اچھی کیں انہوں نے۔ شمع ہدایت، محبت الٰہی کے موضوع پر بہترین تحریر رہی

سبحان اللہ۔" (دیکھو تمہارا خط خاصی تاخیر سے ملا تھا مگر پھر بھی شامل اشاعت ہے)

✤ خولہ بنت عرفان، کراچی سے۔" آپ کے خطوط اور جلترنگ ہمیشہ کی طرح آنکھ میں پانی اور پیٹ میں بل ڈالنے والے تھے۔ اس کے حسن بیان سے کوئی بد ذوق ہوگا جو انکار کرے۔ متاع دل میں کہانی آگے بڑھی دُرِ یکتا سکون میں آئی تو ذہن بھی سکون میں آگیا۔ شمیم فضل خالق نے کرچیاں دل کی میں اپنے ڈنر سیٹ کی صورت میں گھریلو محبتوں کی بہت پیاری عکاسی کی۔ کہانی محبت کی عام سی کہانی مگر انداز بہت خوب صورت، مختصر اور جاندار...... باقی سب افسانے اور ناول' ناولٹ بھی شاندار تھے۔" (خولہ...... تم اب جاگ جاؤ...... بہت سوچکیں...... ہاں تمہارا افسانہ قابلِ اشاعت ہے)

✤ نگینہ ضیا بنگش، کراچی سے۔" ٹائٹل گرل فرینہ اعجاز بہت پیاری لگی۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح بہت، بہت سبق آموز رہا۔ باجی زور قلم اور زیادہ...... دین کی باتیں نے دل و ذہن کو منور کیا۔ یادوں کی مالا کا دوسرا باب محترمہ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی پُر اثر یادیں بہت متاثر کر رہی ہیں۔ ماشاء اللہ بہت عقیدت بھری داستان ہے اگلی قسط کا ابھی سے انتظار شروع ہوگیا ہے۔ ملنے کو دل کرتا ہے، عظمیٰ آفاق کے قلم سے مزے دار احوال پڑھ کر بے حد اچھا لگا اور اپنی تعریف پڑھ کر بہت، بہت خوشی ہوئی۔ مجھ ناچیز کو خوب صورت کہنے پر عظمیٰ تمہارا بہت، بہت شکریہ ہمیشہ خوش رہو' آمین۔ ناول سب اچھے جا رہے ہیں۔ منی ناول، شیریں حیدر، زندگی خاک نہ تھی، ویری ویل ڈن شیریں صاحبہ اتنی زبردست تحریر پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد قبول کریں۔ ناولٹ، کیسی ایمرجنسی نزہت جبیں ضیا آپ کی تحریر بہت پُر اثر رہی سیدھی دل پہ لگی نزہت جی اتنی اچھی تحریر پر بہت مبارک باد...... باقی سب تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ کسی ایک کی تعریف کرنا زیادتی ہوگی۔ مستقل سلسلے سب بہت اچھے جا رہے ہیں۔ بہنوں کی محفل تو پاکیزہ کی جان ہے۔ میں سب بہنوں کی خوشی غمی میں ان کے ساتھ ہوں جن کو خوشیاں ملی ہیں ان کو تہ دل سے مبارکاں اور جن کو دکھ ملے ہیں ان سب کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحومین کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ اور جو بیمار ہیں اللہ پاک ان سب کو صحت کے ساتھ لمبی عمر عطا فرمائے، آمین۔ نزہت آپی نے محترمہ رفاقت جاوید سے بھرپور ملاقات کروائی۔ نزہت آپی ہمیشہ خوش رہیں جو اتنی پیاری، پیاری شخصیات سے ملواتی ہیں، شمع ہدایت کی میں خصوصی طور پر تعریف کروں گی۔" (شکریہ)

✤ فریدہ افتخار، اسلام آباد سے۔" اقبال بانو کا ناولٹ اچھا لگا پڑھ کر خاصی قلمی پچویشن تھی کہانی میں۔ متاع دل میں دُرِ یکتا کے دکھ ختم ہونے والے لگتے ہیں۔ اگست کے شمارے میں شمیم فضل خالق نے تاک کر صحیح نشانہ لگایا۔ ایک یاد دہانی اپریل کے پاکیزہ میں صبیحہ شاہ کی کہانی خواب زادی میں ایک لفظ ہضم نہیں کر پا رہی۔ اگر میں غلط ہوں تو معذرت...... دوسرے پیرا گراف کی آٹھویں لائن میں انہوں نے لق و دق مالز کا ذکر کیا ہے۔ لق و دق بارونق جگہوں کے لیے ہرگز نہیں لکھا جاتا بلکہ یہ لفظ بیابانوں، صحراؤں کے حوالے سے لکھا بولا جاتا ہے۔ کرچیاں مرے دل کی شمیم فضل خالق نے کہانی لکھ کر حقیقت بیان کی ہے کہ ہماری والدہ صاحبہ کے جہیز میں نانا مرحوم نے انگلش ڈنر سیٹ دیا تھا اس وقت ظاہر ہے دونمبر پلاسٹک وغیرہ کا نام و نشان کا نام و نشان کہاں تھا جب سونا 22 روپے تولہ تھا۔ بے حد خوب صورت نیلے رنگ کے ڈنر سیٹ کو اماں عزیز رکھتیں اور خاص مہمانوں کے لیے نکالا جاتا۔ ہمیں آج تک دسترخوان پر ان ڈونگوں میں پکے سجے کھانے لذت، شکل سب یاد ہے۔ ابھی ہماری بڑی ہمشیرہ کو ان کی سنگر سلائی مشین پیروں والی بڑی عزیز ہے کہ ان کو ہماری والدہ نے اس لیے لے کر دی تھی کہ وہ سلائی کڑھائی کی شوقین تھیں۔ جہیز کی کڑاہی کے نام سے کہانی میرے اپنے گھر کی ہے۔ جب میں چھٹی جماعت کی طالبہ تھی میرا ایک بھائی دادا کے گھر کی بڑی، بڑی دیگوں کو آج تک نہیں بھولا کہ وہ سب کہاں گئیں جن میں ہر سال دو مرتبہ نذر نیاز پکتی تھی تھی۔ عظمیٰ کی ترتیب دی ہوئی پاکیزہ ڈائری...... خوب سے خوب تر ہے۔" (تبصرے کا شکریہ لق و دق کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ خالی ہوں اور سنسان سے ہوں آج سے بیس سال پہلے مجھے کینیڈا کے مالز بھی لق و دق سے لگے تھے...... کہ لوگ ہی نظر نہیں آرہے تھے...... سامان بے حساب...... خریدنے والے غائب)

✤ فاتحہ رابعہ، گوجر خان سے۔" اقبال بانو کی دو بہنوں کے انتقال کی خبر پڑھ کر دلی رنج ہوا...... میری دلی تعزیت ان تک پہنچا دیجیے (ضرور) پاکیزہ کا شمارہ...... مصنفات کی تصاویر سے دمک رہا ہے۔ مگر انجم آپ مجھے خاصی کمزور لگی ہیں (نہیں بھئی) اس ماہ کے روحانی مشورے کی میں جتنی بھی تعریف کروں وہ کم ہوگی...... استخارے کے بارے میں لوگوں کی معلومات انتہائی کم بھی اور غلط بھی ہیں...... آپ نے بہت عمدگی سے استخارے کے بارے میں معلومات دی ہیں (شکریہ)

ہاں شیریں حیدر کو مبارک باد ضرور دیں۔ بہت اچھا لکھا۔'' (تبصرے کا شکریہ)

٭ نائلہ ضیا، ڈیفنس کراچی سے۔ ''یوں تو میں گھریلو مصروفیات کی وجہ سے پاکیزہ کی خاموش قاری ہوں..... مگر اپنی رائے دینے کی اصل وجہ عظمیٰ آفاق کی خوب صورت اور پُرمزاح تحریریں ہیں..... ایسی جاندار تحریریں پڑھ کر بہت مزہ آتا ہے..... مصنفات کی عیدملن کی کوریج بے حد شاندار رہی..... اگر میں یہ کہوں کہ اس میں سے بہت سی باتیں ایسی تھیں جو انسان دوسرے سے چھپایا کرتا ہے مگر عظمیٰ نے کس آسانی سے لکھ دیں..... جو اکثر پڑھنے والوں کو بھی اپنے دل کی باتیں لگیں گی..... اس کے بعد مجھے پاکیزہ میں جو ہارٹ فیورٹ تحریریں رہی ہیں وہ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا، انجم انصار کی روحانی مشورے اور جلترنگ اور محترمہ اختر شجاعت کی شمع ہدایت پڑھ کر واہ نکلا..... میری مبارک باد سب کے لیے۔'' (نائلہ بہن اس محفل میں خوش آمدید، آئندہ آپ کے بھرپور تبصرے کی منتظر رہوں گی۔ اختر شجاعت، ذکیہ بلگرامی اور عظمیٰ آفاق شکریہ کہتی ہیں)

٭ فریحہ مبین، کراچی سے۔ ''پہلی بار اپنی رائے دے رہی ہوں پاکیزہ میرا پسندیدہ میگزین ہے۔ میں ایک معلمہ ہوں..... مصروف رہتی ہوں مگر اس کو ضرور پڑھتی ہوں اور میرا خیال ہے کہ اس کو پڑھ کر ہماری قاری بہنیں یقیناً مثبت چیزیں ضرور سیکھتی ہیں۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا بے حد پسند آرہی ہے۔ جلترنگ تو ٹینشن ختم کرنے کا ٹانک ہے۔ عظمیٰ آفاق نے عیدملن کا احوال جس انداز میں لکھا ہے پڑھ کر لطف آیا ہے..... کچھ نہ کہتے ہوئے بھی سب کچھ کہہ دینا ایک عمدہ طرزِ بیان کی دلیل ہوتی ہے..... تمام ناولوں میں مجھے شیریں حیدر سب سے زیادہ اٹریکٹ کر رہی ہیں.....'' (اس محفل میں خوش آمدید..... آپ کی پسندیدگی کے لیے مشکور ہوں..... شیریں حیدر شکریہ کہتی ہیں)

٭ مسز سمیرا حمید فاروق، کراچی سے۔ ''اس ماہ جلترنگ بہت ہی اعلیٰ تھا اور بہت مزہ آیا..... عظمیٰ آفاق کی تحریر کی جتنی تعریف کروں وہ کم ہوگی..... ویل ڈن نگہت سیما کی تحریر میں دھیما پن ہے..... مگر شیریں حیدر کی یہ قسط قدرے ماٹھی سی لگی۔ فرحین اظفر اور بشریٰ گوندل کی تحریروں میں ربط کا فقدان ہے اور بڑی الجھی ہوئی تحریریں..... جو مجھے بالکل بھی پسند نہیں آئیں۔ ذکیہ بلگرامی کی تحریر پڑھ کر دل میں سکون اترتا ہے..... عالیہ توصیف کی مختصر تحریر بہت اچھی لگی..... رفاقت جاوید کی تصویریں بہت خوب صورت ہیں..... مگر سچی بات کہوں گی کہ ان کی وضاحت کے باوجود بھی ان کا ناول ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ انہوں نے یہ کہا ہے کہ سائرہ کی آزادی کی بھی قائل ہیں اور دوسری لڑکی کے بارے میں وہ چاہتی ہیں کہ وہ خبر کے آگے سر جھکا دے..... حالانکہ وہ تو لڑکے کی محبت نہیں جنون تھا۔'' (رفاقت کی وضاحت کے بعد آپ کا یہ اعتراض بے جا ہے..... پھر بھی ہم آپ کی رائے ان تک پہنچا رہے ہیں)

٭ فیروزہ بیگم، کراچی سے۔ ''سب سے پہلے رائٹرز کی عیدملن کا احوال پڑھا۔ ہر سطر پڑھ کر مسکراہٹ آرہی تھی..... مگر میں اپنی رائٹرز سے یہ کہنا چاہوں گی کہ اپنے سروں پر دوپٹے ضرور لیا کریں۔ اس کے بعد رفاقت جاوید کا انٹرویو پڑھا۔ تصویریں دیکھ کر ایسا لگا جیسے کسی بلیک اینڈ وائٹ فلموں کی ہیروئن ہوں۔ رفاقت جاوید تو مجھے اپنے بچوں اور بہوؤں سے زیادہ خوب صورت لگیں..... ان سے کہنا ہے کہ وہ مڈل کلاس یا غریب غربا کے مسائل پر افسانے لکھنے کے بجائے اپنی کلاس کے مسائل پر قلم اٹھائیں کہ وہ اس پر زیادہ بہتر لکھ سکیں گی۔ ذکیہ بلگرامی کی تحریر تو موتیوں میں تولنے کے قابل ہے..... اور میں ان کی سب سے بڑی فین ہوں..... افسانوں میں نئی لڑکیوں کی تحریروں میں مشکل نویسی زیادہ نظر آرہی ہے..... تحریر کی روانی نظر نہیں آتی..... مگر شیریں حیدر کی ناول کی قسط سب سے عمدہ تھی..... اختر شجاعت نے بھی اچھا لکھا۔'' (تبصرے کا شکریہ)

٭ پروین وحید، لاہور سے۔ ''ایک طویل عرصے بعد اپنی رائے دے رہی ہوں۔ رفاقت جاوید کا انٹرویو اتنا خوب صورت شائع ہوا ہے کہ آج تک ایسا انٹرویو نہیں لگا ہوگا۔ ساڑی پہن کر تو وہ حسینہ لگ رہی ہیں۔ مصنفات کی عیدملن کی تصاویر میں مجھے سب سے اچھی عذرا رسول اور عظمیٰ لگیں۔ باقی بھی ٹھیک ہیں..... احوال کی کوریج زبردست رہی..... انجم باجی آپ کے ناول کا انتظار ہے..... بہت سال ہوگئے آپ کا ناول پڑھے ہوئے۔ آخر میں خاص بات ذکیہ بلگرامی کو پھولوں کے سو ٹوکرے پہنچا کر یادوں کی مالا کی مبارک باد دیجیے گا۔'' (پاکیزہ کے تمام انٹرویو ایک سے بڑھ کر ایک ہوتے ہیں۔ پسندیدگی کا شکریہ..... آپ کی تعریفیں پہنچائی جارہی ہیں، مجھ میں اتنی کہاں سکت کہ سو ٹوکرے اٹھاؤں گی، یہ کام تم خود کرلو)

٭ رفاقت جاوید، اسلام آباد سے۔ ''میں نے اپنا انٹرویو پڑھنے کے بعد سب کا شکریہ ادا کرنے کے لیے بے اختیاری میں

قلم اٹھایا۔ میں سب سے پہلے عذرا رسول کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنہیں رب العزت نے اس کارِ خیر کے لیے منتخب کیا تھا۔ پھر مجھے یک لخت انجم انصار کی بے لوث محبت، توجہ اور راہنمائی ماضی میں لے گئی جو آپ سب سے شیئر کرنا چاہتی ہوں۔ جب میں نے پاکیزہ میں پہلی بار فون کیا تو رمضان صاحب سے میری تفصیلاً بات ہوئی۔ انہوں نے مجھے انجم انصار کی طرف کہانی بھیجنے کا مشورہ دیا۔ میں نے کہانی بھیجنے کے بعد تین بار رمضان صاحب سے رابطہ کیا تھا۔ چوتھی بار انہوں نے انکشاف کیا کہ وہ یہاں سے جا رہے ہیں۔ اس لیے آئندہ آپ انجم انصار سے خود رابطے میں رہیں۔ انہوں نے انجم کا نمبر لکھوا کر ان کی بہت تعریف کی۔ اگر میں ان کی باتوں سے مطمئن نہ ہوتی تو ہو سکتا ہے کہ میں انجم سے رابطہ ہی نہیں کر پاتی۔ میں نے انجم سے ایک رائٹر کے ناتے اپنا تعارف کرایا تو انہوں نے میرے ماضی اور شوق کو پرکھتے ہوئے میری حوصلہ افزائی کی اور پھر یکے بعد دیگرے میری کہانیاں پاکیزہ میں چھپنے لگیں۔ وہ ہر کہانی کو پڑھنے کے بعد میری راہنمائی کرتیں تو میں نے انہیں اپنا استاد مان لیا۔ آج بھی انہیں کئی بار اسی مقدس رشتے سے پکارتی ہوں۔‘‘

(پیاری رفاقت آپ سے معذرت خواہ ہوں کہ آپ کا پُرمحبت طویل خط شائع نہیں کر رہی ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ اگر آپ میں ٹیلنٹ نہ ہوتا تو دو افسانے لکھ کر ہی ہار مان جاتیں...... گائڈ کرنے کا فائدہ تب ہی ہوا کرتا ہے جب کسی میں لکھنے کا ہنر بھی ہو۔ اللہ آپ کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے، محترمہ عذرا رسول اور دیگر اراکین پاکیزہ بھی آپ کے لیے دعائے خیر کرتے ہیں)

ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ’’اداریہ کے بعد ذکیہ آپا کی یادوں کی مالا کا دوسرا موتی بھی زبردست تھا...... مسلم باغ میں ان کی جیپ کا حادثہ اور پھر سب کا بچ جانا...... دوبارہ پڑھنے میں ہی بہت اچھا لگا...... قیصرہ حیات کا ناول بھی بہت عمدگی سے جا رہا ہے۔ تو مسلم لوگوں کے کردار بہت اچھے بیان کیے ہیں...... صرف عظمیٰ کا ہی دل ملنے کو نہیں چاہتا ہے ہم لوگ بھی منتظر ہیں تحریروں سے ملاقات تو ہوتی ہے مگر تصویری ملاقات بھی زبردست رہی بلکہ ایک سے بڑھ کر ایک رہی...... بہت سی مصنفات سے ملاقات کروانے کا شکریہ...... تم مجھے بتاؤ کہ اتنی کمزور سی کیوں لگ رہی ہو...... (نہیں بھئی ایسی کوئی بات نہیں ہے) رخ چوہدری نے اپنے انٹرویو میں تصویریں نہیں دی تھیں مگر عید ملن میں ان کو دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ پیاری بیٹی عظمیٰ تمہارے طرزِ تحریر کے بارے میں ہم کیا کہیں سوائے اس کے کہ زورِ قلم اور زیادہ ہو۔ مزاح کی ملکہ کی تحریروں کے ہم فین تھے...... اب مزاح کی شہزادی بھی اپنی تحریروں کے رنگ جمانے لگی ہیں...... نگہت سیما نے بھی اعتبارِ وفا کے آئینے سے گرد صاف کرنی شروع کر دی ہے۔ نبیلہ ابر راجا نے اپنوں اور غیروں کا فرق واضح کر دیا...... ’’دِرِ شمن‘‘ کا ناول اچھا لگ رہا ہے۔ شیریں زندگی خاک نہ تھی...... کے بارے میں یہی کہنا ہے کہ تم نے جب بھی لکھا ہمیشہ نئے موضوعات پر قلم اٹھایا...... ایک ماں کی چاروں بیٹیوں کی کہانی جس کی ڈور اپنی ماں سے جا کر ملتی ہو...... بہت خوب صورت ہے...... اختر شجاعت کی تحریر حاصلِ مطالعہ رہی...... اللہ ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق دے...... رفاقت جاوید سے ملاقات اچھی رہی...... تصاویر بہت خوب صورت تھیں...... بہت گریس فل کپل تھا۔ اب عمیرہ احمد کو اور شیریں حیدر کو بھی لے کر آئیں۔ جلترنگ کی شادو بھابی واقعی ایسی خواتین بہت ہیں...... دوسرا خاکہ بھی بہت زبردست رہا۔ گھبراہٹ کے باوجود...... انجم تم نے استخارہ کے بارے میں لکھا اس سے خواتین و حضرات دونوں کو مدد ملے گی۔‘‘ (بھرپور تبصرے کا شکریہ)

شوکت، کراچی سے۔ ’’مجھے سب رائٹرز کی تصویریں بہت اچھی لگیں۔ مگر عذرا رسول کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے...... مجھے یوں تو پاکیزہ کی ہر تحریر بہت اچھی لگتی ہے بار، بار پڑھتی ہوں مگر عظمیٰ آفاق کی تحریروں کا کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ تحریر میں سادگی، شوخی، ہمدردی سب ہی کچھ نظر آتا ہے۔ مجھے نگہت سیما کا ناول بھی بہت پسند آ رہا ہے اور ذکیہ بلگرامی کی مالا تو روزانہ پڑھتی ہوں میری خصوصی مبارک باد ان تک پہنچائیں۔‘‘ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے آپ کی محبت کا کوئی جواب ہی نہیں ہے)

ڈاکٹر ممتاز ضیا، ضیاالدین اسپتال، کراچی سے۔ ’’ذکیہ تمہاری یادوں کی مالا بہت اچھی لگ رہی ہے۔ ذرا دھیان دو اس میں ایک چھوٹا سا موتی ہی ہمارا بھی ہے۔ آخری امید بہت اچھا جا رہا ہے مگر ان کے قلم سے یہ جملہ اچھا نہیں لگا کہ ولیمے کی رسم ختم ہو گئی۔ رسم کی جگہ تقریب کا لفظ بھی استعمال ہو سکتا تھا۔ اُف عظمیٰ ملنے کو دل کرتا ہے نہیں بلکہ ملنے کو بارہ بار دل کرتا ہے۔ واہ کیا خوب صورت کور پیج کی ہے تم نے جس کے لیے ہم تمہیں نہیں بلکہ عذرا رسول کو خود کو اور دیگر بہت سے قارئین کو شاباش دیتے ہیں جنہوں نے انجم کو ہرا کر تمہیں لانچ کیا...... تمہاری پارٹی کی تیاری بہت مزیدار لگی اجیہ نے تمہیں کتنا پیارا مشورہ دیا پھر بھی تم اپنے پیارے، پیارے بچوں سے شاکی رہتی ہو۔ بنین ہمیں بہت پیاری لگی ہم سمیت سب کے اتنے

اچھے فوٹوگرافس جو بنائے اس بچی نے ...تمہارے سوالات اور مصنفات اور قارئین کے جوابات بہت اچھے لگے۔ نہیں میں تمہاری صحیح تعریف کر کے تھکی نہیں تھی، تمہاری مصروفیت کا خیال تھا۔ آخر جانِ محفل تھیں تم...... تقریب اور ہمارے مصنفین بہت پیارے ہیں عذرا، نزہت اور انجم کی تو ایک الگ ہی اور خصوصی جگہ ہے ہی مگر باقی لوگ بھی اتنے اچھے ہیں۔ ہم جیسوں کو کسی کامپلیکس کا احساس نہیں ہوتا اتنی محبت اور خلوص سے سب ملتے ہیں کہ دل خوش ہو جاتا ہے۔ حمیرا طارق اور شائستہ اعجاز بھی بہت پیار سے ملیں۔ عظمٰی تم نے جو اپنے گھر آنے کی شرط رکھی ہے اب اس کی سزا بھگتو جلدی سے ایک کہانی لکھ کر ہمیں بھیجو جسے ہم اپنے نام سے چھپوا کر تمہارے گھر آنے کے حصے دار بنیں...... جلدی، جلدی بلکہ ہر شمارے میں آتی رہا کرو۔ سیما سراج کی مختصر کہانی بہت کچھ سکھا گئی۔ نگہت سیما بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ متاعِ دل اختتام پزیر ہوا۔ بہت زیادہ اچھا نہیں لگا۔ بھوک، سسی بے خبر اور ثمیا اچھی تحریریں ہیں۔ زندگی خاک نہ تھی، اتنا نازک موضوع اور شیریں کا قلم بس یہی کہہ سکتے ہیں اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ اگر کچھ لوگ بھی سنبھل گئے اس کو پڑھ کے اور شیریں کا اجر بے حساب ہوگا، انشاء اللہ۔ دُرِ ثمن کے ناول پر تبصرہ کچھ اور قسطوں کے بعد کیسی ایمرجنسی ہلکی پھلکی اچھی تحریر ہے۔ تم نے کہا تھا خاص نہ لگی۔ توکل، یقینِ الٰہی بہت ایمان افروز مضمون ہے۔ اللہ اختر شجاعت کو اسی طرح راہنمائی کی توفیق عطا کرے آمین...... رفاقت جاوید بہت بھرپور انداز سے بزم میں آئیں۔ ان سے مل کر بہت اچھا لگا۔ ان کے نام کے حوالے سے دلچسپ تجربہ اچھا لگا اگر رفاقت بہن برا نہ مانیں تو معذرت کے ساتھ میں ان سے کہنا چاہوں گی کہ حساس صرف لکھاری ہی نہیں ہوتے بلکہ قارئین اور تبصرہ نگار بھی حساس ہوتے ہیں۔ ان کے لیے انہوں نے کچھ زیادہ سخت الفاظ استعمال نہیں کر لیے۔ جیسے موٹا اور ڈل دماغ، تیتر نہ بٹیر، نہ انگریزی کے نہ اردو کے وغیرہ وغیرہ۔ تنقید یا تبصرے سے کسی کی دل آزاری مقصود نہیں ہوتی، یہ تو انسان کی اپنی رائے ہے جس سے دوسروں کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ اب باری ہے بہنوں کی محفل کی اس میں تم نے بچیوں کی حفاظت کے لیے والدین کو جو پیغام دیا ہے کاش ان کے دل میں اتر جائے۔" (بھرپور تبصرے کا شکریہ)

عزیز بہنو! آپ کی اس محفل کے صفحات کا کوٹا ختم ہوا...... آیئے اب حسبِ دستور درودِ ابراہیمی پڑھ کر دعا مانگتے ہیں۔ اللہ بزرگ و برتر کی توفیق کے بغیر نیکی کرنے کی طاقت ہے نہ برائی سے بچنے کی ہمت میں اس کلمہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ کے ساتھ مدد مانگتی ہوں، اپنی زندگی اور موت پر اور ملک الموت کی آمد پر...... سکرات الموت اور اس کی بے ہوشیوں کے نزول کے وقت...... اے ارحم الراحمین! میں اپنی جان، اپنے اہلِ خانہ، اپنے مال، اپنی اولاد اور جو بھی موجود یا غائب ہے اسے آج تیرے پاس امانت رکھتی ہوں...... اے اللہ! ایمان کے ذریعے ہماری حفاظت فرما اور اس کو ہم پر محفوظ رکھ...... اے اللہ ہمیں اپنی رحمت میں ڈھانپ لے اور ہم سے اپنا فضل و کرم نہ چھین...... ہم تیری ہی طرف راغب ہیں۔ اے اللہ! ہم پناہ طلب کرتے ہیں سفر کی تکلیفوں سے اور پریشانی کی حالت دیکھنے سے اور اہل و عیال اور مال و دولت کے برے منظر سے، اے وہ جو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے! اے وہ جو چاہے سو کرے...... اے وہ جو بندے اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ اپنی طاقت و قوت سے ہمارے اور ہمیں تکلیف دینے والے کے درمیان حائل ہو جا...... اے ہر چیز کو مستغنی کرنے والے جس سے کوئی چیز بے نیاز نہیں ہو سکتی۔

اے ارحم الراحمین! دنیا اور آخرت کی تمام مہمات سے ہمیں مستغنی اور بے پروا کر دے۔

آمین، ثم آمین

یا مجیب، یا مجیب، یا مجیب

دعا گو

آپ کی اپنی باجی

انجم انصار

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.C فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 021-35895313 EXT 107,118 , 021-35804200



پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

حمد

میرے مالک، میرے مولا کرم اپنا سدا رکھنا
رحمتوں کی بارشیں یونہی مجھ پر برسا رکھنا
بات جب آئے میرے گناہوں کی بھرم میرا بنا رکھنا
ذکر جب آئے تیری رحمت کا دروازہ عطا کھلا رکھنا
میرے بس کی بات نہیں عطاؤں کا تیری شمار رکھنا
میری خطاؤں کو ہمیشہ اے غفار بھلا رکھنا
میری دعاؤں کو شرفِ قبولیت کا اذن دیا رکھنا
جسم و روح کی ہر بیماری میں بس تو اپنی شفا رکھنا
گناہوں کا بوجھ لیے حاضر ہوں، کرم اپنا عطا رکھنا
مجھ نکمی کے عیبوں کو اپنی رحمت تلے چھپا رکھنا

شاعرہ: اُمِ ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ

نعت

اگر چھوڑ دے مجھ کو سارا زمانہ
ملے جب نہ مجھ کو کہیں بھی ٹھکانا
تو عاصی پہ اپنا کرم کیجیے گا
مجھے آپؐ اپنا بنا لیجیے گا
میں عاشق نبی ﷺ کا بتادوں گا سب کو
فنا میں بقا ہے دکھادوں گا سب کو
میں سہہ لوں گا ہر غم مگر پیارے آقا
مجھے آپ ﷺ اپنا بنا لیجیے گا
گناہوں کی چادر میں لپٹا ہوا ہوں
چھپایا ہے چہرہ کہ سہما ہوا ہوں
مجھے دستِ شفقت عطا کیجیے گا
مجھے آپؐ اپنا بنا لیجیے گا
مدینے کی گلیوں میں پھرتا رہوں گا
میں دیوانہ اُن کا رہا ہوں رہوں گا
زمانہ ہنسے گا مگر میرے آقا
مجھے آپؐ اپنا بنا لیجیے گا

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی
مرسلہ: سعدیہ سلیم، سڈنی

حج کے دوران وفات پانے والے

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے فرمایا کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے کہ ایک شخص جو احرام باندھے ہوئے تھا اونٹ سے گرا اور گردن ٹوٹ جانے کی وجہ سے فوت ہوگیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''اسے بیری کے پتوں اور پانی سے غسل دے دو اور ان ہی کپڑوں میں کفن دے دو اور اس کا سر نہ ڈھکو کیونکہ قیامت کے دن یہ اسی طرح تہلیل یا تلبیہ کہتے ہوئے اٹھایا جائے گا۔''

جامع ترمذی شریف
مرسلہ: اینہ عندلیب، سلانوالی

بخش دیا جاتا ہے

حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''دو مسلمان شخص جس وقت آپس میں ملتے ہیں اور مصافحہ کرتے ہیں تو جدا ہونے سے پہلے ان کو بخش دیا جاتا ہے۔ اور ابوداؤد کی روایت ہے کہ جس وقت دو مسلمان باہم ملیں اور مصافحہ کریں اللہ تعالیٰ کی حمد کریں اور اس سے بخشش چاہیں تو ان کو بخش دیا جاتا ہے۔''

مشکوٰۃ شریف
مرسلہ: صبا نور، لیہ

دیکھا جو حرم کو

روشن ہوئی روح بھی، دل بھی نظر بھی
پہنچی جو تیرے در پر، دیکھا جو حرم کو

کیا مانگنے آئی تھی، نہ یاد رہا کچھ
نظریں جو اٹھیں اوپر، دیکھا جو حرم کو
بن مانگے ملا سب کچھ اِک تیرے کرم سے
ٹھنڈک سی پڑی دل میں، دیکھا جو حرم کو
واپس نہ کبھی جاؤں، رہ جاؤں یہیں پر
دل سے یہ دعا نکلی، دیکھا جو حرم کو

کلام: عالیہ ضیا، کراچی

شکر

اگر ہم اپنے آپ پر، اپنے حالات اپنی زندگی اور اللہ تعالیٰ کی عنایتوں پر نظر ڈالیں تو سارا دن اور ساری رات بھی شکر ادا کرتے رہیں تو بھی اللہ پاک کی ایک عنایت کا بھی شکر نہیں ادا کر سکتے ہیں۔

کیونکہ سب سے پہلے تو یہ کہ اس نے ہمیں مسلمان گھرانے میں پیدا کیا، ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان، ناک، دماغ سب صحیح سلامت عطا کیا اگر ان میں سے ایک چیز بھی کم ہو جائے تو ہم ادھورے ہیں اگر آنکھ نہ ہو تو دنیا کی رونقیں نہیں دیکھ سکتے۔ پاؤں نہ ہو تو چلنے پھرنے سے معذور ہوتے۔ ماں، باپ جیسی دولت عطا کی۔ کھانے کو دیا، پینے کو دیا، ہر طرح کا سکون عطا کیا تو ہمیں ہر وقت اٹھتے بیٹھتے اپنے رب کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کو شکر گزار بندے بہت پسند ہیں۔ اور وہ شکر کرنے والوں کو زیادہ عطا کیا کرتا ہے۔

تحریر: رفعت مبین رفی، یو ایس اے

دعا

سن لیں میری دعائیں
مدنی مدینے والے
پھر اپنے گھر بلائیں
مدنی مدینے والے
جب جب سوئے مدینہ
جب قافلے رواں ہوں
بس خواہشِ مدینہ
دل میں مرے جگائیں
گرد و غبارِ پا میں
میں ڈھونڈتی ہوں راہیں
اِک آس آرزو ہے
مجھے اپنے گھر بلائیں
تیرے کرم کا مجھ کو
اِک انتظار سا ہے
جاگے مرا نصیبہ
شاہِ عرب بلائیں
سن لیں مری دعائیں
مدنی مدینے والے

کاوش: فریدہ افتخار، اسلام آباد

ماں

ایک ایسا پیارا رشتہ جس کا کوئی جواب نہیں...... یہ رشتہ جب نظروں سے اوجھل ہوتا ہے تو اولاد کی دنیا اجڑ جاتی ہے۔ بدقسمت ہے وہ اولاد جو اس رشتے کو پہچان نہیں پاتی۔ آج کل آپ کو ہر جگہ سے ہر رشتہ دل بہلانے کو اور وقت گزارنے کو مل جائے گا مگر ماں جتنا عظیم رشتہ نہ ملا ہے نہ کسی کو مل سکتا ہے۔ جن کے پاس یہ رشتہ ہے وہ اس کا احترام کریں اور جو بہ رضائے ربی اس رشتے سے محروم ہو چکے ہیں ان کے لیے دعائے مغفرت کریں تاکہ وہ دین و دنیا کی فلاح پائیں۔

مرسلہ: فرح ناز، ملکوال

زلزلہ

دیکھتے دیکھتے اس آفت نے
کس قدر ظلم آہ کر ڈالا
کوئی کیسے کہے کہ کیا، کیا کچھ
زلزلے نے تباہ کر ڈالا

مرسلہ: ماہا بلوچ، میر پور خاص

عورت

☆ ڈاکٹر کی نظر میں ایک تھرمامیٹر ہے جو حالات کے مطابق ٹمپریچر ظاہر کرتی ہے۔

☆ شاعر کے تصور میں قدرت کی شاعری کا

مجموعہ ہے۔

☆ قسائی کی نظر میں ایک ایسی چھری ہے جو ذبح تو کرتی ہے مگر خون نہیں کرتی۔

☆ دھوبی کی نظر میں ایسا کپڑا ہے جو صرف تعریف کے صابن سے دھویا جا سکتا ہے۔

☆ درزی کی نظر میں ایسا لباس ہے کہ جب پرانا ہو جائے تو فوراً نظر سے اتر جائے۔

☆ شوہر کی نظر میں شاپنگ کرنے کی مشین ہے۔

مرسلہ: آمنہ ولید، ٹاؤن شپ لاہور

زندگی کے نام

کیسے ممکن ہے
بھول جاؤں تمہیں
زندگی کو بھی بھلا کوئی
فراموش کیا کرتا ہے

مرسلہ: عنبر وسیم، گوجرانوالہ

خوشامد

☆ دو انسانوں کے مابین ایسے الفاظ جو سننے والا سمجھے کہ سچ ہے...... اور...... کہنے والا جانتا ہے کہ جھوٹ ہے...... وہ خوشامد کہلاتے ہیں۔

واصف علی واصف

مرسلہ: فردوس شاہی، لاڑکانہ

زندگی

ہجوم غم میں کھو گئی برسوں سے
تلاش کرتی ہوں زندگی نہیں ملتی
وہ غم نصیب جئیں، کہاں جائیں
کہ زندگی میں جنہیں زندگی نہیں ملتی

مرسلہ: عائشہ اعوان، رحیم یار خان

پیار کا مرہم

کھو چکی ہے ہنسی
گم ہوئی ہر خوشی
جو مکاں تھے کبھی
خاک کا ڈھیر ہیں
جن کے ملبے تلے
ہیں گھروں کے مکیں
منتظر کسی مہرباں ہاتھ کے
پیار کا اپنے مرہم ہی
رکھے کوئی
زندگی کی طرف
پھر بلائے کوئی

شاعرہ: شگفتہ شفیق، کراچی

ٹھیکا

اپنے بارے میں کبھی برا مت سوچو کیونکہ یہ ٹھیکا آپ کے رشتے داروں نے اٹھایا ہوا ہے...... اور خاص طور پر آپ کے کزنز نے......

مرسلہ: مس فوزیہ، راول پنڈی

نفرت اور محبت

میاں، بیوی کا رشتہ دنیا کا وہ واحد رشتہ ہے جس میں ایک ہی انسان سے کئی بار نفرت اور بار، بار محبت ہو سکتی ہے۔

از: منور شہزادی، گوجرانوالہ

اس ماہ کی انعام یافتہ تحریر

بیمار ساس اور ہم

کتنا آسرا ہے سوئے ہوئے بزرگ کا بھی
ہمیں لگتا ہے ہم اکیلے نہیں
کیسا سکون ہے بیمار کی سنگت میں
یہاں دنیا کے کچھ جھمیلے نہیں
دعاؤں کے نادیدہ حصار میں مقید ہیں
اس لیے عذاب ہم نے جھیلے نہیں
غیب کی امداد بھی ہے سوا نیزے پر
ہم بہت خوش ہیں گو یہاں میلے نہیں

شاعرہ: کوثر خالد، جڑانوالہ

☆☆☆



جلترنگ

انجم انصار

ٹاپ

"ساری بات نصیب کی ہوتی ہے، دل بھی لگایا تو کس سے......" میں اکثر آہ بھر کر سوچتی، یہ حقیقت تھی کہ شارق بڑے مشکل سے شخص تھے بات کرو تو یوں لگتا تھا جیسے بندہ حساب کا پرچہ دے رہا ہو۔

"کل آپ کیوں نہیں آئی تھیں؟" وہ عجیب کھڑتل سے لہجے میں پوچھتے۔

"آپ کو میری کمی محسوس ہوئی تھی؟" میرا انگ انگ آنکھوں میں سوال لیے پوچھتا۔

"لاحول ولا قوۃ......" وہ بھنا جاتے۔

"کیسے آتی میں......؟" میں کسی ہیروئن کی طرح اپنا دوپٹا انگلیوں پر لپیٹتے ہوئے کہتی۔

"کیا روزانہ ہوائی جہاز پر آتی ہو۔"

"کاش کوئی بائیک پر لینے آجاتا۔" میں دل ہی دل میں سوچتی مگر کہہ نہ پاتی۔

"یہ سر جھکا کر کیوں بیٹھ گئیں، کیا پوچھ رہا ہوں میں؟"

"گھر میں مہمان آگئے تھے کیسے آتی؟" میں اپنی چپل کی نوک سے قالین کا رواں نوچتے ہوئے کہتی۔

"مہمان داری ہوتی رہے گی تو کیا آپ پڑھیں گی نہیں......؟"

"کیوں نہیں پڑھوں گی، جب سے ہوش سنبھالا ہے کتابوں کے سوا کسی کو نہیں دیکھا...... یہی میری دوست ہیں اور یہی میری دشمن۔"

"کتابیں بھی کہیں دشمن ہوا کرتی ہیں؟"

"ہاں ہوتی ہیں...... جب ان کو یاد کر کے جاؤ اور امتحانی ہال میں وہ ذہن سے نکل جائیں تب اپنی کسی سہیلی سے صرف یہ پوچھنا ہوتا ہے کہ پلیز صرف شروع کا بتا دو باقی میں سب خود لکھ لوں گی۔"

"لگتا ہے آپ کی سہیلیاں بھی آپ جیسی ہیں؟"

"نہیں...... میری سہلیاں سب کالی کلوٹی سی ہیں، میں تو بے حد خوب صورت ہوں۔" میں انہیں آگاہی دیتی۔

"افوہ بات کا مطلب کتنا غلط سمجھتی ہیں آپ...... مجھے تو حیرت کے ساتھ افسوس بھی ہوتا ہے آپ کی نالائقی دیکھ کر۔"

"میں نالائق تھوڑی ناں ہوں...... آپ کی ایک بات کے دس مطلب تو سمجھ جاتی ہوں۔"

"میں آپ کے امتحان کے بارے میں سوچ رہا ہوں کیا ہوگا......؟" وہ سر تھام لیتے۔

"میں ہر امتحان میں پوری اتروں گی۔" میں شرما کر کہتی۔

"بہت مشکل ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑاتے۔

"جی کہہ دیا ناں...... اب چھٹی نہیں کروں گی، میں نے اماں سے کہہ دیا ہے کہ اب گھر میں چاہے کتنے ہی مہمان آئیں میری وجہ سے کل آپ نے صبا کو بھی نہیں پڑھایا تھا۔" میرا لہجہ ٹوٹا پھوٹا سا ہوتا۔

"فیل تو آپ ویسے بھی ہوں گی بالکل ہی گھامڑ ہیں آپ۔" وہ ہلکی سی مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجا کر کہتے۔

"میں تو سمجھتی ہوں کہ میں پاس بھی ہوگئی۔" میں آنکھوں میں نشہ بھر کر کہتی۔ اپنی دوست صبا کے یہ پروفیسر بھائی مجھے کچھ زیادہ ہی پسند آگئے تھے۔

"خاک ہوں گی آپ پاس......" وہ آنکھوں کی زبان سمجھ ہی نہیں پاتے۔ تب میرا دل چاہتا کہ جو کچھ میرے دل میں ہے وہ سب کہہ ڈالوں مگر ان کی طبیعت ایسی تھی کہ چاہتے ہوئے بھی میں دل کی بات ان سے نہ کہہ پاتی۔

''سر کل آئے گا ہمارے ہاں صبا کے ساتھ۔''
ایک دن میں نے ہمت کر کے کہا۔

''نہیں بھئی، یونیورسٹی سے آ کر مجھ میں قطعاً ہمت نہیں ہوتی کہ کسی کے گھر جاؤں۔''

''مگر اماں نے آپ کو بلایا ہے۔'' میں گھبرا کر کہتی۔

''کوئی خاص وجہ......؟'' ان کی خفیف سی مسکراہٹ بھی بے روح ہوتی۔

''ہمارے ہاں حلیم پک رہا ہے۔'' میں دبے، دبے لہجے میں بتاتی۔

''سوری، میں زیادہ شوق سے نہیں کھاتا ہوں۔''

''پھر کیا کھاتے ہیں؟'' میرا رواں، رواں سوالیہ بن جاتا۔

''جو مل جائے، سیدھی سادی غذا۔'' وہ اتراتے۔

''اچھا تو پھر نہیں آ رہے آپ......؟'' میرا لہجہ غم سے بوجھل ہو جاتا۔

''جی نہیں۔'' تڑ سے کہا جاتا۔

''جی بہت اچھا...... میں اماں کو بتا دوں گی۔'' میں آنکھوں میں ستارے چھپا کر اٹھ کھڑی ہوتی۔

''ہاں، آنٹی سے یاد سے کہہ دینا۔'' انہوں نے حکم نازل کیا۔

''بھلا کیا کہہ دوں......؟''

''یہی کہ اس امتحانی سیزن میں بالکل ڈسٹرب نہ کریں ورنہ میری ساری محنت اکارت جائے گی اور تم فیل ہو جاؤ گی۔''

''آپ کو کیا اگر میں فیل ہو گئی تو......؟'' آنسو رخساروں سے گرنے کو بے تاب ہو گئے تھے۔

''مصیبت تو میری ہی ہو گی۔'' انہوں نے کھنکھارا۔

''جی نہیں، آپ کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔'' میں نے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

''کسی کے کہنے کی میں پروا بھی نہیں کرتا مگر......؟''

''مگر کیا......؟''

''جاہل بیوی کے ساتھ گزارہ کرنا مشکل ہوگا۔''
آخر سوال حل ہو ہی گیا۔

''کیا......!'' میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی پتھر کو جونک لگی تو کیسے۔

''محترمہ آپ جیسی نالائق لڑکی ایک قابل پروفیسر کی زندگی میں شامل ہو رہی ہے، تمہاری اماں نے میرے کہنے سے تمہیں لاعلم رکھا ورنہ فیل ہو جاتیں۔''

''فیل تو پہلے ہوتی اگر آپ مجھے نہ بتاتے غم کے مارے پڑھا ہی نہیں جاتا۔ آپ کو کیا پتا محبت سے محرومی کے غم کیا ہوتے ہیں۔ اب تو ٹاپ کروں گی ٹاپ......''
میں ہنستی کھلکھلاتی ان کے کمرے سے بھاگ آئی۔

بارش کے بعد

بارش کی گیلی، گیلی سی دوپہر کا وقت تھا مگر بارش چھما چھم برس رہی تھی۔ چھت کی الگنی کے کپڑے اب ٹی وی لاؤنج میں سوکھ رہے تھے...... باہر کے برآمدے کا سامان بھی اندر آ گیا تھا۔ جنریٹر کو بھی بارش سے بچانے کے لیے اندر کے کمرے میں رکھ دیا گیا تھا...... کمبل اور چادریں کھانے کی ٹیبل پر سوکھ رہی تھیں۔

''کتنا گندا گھر ہو رہا ہے، ہر طرف چیزیں پھیلی ہوئی ہیں......'' میاں جی اپنے کمرے سے نکل کر آئے تو تیوری چڑھا کر بولے۔

''بارش میں کون آ رہا ہے...... جس کے لیے میں صفائیاں کروں...... یہ گھر ہے اسپتال تھوڑی جو ہر وقت صاف ستھرا رہے۔'' (میرا لہجہ بھی کٹ کھنا سا تھا)

''کوئی نہ کبھی آئے...... بے ترتیبی سے الجھن تو ہوتی ہے ناں......'' وہ لہجے میں سلیقہ سمو کر بولے۔

''مجھ سے نہیں ہوتی اتنی صفائی ہر وقت کام...... کام...... مجھ سے نہیں ہوتا...... اور بارش میں تو اچھے اچھوں کے گھر گندے نظر آتے ہیں۔''

اور پھر یوں ہوا کہ بڑی جیٹھانی اپنی ہائی روف میں اپنے بچوں کو بھر کر ہمارے گھر آ گئیں۔ ان کے

بچے جب گاڑی سے اتر رہے تھے...... تو مجھے یہی لگا کہ کسی اسکول کے بچے اتر رہے ہیں۔

مگر جب چاچی چاچی السلام علیکم...... چاچی السلام علیکم کی تکرار...... کسی طرح ختم ہونے میں نہ آئی تو میں سمجھ گئی کہ اس خراب موسم میں...... میرے گھر کی خراب حالت کا آج انسپکشن ہو رہا ہے۔

’’قمر آرا...... کیا بیمار ہو......؟‘‘ بھابی نے پوچھا۔

’’ہاں طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے......‘‘ میں نے قدرے نڈھال سے لہجے میں کہا۔

’’کیا تم لوگ کہیں شفٹ ہو رہے ہو؟‘‘ وہ جگہ، جگہ سامان پھیلا دیکھ کر بولیں۔

’’نہیں تو......‘‘ میں کھسیا کر بولی۔

’’پھر یہ سامان کیوں پھیلا ہوا ہے؟‘‘ جیٹھ صاحب نے آخر کہہ دیا۔

’’وہ بارش ہو رہی تھی ناں...... اس لیے سب چیزیں یہاں آ گئیں...... حالانکہ یہ وہاں کی تھیں......‘‘ میں بدحواسی میں اٹک، اٹک کر بول رہی تھی۔

’’کراچی میں بارش ہوتی ہی کتنی دیر کی ہے...... مشکل سے آدھے گھنٹے کی بارش ہوئی تھی۔‘‘ جیٹھانی نے گو ہنس کر کہا مگر مجھے ان کا جملہ خاصا کَس کے لگا۔

اور پھر ایک ہی ہفتے بعد...... جب گھن گرج کے ساتھ بارش ہو رہی تھی...... میں اپنے میاں سے ضد کر کے جیٹھ کے گھر گئی...... ان کے ماشاء اللہ درجن بھر بچے...... دو بچے چھت پر...... دو محلے میں...... ابھی ہماری گاڑی ان کے علاقے میں داخل ہوئی تھی اور ان کے دو بچوں نے اپنے گھر میں مخبری کر دی کہ چاچا، چاچی ان کے گھر آ رہے ہیں...... ڈھیر بچوں کا انہیں کچھ تو فائدہ تو ہونا ہی تھا۔ ان پانچ سات منٹوں میں جب تک ہم ان کے گھر پہنچے...... دو بیٹیوں نے آناً فاناً گھر سنگوا کر جھاڑو پوچا لگا دیا...... دو بیٹیاں شامی کباب تلتے ہوئے پکوڑے بنانے کی تیاری کر چکی تھیں...... ہم ابھی بیٹھے ہی تھے...... پکوڑے...... نمک پارے...... کباب...... چٹنی کے ساتھ سامنے رکھ دیے گئے۔

’’دیکھا اسے کہتے ہیں سلیقہ......‘‘ گھر آ کر میاں جی موزے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولے۔

’’بھابی کے ڈھیر سارے بچے ہیں...... سلیقہ تو ہونا ہی تھا ناں ہمارے سامنے...... دو فارغ بچیاں تو لوڈو کھیل رہی تھیں۔‘‘ میں نے تنک کر کہا۔

’’تمہاری بھی تو دو بیٹیاں ہیں...... ان کو سلیقہ کیوں نہیں سکھایا؟‘‘

’’اتنے کم بچوں کو میں کیا، کیا سکھاؤں گی...... ان کی تو آپس کی لڑائیاں ہی ختم ہونے میں نہیں آتیں...... تو وہ سلیقہ کہاں سے سیکھیں گی...... یہ سلیقہ تو ان کے ہاں نظر آتا ہے جن کے ہاں بچوں کی فوج ہوتی ہے...... ہے ناں......‘‘

☆☆☆



جو میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆انعم حیدر خان...... پاک پتن
قتل کرتے ہیں نہ جینے کی دعا دیتے ہیں
لوگ کس جرم کی آخر یہ سزا دیتے ہیں
جب بھی ہم چاہتے ہیں اُن سے وفاؤں کا صلہ
سر پر لٹکی ہوئی تلوار دکھا دیتے ہیں

☆پروین افضل شاہین...... بہاول نگر
ہوا چلے گی تو خوشبو میری بھی پھیلے گی
میں چھوڑ آئی ہوں، پیڑوں پہ اپنے ہاتھ کے رنگ

☆نگہت زیدی...... اسلام آباد
اسے کہنا سدا موسم بہاروں کے نہیں رہتے
سبھی پتے بکھرتے ہیں ہوا جب رقص کرتی ہے

☆ایمان چوہدری...... فیصل آباد
بشر کو صبر نہیں ورنہ یہ مثل سچ ہے
کہ چپ کی داد غفور الرحیم دیتا ہے

☆ناظمہ شاہین اعوان...... واہ کینٹ
کڑے سفر کا تھکا مسافر تھکا ہے ایسا کہ سو گیا ہے
خود اپنی آنکھیں تو بند کرلیں، ہر آنکھ لیکن بھگو گیا ہے

☆نفیسہ آرا...... دبئی
مجھ کو اچھا نہیں لگتا کوئی ہم نام تیرا
کوئی تجھ سا ہو تو پھر نام بھی تجھ سا رکھے

☆روا اقبال...... اوکاڑہ
اے صبا آج ہمیں راکھ سمجھ کر نہ اڑا
ہم نے جل، جل کے تیرے راستے چمکائے ہیں

☆ناعمہ تحریم...... کراچی
خوشبو کی طرح پھیلے گی یہ بات کبھی تو
بخشے گا ہمیں شرفِ ملاقات کبھی تو
اب تک کی ملاقاتیں ہیں آئندہ کی خاطر
مل جائیں گے آپس میں خیالات کبھی تو

☆ماہ رخ...... لطیف آباد
بسا سکتے تھے یادوں کے کئی چہرے کئی پیکر
مگر کچھ سوچ کر ہم نے یہ دل ویران رکھا ہے
ہمیں شوقِ اذیت ہے وگرنہ اس زمانے میں
تیری یادیں بھلانے کو بہت سامان رکھا ہے

☆عنبر وسیم...... گوجرانوالہ
تجھ کو ڈھونڈے ہے گزرتا ہوا پل، پل جاناں
دیکھ ہم کب سے کھڑے ہیں سرِ مقتل جاناں
اب بھی ہونٹوں پہ الجھتے ہیں تیرے نام کے حرف
اب بھی سانسوں میں مہکتا ہے وہ آنچل جاناں

☆سیما گل...... ملتان
کبھی جو دل میں رہتا تھا ہمارے
پرائی آنکھ میں اب بس گیا ہے
نہ اس سے تم کوئی امید رکھو
سحر دنیا بڑی ہی بے وفا ہے

☆سیما ممتاز عباسی...... لاڑکانہ
قربت بھی نہیں دل سے اتر بھی نہیں جاتا
وہ شخص کوئی فیصلہ کر بھی نہیں پاتا
آنکھیں ہی نہیں خالی رہتی ہیں لہو سے
اِک زخم جدائی ہے کہ بھر بھی نہیں جاتا

☆صدف آصف...... کراچی
اور ہتھیلی سے مہکاریں پھوٹ پڑیں
میں نے تو بس نام تمہارا لکھا تھا

☆فردوس شاہی...... لاڑکانہ
دیکھی ہے اس کی آنکھ میں پہلی دفعہ نمی
یوں لگ رہا ہے جیسے سمندر اداس ہے

☆شازیہ حسن...... کراچی
ایسی حقیقتوں سے تصادم ہوا کہ بس
میں تو گیا ہوں بچ مگر خواب مر گئے

☆ راحت وفا...... ملتان
خاک مٹھی میں لیے قبر کی یہ سوچتے ہیں
مرتے ہیں انسان تو غرور کہاں جاتا ہے

☆ طیبہ عبید...... کراچی
نہیں کرتی پریشاں ان کو زندگی کی ٹھوکریں
خدا کا نام لے کر جن کو اٹھ جانے کی عادت ہو

☆ انیقہ...... کھاریاں
شاخ جھکتی جارہی ہے قربتوں کے بوجھ سے
پیار پہ ترکِ تعلق کا ثمر آنے کو ہے

☆ کرن ناز...... کھاریاں
کھلتا تھا کبھی جس میں تمنا کا شگوفہ
کھڑکی وہ بڑی دیر سے ویران پڑی ہے

☆ تمنٰی قندیل...... کمالیہ
درد حد سے بڑھا ہے تو یہ احساس ہوا ہے
دل بجھ کے بھی دل رہتا ہے پتھر نہیں ہوتا
ہر شخص کو منہ مانگی مرادیں نہیں ملتیں
ہر شخص مقدر کا سکندر نہیں ہوتا

☆ ثنا شاہ محمود...... گجرات
نیند پھر شب کو کہاں آپ کی زلفوں کی قسم
ذکر یاں جب سے سرِ شام تمہارا نکلا

☆ فوزیہ الیاس...... کھاریاں
پیار کے سچے مراسم کا پتا دیتا ہے
خط کے القاب میں اس کا مجھے پاگل کہنا

☆ گلناز گل...... ملتان
اب تو بیٹے بھی چلے جاتے ہیں رخصت ہو کر
صرف بیٹی کو ہی مہمان نہ سمجھا جائے

☆ کائنات عبدالحلیم...... میرپور خاص
روشنی بانٹتے رہنے سے بکھر جاتا ہوں
شام ہوتے ہی میں پانی میں اتر جاتا ہوں
میں ہوں پلکوں سے اترتا ہوا آنسو مظہر
چادرِ خاک پہ آتا ہوں تو مر جاتا ہوں

☆ مہرین ضیا بنگش...... کیماڑی
نہ کوئی رنج کا لمحہ کسی کے پاس آئے
خدا کرے کہ نیا سال سب کو راس آئے

☆ ساجدہ ظفر...... کمالیہ
دل جیتنے کے فن پہ اگر دسترس نہ ہو
دکھتی رگوں کو چھیڑنا دانشوری نہیں

☆ نایاب کرن صدیقی...... کمالیہ
روز روتے ہوئے کہتی ہے زندگی مجھ سے
صرف ایک شخص کی خاطر مجھے برباد نہ کر

☆ ارم کمال...... فیصل آباد
میں اپنی روح کی پوشاک بھی پہنا دوں اسے
وہ میری ذات میں رہنے کا فیصلہ تو کرے

☆ یاسمین کنول...... پسرور
مریضانِ محبت کو فقط دیدار کافی ہے
ہزاروں طب کے نسخوں سے نگاہِ یار بہتر ہے

☆ ایمن زرتاب ڈوگر...... کمالیہ
میں چپ رہوں کبھی بے وجہ ہنس پڑوں محسن
اسے گنوا کے عجب حوصلے تلاش کروں

☆ صائمہ سجاد بنگش...... کوہاٹ
بس یونہی دور جا نکلتے ہیں
بھلا خیال کی سرحد بھی کوئی ہوتی ہے

☆ نگینہ ضیا...... کیماڑی
مر کے آنسو ختم نہیں ہوتے
لوگ جب بین ڈال دیتے ہیں

☆ کوثر خالد...... جڑانوالہ
شاید شبِ وصال کی منزل قریب ہے
کانوں میں آرہی ہے کسی کی صدا مجھے

☆ جبین نیاز...... ملتان
گلدان سے جب مجھ کو تیری باس نہ آئی
مجھ کو میرے کمرے کی ہوا راس نہ آئی

☆ ماہ نور قیصر...... راولپنڈی
خاموشی کی تہ جمی تھی ایک مدت سے جہاں
دل کے دروازے پہ وہ جذبے صدا کرنے لگے

☆ زونیہ...... دینہ
کہاں تک مجھ سے ہو پاتی ہے اس دل کی نگہبانی
مکاں کی دیکھ بھال اس کے مکیں پہ چھوڑ دیتا ہوں



پشاوری قیمہ

اجزا: قیمہ، مشین کا، ایک کلو۔ ثابت دھنیا، دو کھانے کے چمچ۔ لال مرچ کٹی ہوئی، ایک کھانے کا چمچ۔ لہسن، ادرک پیسٹ، ایک کھانے کا چمچ۔ پیاز سلائس میں کٹی ہوئی، دو عدد۔ زیرہ ثابت، ایک چائے کا چمچ۔ قصوری میتھی، دو چائے کے چمچ۔ ہلدی پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ ہری مرچیں، چھ عدد۔ ہرا دھنیا، آدھی گڈی۔ ادرک، باریک کٹی ہوئی، ایک کھانے کا چمچ۔ تیل، آدھا کپ۔

ترکیب: ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں۔ زیرہ، ثابت دھنیا، ادرک لہسن کا پیسٹ اور قیمہ ڈال کر فرائی کریں۔ ساتھ ہی نمک، کٹی ہوئی لال مرچ، ہلدی پاؤڈر ڈال کر دھیمی آنچ پر پکائیں۔ قیمے کا پانی خشک ہو جائے تو قصوری میتھی، ادرک، ہری مرچیں اور پیاز ڈال کر دم پر رکھیں۔ قیمہ گل جائے اور پیاز نرم ہو جائے تو ہرا دھنیا ڈال کر گرم گرم نان اور لیموں پیاز کی سلاد کے ساتھ سرو کریں۔

مرسلہ: فرحین عمران، کراچی

ڈرائی بیف چلیز

اجزا: گائے کا گوشت انڈر کٹ، ایک کلو۔ بڑے بڑے ٹکڑے کرلیں، ان ٹکڑوں کو ایک سے دو گھنٹے کے لیے فریز کرلیں۔ ہری مرچ، پندرہ عدد۔ (بیج نکال کر لمبی، لمبی کاٹ لیں) سویا ساس، چار کھانے کے چمچ۔ چینی، ایک چائے کا چمچ۔ کالی مرچ پسی ہوئی، حسبِ ذائقہ۔ سفید سرکہ، دو کھانے کے چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ تل کا تیل، چند قطرے۔ کارن فلاور، دو چائے کے چمچ۔ سفید مرچ پسی ہوئی، حسبِ پسند۔ چکن کیوب ملا ہوا میدہ، ایک چائے کا چمچ۔ لہسن کے جوئے چھلے ہوئے، آٹھ عدد۔ (باریک کاٹ لیں) تیل، چار کھانے کے چمچ۔

ترکیب: فریز کیے ہوئے گوشت کے ٹکڑے نکال کر تیز چھری کے ساتھ باریک پارچے کاٹ لیں پھر ان پارچوں میں نمک، چینی، کالی اور سفید مرچ، سویا ساس، سرکہ، لہسن، کارن فلاور اور میدہ ڈال کر اچھی طرح ملا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ جب پکانا ہو تو ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں پھر سب مسالا لگے پارچے ڈال کر تیز آنچ پر اسٹر فرائی کرلیں۔ جب پانی خشک ہونے لگے تو آنچ ہلکی کردیں۔ دوسرے فرائی پین میں ایک کھانے کا چمچ تیل ڈال کر ہری مرچوں کو اسٹر فرائی کر کے گوشت میں ڈال دیں پھر تل کا تیل ڈال کر گرم، گرم کھانے کے لیے پیش کریں۔ اس کے ساتھ خشکہ چاول کھائے جاتے ہیں۔ چاہیں تو کیچپ یا ہاٹ ساس کے ساتھ کھائیں۔

مرسلہ: مہ نور خان، بہارہ کہو

چائنیز ڈرم اسٹکس

اجزا: چکن لیگ پیس، آٹھ عدد۔ پیاز، ایک عدد۔ سفید سرکہ، دو چائے کے چمچ۔ انڈا، ایک عدد۔ سفید مرچ پسی ہوئی، حسبِ پسند۔ چائنیز نمک، ایک چائے کا چمچ۔ کارن فلاور، ایک کھانے کا چمچ۔ میدہ، آدھا کپ۔ ہری مرچ، چھ عدد۔ (باریک کاٹ لیں)

ترکیب: لیگ پیس کو ایک سرے سے پکڑ کر گوشت کو تیز چھری سے اس طرح کاٹیں کہ وہ ہڈی سے علیحدہ تو ہو جائے مگر ہڈی کے سرے پر جڑا رہے۔ اس علیحدہ شدہ گوشت پر بھی چھری سے ہلکے، ہلکے کٹ لگائیں۔ تقریباً ایک گھنٹے کے لیے ان پر سرکہ اور چائنیز نمک لگا کر رکھ دیں۔ ایک پیالے میں پیاز کو آملیٹ کی

طرح کاٹ لیں، ہری مرچیں بھی ملا دیں۔ پھر نمک، سفید مرچ، کارن فلاور، انڈا اور میدہ بھی ملا دیں۔ اس مرکب کو مرغی کی ٹانگوں پر اندر اور باہر اچھی طرح لگا دیں۔ ہاتھ سے پانی لگا کر اچھی طرح شیپ دے کر ایک بڑی پلیٹ میں کر کے فریج میں رکھ دیں۔ جتنی دیر فریج میں رکھیں تلنے کے بعد اتنی ہی زیادہ مزے دار ہوں گی کیونکہ تمام مسالے اور خوشبو خوب رچ بس چکی ہوگی۔ کڑاہی میں کافی سارا تیل گرم کر کے ان کو تل لیں۔ آنچ تیز اور تیل زیادہ گرم نہ ہو ورنہ اندر سے کچی رہیں گی۔ تلتے ہوئے بھی کانٹے سے کچوکے لگاتے جائیں تاکہ اندر تک پک جائیں۔ گولڈن براؤن ہونے پر تل کر نکال لیں اور ڈش میں نکالیں اور ڈش میں سجا کر گرما گرم پیش کریں۔

مرسلہ: نفیسہ آرا، راس الخیمہ

کھجور کا میٹھا

کھجور اگرچہ ماہِ رمضان میں زیادہ کھائی جاتی ہے مگر موسمِ سرما میں اس کے بنائے گئے میٹھے بہت قوی اور حدت بخش ثابت ہوتے ہیں۔

اجزا: کھجور، ایک پاؤ (گٹھلیاں نکال لیں) کریم، آدھا کپ۔ دودھ، آدھا کلو۔ پسا ناریل، دو کھانے کے چمچ۔ میوہ، بادام، پستہ، کشمش، حسبِ ضرورت و حسبِ استطاعت۔ چینی، دو کھانے کے چمچ اگر ضرورت .... ہو تو ورنہ کھجوریں میٹھی ہوں گی۔

ترکیب: کھجوروں کو دودھ میں اچھی طرح ابال کر نرم کر لیں اور پھر میش کر لیں اس میں چینی، کریم، ناریل اور میوہ ڈال کر پکائیں اور خوب گاڑھا کر لیں۔ یکجا ہو جائیں تو ٹھنڈا کر کے سرو کریں۔ چاہیں تو اوپر سے بھی باریک کٹا میوہ چھڑک دیں۔

مرسلہ: عرشیہ جنید، کراچی

شاشلک

اجزا: بکرے کا گوشت، آدھا کلو، بغیر ہڈی کا۔ پیاز، درمیانی دو عدد۔ ہرے سیب، دو عدد۔ انڈا، ایک عدد۔ شملہ مرچ، دو عدد۔ سویا ساس، دو کھانے کے چمچ۔ سرکہ، دو کھانے کے چمچ۔ تیل، 3/4 کپ۔ لال ٹماٹر، تین عدد۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ اجینو موتو، حسبِ ذائقہ۔ کارن فلاور، دو چائے کے چمچ۔

ترکیب: گوشت کے چار 1/2 انچ موٹے پارچے بنا کر ان کے تقریباً ڈیڑھ، ڈیڑھ انچ کے چوکور ٹکڑے کر لیں۔ پیاز، مرچیں، ٹماٹر اور سیب سب کے ایک، ایک انچ کے چوکور ٹکڑے کر لیں۔ گوشت کے ٹکڑے سبزیوں کے ساتھ ملا کر سویا ساس، نمک، چائنیز نمک، سرکہ، سیاہ مرچ، انڈا اور کارن فلاور ملا کر رکھ دیں۔ اب شاشلک بنانے والی سیخوں یا تنکوں میں اس طرح پرو دیں کہ پہلے ایک بوٹی پھر پیاز پھر شملہ مرچ، ایک سیدھے پیندے کی فرائی پین میں تیل گرم کر کے ان سیخوں کو گھما، گھما کر تل کر چاروں طرف سے پکائیں۔ ابلے چاولوں کے اوپر رکھ کر پیش کریں۔ شاشلک چکن اور بیف کے بھی بن سکتے ہیں۔

مرسلہ: بینا عباس، کراچی

سیب کی کھیر

اشیا: سیب، دو عدد کش کر لیں۔ کوکونٹ ملک، تین کپ۔ سبز الائچی، دو عدد۔ مکھن، ایک کھانے کا چمچ۔ چاول کا آٹا، دو کھانے کے چمچ۔ فریش کریم، ڈیڑھ کپ پھینٹی ہوئی۔ چینی، آدھا کپ۔ بادام، پستے سجاوٹ کے لیے۔

ترکیب: ایک پتیلی میں مکھن گرم کر کے الائچی ڈال کر کڑکڑائیں۔ اب اس میں چاول کا آٹا ڈال کر بھونیں اور مہک آنے پر چولھے سے اتار کر مسلسل چمچہ چلاتے ہوئے اس میں کوکونٹ ملک شامل کریں اور اچھی طرح مکس کر کے دوبارہ ہلکی آنچ پر پکائیں۔ ساتھ چینی بھی ڈال دیں۔ جب گاڑھا ہونے لگے تو اس میں کش کیے ہوئے سیب، بادام، پستے ڈال دیں۔ تھوڑی دیر پکانے کے بعد چولھے سے اتار لیں۔ جب کھیر ٹھنڈی ہو جائے تو اس میں کریم ڈال کر مکس کریں اور سرونگ ڈش میں نکال لیں۔

مرسلہ: نازنین آفریدی، پشاور



چھائیاں اور ان سے مکمل بچاؤ کیسے ممکن ہے؟

چھائیوں سے بچاؤ بہت آسان اور مکمل مستقل مزاجی سے ہی ہوسکتا ہے۔آپ کو اپنے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق خوراک ،ادویات اور ہلکی پھلکی ورزش یہ سب مل کر مستقل طور پر کرنا ہوگا۔کبھی کبھار کوئی چھوٹا موٹا وقفہ ہوجائے تو کوئی بات نہیں مگر مستقل بے پروائی آپ کی جلد کو مزید خراب کرنے کا باعث ہوگی۔

چھائیوں کا مکمل میڈیکل علاج:

جیسے ،جیسے سائنس نے بے پناہ ترقی کی ہے ویسے ویسے چھائیوں اور جلد کی دوسری بیماریوں کے علاج بھی اب بہت آگے جاچکے ہیں۔چھائیوں کے علاج کے سلسلے میں سب سے اہم بات وٹامن سی کا استعمال' سورج کی شعاعوں سے بچاؤ کے لیے سن اسکرین' ہارمونز کی مکمل جانچ ،ٹینشن اور پریشانیوں سے نجات بہت ضروری ہے۔آپ کو پانی اور دودھ کا استعمال خاصی حد تک بڑھانا ہوگا۔ایسی کریمیں جن میں وٹامن سی اور cartizone Hydrog شامل ہوں صرف اور صرف ڈاکٹر کے مشورے سے ہی استعمال کی جاسکتی ہیں اگر کوئی بھی خاتون یا شخص اپنی مرضی سے ایسی ادویات یا کریمیں استعمال کرے گا تو ہوسکتا ہے بہت ہی زیادہ نقصان ہو جو نا قابلِ تلافی بھی ہوسکتا ہے اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ نہ صرف چھائیوں کی رنگت اور زیادہ سیاہ ہوجائے بلکہ آپ کا پورا چہرہ ہی خراب ہوجائے۔

جدید علاج کے علاوہ آج کل Peeling بھی موجود ہے جو بہتر طریقہ علاج ہے اور اس کے کوئی نقصانات بھی نہیں ہیں۔مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ Peeling صرف اور صرف ماہر اور مستند ڈاکٹر سے ہی کروانی چاہیے کہ اسے آپ کی جلد کی ساخت اور اندرونی عوارض کا پوری طرح سے علم ہو اور وہ آپ کی صحت ،عمر اور ساخت کی کیفیت کے حساب سے آپ کا علاج کرے اور اس کے بعد کیا دوا تجویز کرنی ہے اسے اچھی طرح سے معلوم ہونا چاہیے۔یاد رہے کہ peeling کا عمل ہر کوئی نہیں کرسکتا۔یہ صرف اور صرف ماہر ڈاکٹر کی نگرانی میں ہونا چاہیے کیونکہ غیر سند یافتہ شخص آپ کی جلد کو نا قابلِ تلافی نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔

عام طور پر جلد سرخ وسفید اور شاداب کیسے رکھی جاسکتی ہے

اگر ہم اپنے اندر سے بلاوجہ کا حسد وبغض ،کینہ اور ٹینشن نکال دیں۔باوضو رہیں ،پانچ وقت نماز پڑھا کریں۔ہلکی پھلکی غذائیں کھائیں۔مرغن غذاؤں سے بچیں ،پانی اور دودھ کا استعمال بڑھائیں۔سرسبز و شاداب علاقے میں ہلکی پھلکی ورزش اور چہل قدمی کریں۔غرض یہ کہ سکون کی زندگی گزاریں تو اس کا عکس ہمارے چہرے پر بھی آجائے گا اور ہم نکھرے ،نکھرے ،خوب صورت اور دلکش نظر آئیں گے۔اس کے علاوہ خواتین کا زیادہ تر وقت کچن میں گزرتا ہے تو اس کے لیے آپ کچن کی چیزوں سے فائدہ اٹھائیں۔

کچی سبزیاں جو بہ آسانی کھائی جاسکیں استعمال کریں۔مرغن غذاؤں سے بہتر ہے کہ پھل اور سبزی سے پیٹ بھریں۔ہرے پتوں والی سبزیوں کا استعمال کریں۔ہرے پتوں والی سبزیوں کا استعمال فولاد کی کمی پوری کرے گا۔اپنی بچیوں کو بچپن سے ہی باقاعدگی سے دودھ پینے کی عادت ڈالیں تاکہ آئرن اور کیلشیم مل سکے۔اس کے ساتھ ،ساتھ مختلف قسم کی پھلیوں کو غذا میں شامل کریں۔

☆☆☆



بزمِ پاکیزہ
پاکیزہ بہنیں

پہلا انعام یافتہ سوال

☆ فرخندہ جعفری، گجرات

سوال 1۔ اگر میرے جیسی بوڑھی خاتون کو گڑیا کہا جائے تو وہ کیا محسوس کرے گی؟

جواب۔ یہی کہ سچ بولنے والے اب بھی موجود ہیں۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ سائرہ ارم ڈوگر......کمالیہ

سوال۔ امتحان میں بغیر محنت، بغیر نقل اور بغیر رشوت......کامیابی حاصل کرنے کا آسان سا طریقہ بتادیں؟

جواب۔ پھر خواب میں امتحان دے دو اور خوابوں میں ہی ٹاپ بھی کرلو۔

حمنیٰ قندیل......ٹوبہ ٹیک سنگھ

سوال۔ مسالا زیادہ ڈالوں تو ساس کا موڈ خراب ہوتا ہے اور مسالا کم ڈالوں تو کھانا خراب ہوتا ہے، کیا کروں؟

جواب۔ نندوں سے پکوایا کرو......تم کیوں جاتی ہو کچن میں۔

اُمِ ایمان قاضی۔ کوٹ چھٹہ

سوال۔ ایک بیٹی اور ایک بہو کے لیے ایک ہی قسم کے معاملات میں اصول کیوں مختلف ہوتے ہیں؟

جواب۔ ساس ماں بننے کے لیے تیار نہیں اور نہ ہی بہو...... بیٹی بننے کے لیے رضامند ہے تو پھر ایسا ہی کچھ ہوتا ہے۔

ایمن رانی......پنجاب

سوال۔ چلو پھر آج کوئی بچپنے کا کھیل کھیلیں ہم بڑی مدت ہوئی بے ساختہ ہنس کر نہیں دیکھا

جواب۔ حیرت ہے کیا ٹی وی کے ٹاک شو نہیں دیکھتی ہو تم...... مجھے تو جھوٹے فریبی لوگوں کو آپس میں لڑتے دیکھ کر بڑی ہنسی آتی ہے۔

عذرا لیاقت......فیصل آباد

سوال۔ سب لوگ روٹی گول ہونے کا ہی اصرار کیوں کرتے ہیں؟

جواب۔ انہیں ٹیڑھی میڑھی محبت سے پکی ہوئی روٹی کی لذت معلوم نہیں ہوتی۔

نرگس نسیم......صابہ موہڑہ

سوال۔ باجی جب میں نسوار کلر کی ساڑی پہنتی ہوں ناں تو......؟

تو میں سب کو قوام جیسی دلکش نظر آتی ہوں۔

شمع خالد......جڑانوالہ

سوال۔ کیا سبزیاں صرف غریب غربا ہی کھاتے ہیں؟

جواب۔ نہیں، موٹے اور مریض بھی سبزیاں کھاتے ہیں۔ کولیسٹرول والے تو بہ حالتِ مجبوری بھی کھاتے ہیں۔

عنبر وسیم......گوجرانوالہ

سوال۔ آنٹی کھسیانی ہنسی کسے کہتے ہیں؟

جواب۔ جب ہنستے ہوئے رونے کو دل چاہے۔

فردوس شاہی......لاڑکانہ

سوال۔ کہتے ہیں کہ زندگی ایک امتحان ہے تو اس کا رول نمبر کہاں ہے۔

جواب۔ بغیر رول نمبر، بغیر ایڈمٹ کارڈ اور بغیر امتحانی سینٹر کے...... یہ امتحان ہوتا رہتا ہے۔

شہلا نواز......لاہور
سوال۔ عمر یا بیتی جائے کوئی رشتہ نہ آئے...... بتایئے کیا کروں؟
جواب۔ کسی اچھے اور قابلِ اعتماد میرج بیورو سے رابطہ کریں۔

سیدہ غزالہ عالم......لانڈھی
سوال۔ 2015ء تو گزر گیا، یہ سال کس کا تھا۔
جواب۔ گزرنے والوں کا۔

ماہ رخ......حیدر آباد
سوال۔ مینڈکی کوز کام کب ہوتا ہے؟
جواب۔ جب وہ کچن کے کام نمٹا کر اپنے اے سی چلتے کمرے میں آجاتی ہوگی۔

انیقہ صدف......لطیف آباد
سوال۔ سفید جھوٹ کسے کہتے ہیں؟
جواب۔ جو سفید سوٹ پہن کر بولا جائے۔

نسیم منظر......بفرزون
سوال۔ افواہیں کیسے پھیلتی ہیں؟
جواب۔ موبائلز اور ٹی وی کے چینلوں سے؟

صائمہ سجاد بنگش......کوہاٹ
سوال۔ ان کے بیل نے ہمارے بیل کو ٹکر ماردی؟
جواب۔ تم اُن کی کھڑی بائیک کو اپنی سینڈل سے کچل دو۔

ارم کمال......فیصل آباد
سوال۔ تو، تو اور میں، میں کا اینڈ کیا ہوتا ہے؟
جواب۔ دور فٹے منہ......پر......

پروین افضل شاہین......بہاول نگر
سوال۔ طبیعت زیادہ خراب ہو تو کس سے رجوع کیا جائے؟
جواب۔ اسی سے جس کی وجہ سے طبیعت خراب ہوئی ہے۔

یاسمین اسرار......کمالیہ
سوال۔ کمر کو کمرا بننے میں کتنی دیر لگتی ہے؟
جواب۔ بے فکری کے چند سال ہی کافی ہیں جب آپ آئینہ دیکھنا چھوڑ دیں۔

نازیہ نزی......نوشہرہ کینٹ
سوال۔ نفسیاتی سا ہونے کے لیے کیا بے وقوف ہونا ضروری ہوتا ہے؟
جواب۔ چڑ چڑے لوگوں کو بھی نفسیاتی ہونے کا میڈل مل سکتا ہے۔

انیسہ زینب......شیخوپورہ
سوال۔ اگر پاکستان کا وزیر اعظم کسی پاکستانی اداکارہ کو بنا دیا جائے تو کس کو بنایا جائے؟
جواب۔ کوئی بھی...... میرا...... ماہرہ...... عائشہ عمر کسی کو بھی۔

مسز روزینہ عابد......کراچی
سوال۔ سیدھی آنکھ پھڑکے تو غم اور الٹی آنکھ پھڑکے تو خوشی ملتی ہے۔ مگر میری تو دونوں پھڑک رہی ہیں، کیوں؟
جواب۔ آپ آشوبِ چشم میں گرفتار ہیں۔

فلک بنت ندیم......حیدر آباد
سوال۔ کس طرح کے لوگ جلد ناراض ہو جاتے ہیں؟
جواب۔ جس سے بھی بدتمیزی کرو، سب ہی ناراض ہو جاتے ہیں۔

فرحین......لاہور
سوال۔ مت گستاخی کرنا اس سے......کس سے؟
جواب۔ اپنے شوہر کی ماں سے کہ ماں صرف ماں ہی ہوتی ہے اور ان سے بدتمیزیاں نہیں کی جاتیں۔

نور افشاں......شکار پور
سوال۔ کتابی چہرے کیسے ہوتے ہیں؟
جواب۔ جن کی پیشانی پر دیباچہ درج ہوتا ہے۔

☆☆☆



روحانی مشورے

ادارہ

ڈینگی وائرس کا موثر علاج

☆سیب کے جوس میں لیمن کے چند قطرے ملا کر ڈینگی وائرس کے مریض کو پلایا جائے تو اس سے پلیٹلیس کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوجاتا ہے یہ ڈینگی وائرس کا آزمودہ علاج ہے۔ اب آپ اس... جوس پر 41 مرتبہ سورۂ فاتحہ (الحمد) اول و آخر تین مرتبہ درود ابراہیمؑ بھی پڑھ کر دم کردیں۔ انشاء اللہ سو فی صد افاقہ ہوگا۔

برے اثرات، حاسدین اور شر پسندوں سے بچاؤ کے لیے

☆روزانہ بلند آواز میں سورۂ بقرہ کی تلاوت کریں اگر آپ پوری نہیں پڑھ سکتے تو ایک رکوع ہی پڑھ لیں اور ایک رکوع پڑھنے کا بھی ٹائم نہیں ہے تو ایک صفحہ ہی پڑھ لیں مگر ہر روز پڑھیں...... کسی دن کا ناغہ نہ کریں۔ (سوائے اس کے آپ کو ناپاکی کی وجہ سے پڑھنا نہ ہو) چند ہی دنوں میں آپ کو خود ہی اندازہ ہوجائے گا کہ اس کے پڑھنے کی وجہ سے آپ کی پریشانیاں کتنی آسانی سے ازخود ختم ہوگئی ہیں۔ آپ خود بھی پڑھیں اور دیگر لوگوں کو بھی پڑھنے کو کہیں...... اس سے آپ بھی ایک نیک عمل میں شریک ہوجائیں گی۔

کاروبار میں ترقی کے لیے

اگر آپ کی کوئی دکان، آفس، یا کمپنی ہے اور گھاٹے میں جارہی ہے تو سب سے پہلے صدقہ دیں...... اور خیال رکھیں کہ آپ کے رشتے داروں یا آس پڑوس میں کوئی یتیم، غریب، مسکین ہے تو اس کی مدد کریں۔ اور اپنے آفس میں کسی قسم کی تصاویر نہ لگائیں۔ صبح جا کر تلاوت کریں...... روزانہ دو رکعت نماز شکرانہ پڑھنا اپنی عادت بنالیں۔ یاد رکھیے گا اللہ تعالیٰ شکر ادا کرنے والوں کو ہمیشہ زیادہ دیا کرتا ہے۔

اللہ پاک کے کلام مجید میں بہت شفا اور برکت ہے۔ سورۂ قاریہ لکھ کر اپنے ساتھ رکھیں یا دفتر، دکان، مکان میں کسی پاک جگہ پر رکھ دیں چھوٹی سی سورہ ہے جلد یاد ہوجائے گی اس کا ورد بھی کرتے رہیں۔

جب طبیعت میں چڑ چڑا پن ہو

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بلاوجہ غصہ آتا ہے اور طبیعت میں تناؤ سا آجاتا ہے۔ نہ کچھ کھانے کو دل چاہتا ہے اور اگر کچھ کھا بھی لیا جائے تو تسلی نہیں ہوتی۔ جب آپ کا مزاج ڈپریشن بھی محسوس کررہا ہو اور بے بات رونا بھی آرہا ہو تو آپ فوراً وضو کرکے دو رکعت نماز توبہ پڑھیں اور درود شریف پڑھنا شروع کردیں...... آپ خود دیکھیں گی کہ صرف پندرہ منٹ میں آپ کے مزاج کا تمام چڑچڑاپن ازخود ختم ہوجائے گا۔ (انشاء اللہ)

اچھی ملازمت حاصل کرنے کے لیے

سب سے پہلے نماز کی پابندی کریں...... بزرگوں کی دعائیں لیں۔ حسبِ استطاعت صدقہ روزانہ دیں...... یا معید یا مقدم کی ایک، ایک تسبیح دس دن تک مسلسل پڑھیں اول و آخر درود ابراہیمؑ کے ساتھ انشاء اللہ حسبِ پسند ملازمت مل جائے گی۔

نظر لگنا

بچوں کو نظر لگ جانا حقیقت ہے اور ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ نے اس کی تصدیق کی ہے اور آپ ﷺ نے یہ بھی ہدایت کی ہے کہ چھوٹے بچوں کو مغرب کے وقت گھروں سے لے کر نہ نکلا جائے اور جب تک اندھیرا نہ پھیل جائے...... (عشا تک) انہیں

گھروں میں ہی رکھا جائے...... اس وقت آسمان سے بلاؤں کا نزول ہوتا ہے اور گھر سے باہر نکلے ہوئے بچے اس سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ یوں بھی جب ہم بڑے بھی گھر سے باہر نکلیں تو آیت الکرسی پڑھنے کی عادت پکی کر لینی چاہیے۔ بعض گھرانوں میں ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ بچے کسی وجہ سے بھی بیمار ہوں اس ضمن میں آپ کی بے احتیاطی کی وجہ بھی نمایاں ہو مگر وہ پھر بھی یہی کہتے ہیں کہ ہمارے بچے کو نظر لگ گئی ہے...... کوئی غلط فیصلہ کرنے کے بعد جب اس کا نتیجہ حق پر نہ نکلے تو اسے بھی بدنظری سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہے...... اسی طرح رزق میں تنگی آجائے یا کمی ہو جائے تو یہ نتیجہ نکالنا کہ میرا رزق کسی نے باندھ دیا ہے صحیح بات نہیں ہے۔ یہ کہتے ہوئے ہم بھول جاتے ہیں کہ ہم سب کا رازق صرف وحدہ لاشریک اللہ ہی کی ذات ہے۔ اگر میرا رب مجھے رزق دینا چاہے تو مخلوق میں سے کسی کی بھی یہ ہمت نہیں ہو سکتی کہ وہ میرا رزق باندھ سکے اور اگر خدانخواستہ میرا رب کسی بندے پر رزق تنگ کردے تو کسی کی مجال نہیں کہ وہ اسے رزق دے دے۔ اللہ اپنی مرضی کا مالک ہے اور وہ اپنی مرضی کے بغیر نہ کسی کی سفارش سنتا ہے اور نہ کسی کی مجال ہے کہ اسے مجبور کر سکے...... اس لیے جب رزق کی کمی ہو تو ہمیں اپنے خالق و مالک کو راضی کرنے کی فکر ہونی چاہیے۔ اس کے لیے ہمیں زیادہ سے زیادہ استغفار پڑھنا چاہیے۔ توبہ کے نفل پڑھنے چاہئیں۔ اور معوذ تین سورۂ فلق، سورۂ ناس) کا ورد ضرور رکھیں۔ اور جب ہمارا اللہ ہم سے راضی ہوگا تو ہماری ساری مشکلات از خود ختم ہو جائیں گی...... اس لیے پیارے قارئینِ کرام...... لوگوں کی خوشامد، بے جا سفارش کے بجائے اپنے رب کو راضی کرنے کی کوشش کریں...... کہ وہ جس کا دوست ہے اس کا کوئی دشمن نہیں۔

بے خوابی

رات کو نیند نہ آنے کی شکایت ہو...... تو دو رکعت توبہ کے نفل پڑھیں۔ پہلے کلمے کی تسبیح پڑھیں اور سونٹھ کا جوشاندہ بنا کر پی لیں انشاء اللہ اچھی اور پُرسکون نیند آئے گی...... اور جن لوگوں کو راتوں کو جاگنے کی عادت ہے انہیں جوشاندہ پینے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ساری رات ٹی وی دیکھنے کے بجائے استغفار کی تسبیح پڑھا کریں تا کہ وقت تو ضائع نہ ہو۔

بال خوب لمبے ہو جائیں

اگر آپ کے بال گر رہے ہوں اور کسی صورت بڑے نہ ہو رہے ہوں تو یہ نسخہ ہمیں ایک قاری بہن نے راولپنڈی سے بھیجا ہے۔ بقول عاصمہ بہن کے یہ ان کا آزمودہ ہے۔ اس کے لیے آپ دو مٹھی پتری تمبا کو لے لیں اور صرف ایک مٹھی نیم کے خشک پتے۔ ان کو اسٹیل کے تین گلاس پانی (یا کوئی بھی گلاس کا پیمانہ لے لیں) میں کسی اسٹیل کی پتیلی میں یہ دونوں چیزیں پکنے کے لیے رکھ دیں اور جب پانی آدھا گلاس رہ جائے تو چھان کر یہ پانی علیحدہ رکھ لیں اور تمبا کو اور نیم کے پتے ڈسٹ بن میں ڈال دیں۔

اب کڑاہی میں آدھا کلو سرسوں کا خالص تیل ڈال کر گرم کریں اور اس میں یہ تمبا کو اور نیم کی پتی کا عرق جو ہمارے پاس آدھا گلاس موجود ہے اس تیل میں ڈال دیں۔ اب چولہا تیز کر دیں۔ اور کڑاہی پر ڈھکن ڈھک دیں۔

تیل جب تیز پکنے لگے تو چولہا ہلکا کر دیں جب ہمیں یہ اندازہ ہو جائے کہ اس تیل میں ہم نے جو پانی ڈالا تھا وہ ختم ہو گیا ہے تو اتار لیں اور ٹھنڈا ہو جانے پر اسے شیشی میں گیارہ مرتبہ سورۂ فاتحہ اور سات مرتبہ سورۂ بقرہ پڑھ کر اس تیل پر دم کر دیں۔ رات کو سر میں اچھی طرح لگا کر سو جائیں اور شیمپو کم سے کم کریں۔ آج کل بالوں کا ستیاناس صرف شیمپوز کے زیادہ استعمال کی وجہ سے بھی ہو رہا ہے اور دوسرے ہم نے تیل لگانا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ لڑکیاں روزانہ تیل نہیں لگا سکتیں مگر ہفتے میں دو دن تو لگا سکتی ہیں۔ اس تیل کے اثرات تین ماہ کے اندر انشاء اللہ آپ خود دیکھ لیں گی۔

☆☆☆



شوابے ہومیو کلینک

SCHWABE

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

ڈسمینوریا

آمنہ فیصل .... فیصل آباد

مجھے ایام کے وقت الٹیاں آنا شروع ہو جاتی ہیں اور کچھ کھایا پیا نہیں جاتا۔ یوں لگتا ہے کہ جان نکل جائے گی۔ میری کمر کے نچلے حصے اور پٹھوں اور پنڈلیوں میں بھی درد ہوتا ہے۔ میرے سر کے بال بھی گرتے ہیں۔ میرے جسم پر سرخ دانے نکل رہے ہیں اور کبھی کبھی ہاتھ بھی کانپتے ہیں۔ پیٹ اور کولہے پھیلتے جارہے ہیں۔ رنگ بھی خراب ہوگیا ہے۔ کبھی صاف لگتا ہے اور کبھی کالا۔ صرف چہرے اور ہاتھوں کا رنگ خراب ہوتا ہے۔ پانی پینے سے مجھے اپھارا ہو جاتا ہے۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے بھی ہیں۔ چہرے پر بال نکل آئے ہیں جو پہلے نہیں تھے۔

جواب: پانچ وقت نماز کی پابندی کریں۔ صبح چہل قدمی کیا کریں۔ پانی کا استعمال کم از کم 12 گلاس روز کریں۔ متوازن غذا دودھ، گوشت، سبزیاں اور پھلوں کا استعمال بڑھائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں اور پھر اپنا حال تفصیل سے لکھیں۔ Sulphur-200 کی ایک خوراک سب سے پہلے لیں۔ صبح نہار منہ 5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر ہر 3 ہفتے بعد لیں،

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

جنوری 2016

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________________

پتا: ____________________

____

اس سے ایک دن پہلے اور بعد کوئی اور دوا نہیں لیں۔ پھر ایک دن بعد Magnesium Phos Pentarkan Ptk 60 کی ایک، ایک گولی دن میں 3 مرتبہ میں چوسیں۔

لیکوریا

امامہ ارم .... سکھر

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے سر کے تقریباً 80% بال سفید ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ آپ پلیز کوئی اچھی سی دوا تجویز کریں کہ میرے بال کالے جائیں۔ مجھے لیکوریا کی شکایت بھی ہے، تقریباً چودہ سال سے ہے۔ میرا پیٹ بھی بڑھ گیا ہے۔ دواؤں سے وقتی طور پر افاقہ ہوتا ہے۔ آپ میرے لیے اچھی سی دوا تجویز کر دیں تا کہ میرے مسئلے حل ہو جائیں۔

جواب: غم، فکر، ناقص غذا، پانی غیر معیاری، شیمپو، تیل اور کچھ جسمانی تبدیلیاں جو وقت و عمر کے ساتھ ہوتی ہیں بالوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ہمیں لگتا ہے کہ آپ لگ کر علاج نہیں کراتیں کچھ افاقہ ہونے پر علاج چھوڑ دیتی ہیں۔ ایسا نہ کریں بلکہ مستقل مزاجی کے ساتھ علاج کریں ورنہ مسئلہ بڑھ ہو جائے گا۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Lycopodium-30، Borax-30، Pulsatilla-30، Calc. carb-30۔ ہر بوتل میں سے 7-7 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

معدے کا مسئلہ

رمیش .... کوٹ ادو

میرا مسئلہ معدے کا ہے اور یہ تقریباً 4 سال سے ہے۔ معدے میں درد رہتا ہے۔ کھانے کے بعد کبھی فوراً اور کبھی کچھ دیر بعد جلن کی شکایت ہو جاتی ہے۔ الٹرا ساؤنڈ سے معلوم ہوا.... کہ مجھے معدے کا السر ہے۔ میں اس کے ساتھ رپورٹ بھی کر رہا ہوں۔ برائے مہربانی میرا کوئی اچھا سا علاج تجویز کریں تا کہ اس مرض سے نجات مل جائے۔

جواب: کھانے کے ساتھ اور بعد پانی کا استعمال نہ کریں۔ کھانا اچھی طرح چبا کر کھائیں۔ مرغن اور بھاری غذا کھانے سے پرہیز کریں۔ میٹھی اشیا، مرچیں، تلی ہوئی، بھنی ہوئی چیزیں اور ترش پھل بھی تیزابیت پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے چیک کریں کہ کس چیز سے تیزابیت ہوتی ہے؟ غم، فکر بھی تیزابیت کا باعث بنتے ہیں۔ آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Nux vomica Pentarkan Ptk 63 کے 10 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

جوڑوں کی آوازیں

حافظ سلیم .... ضلع بدین

ڈاکٹر صاحب مجھے بچپن سے ہی گھٹنوں کے جوڑوں میں درد رہا ہے۔ جب میں پاؤں بلاتا تھا تو ٹک ٹک کی آواز آتی تھی اور مجھے سکون مل جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اب مجھے درد تو نہیں ہوتا البتہ اٹھتے بیٹھتے وقت گھٹنوں کے جوڑوں سے ٹک ٹک کی آوازیں آتی ہیں جیسے جوڑ کی دونوں ہڈیاں آپس میں رگڑ رہی ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے وقت ایسا ہوتا ہے۔ دوسرا مسئلہ ویری کوسل ہے۔ ڈاکٹر صاحب جلد از جلد مجھے اس کا علاج بتائیں اور یہ بھی بتائیں کہ علاج کتنا عرصہ جاری رکھنا ہے۔

جواب: جب ہم بالغ ہوتے ہیں تو ہمارے جسم میں اور جذبات میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ والدین اور بڑے بزرگوں سے جھجک و گھبراہٹ کے باعث ہم ان سے ذکر نہیں کرتے بلکہ اپنے ہم عمر لوگوں سے کرتے ہیں جن کو خود کچھ نہیں پتا ہوتا۔ نتیجتاً غلط معلومات پر گمراہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک بہت عام مسئلہ

ہے۔ ہم میں سے ہر ایک فرد کو اس جانب سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ اپنے نوجوان بچوں اور بچیوں کی حدود کے اندر رہتے ہوئے کیسے رہنمائی کی جائے کہ وہ بے راہ روی کا شکار نہ ہوں۔

آپ قرآن و حدیث کا مطالعہ کیجیے۔ نماز کی پابندی کیجیے۔ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں اور پھر اپنی صحت کے لیے دعا کیجیے۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں اور پھر تمام حالت تفصیل سے لکھیں۔ Calc. phos-30، Staphisagria-30 کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

گردے کی پتھری

حمیرا کلیم .... ضلع شکر گڑھ

میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے عرصہ 8 سال سے گردے میں بار بار پتھری بن جاتی ہے۔ پہلی مرتبہ جب پتھری ہوئی تو ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے دوائی لی جس سے پتھری نکل گئی۔ سال کے بعد پھر بن گئی، علاج کرایا پھر نکل گئی۔ پتھری تقریباً ہر سال ہو جاتی ہے۔ آخری مرتبہ جب پتھری ہوئی تو الٹراساؤنڈ کرایا اس وقت تقریباً 17cm کی پتھری تھی دائیں گردے میں۔ اس وقت ڈاکٹر نے کہا کہ کوئی علاج نہ کروانا صرف آپریشن ہوگا۔ آخر تنگ آکر آپریشن کرایا۔ اب تقریباً دو سال ہو گئے ہیں آپریشن کو۔ اب دونوں گردوں میں درد اور کھنچاؤ رہتا ہے۔ پیشاب ٹیسٹ کرایا تو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس میں کرسٹل نہیں آتے۔ بائیں گردے میں تقریباً چنے کے برابر پتھری ہے۔ برائے مہربانی کوئی اچھی سی دوائی تجویز کر دیں تاکہ آپریشن نہ کرانا پڑے۔

جواب: لگتا ہے کہ آپ علاج بے قاعدگی سے کراتی ہیں جبھی تو یہ بار بار بن رہی ہے۔ کیلشیم کی گولی یا اس کے مرکبات کے استعمال سے بھی پتھری بننے کے چانس بڑھتے ہیں۔ پیشاب آنے پر اس کو روکنے سے بھی پتھری بنتی ہے۔ پانی کا کم استعمال کیا جائے تو بھی پتھری بنتی ہے۔ کیلشیم کی گولیاں استعمال نہ کریں۔ پانی کم از کم 15 گلاس روزانہ پئیں۔ پیشاب جیسے ہی آئے ویسے ہی کریں روکنے کی عادت ترک کر دیں۔ کیلا، پالک، ٹماٹر، دودھ کا استعمال فی الحال نہ کریں۔ وزن نہ اٹھائیں۔ البتہ چلتی پھرتی ضرور رہیں بلکہ سیڑھیاں اترنے چڑھنے کی ورزش کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ استعمال کریں پھر کیفیت سے مطلع کریں۔ Calc. carb-30 کے 7-7 قطرے ایک گلاس پانی میں جبکہ Berberis Pentarkan 15 کی ایک گولی تھوڑے پانی کے ساتھ دن میں 3 مرتبہ لیں۔

مختلف بیماریاں

رومان المان .... راولپنڈی

کافی عرصے سے پاکیزہ میں آپ کا کالم پڑھ رہی ہوں۔ سوچا آج اپنا مسئلہ بلکہ مسائل آپ کو لکھوں۔ مہربانی فرما کر مجھے میرے مسئلے کا حل بتا دیں۔ میں بہت پریشان ہوں اور اب تو شدید مایوسی کا شکار ہو چکی ہوں۔ میرے موجودہ مسائل جن کا میں جلد حل چاہتی ہوں وہ چہرے کے دانے اور داغ دھبے، چہرے اور سینے پر بالوں کا آنا، پیٹھ پر بھی دانے ہیں جس کی وجہ سے زیادہ بیٹھنے سے جلن ہونا شروع ہو جاتی ہے، معدے کا مسئلہ، بالوں کا گرنا، سفید ہونا، دبلا پتلا جسم بالکل ہڈیاں ہیں، گوشت بالکل بھی نہیں، نسوانی حسن بھی بالکل نہیں۔ خون کی کمی اور کیلشیم کی بھی بہت کمی ہے۔ بلڈ ٹیسٹ، الٹراساؤنڈ، پیشاب ٹیسٹ رپورٹس بھجوا رہی ہوں۔ کوئی کریم یا میڈیسن بتا دیں۔ چہرے اور جسم کے لیے بھی دوا تجویز کر دیں۔ آپ کی بہت نوازش ہوگی اور آپ کی احسان مند رہوں گی۔ اگر ممکن ہو تو جواب جلد دے

دیں۔ میں چاہتی ہوں کہ رنگت صاف ہو جائے اور جسم بھی بھر جائے۔

جواب: اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ہم صحیح تشخیص کر کے صحیح قسم کا علاج کریں (ہومیو پیتھک) تو کوئی وجہ نہیں کہ مرض سے نجات نہ ملے۔ ہاں صحت کے اصولوں کی پابندی یقیناً حصولِ صحت کے لیے شرط ہے۔ متوازن غذا کا استعمال کریں۔ لال گوشت (بکرا، گائے) ٹماٹر، پالک، سلاد، کدو، چھولے، آم، چیری، فالسہ، آلو بخارا سیب، انار، سنگترہ وغیرہ کا بھرپور استعمال کریں۔ صبح سویرے اٹھیں۔ نمازوں کی پابندی کریں۔ کوشش کریں کہ صبح کی نماز کے بعد کسی باغ میں چہل قدمی کریں۔ پانی کا استعمال زیادہ سے زیادہ کریں، کم از کم 12 گلاس روزانہ ...... پئیں۔ کھانے سے پہلے اور کھانے کے دو گھنٹے بعد پانی کا استعمال کریں۔ شربت اور کولڈ ڈرنکس بالکل استعمال نہ کریں ان سے بھی دانے نکلتے ہیں۔ البتہ ستو، لسی اور تازہ پھلوں کے جوس مفید ہیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Calc. sulph-30، Ferrum met 30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ جبکہ Alfalfa-Ø کے 11 قطرے ہر کھانے کے بعد آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ Asa foetida Petarka Ptk 12,Nux vomica Pentarkan Ptk 63 کے 10 قطرے تھوڑے پانی میں تین مرتبہ لیں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

پڑھا ہوا یاد نہیں رہتا

قمر النساء............سیالکوٹ

میں انٹر کی طالبہ ہوں۔ مجھے پڑھا ہوا یاد نہیں رہتا۔ اور پیپر والے دن تو گھبراہٹ میں سب بھول جاتی ہوں۔ ماہنامہ پاکیزہ میں کریٹکس (Cratex) کے بارے میں پڑھا۔ مہربانی فرما کر میری راہنمائی فرمائیں۔

جواب: بی بی دماغی صلاحیت اور جسمانی نشوونما کو بڑھانے کے لیے کریٹکس ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ایک بے مثال دوا ہے۔ اس کے اب تک کوئی ضمنی اثرات مرتب نہیں ہوئے ہیں۔ ایام کے دنوں میں بھی اس کو لیا جا سکتا ہے اس سے کوئی خراب اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ قوت اور توانائی برقرار رہتی ہے۔ اس کو کم از کم ایک ماہ تک استعمال کریں۔ ایک ڈبے کی قیمت 415 روپے ہے جس میں 20 گولیاں ہوتی ہے۔ صبح اور شام ایک ایک گولی تھوڑے پانی کے ساتھ لیں۔ اس کے علاوہ Anacardium 30 ولمار شوابے جرمنی کے 5 قطرے دن میں 3 مرتبہ لیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

آنکھوں کی کمزوری

نور عمر............لاہور

میری بیٹی کی عمر ساڑھے چھ سال ہے۔ اسے عرصہ ڈھائی سال سے عینک لگی ہے۔ اس کے سر میں شدید درد ہوتا تھا اور متلی کی کیفیت ہوتی تھی۔ بائیں آنکھ کو ٹیڑھا کر کے دیکھتی تھی۔ اب یہ صورتِ حال ہے کہ ہر چھ ماہ بعد نظر چیک کروانے پر پہلے سے کمزور ہی نکلتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ہر بات کی ٹینشن لیتی ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو خود پہ سوار کر لیتی ہے۔ حد سے زیادہ حساس ہے۔ برائے کرم ایسی اچھی دوا تجویز کریں جو نہ صرف نظر کو ٹھہرنے میں مدد دے بلکہ improve بھی کرے۔ شکریہ۔

جواب: جناب نور صاحب بچی کو صبح سویرے سورج نکلتے ہوئے باغ کی سیر کرائیں ...... سونف، مصری، بادام سب کو ہم وزن لے کر پیس کر رکھ لیں اور روزانہ نہار منہ ایک کھانے کا چمچہ کھلا کر دودھ ایک پیالی پلا دیں۔ گاجر کا استعمال خوب کرائیں۔ ڈاکٹر ولمار

شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات تین ماہ تک استعمال کرائیں Physostigma 30,Calc Phos 30, Calc.Flour 30 کے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کرائیں۔

بیماریاں

عاصمہ............فیصل آباد

ماہواری سے پہلے الٹیاں آتی ہے۔ کچھ بھی کھایا پیا ہوسب نکل جاتا ہے۔ پھر معدے کے منہ پر درد شروع ہو جاتا ہے۔ نہ پیٹ کم ہوانہ کولہے، بال بھی گرتے ہیں اور میں نے آپ کو عینک کے متعلق بھی لکھا تھا۔ آنکھوں کی سیدھ میں سر میں درد ہوتا ہے۔ میرے چہرے پر کیل نکلتے ہیں اور ناک پر بلیک ہیڈز بہت زیادہ ہیں۔ اب میرا جسم پھول گیا ہے اور طاقت نہیں ہے، سیڑھیاں چڑھنے سے سانس پھولتی ہے۔ میرے منہ میں تالو والی جگہ پر خارش ہوتی ہے۔ اکثر منہ میں چھالے نکل آتے ہیں۔ جب خارش ہوتی ہے تو زبان تالو پر پھیرنے سے چھینکیں آتی ہیں اور غصہ بہت آتا ہے۔ تھوڑا سا کام کر کے تھک جاتی ہوں۔

جواب: بی بی آپ کا مسئلہ ہارمونز کی خرابی کا ہے اس لیے آپ کو باقاعدگی سے اس کو ٹھیک کرنے کے لیے علاج کرنا ہوگا۔ خطوط کے ذریعے جواب دے دیا جاتا ہے۔ فون نمبر دینا بیکار ہے کہ ہر کیس یاد نہیں رکھا جاسکتا کہ کس کو کیا ہے؟ اور کیا دوائی دی؟ خط میں بھی پچھلی دوائیوں کا ذکر ضرور کیا کریں تاکہ معلوم ہو کہ پہلے کیا دیا تھا اور اب کیا صورت حال ہے۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc carb-200 کی ایک خوراک 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں ہر ہفتہ لیں ایک دفعہ اس کے ایک دن بعد Thyroidinum-30، Pulsatilla-30، Fucus ves-Ø، Phytolcca- e-becsis-Ø، Ruta-30، Physostigma-30 کے 7-7 قطرے ایک کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ 3 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

سورائسس

مسز فاکہہ ارسلان......آزاد جموں کشمیر

میں ایک تکلیف دہ مسئلے کی طرف آپ کی توجہ دلا رہی ہوں۔ میں پانچ چھ سال سے دونوں پاؤں میں ایک ایسے مرض میں مبتلا ہوں جس کا بار، بار علاج کرنے کے باوجود وقتی فائدے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوسکا۔ پہلے کئی بار ایلو پیتھک علاج کرایا۔ ان لوگوں نے سورائسس تجویز کیا۔ بعد میں ہومیو پیتھک علاج بھی کروایا۔ علاج سے وقتی فائدہ تو ہوجاتا ہے لیکن مکمل افاقہ نہیں۔ مرض پھر بڑھ جاتا ہے۔ میں Housewife ہوں۔ عمر تقریباً 60 سال ہے۔

مہربانی کر کے اس لاعلاج بیماری کا مناسب حل تجویز کریں جس سے مستقل افاقہ ہو اور مجھے صحت کاملہ نصیب ہو۔

جواب: آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Bacilinum 200 کی ایک خوراک ہفتے میں ایک دفعہ لیں، ایک دن کے وقفے کے بعد Ars.iod 30 اور Hydrocotyle 30 کے بھی 5 قطرے دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں ..... شوگر ٹیسٹ کروائیں اور میٹھی چیزوں کا استعمال بھی کم سے کم کریں۔

***